۱۸۷۴ء

آئینہ پنجاب

یعنی

پنجاب کی دولت اور خوشحالی

مصنّفہ

ایچ۔ کیلورٹ۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ سی۔ آئی۔ ای

جسے

پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور نے

شائع کیا

آئینۂ پنجاب

یعنی

پنجاب کی دولت اور خوشحالی

آئینۂ پنجاب اقتصادیاتِ دیہات پنجاب کے باب میں ایک لاجواب کتاب ہے۔ اِس تصنیف کے متعلق صرف یہ کہہ دینا ہر لحاظ سے وافی و کافی ہے۔ کہ اس کے مصنف امدادِ باہمی کے یگانۂ روزگار، اور تحریک کے عدیم المثال، معاون و ممد، **ایچ کیلورٹ** آئی۔سی۔ایس۔سی۔آئی۔ای۔ ہیں "پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور" نے اس کے ترجمے کا اہتمام کیا۔ مترجم نے اپنی طرف سے انتہائی کوشش کی۔ کہ کتاب کے مطالب و مقاصد واضح ہو جائیں۔ یونین نے اِس کے ترجمہ۔ کتابت۔ اور طباعت پر زرِ کثیر صرف کیا ہے۔ ضرورت فقط یہ ہے۔ کہ پنجاب کا کوئی کوآپریٹر ایسا نہ ہو جس کے ہاتھ میں کیلورٹ صاحب کی یہ کتاب نہ پہنچ جائے۔ آج جو پنجاب کو امدادِ باہمی کا تیرتھ تصور کیا جاتا ہے، اُس کیلئے اس کی گردن سب سے زیادہ جس کریم النفس، جس فاضل، جس مخدومِ پنجاب کے احسانات کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ اُن کا اسمِ نامی اور اسمِ گرامی مسٹر ایچ کیلورٹ ہے۔ یہ نام ہر حامی تحریک اور ہر رکنِ تحریک کے وردِ زبان ہے۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ اس کی کتاب بھی ہر گوشہ میں پہنچ جائے۔ اس کے لئے ہر سوسائٹی، ہر کارکن، ہر عہدہ دار اور ہر بہی خواہ پنجاب کو یونین کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔

ایڈیٹر

اِس کتاب کو اعتراض اور نکتہ چینی کا ہدف بنا لینا آسان ہے۔ اور یہ کہنے والے بھی نکل آئینگے کہ اس کے مطالب میں کوئی نئی چیز نہیں۔ اور اِس نے ہماری معلومات میں کوئی اِضافہ نہیں کیا۔ اِس لئے اِسے شائع کرنے کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ مَیں ایسے لوگوں کو لارڈ مارلے کے اِن الفاظ میں جواب دینا چاہتا ہوں۔ کہ "ہم اکثر ایسی باتیں جانتے ہیں۔ جنہیں اگر از سرِ نو بیان کر دیا جائے۔ تو ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا" مَیں اِس ضمن میں یہ صاف صاف کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ مَیں نے یہ کتاب محض اس لئے لکھی ہے کہ اِس موضوع پر کوئی دوسری کتاب موجود نہیں۔ بعض ایسے معترض بھی ہونگے۔ جو اِس کتاب کے مطالب کو اپنے لئے بالکل نیا پائیں گے۔ اور اُن کے نزدیک ان کی صحت محلِّ نظر ہوگی۔ ایسے لوگوں کی خدمت میں عرض ہے۔ کہ اِس کتاب میں جا بجا مَیں نے بحدِ امکان حوالے دیئے ہیں۔ اِن حوالوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد آپ بھی اِس امر میں میرے ہمخیال ہو جائینگے۔ کہ اگر پنجاب کو اِن اِقتصادی فوائد سے بہرہ ور کرنا مقصود ہے۔ جو قدرت نے اِس کیلئے مستقبل کے پردہ میں پنہاں کر رکھے ہیں۔ تو اِس غرض کے لئے اِس صوبہ کے اِقتصادی حالات کا گہرا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔

مجھے ابھی انجمن ہائے اِمداد باہمی کی رجسٹراری کے عُہدہ پر متعیّن ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ مَیں نے سمجھ لیا۔ کہ اِس مضمون کو دیہاتی اِقتصادیات کی ایک اہم شاخ تصوّر کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔ چنانچہ جب مَیں نے اِس امر پر غور کیا۔ کہ آج کل متمدن ممالک میں انجمن ہائے امداد باہمی کو کیا حیثیت حاصل ہے۔ تو مَیں نے ان تمام ممالک کے حالات

کا مطالعہ کیا جن کا دارومدار پنجاب کی طرح زراعت پر ہے۔ چونکہ بعض مسائل جو آج اس صُوبہ میں زیرِ غور ہیں۔ یا غور و فکر کے محتاج ہیں۔ دوسرے زرعی ممالک کے اقتصادی حالات سے بہت مِلتے جُلتے ہیں۔ اِس لئے مجھے خیال گذرا۔ کہ اگر مقامی حالات و ضروریات کو مدِّ نظر رکھ کر اِس صُوبہ کے لوگوں کو بعض موٹی موٹی باتیں بتا دی جائیں۔ تو شاید اِس سے کسی قدر فائدہ ہو۔ چنانچہ مَیں نے اِس کتاب میں اقتصادیات کے عام مسائل اِس طریق اور اسلوب سے بیان کر دیئے ہیں۔ کہ وہ پنجاب کے حالات پر پُوری طرح منطبق ہو سکتے ہیں۔ آج کل جبکہ اِس ملک میں ایک نئے نظامِ حکومت کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ضروری ہے۔ کہ جو لوگ اِس صُوبہ کے نظم و نسق کی باگ ڈور سنبھالنے کیلئے منتخب کئے گئے ہیں۔ زرعی اقتصادیات کا علم عملی طور پر حاصل کریں۔ کیونکہ تعلیم یافتہ لوگوں کا مفاد اوّلین توجہ کا مستحق نہیں۔ بلکہ یہ حقِ اوّلیت زراعت پیشہ لوگوں کو پہنچتا ہے۔ جن پر آبادی کا بیشتر حصہ مشتمل ہے۔ خواہ دیہات کے باشندے حکومت کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ یا پیشہ ور قانون دانوں کے ہاتھ میں زمامِ حکومت رہنے دیں۔ بہر حال حکومت ایسی ضرور ہونی چاہئے۔ جسے دیہات کے باشندے گوارا کر سکیں۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ شہر کے باشندے خواہ اُنہیں دیہات سے شہر میں آئے ایک ہی پُشت کیوں نہ ہوئی ہو۔ زراعتی مسائل سے ناقابلِ بیان بے رُخی اور بے التفاتی برتتے ہیں[1]۔ لیکن قدرت نے شہر کے باشندوں کو اِس قدر عقل و فہم کا سرمایہ دار بنایا ہے۔ کہ اُنہیں جن مواقع سے دوچار ہونے کا اِتفاق ہو اُن سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ مزید براں صوبہ کی کونسل کے ارکان بھی

[1] یہاں شہر کے باشندوں کا ذکر کرنے سے ہرگز ہمارا یہ مقصود نہیں۔ کہ پنجاب کے شہروں کے باشندوں پر خصوصیت سے حملہ کر رہے ہیں۔ دنیا میں ہر جگہ شہر کے باشندوں کی یہ نمایاں خصوصیت ہے۔ کہ انہیں دیہاتی مسائل کا مطالعہ کرنے کیلئے وقت نہیں ملتا۔ مسٹر اے کالٹ نے جولائی ۱۹۲۰ء کے "کانٹمپریری ریویو" میں ایک مضمون بعنوان "ملک میں گیہوں کی بہم رسانی" لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

"دیہاتی مسائل سے اِس ملک کے اکثر باشندگان کی بیخبری اور جہالت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ خاص اور اہم توجہ کا تقاضا کرتی ہے۔"

شہر کے باشندوں میں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اِس لئے اگر دیہات کے مسائل کی جانب اُن کی توجہ منعطف کرانے کی کوشش کیجائے۔ تو یہ کوشش کسی شرح و معذرت کی محتاج نہیں ہوگی جب تک شہر کے باشندے کے پاس دیہات کے اقتصادی حالات معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ وہ بآسانی یہ عذر پیش کرسکتا ہے۔ کہ دیہاتی مسائل سے بے خبر ہونے کے باعث وہ اُن میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ اگر یہ کتاب دیہات کے معاملات کیجانب اس کی توجہ مبذول کرانے میں مفید ثابت ہو۔ تو اِن کے مفید ہونے میں کوئی شُبہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اِس کتاب کا مطالعہ کسی شخص کو جو مجھ سے زیادہ اِستعداد رکھتا ہو۔ ایک زیادہ گرانمایہ اور قابلِ قدر کتاب لکھنے پر آمادہ کردے۔ تو میں سمجھونگا۔ کہ میری آرزو پوری ہوگئی۔

یورپ تجربہ گاہ ہے

یہ بالکل صحیح ہے۔ کہ یورپ صدیوں سے ایک بہت بڑی معاشرتی تجربہ گاہ بنا ہوُا ہے۔ اِس تجربہ گاہ میں ہر قسم کے تجربے کئے گئے ہیں۔ اور اُن سے مفید اور غیر مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہ عجیب امر ہے۔ کہ جن طریقوں میں ناکامی ہو چکی ہے۔ بار بار اُن کے استعمال کی کوشش کیجاتی ہے۔ جو ناکامی پر منتج ہوتی ہے۔ یا تو یہ بات ہے۔ کہ اِن ناکام طریقوں کو جب تک خود آزما نہ لیا جائے۔ وہ اِس قدر دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ کہ لیڈر بننے والے لوگ تاریخ کے درسِ عبرت کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ اور یا یہ بات ہے۔ کہ یہ لوگ تاریخ کا مطالعہ ہی نہیں کرتے۔ دنیا میں ہر جگہ تعمیری کوشش ناپید ہے۔ اور آج دنیا کو محض تعمیری قابلیت و استعداد کی ضرورت ہے۔ اگر کسی شخص میں مصیبتیں اُٹھانے اور محنت کرنے کی غیر محدود قابلیّت موجود ہے۔ تو امید رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ جلد اُن مسائل کو حل کرنے کی جانب توجہ کریگا۔ جن سے پنجاب آجکل دوچار ہو چکا ہے۔ اِس کتاب کا مقصد اِن مسائل کا حل نہیں۔ بلکہ میں تو صرف اِس قدر واضح کردینا چاہتا ہوں۔ کہ پنجاب میں بعض مسائل ایسے ہیں۔ جن کی گرہ کشائی آج تک کسی ناخنِ تدبیر سے

نہیں کی۔ اور دیہاتی اقتصادیات اِس نوع کے ایک حل طلب مسئلہ کا نام ہے۔ میرا عقیدہ ہے۔ کہ اگر ہم پنجاب کے اِقتصادی مسائل کا حل کرنے پر اپنی تمام توجہ لگا دیں۔ تو آج جو بے اطمینانی نظر آ رہی ہے۔ اِس سے بہت حد تک نجات حاصل ہو جائیگی۔ جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ پنجاب میں جو مسائل عقدہ کشائی کے محتاج ہیں۔ وہ دوسرے زرعی ممالک مثلاً ہسپانیہ۔ اطالیہ۔ یونان اور سرویا وغیرہ جیسے ممالک میں بھی موجود ہیں۔ جہاں حکومت خود مختاری قائم ہے۔ تو یہ امر روز روشن کی طرح آشکارا ہو جاتا ہے۔ کہ اِن حل طلب مسائل کی ذمہ داری اس صوبہ کے نظامِ حکومت پر عاید نہیں ہوتی۔ بلکہ اِن مسائل کو بعض ایسے اسباب نے پیدا کر دیا ہے۔ جو پنجاب اور یورپ کے زراعتی ملکوں میں یکساں موجود ہیں۔ مَیں نے زرعی ممالک کے حالات کا جس قدر مطالعہ کیا ہے۔ اُس سے مَیں اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پنجاب بعض مختص خصوصیات رکھنے کے علاوہ ایسی خصوصیات بھی رکھتا ہے۔ جو تمام زرعی ملکوں میں پائی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں کے تعلیمیافتہ شہریوں کی جو کیفیت ہے، دوسرے ملکوں کے شہری باشندوں کی بھی بجنسہٖ وہی حالت ہے۔ انگلستان کے تعلیم یافتہ شہریوں کا گروہ ترقی کے میدان میں صنّاعوں اور تاجروں سے بہت پیچھے ہے۔ حالانکہ اہلِ صنعت اور تجارت میں بہت کم گریجویٹ ہیں۔ بلکہ وہاں تو تعلیمیافتہ لوگوں کا حصولِ اِقتدار کی کوشش کرنا ایک خارج از بحث مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اِس بیسویں صدی کے روشن عہد میں بھی کاروباری اشخاص کا ایک بہت بڑا گروہ ایسا ہے۔ جو کالجوں کی تعلیم پر اعتماد نہیں رکھتا۔

سیدھے سادھے لوگ اور ترقی

برطانیہ کو صنعت و حرفت کے جن شعبوں مثلاً جہاز سازی۔ تجارتی۔ جہاز رانی اور روئی اُون۔ کوئلہ۔ فولاد وغیرہ کی صنعت میں جو غلبہ اور برتری حاصل ہے۔ اس کیلئے وہ یونیورسٹیوں کے گریجوئیٹوں کا شرمندۂ احسان نہیں۔ پروفیسر "ایلفرڈ مارشل" نے صحیح کہا ہے۔ کہ جن لوگوں نے برطانیہ کی صنعتی ترقی کی جانب سب سے پہلے توجہ کی۔ وہ سیدھے سادھے لوگ تھے۔

اُن کے قلب میں محض ترقی کا ولولہ اور ہمدردی کا جوش تھا۔ جن کی رہنمائی اُن کی فطرتی قوت اور کاروباری استعدادنے کی۔ یونیورسٹی کی تعلیم نے افلاس اور دولت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ البتہ اب کہیں جاکے یہ تجربہ ہو رہا ہے۔ کہ یونیورسٹی کی تعلیم سے تجارت اور صنعت وحرفت میں کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ ایک مفلس ملک کو دولتمند اور با اقبال بنانے کے لئے محض اقتصادیات سے عملی طور پر فائدہ اُٹھانے کی سمجھ درکار ہے۔ اور یہ چیز انگریزوں کو نارمن فتحمندوں سے ورثہ میں ملی تھی۔ لیکن اِس ورثہ سے انگریزوں نے بہت دیر میں فائدہ اٹھایا۔ ۱۸۲۵ء تک تو یہ کیفیت تھی۔ کہ موجودہ معیارِ زندگی کے مقابلہ میں اِنگلستان کے باشندوں کا بیشتر حصہ بہت مفلس تھا۔ نہ مکان اچھے تھے۔ نہ لباس اور خوراک اچھی۔ اب بھی اِنگلستان کے بڑے بڑے شہروں میں اِفلاس کا مسئلہ پنجاب سے بھی کہیں زیادہ صبر آزما (کٹھن) واقع ہوا ہے۔ پنجاب کئی حیثیتوں میں برطانیہ کی نسبت دولتمند ہے۔ یہاں کی زمین زرخیز ہے۔ اور آب وہوا ایسی ہے۔ کہ سال بھر میں دو فصلیں ہوتی ہیں۔ اِس لئے فن لینڈ اور بحیرہ روم کے ساحلی ممالک یعنی پرتگال۔ ہسپانیہ۔ اطالیہ۔ یونان اور سرویا کے مقابلہ میں پنجاب کو زیادہ دولتمند سرزمین سمجھنا چاہئیے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جن ملکوں کا دارومدار زراعت پر ہے اُن کا اِسوقت تک مفلس رہنا ضروری ہے۔ جب تک لوگ اِمدادِ باہمی ومیل جول اور تعلیم اور سائینس کی مدد سے زمین کی پوشیدہ دولت حاصل کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ اِس موقعہ پر بلجیم کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ بلجیم کی زمین ریتلی اور بنجر ہے۔ اور اِس حیثیت سے یورپ بھر میں بدترین سمجھی جاتی ہے۔ اور اگرچہ ایک ہزار سال سے اسے زرخیز بنانے کے لئے بیحد محنت کی جارہی ہے۔ تاہم اب بھی یہ حالت ہے۔ کہ جب تک ایک دو مرتبہ کھاد نہ ڈالی جائے۔ سال بھر میں ایک فصل بھی نہیں ہوتی۔ لیکن بلجیم کے کسان بہت اچھے کاشتکار اور جفاکش لوگ ہوتے ہیں۔ اِنہیں اعلیٰ درجے کی زرعی تعلیم دی جاتی ہے۔ جسکی وجہ سے اِمدادِ باہمی کی تحریک اُن کے ہاں ترقی حاصل کر رہی ہے۔ اور رسل رسائل کا بھی بہت اچھا اِنتظام ہے۔ کیا بلجیم کے کسانوں کی زندگی میں ہمارے لئے کوئی سبق موجود نہیں؟[1] میں نے

---

[1] لائف اینڈ لیبر مصنفہ راؤنٹری میں سے بلجیم سے سبق کا حصہ صفحہ ۱۴۸-۱۵۵

اوراقِ آئندہ میں جابجا ان کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ جو دوسرے زراعتی ممالک کے متعلق
لکھی گئی ہیں۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے۔ کہ مَیں بار بار پنجاب کے نقائص بیان کرنا نہیں
چاہتا تھا۔ دوسرے میرا خیال ہے۔ کہ اگر دوسرے زرعی ممالک کے حالات کا گہرا مطالعہ کیا جائے
تو اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ اگر ہم صحیح طور پر مقامی حالات بیان کرنے کے خواہشمند
ہیں۔ تو اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ دوسرے ملکوں کے حالات پر ایک نظر اِس طرح ڈالی
جائے۔ کہ پنجاب سے اُن کا موازنہ (مقابلہ) ہو جائے۔ بدقسمتی سے دوسرے ملکوں کی طرح پنجاب
میں یہ چیز نمایاں نظر آتی ہے۔ کہ تعلیم یافتہ لوگ شہروں میں جا بستے ہیں۔ مستقبل کے
سود و بہبود کیلئے ہماری نگاہیں اُن لوگوں پر لگی ہوئی ہیں۔ جنہیں تعلیم نے افلاس اور دولت
کے اسباب و ذرائع معلوم کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ امریکہ کے اہلِ قلم بھی اِس امر کی شکایت
کرتے ہیں۔ کہ شہر کے باشندے زرعی مسائل کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔ لیکن شہر
گاؤں والوں کے التفات کا محتاج نہیں۔ کیونکہ وہ تربیت یافتہ اہلِ دانش کا مرکز ہے۔ اور
گاؤں میں اِس چیز کا وجود نہیں۔ گاؤں کو شہر سے جو شکایت ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔
کہ اوّل الذکر تعلیمیافتہ لوگوں کی اعانت اور ہمدردی کا محتاج ہے۔ اور تعلیم یافتہ لوگ شہر
میں آباد ہیں۔ بعض لوگوں نے ہمدردانہ طور پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔
کہ اِس کتاب میں بعض دلائل ایسے بھی ہیں۔ جن کا اثر یہ ہوگا کہ شہر کے باشندے دیہاتی
مسائل کی جانب توجہ کرنے کی بجائے اُن سے زیادہ نفرت کرنیوالے ہو جائینگے۔ اگر یہ صحیح ہے
تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اِس کتاب کی اشاعت میرے دِلی مقصد کے لئے نقصان رساں ثابت
ہوگی۔ اِن ابواب میں مَیں نے سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی ہے۔ کہ اراضی صوبہ کی
دولت کا ذریعہ ہے۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ مزید برآں ہم اِس ملک میں جن مصنوعات کو دیکھنا
چاہتے ہیں۔ اُن کے لئے خام اجناس بھی مہیا کرے گی۔ اگر اِس دلیل کو صحیح تسلیم کر لیا
جائے۔ تو دیہات کے مسائل کا مطالعہ زراعت وصنعت و حرفت دونو کی ترقی کے لئے یکساں
ضروری ہے۔ اور اگر تعلیمیافتہ لوگوں کو دیہاتی مسائل کے مطالعہ پر آمادہ کیا جائے۔ تو ایک عظیم الشان ترقی
کی پہلی منزل پر پہنچنے میں کوئی چیز ہماری سدِّ راہ نہیں ہوگی۔

مجھے اپنی دفتری مشغولیتوں سے جو فرصت کے اوقات ملتے رہے۔ اُن میں مَیں نے اِس کتاب کا مسالہ جمع کیا۔ اور اِس کام پر سالہا صرف ہو گئے۔ قانون اِنتقال اراضی کے متعلق مَیں نے جو ابواب تحریر کئے ہیں۔ وہ بنگال اکنامک جرنل میں جواب بند ہو چکا ہے۔ شائع ہو چکے ہیں۔ اراضی کی قیمت کے متعلق جو کچھ مَیں نے لکھا ہے۔ یہ پہلے انڈین جرنل آف اکنامکس میں شائع ہوا تھا۔ اور مَیں نے اُس کے ایڈیٹر کی اجازت سے اِس آرٹیکل کو زیادہ پھیلا کر لکھ دیا ہے۔ بعض باتیں مَیں اپنے لکچروں میں جو مَیں نے گذشتہ دو سال کے اندر دیئے۔ بیان کر چکا ہوں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض جگہ ترتیب و تسلسل موجود نہیں۔ اور بعض مباحث میں تکرار ہے۔ وقت کی قلت اِس قدر اجازت نہیں دیتی۔ کہ مَیں یہ نقائص رفع کر سکوں۔ مَیں تو اِس کتاب کی اشاعت ملتوی کر کے اِس سے بہتر کتاب شائع کرنا پسند کرتا۔ لیکن مَیں نے اِس موضوع کو ایک بحرِ بیکراں پایا۔ اور جوں جوں مطالعہ کرتا گیا۔ مجھے اپنی اساسی دلیل کی تائید میں مزید شواہد دستیاب ہوتے گئے اِس لئے یہ مناسب معلوم ہوا۔ کہ جس قدر کتاب مرتب ہو چکی ہے۔ اسے شائع کر دیا جائے۔

مَیں اُن دوستوں کا شکر گذار ہوں۔ جنھوں نے اِسے تنقیدی نظر سے دیکھا۔ علی الخصوص مسٹر ایچ۔ ڈبلیو۔ ایمرسن آئی۔ سی۔ ایس سیٹلمنٹ آفیسر ملتان۔ جنہوں نے کئی حصّے مجھ سے از سرِ نو لکھوائے۔ مسٹر سی۔ سی۔ ہارو سے پروفیسر تاریخ خالصہ کالج۔ مسٹر ڈبلیو۔ رابرٹس سابق پرنسپل زراعتی کالج پنجاب وغیرہ میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اگر اِس کتاب میں کوئی خوبی ہے۔ تو وہ اِنہی اصحاب کی رہین منت ہے۔

اِس کتاب کو کوئی سرکاری حیثیت حاصل نہیں۔ اِسمیں جن دلائل اور آراء کا اظہار کیا گیا ہے اُنکی تمام تر ذمہ داری مجھ پر عاید ہوتی ہے۔ جن مقامات پر مَیں نے پنجاب کے متعلق بعض واقعات بیان کئے ہیں۔ اور کوئی حوالہ نہیں دیا۔ وہ زیادہ تر سرکاری کاغذات سے لئے گئے ہیں۔ البتہ جہاں دوسرے ملکوں کے متعلق کچھ بیان کیا گیا ہے۔ مَیں نے یہی کوشش کی ہے۔ کہ جس کتاب سے مَیں نے اِس بارے میں اِستفادہ کیا ہے۔ اس کا پورا پورا حوالہ دیا جائے۔

یکم جنوری سنہ ۱۹۲۲ء

ایچ کیلورٹ

تمہید

حکومت پنجاب ہر سال اپنی انتظامی رپورٹ میں صوبہ کی علمی اور ادبی حالت کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ شائع کرتی ہے۔ خدا جانے کیا وجہ ہے۔ کہ کبھی کسی شخص نے علم وفن کے مختلف شعبوں سے اِس نوٹ کا مقابلہ کر کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر کوئی شخص یہ کوشش کرتا۔ تو اُسے معلوم ہو جاتا۔ کہ جہاں پنجاب میں مذہب سیاسیات شاعری ہر دلعزیزوں اور بہادروں کے عاشقانہ قصوں کے متعلق بیسیوں کتابیں شایع ہوتی ہیں۔ وہاں ان اِقتصادی مسائل پر جو آج پانچ دریاؤں کی سرزمین کے باشندوں کو پیش ہیں۔ ایک کتاب بھی نظر نہیں آتی۔ طالب علم کو ایک اچھی لائبریری میں تمام ممالکِ عالم کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ دنیا درحقیقت اِتنی بڑی نہیں لیکن اس کی نسبت عام طور پر لوگوں کے معلومات بہت محدود واقع ہوئے ہیں۔ آج ہر ملک میں زراعت کو علم وفن کے تمام شعبوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لیکن لطف یہ ہے۔ کہ ہر ملک میں یہ شکایت عام ہے۔ کہ اگر لوگ اپنی معلومات سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں۔ تو ملک زیادہ زرخیز و زرریز بن سکتا ہے۔ عروج و کامرانی کی شاہ راہ پر ملکوں کی ترقی کے مدارج مختلف ہیں۔ سب ملکوں پر افلاس کا ایک دور گذر چکا ہے۔ اکثر ممالک ابھی تک افلاس کی تنگنائی سے نہیں نکلے چند ملکوں نے سائنس کی ایجادات میں ترقی کی ہے۔ اور کسی قدر اقبال و عروج حاصل کر لیا ہے۔ لیکن اُن ممالک کے باشندوں کی نگاہ میں یہ ترقی چنداں زیادہ نہیں۔ اور اِس راہ کے دوسرے مسافروں یعنی دوسرے ممالک کے باشندوں کی یہ کیفیت ہے۔ کہ وہ اِسقدر کو بھی رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ آج ایک تنہا شخص جو سرمایہ سائنس۔ کسی دانشمندانہ اور جرأت و ہمت کی اعانت کے بغیر زندگی کے میدان میں کود پڑتا ہے

اتنا بھی نہیں کما سکتا۔ کہ اپنا اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پال سکے۔ اس صوبہ کے باشندے بھی اس عقدۂ لاینحل سے دوچار ہو رہے ہیں۔ یہ ماننا پڑیگا۔ کہ ملک کی دولت کسان کے بازوئے ہمت کی شرمندۂ احسان ہے۔ کسانوں کے سوا بہت کم لوگ ایسے ہیں۔ جو ملک کی پیداوار میں اضافہ کر سکیں۔ اور یہ بھی مسلمہ امر ہے۔ کہ انسان کو کمانے کے بغیر چارہ نہیں۔ پیٹ بھرنے کے لئے خوراک ضروری ہے۔ اور اگر انسان زندہ رہنا چاہتا ہے۔ تو اُسے خوراک بہم پہنچانی پڑے گی۔ گویا خوراک زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے۔ لیکن لطف تو یہ ہے۔ کہ خوراک بہم پہنچانے کا کام جاہل اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے سپرد ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ صرف اس فن سے بے خبر ہی نہیں بلکہ وہ اس پیشہ کو اپنے وقار و شان کے منافی سمجھتے ہیں۔ اس صوبہ میں نوعِ انسان کی اِس اہم ترین ضرورت کی جانب جتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات نے توجہ فرمائی ہے۔ اُن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ذات پات کا مسئلہ اس راہ میں ایک بڑا بھاری پتھر ہے۔ اور اس کے ہمہ گیر اثر کی بدولت ملک کی اقتصادیات کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ خوراک بہم پہنچانے کے لئے جسمانی مشقت کی ضرورت ہے۔ اور اکثر تعلیمیافتہ لوگوں کو جسمانی مشقت ناگوار ہے۔ اس لئے وہ زراعت کو وسیلۂ معاش بنانا نہیں چاہتے۔ یہی تعلیم یافتہ لوگ اخبارات میں لوگوں کے افلاس کے متعلق مضامین لکھتے ہیں۔ وہ اِس موضوع پر تقریریں کرتے ہیں۔ یا لوگوں کے قلب میں افلاس کے مسئلہ پر تقریر کرنے کا ولولہ پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ کسانوں کو ایسے طریقے اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جس سے بیچارے کسان افلاس اور پابندی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں گے۔ وقت اُن پر خدمتِ عامہ کے بہتیرے دروازے کھول دیتا ہے۔ جن کے اندر وہی شخص داخل ہو سکتا ہے۔ جو ابنائے جنس کے سود و بہبود کا بے غرضانہ ولولہ رکھتا ہو۔ اور وہ اِس پیشکش کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ وہ صنعت و حرفت کے معمولی قوانین کو تو تسلیم کر لیں گے۔ جس کام سے فائدہ پہنچیگا اُسے کرینگے۔ کہیں کافی نفع کی امید دکھائی دے گی۔ تو فوراً اس سمت دوڑ پڑیں گے۔ لیکن یہ نہیں مانیں گے۔ کہ کسان بھی اُن جیسا انسان ہے۔ جو خواہشات اُن کے دل میں ہیں۔ وہ اُس بیچارے کے دل میں بھی موجود ہیں۔ اور اُن کی زندگی کا نظم و ترتیب جن اثرات کا شرمندۂ احسان ہے کسان

کی زندگی بھی انہیں اثرات سے بہرہ یاب ہے۔

ناداری ایک عام بیماری ہے

غالباً افلاس آج دنیا کی سب سے زیادہ ہمہ گیر اور نمایاں خصوصیت ہے۔ اکثر انسان ابھی تک بے زری کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ اِس کے پھندے سے نجات حاصل کرنے کے لئے کامیاب جدوجہد کر رہے ہیں۔ بعض اس کی زنجیروں سے آزاد ہو کر کامیابی کی شاہراہ پر بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن دنیا کے کسی گوشے میں انسان کو فاقہ کشی کے اندیشے سے نجات حاصل نہیں ہوئی۔ اور غالباً ہندوستان میں یہ خیال عام ہے۔ کہ انگلستان اور دوسرے ممالک میں افلاس کا گذر نہیں۔ اور ان ممالک کے لوگ مفلس نہیں ہوتے۔ وہاں ہر شخص خوشحال ہے۔ صرف ہندوستان ہی ایسا ملک ہے۔ جسے اِس دولت سے جو دوسرے ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ حصہ نہیں ملا۔ اور تو اور تعجب ہے۔ کہ جاپان جو غالباً دنیا کا مفلس ترین ملک ہے۔ ہندوستان میں ایک دولتمند اور با اقبال خطہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر جاپان ایشیا کے بجائے کسی دوسرے براعظم میں ہوتا۔ تو اس سرزمین کے مصائب سے تعلیم یافتہ طبقہ کو باخبر کیا جا سکتا تھا۔ چونکہ یہ ملک ایشیا میں واقع ہے اِسلئے مجھے اندیشہ ہے۔ کہ اگر اس کے افلاس و اقبال کا مقابلہ دوسرے ملکوں سے کیا گیا۔ تو مجھ پر فوراً جانبداری کا الزام لگ جائیگا۔

اِنگلستان ایک ایسا ملک ہے جس کی تاریخ دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ مکمل ہے۔ اِنگلستان میں ایسی قدیم تاریخی دستاویزیں موجود ہیں۔ جن سے اس ملک کے صحیح حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ حقیقت کی تلاش کرنیوالے کے لئے یہ تفصیلی حالات اور دستاویزیں ایک خزانہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کسی دوسرے ملک میں اقتصادی ترقی کی تاریخ کا اِس قدر سرمایہ موجود نہیں۔ اِس تاریخی سرمایہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انگلستان ہمیشہ سے متمول نہیں تھا۔ اِس کے باشندے ہرگز ہمیشہ دولتمند نہیں تھے۔ انہیں بھی وبا اور قحط سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ بھی اپنے ابنائے وطن کی ہلاکت پر آنسو بہاتے رہے۔ انہیں ہمیشہ

اقتصادی ترقی کی راہ میں دانشمند رہنما نہیں ملتے رہے۔ اُن کے سیاسی رہنماؤں نے ہمیشہ دانش وتدبر کا ثبوت نہیں دیا لیکن انگلستان کی تاریخ میں ایک حقیقت ضرور نمایاں نظر آتی ہے۔ اور یہی حقیقت ہے۔ جس نے اُسے دوسرے ملکوں کی نگاہ میں قابل قدر بنا دیا ہے وہ حقیقت یہ ہے۔ کہ انگلستان قدرتی طور پر دولتمند ملک نہیں۔ لیکن اس کے باشندے جو مختلف نسلوں کی آمیزش اور اختلاط (ملاپ) کا نتیجہ ہیں۔ یقیناً اس راہ پر جو افلاس سے دولتمندی کی منزل کو جاتی ہے۔ بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ اِس لئے انگلستان کی تاریخ میں اُن تمام لوگوں کے عبرت ونصیحت کا سامان پوشیدہ ہے جو اپنے ملک کو با اقبال اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں۔ فرض کر لیجئے! کہ ایک ملک آج مفلس ہے۔ لیکن اُس کے باشندوں کے دل میں اپنے ملک کے سود و بہبود کی حقیقی خواہش موجود ہے۔ تو ایسے لوگوں کے لئے جن کے ہاتھ میں اُس ملک کے اختیار کی باگ ڈور ہے۔ انگلستان کی تاریخ اپنے اندر درسِ عبرت رکھتی ہے۔ انگلستان نے کامرانی (کامیابی) حاصل کرنے کے لئے جو طریقے اختیار کئے۔ اُن پر غور کیجئے۔ اِن متعدد طریقوں میں آپ کو کوئی نہ کوئی ایسا طریقہ ضرور مل جائیگا۔ جس کی مدد سے آپ عروج واقبال کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ اگر آج ہندوستان میں ایسی دشواریاں موجود ہیں۔ جنکا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تو یہی دشواریاں انگلستان کی تاریخ میں بھی مل سکتی ہیں۔ جن طریقوں سے انگلستان نے اِن دشواریوں سے نجات حاصل کی۔ اُن کی روشنی میں ہم بھی اپنے لئے ایک راہ معین کر سکتے ہیں۔ جس پر گامزن ہونا بہتر نتائج کا حامل ثابت ہوگا۔ انگلستان کی دولتمندی کا راز کچھ تو اِس امر میں پنہاں ہے۔ کہ اس ملک میں عرصۂ دراز تک امن وسکون رہا ہے۔ اور کچھ یہ چیز اس کے تموّل کا باعث ہوئی ہے۔ کہ طالب علم اور محقق کے افادہ کے لئے اقتصادی تاریخ کا سرمایہ موجود ہے۔ امن وسکون سے یہ فائدہ ہوا کہ ملک برابر ترقی کرتا چلا گیا۔ اور اقتصادی تاریخ کی بدولت جرح وقدح اور اصلاح وتنقید کا موقع ملتا رہا۔ دوسرے ملکوں میں بیرونی حملوں اور بغاوتوں نے یکبارگی فیوڈل سسٹم کی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ اور صدیوں کے پرانے قوانین ودساتیر (ضوابط) کو مٹا ڈالا۔ لیکن انگلستان میں تغیر وانقلاب مسلسل وپیہم مگر آہستگی کیساتھ ہوتا رہا۔ چونکہ انقلاب برپا کرنا یا ملک کو بیرونی حملہ آوروں کا

حرف بنا دینا کسی شخص کے بس کی بات نہیں۔ اِس لئے ان شورشوں کے نتائج تدریجی تغیر کے مقابلہ میں حصولِ ترقی کیلئے کم مفید ثابت ہوئے ہیں۔

زراعت اور انگلستان

زراعت کے میدان انگلستان وہ تمام منزلیں طے کر چکا ہے۔ جن سے دوسرے ملک اب گذر رہے ہیں۔ بلکہ انگلستان تو اکثر ایسی منزلوں سے بھی گذر چکا ہے۔ جن سے دوسرے ملکوں کو گذرنا باقی ہے۔ جب کوئی خاص رسم زیر بحث ہو۔ تو ایسے موقعہ پر اس امر پر غور کرنا بہت مفید ہے۔ کہ انگلستان کو جب یہ صورتِ حال پیش آئی۔ تو اُس نے اس رسم کو ترک کر کے کیا فوائد حاصل کئے مثلاً کسی زمانے میں یہ سوال زیر بحث تھا۔ کہ آیا زمین کی کاشت کے حق میں مالک خود کاشت اچھا ہے۔ یا مزارع؟ اِس مسئلہ کا حل تجربہ نے کیا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہؤا۔ کہ نہ تو حقوقِ ملکیت اور نہ شرائط اجارہ اراضی کی تعیین ضروری ہے۔ بلکہ صرف اِس قدر حفاظت کی ضرورت ہے۔ کہ مالک اراضی مزارع کو غیر ذمہ دارانہ طور پر بے دخل نہ کر سکے۔ مزارعہ کے حقوق محفوظ کر دیئے جائیں۔ تو اِس سے یہ فائدہ ہوگا۔ کہ زمین کی غور و پرداخت اچھی طرح سے ہوگی۔ محض ملکیت سے فائدہ کی بجائے نقصان کا احتمال ہے۔ پنجاب میں آج یہ دستور رائج ہے۔ کہ زمین لاکھوں چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور جب مزارعین میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت لیجانیکا خیال پختہ ہو جائیگا۔ تو اغلب ہے۔ کہ یہ چیز ترقی کی راہ میں روک ثابت ہو۔ جب جی چاہے مزارع تابع مرضی کو نقصان دہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب ساتھ ہی اراضی کسانوں کی ملکیت بھی ہو۔ تو یہ چیز ایک خطرہ بن جائے گی۔ جب زیادہ تعلیم یافتہ اور ماہر فن لوگ بڑے بڑے قطعات اراضی کیلئے غیر ترتیب یافتہ اور جاہل موروثی مزارعین کا مقابلہ کرینگے۔ تو یہ طریقہ جس کی بدولت اراضی چھوٹے چھوٹے زمینداروں پر منقسم ہے۔ زراعتی ترقی کے لئے روک ثابت ہوگا۔ کیونکہ اِس طرح اعلیٰ درجہ کے تربیت یافتہ کاشتکاروں کے لئے اتنی کافی اراضی مہیا نہیں ہو سکے گی۔ جن میں وہ قابلیت کے جوہر دکھا سکیں۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ جس طرح سیاسی صنعتی اور معاشرتی دشواریوں کا حل سہل نہیں۔

اسی طرح زرعی مسائل کا حل بھی کوئی آسان کام نہیں - اس گرہ کو کھولنے کے لئے صوبہ بھر کے دانشمند ترین اشخاص کی توجہ ضروری ہے - جب تک پنجاب کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے لوگ اسطرف توجہ نہیں کرتے - یہ صوبہ بدستور پستی اور افلاس کی زنجیروں میں جکڑا رہیگا -

مختلف خیالات

آج صحت خیال، اور منطقیانہ طریق استدلال نظر نہیں آتے - بہتیرے لوگ ایسے ہیں - جو بیک وقت سراسر مختلف خیالات رکھتے ہیں - بعض کو شکایت ہے - کہ اسباب معیشت کی فراہمی پر بہت روپیہ صرف ہوتا ہے - اور پھر تحفظ کے بھی طالب ہیں - جو یقیناً اس نقص میں اضافہ کریگی بعض کہتے ہیں - کہ ملک کی پیداوار ضروریات کے لئے کافی نہیں - اور پھر ایسے طریقے اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں - جنہیں اختیار کیا جائے - تو پیداوار کا دائرہ محدود تر ہو جائیگا - ہر اہل قلم یہ ضرور لکھتا ہے - کہ زراعت پر بہت دباؤ پڑ رہا ہے - اس لئے اس ملک میں صنعت وحرفت کو فروغ دینا چاہئے - گویا اگر ایک شخص زراعت کو چھوڑ کر صنعت وحرفت کیطرف توجہ کرے - تو اسے کم خوراک کی ضرورت ہوگی - یا زراعت پر جو دباؤ پڑ رہا ہے - اس میں کمی واقع ہو جائے گی - صنعت وحرفت کو فروغ دینے کے مسئلہ پر زور قلم صرف کرنیوالے اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں - کہ دیسی مصنوعات کو فروغ حاصل ہوا - تو لامحالا آبادی میں اضافہ ہوگا - اور اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ ہوگا - کہ خوراک کی ضرورت زیادہ ہوگی - پھر لطف یہ ہے - کہ ایک اہل قلم جہاں ایک طرف اس امر پر اظہار افسوس کرتا ہے - کہ لوگوں سے بہت زیادہ محاصل لئے جاتے ہیں - وہاں یہ بھی چاہتا ہے - کہ ان وسیع اسکیموں پر جو اسے پسند ہیں بے دریغ روپیہ صرف کیا جائے ایک شخص اٹھتا ہے - اور دفتری حکومت کی وسعت کو قابل ملامت قرار دیتا ہے - اور ساتھ ہی اس امر پر زور دیتا ہے - کہ حکومت کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع کر دیا جائے - اس بنیادی حقیقت کو اکثر اوقات نظر انداز کر دیا جاتا ہے - کہ حکومت کے مصارف و مخارج (خرچ) کو اسکے مداخل (آمدنی) سے متاثر ہونا ضروری ہے - جو لوگ جاپان کی حکمت عملی کی تعریف کرتے ہیں - وہ زیادہ محصول لگانے کو گوارا نہیں کر سکتے - حالانکہ گرانی محاصل سے ہی اس حکمت عملی کو مالی مدد پہنچ سکی تھی - ان لوگوں کو

دفتری حکومت کی مداخلت اور اقتدار بھی گوارا نہیں۔ جس سے اِس حکمت عملی کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ صاف بات تو یہ ہے۔ کہ اقتصادیات کے متعلق زبان وقلم کے جوہر تو خوب دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن مطالعہ بہت کم کیا جاتا ہے۔ یہ احساس ناپید ہے۔ کہ اقتصادی قوانین چند پروفیسروں کے فیصلوں کا نام نہیں۔ جو مخصوص عقاید کے مطابق کر لئے گئے ہیں۔ بلکہ یہ دنیا بھر کے متفقہ تجربات کا مجموعہ ہیں۔ کوئی شخص انہیں پائے حقارت سے ٹھکرا کر سزا سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ تجربہ کی راہ بہت کٹھن ہے۔ جو شخص محض اپنے عقاید وخیالات اور اپنی محدود تاریخ کو بھی قابلِ اعتماد سمجھتا ہے جب اُن لوگوں کے مقابلے میں آئیگا۔ جنہوں نے زمانہ سے زیادہ وسیع سبق حاصل کیا ہے۔ تو یقیناً ناکام ہوگا۔ امریکہ دوسرے ملکوں کے حالات کا مطالعہ کر کے معلومات حاصل کر رہا ہے۔ ہسپانیہ اس سرچشمہ سے مستفید نہیں ہُوا۔ اِس لئے اُس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیش آرہی ہیں۔ ہندوستان اور جنوبی یورپ کے لوگ مذہبی اور آئینی مسائل میں اس قدر مست ہیں۔ کہ انہوں نے زندگی کے اِقتصادی پہلو کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ اُن کے انہماک کا یہ عالم ہے۔ کہ بعض اوقات یہ شُبہ ہوتا ہے۔ کہ آیا اِن لوگوں میں اپنے ملک کو مادّی ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنے کی خواہش بھی موجود ہے یا نہیں۔

پنجاب اور دوسرے ملک

اِس ملک میں جو لوگ امورِ عامہ میں دلچسپی لیتے ہیں۔ انہیں عادت ہو گئی ہے۔ کہ اپنے ملک کے حالات کا مقابلہ صرف اِنگلستان سے کرتے ہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان۔ اِنگلستان سے دوسرے درجہ پر نظر آتا ہے۔ وہ دوسرے ملکوں کو جن کے حالات ہندوستان سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بعض وجوہ کی بنا پر اِنگلستان کو معیار قرار دینا صحیح نہیں۔ اِنگلستان کی اراضی کے بیشتر حصّہ میں ایسے مزارعین زراعت کرتے ہیں۔ جو بڑے بڑے دولتمند مالکان اِراضی کے ماتحت ہیں۔ اِن مالدار زمینداروں نے اٹھارویں صدی میں نہایت ذوق اور محنت سے فنِ زراعت کا مطالعہ کیا۔ اور نہایت جرأت سے زراعت کے طریقوں کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اور چھوٹے چھوٹے مالکانِ اراضی کسانوں اور کاشتکاروں کو اِن طریقوں کی

تعلیم دی۔ مشہور لارڈ ارنسٹ[1] کا قول ہے۔ کہ اٹھارویں صدی کے متعدد زمینداروں نے زراعت کی راہ میں جو خدمات انجام دیں۔ اُن سے بڑی عوام کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔ پنجاب میں بھی بڑے بڑے زمیندار موجود ہیں۔ لیکن ابھی تک اُن میں اُس جوش اور سرگرمی کے آثار نمایاں نظر نہیں آتے جس نے انگلستان کے تمول (دولت) کو اِس قدر ترقی دی۔ پنجاب میں چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی کی کثرت ہے۔ اِس لئے اِس سرزمین کا مقابلہ ایک ایسے ملک سے کرنا صحیح نہیں۔ جہاں مزارعین کی اکثریت ہے۔ البتہ فرانس۔ جرمنی۔ بلجیم۔ رومانیہ وغیرہ ایسے ممالک ہیں۔ جہاں اراضی کسانوں کی ملکیت ہے۔ اور ان ممالک کی تاریخ میں ایسا سامان ملتا ہے۔ جس کی روشنی میں اِس صوبہ کے موجودہ حالات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ اراضی کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر دینے کی خرابی جو اِس صوبہ میں پائی جاتی ہے۔ اِن ممالک میں بھی موجود ہے۔ اور اُن کی ترقی میں مارج ہو رہی ہے۔ ابھی ان ملکوں کی حکومتوں کو اِس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ معلوم نہیں ہو سکا۔ فرانس کی زراعت پانچ سو سال تک زوال پذیر رہی۔ اِس طویل زمانہ کا ایک حصہ وہی ہے جس میں انگلستان نہایت تیزی سے زراعت میں ترقی حاصل کر رہا ہے۔ جرمنی نے انیسویں صدی میں زراعت کے متعلق جو اِصلاحات کیں۔ اُن کا آغاز ۱۸۰۷ء[2] سے ہوتا ہے۔ جبکہ البرٹ تھیئر کی کتاب موسومہ "انگلستان کی زراعت کے متعلق معلومات" شائع ہوئی۔

اِنگلستان کی خصوصیتیں!

اراضی کے اجارہ اور انگریز زمینداروں کی وسیع خدمات کے علاوہ برطانی تاریخ میں ایک اور عنصر بھی ہے۔ جس کے پیش نظر ہندوستان اور انگلستان کا موازنہ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ انگلستان ہمیشہ سے کفایت شعار بننے۔ اور پس انداز کرنے کی کوشش میں مصروف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ دونوں ملکوں کے باشندوں کی اوسط آمدنی کے متعلق غلط خیالات رائج ہو گئے ہیں۔

---

[1]:۔ ہسٹری آف اگریکلچر اینڈ پرائسز جلد پنجم۔ ساتواں اور تیرھواں دیباچہ۔

[2]:۔ جیب مین کی کتاب۔ اکنامک ڈیولپمنٹ آف فرانس اینڈ جرمنی۔

اِس ملک میں اوسط کا دارومدار محض موجودہ نسل کی آمدنی پر ہے۔ اِس پر آبائی وراثت کا کوئی اثر نہیں۔ اگر انگلستان کے لوگوں کی آمدنی کی اوسط بہت زیادہ ہے۔ تو اس کا باعث یہ ہے۔ کہ پہلی نسلیں مفید کاروبار میں روپیہ لگا چکی ہیں۔ مزید براں اُن سے انگلستان کے موجودہ باشندوں کو وسیع علم اور تجربہ ورثہ میں ملا ہے۔ اس ملک میں اکثریت کی عام ضروریات کم از کم کوشش سے پوری ہو سکتی ہے۔ بڑے بڑے زرآمد دریائی میدانوں کی تو یہ کیفیت ہے۔ کہ زمین کو ذرا سا کھود کر مٹھی بھر بیج بو دیا جائے۔ تو فطرت کی مخفی قوتیں فوراً فصل اُگانے میں مصروف ہو جائیں گی۔ فطرت اِس قدر فیاض واقع ہوئی ہے۔ کہ اِنسان کو ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت ہی نہیں زمین فطرت کا عطیہ ہے۔ فطرت جو کچھ بخش دیتی ہے۔ اِنسان اُسی پر زندگی بسر کرتا ہے۔ انگلستان کی حالت اِس سے بالکل مختلف ہے سوہاں زمین کبھی زرخیز نہیں تھی۔ آج ہم انگلستان کی زمین کو جس صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ وہ سراسر اِنسان کے قوتِ بازو کی شرمندۂ احسان ہے۔ انگلستان میں زمین کی قیمت کچھ بھی نہیں۔ قیمت تو اُس محنت کی ہے۔ جو اُس کے مختلف مالک یکے بعد دیگرے اُسے زرخیز بنانے کے لئے کرتے رہے ہیں۔ اور اگر زمین کی کچھ قیمت بھی ہے۔ تو وہ بہت کم ہے۔ مثلاً یہ اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ آجکل سڑکوں۔ جنگلوں۔ پھاٹکوں۔ پانی کی موریوں پر جو عہدِ حاضرہ میں کھیتی باڑی کے لئے ضروری ہیں۔ بارہ ۱۲ پونڈ فی ایکڑ صرف ہوتے ہیں۔ زمین کے متعلقہ مکانات کی تعمیر پر ۹ پونڈ خرچ ہوتے ہیں۔ یہ کل ۲۱ پونڈ ہوئے۔ اور جنگ سے پہلے زمین کی قیمت پچیس ۲۵ پونڈ فی ایکڑ تھی۔ اِسی طرح صرف چار ۴ پونڈ رہ گئے۔ اِس کا بیشتر حصہ بھی ۹ اِنچ سطحِ زمین کی قیمت ہے۔ جسے کسانوں کی محنت زرخیز بناتی ہے۔ اس کا مقابلہ پنجاب کے حالات سے کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ انگریز کس حد تک اپنے بزرگوں کے شرمندۂ احسان ہیں چونکہ انگریزوں پر ایسا زمانہ گذر چکا ہے۔ جبکہ وہ عرصہ تک افلاس کے تباہ کن پنجہ میں اسیر رہے ہے۔ کئی کئی دِنوں تک مصیبتیں اٹھاتے اور دکھ برداشت کرتے رہے۔ سالہا سال تک اچھی فصل نہیں ہوئی۔ اور ہمیشہ فاقہ کشی کا خوف ان پر طاری رہتا تھا۔ اِس لئے وہ اِسی پر مجبور ہو گئے۔ کہ ہلاکت سے بچنے کے لئے کفایت شعاری اختیار کریں۔ صدیوں تک مخالف آب و ہوا کے اثرات کے خلاف جنگ کرنے سے اُن میں مضبوط ارادے اور صبر و تحمل پیدا ہو گیا ہے۔ جو اُن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

بابِ اوّل

چند ابتدائی باتیں!

جب ایک ہی چیز سے نگاہ بار بار آشنا ہوتی ہے۔ تو قوتِ مشاہدہ کند ہو جاتی ہے ایک نو وارد کو کسی مقام کی جو چیزیں اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہیں۔ اُن میں خود اُس مقام کا باشندہ کوئی دلچسپی کا سامان نہیں پاتا۔ جو چیز روزمرّہ کی باتوں میں داخل ہو جائے۔ اُس پر کوئی شخص سوچ بچار نہیں کرتا۔ اِس لئے ایسی چیزوں کیجانب توجہ منعطف کرانے کے لئے کسی ہیجان پیدا کرنیوالی چیز مثلاً نمایاں بے اطمینانی اور اضطراب کی ضرورت ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ ایک ملک میں سالہا سال بلکہ کئی نسلوں تک افلاس کے متعدد اسباب موجود ہوں۔ اور کسی نے کبھی اُن کا ذکر تک نہ کیا ہو۔ پھر یکبارگی ملک میں شدید قحط رونما ہو جائے۔ اور اسبابِ افلاس کی تحقیقات ہونے لگے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ لوگوں میں بعض ایسی غلط فہمیوں یا عقاید کو قبولِ عام حاصل ہو۔ جن کی تردید میں بآسانی شہادتیں بہم پہنچائی جا سکتی ہوں۔ لیکن بایں ہمہ لوگ اُن پر یقین رکھتے ہوں۔ لوگ اُس وقت اپنے عقاید کے جھوٹ سچ کا امتحان کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ جب تک انہیں اصل حقیقت کیجانب توجہ کرنے پر مجبور نہ کر دیا جائے پنجاب ہندوستان کے ایک گوشے میں آباد ہے۔ اِس کے تین طرف ریگستان واقعہ ہے۔ اِس لئے اگر اِس صوبہ کے لوگوں میں یہ احساس نہیں۔ کہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جو تحقیق و جستجو کے محتاج ہیں۔ تو اِس بے حسی کے بعض خاص اسباب ہیں۔ ایک ملک جو بحری ساحل اور بندرگاہیں رکھتا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں سے تجارت کرتا ہے۔ دور دراز بندرگاہوں سے اُس کا تعلق ہے مقام طور پر غیر ملکی لوگوں سے اِتنا تعلق پیدا کر لیتا ہے۔ کہ نئے خیالات پرانے عقاید اور رسوم و رواج کو ہٹا کر اپنا راستہ پیدا کر لیتے ہیں۔ انگلستان کا جغرافیائی محلِ وقوع ایسا ہے۔ کہ اُس کے فرزندوں کو دوسرے ملکوں

کے حالات معلوم کرنے کے بے نظیر مواقع حاصل ہو گئے۔ اس نے اپنی حریف سلطنتوں مثلاً ہالینڈ، فرانس اور شمالی جرمنی کی ریاستوں سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ یورپ سے اکثر کسان اور اہلِ حرفہ آکر انگلستان میں آباد ہو گئے۔ بلکہ انگریز کسی نہ کسی وجہ سے ہمیشہ دوسرے ملکوں کا سفر کرتے رہے۔ اور اس طرح زمانہ دراز تک خیالات کا مبادلہ ہوتا رہا۔ قدیم زمانہ کے اہلِ انگلستان مستحقِ تحسین ہیں۔ کہ انہوں نے صرف دوسرے ملکوں سے فائدہ ہی حاصل نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے ملکوں سے جو خیالات سیکھے اُن کو ترقی بھی دی۔ پنجاب پر جن حملہ آوروں نے یکے بعد دیگرے حملے کئے۔ انہوں نے اس ملک کے باشندوں کی عادات اور رسم و رواج پر گہرا نقش چھوڑا۔ لیکن یہ حملے جنوب یا شرق کی جانب سے نہیں ہوئے۔ جہاں قدیم زمانہ میں تمدن موجود تھا۔ بلکہ مغرب کے اُن علاقوں کی جانب سے کئے گئے تھے۔ جہاں علم و فن ترقی کی کسی قابلِ ذکر منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ انگلستان پر یکے بعد دیگرے جو حملے ہوئے۔ اُن کے نتائج بیحد بیش بہا تھے۔ اور پنجاب صدیوں تک جن حملوں کا ہدف بنا رہا۔ وہ مادی فوائد کے اعتبار سے بہت کم نفع بخش تھے۔ بلکہ انہوں نے پنجاب کی اقتصادی ترقی کو بہت نقصان پہنچایا۔ انگلستان کو اس اعتبار سے دنیا کی تاریخ میں بے مثال حیثیت حاصل ہے۔ کہ اس ملک میں عرصہ دراز تک مسلسل و پیہم اندرونی امن و امان رہا ہے۔ یعنی ۱۰۶۶ء کی فتح سے آج تک انگلستان میں امن قائم ہے۔ اس زمانے میں جو شورش اور ہنگامے برپا ہوئے اُن سے صنعتی ادارے یا انکا ریکارڈ تباہ نہیں ہوا۔ چنانچہ انگلستان میں جہاں ابھی تک پرانی روایات قائم ہیں[1] وہاں اُس کی تاریخ کے متعلق مسلسل شہادتیں دستاویزوں کی صورت میں موجود ہیں۔ پنجاب کی گذشتہ تاریخ کے متعلق دستاویزیں موجود نہیں۔ اگرچہ یہاں بھی محققین کو پرانے سکے، کتبے، تانبہ پر کھدی ہوئی سندیں اور پرانی عمارتوں کے آثار تو بکثرت ملتے ہیں۔ لیکن پرانے زمانے کی تاریخ کے تفصیلی حالات نہیں ملتے۔ حالانکہ یہاں کے حالات کا مکمل علم حاصل کرنے اور دوسرے ممالک اور موجودہ حالات سے موازنہ کرنے کے لئے یہ چیز ضروری ہے۔ یہاں ایسے کتب خانے نہیں جنمیں دانشورانِ سلف (گذشتہ فاضلوں) کی دستی تحریریں موجود ہوں۔ علی الخصوص زراعت کے متعلق کوئی

[1] یورپ کے بعض دوسرے ملکوں کا ریکارڈ بھی بہت اچھا ہے۔ لیکن جامعیت کے اعتبار سے انگلستان کے ریکارڈ کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

پرانی قابلِ قدر یا مشہور کتاب موجود نہیں۔ جس قدر حالات فراہم ہو سکے ہیں۔ اُن کا خلاصہ صرف اِسقدر ہے۔ کہ اِس ملک میں زراعت کے قدیم فن نے سینکڑوں سالوں سے بہت کم ترقی کی ہے۔ پُرانے عہد نامے میں جن زرعی حالات کا ذکر ہے۔ وہ پنجاب کے موجودہ حالات سے مطابقت رکھتے ہیں[۱]۔

آج اِقتصادی مسائل کے متعلق عام طور پر جو طریق عمل اختیار کیا جا رہا ہے۔ اُسکی ذمہ داری شاید تاریخی ریکارڈ کے فقدان پر عاید ہوتی۔ لیکن موجودہ حالات ویسے ہی ہیں۔ جیسے آج سے سالہا سال پیشتر تھے۔ اب یہ حالات اِس سرزمین میں رسم اور دستور کی حیثیت اِختیار کر چکے ہیں۔ اور افلاس کو رواج عام سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کو ایک مفلس ملک خیال کیا جاتا ہے۔ اِس لئے اس کے باشندے بھی قدرتاً مفلس ہیں۔ پبلک معاملات میں دلچسپی لینے والے لوگ جب مسئلہ افلاس کیطرف توجہ کرتے ہیں۔ تو اُن کی توجہ کا دائرہ اظہارِ غیظ و غضب تک محدود رہتا ہے۔ لیکن افلاس ایک اقتصادی حقیقت کا نام ہے۔ اس کے اسباب اقتصادی ہیں۔ اِس لئے ضروری ہے۔ کہ اِسکا علاج بھی اقتصادی طریقوں سے کیا جائے۔ تمام ملکوں اور قوموں میں یہ خصوصیّت پائی جاتی ہے۔ کہ جب ملکی حالات پر غور کیا جاتا ہے۔ تو اُن تمام ذمہ داریوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جو اُس ملک کے باشندوں پر عاید ہوتی ہیں۔ اور ایسے عناصر کو مصیبت کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ جو عوام کے دائرہ اختیار و قدرت سے باہر ہوتے ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے۔ کہ لوگ مصیبت اور تکلیف کے عالم میں اُن دشواریوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے جو درحقیقت اُن کے اپنے نقائص کے ثمرات ہیں۔ سیاسی علاج تلاش کرتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ بدامنی۔ جنگ و جدال اور ہنگامہ و پیکار کا آغاز ہو جاتا ہے۔ مصیبت و پریشانی بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر ان تکالیف کے صحیح علاج کو نظر انداز ہی نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اُن مصیبت زدہ لوگوں کو اس سے فائدہ حاصل کرنے سے روکا جاتا ہے۔ سیاست اِقتصادی امراض کا علاج نہیں کر سکتی۔ بلکہ اُس کی جانب رجوع کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ اگر آپ اِنسانی کامیابیوں کی تاریخ کے اوراق اُلٹ کر یہ تلاش کرنا چاہیں۔ کہ سیاست نے کبھی دنیا کو کوئی اقتصادی فائدہ بھی پہنچایا ہے۔ تو آپ کو اِس جستجو میں بہت دشواریاں پیش آئیں گی۔

---

[۱] جنوبی یورپ کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

انگلستان کے باشندے بھی کسی زمانہ میں اِس غلط خیال میں مبتلا تھے ۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ سیاسی ایجی ٹیشن (ہنگامہ آرائی) کوئی اقتصادی فائدہ نہیں پہنچا سکتا ۔ تو انہیں اپنی مدد آپ کرنے کا خیال آیا ۔ اور وہ عظیم الشان تحریک عالمِ وجود میں آئی ۔ جو انجمن ہائے اِمداد باہمی کی تحریک کے نام سے مشہور ہے ۔ آئرلینڈ کے ایک اہلِ قلم کا قول ہے ۔ کہ آئرلینڈ میں سیاست کو جو اہمیت دی جاتی ہے اس نے آئرلینڈ کے کسانوں پر بہت بُرا اثر ڈالا ۔ اور اُن میں دولت پیدا کرنے کی اگلی سی قوت نہ رہی ۔ وہ لکھتا ہے ۔ کہ مادّی ضروریات سے توجہ ہٹا لینے کے باعث آئرلینڈ والوں کا ذہن غیر حقیقی اور تاریک خیالات کا خزانہ بن گیا ۔ لوگوں کی توجہ عملی مسائل سے ہٹ گئی ۔ حکومتِ خود مختاری کے حصول کا مسئلہ اُن کا اوڑھنا بچھونا بن گیا ۔ اِس مطالبہ میں آئرلینڈ والوں نے جس سرگرمی اور ثابت قدمی کا اظہار کیا ۔ اگر اس کا عشر عشیر[1] حصہ بھی اقتصادی ترقی کے عملی مسائل پر صرف کیا جاتا ۔ تو آج آئرلینڈ کے حالات بالکل مختلف ہوتے[1] ۔ آئرلینڈ میں بھی اصل سوال افلاس کا تھا ۔ دراصل یہ مسئلہ اقتصادی نوعیت رکھتا تھا ۔ اور اِس امر کا متقاضی تھا ۔ کہ اِقتصادی ذرائع سے اس کا حل کیا جائے ۔ چنانچہ آج اِس جزیرے میں جو ترقی نظر آتی ہے ۔ اِس کا باعث یہی ہے ۔ کہ دیہات کے مصائب کا علاج کرنے کی جانب توجہ کی گئی ۔ انجمن ہائے اِمداد باہمی کا نظم و نسق ہوشمند اور تعلیمیافتہ لوگوں کے سپرد تھا جو نہ صرف اِس تحریک کے ارکان کو اس کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کرنے کی اہلیت رکھتے تھے ۔ بلکہ باقی لوگوں پر بھی یہ امر واضح کر سکتے تھے ۔ کہ یہ تحریک قومی سود و بہبود کے لئے کس حد تک مفید ثابت[2] ہوئی ہے اور اِس طرح لوگوں کو اِس کے احترام پر آمادہ کر سکتے تھے ۔ یہ بحث کہ آیا اقتصادی ترقی سے پہلے سیاسی تغیر ضروری ہے یا نہیں ہماری کتاب کے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی ۔ لیکن درآنحالیکہ اِس غلطی کے اعادہ کا خطرہ دامنگیر ہو عوام میں اُسی طرح یہ خیال پھیلانے کی کوشش کیجارہی ہو ۔ کہ نظامِ حکومت کی تبدیلی سے غیر محدود فواید حاصل ہونگے ۔ اِس امر کو نظر انداز کیا جا رہا ہو ۔ کہ لوگوں کے کندھوں پر اپنی فلاح و بہبود کی خاطر کام کرنے کی ذمہ داری بھی ہے ۔ تو اِس صورت میں یہ لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا

---

[1] ۔ پھولدری کنسٹرکشن اِن آئرلینڈ صفحات ۱۶ و ۱۷ ۔

[2] ۔ بٹربرنس جلد پنجم صفحہ ۲۰۰

ہے - کہ جب تک زیادہ ہوشمندانہ طریق اختیار نہیں کرینگے - اقتصادی تباہی کے سوائے اِس کا کوئی
نتیجہ نہیں ہو سکتا - ہم نے جو کچھ کہا ہے - اسے توڑ مروڑ کر یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئیے - کہ ہمارے نزدیک
سیاسیات میں تبدیلی ہونی ہی نہیں چاہئیے - یہ تو فطرتی چیز ہے - کہ ہندوستانی جب اپنے گرد و پیش
افلاس ہی افلاس دیکھتے ہیں - تو وہ ایسے طریقے پر اِس مسئلہ کا حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو
اُن کے نزدیک اچھے نتائج کا حامل ثابت ہو سکتا ہے - لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں اِس ملک کی
سیاسی قوت ہے - جب تک دیہاتی اقتصادیات کا مطالعہ نہ کرینگے - جب تک وہ مقامی حالات کے
متعلق علم حاصل نہیں کرینگے - اور یہاں کے حالات کا دوسرے ممالک کے حالات سے مقابلہ کر کے
اِس علم کو روشن اور اُجالا کرنے کی کوشش نہیں کی جائیگی - وہ مقامی جذبات و خیالات کی روشنی
میں عوام کو مصائب سے نجات دینے کے لئے جس قدر طریقے سوچیں گے - اُن سے یقیناً یقیناً کوئی
فائدہ نہ ہوگا - یہ اَور بات ہے - کہ انہیں اس سے کوئی شدید نقصان بھی نہ پہنچے محض سیاسی تبدیلیوں سے
اقتصادی فوائد حاصل نہیں ہو سکتے - یہ ہو سکتا ہے - کہ ہم مادی ارتقا کی راہ میں ایک آدھ قدم آگے بڑھ جائیں
لیکن اس کے لئے بھی ضروری ہے - کہ سیاسیات کو اِس قدر مقدم نہ رکھا جائے - کہ اقتصادی قوتوں کے نتائج
اُس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیئے جائیں -

اِس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے - کہ اقتصادی مصائب کا علاج اقتصادی طریقوں سے ہی
کیا جا سکتا ہے - اب رہا دوائی کا اِنتخاب تو اس کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے - کہ مرض کیا ہے - لہٰذا
سب سے پہلے اسی کی جانب توجّہ کرنی چاہئیے - اِس لئے پہلے تو پنجاب کے اقتصادی حالات کے متعلق
جس قدر مسالہ مل سکے اُسے فراہم کر کے اس صوبہ کے اقتصادی حالات معلوم کئے جائیں - اگر یہ تحقیق و تجسّس سے معلوم ہو
جائے - کہ اس صوبہ کے لوگوں کا معیارِ زندگی کیوں پست ہے - پیداوار کیوں کم ہوتی ہے - اور پھر اگر ان شکایتوں کو
رفع کرنے کی ایسی تدابیر معلوم ہو جائیں - جو عمل میں لائی جا سکیں - تو ماہرِ اقتصادیات نے اپنے دعویٰ کی صداقت
ثابت کر دی - اب یہ سیاست دانوں کا کام ہے - کہ وہ ایسے قوانین یا احکام کے نفاذ پر زور دیں - جو اِس غرض کے
لئے ضروری معلوم ہوں -

پنجاب ایک زراعتی صوبہ ہے - لیکن اسے اِس باب میں کوئی بے مثال حیثیت حاصل نہیں - یہ دُنیا کے
بہت سے ملکوں میں سے ایک ہے - جو سب کے سب یکساں طور پر زراعت کے دست نگر ہیں - ان سب سے

ایک ہی صدائے افلاس[۱] بلند ہو رہی ہے۔ اور کم و بیش سب میں اسبابِ افلاس کی تحقیق کرنے اور ان سے مخلصی کے طریقے سوچنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انگلستان کے دیہات اِس بارے میں کوئی مستثنا حیثیت نہیں رکھتے۔ دنیا میں ہر جگہ یہ دیکھا گیا ہے۔ کہ کسان اپنی آمدنی کو اِس حد تک بڑھا نہیں سکے کہ وہ زمانۂ جدید کی ضروریات کے لئے کافی ثابت ہو۔ یہ صحیح نہیں۔ کہ اس صوبہ کے کسان اوسط کے اعتبار سے جاپان یا بحیرۂ روم کے ساحل کے کسانوں سے کم خوشحال ہیں۔ برخلاف اِس کے یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں کسانوں کی اتنی بڑی جماعت اپنی ضروریات کے تناسب کے اعتبار سے مرفہ الحال ہیں۔ جس قدر نہر لوئر چناب کے آباد کار۔

اِس کے علاوہ بلا خوفِ تردید یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ ملک میں کسانوں کی کوئی جماعت پنجاب کے کسانوں کی طرح مقدمہ بازی پر کروڑوں روپیہ صرف نہیں کرتی۔ یہ جو کہا جاتا ہے۔ کہ پنجابی مفلس ہے قطعاً غلط ہے۔ پنجابی کے سامنے اقبالمندی اور خوشحالی کے حصول کا جس قدر وسیع میدان موجود ہے۔ وہ کسی ملک کے باشندے کو نصیب نہیں۔ زرعی ممالک کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تین امور کے متعلق رایوں میں اتحاد پایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ زراعت کی جانب توجہ نہیں کی گئی دوسرے یہ کہ زراعت میں آہستہ آہستہ تبدیلی ہو رہی ہے۔ تیسرے یہ کہ اِس تبدیلی کا اثر یہ ہوا ہے۔ کہ اپنے پیشے کے بارے میں کسانوں کا جو طریق عمل تھا اُسمیں پوری تبدیلی دکھائی دے۔ اور اگر زراعت کو جو دنیا کی دولت کا سرچشمہ ہے اپنی اصلی حالت پر لانے کی کوشش کرنا مقصود ہے۔ تو اس غرض سے دیہاتی اقتصادیات کے علم کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اِس دلیل کی وضاحت کیلئے اِن امورِ ثلاثہ پر مزید بحث کی جائے۔

[۱] - اس بارے میں غالباً ڈنمارک مستثنا ہے۔ کیونکہ وہاں امداد باہمی کی تحریک دنیا کے تمام ممالک سے بہتر حالت میں ہے۔ لیکن ڈنمارک نے اس وقت امداد باہمی کے طفیل اقتصادی نجات حاصل کی۔ جب یہ ملک تباہی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کی مصیبت کا باعث کچھ پرشیا والوں کی جنگ تھی۔ اور کچھ یہ امر۔ کہ امریکہ کے گیہوں کی افراط نے انگلستان کی زراعت کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔

اِس ملک اور انگلستان کی موجودہ نسلیں وہی کچھ ہیں۔ جو اُنہیں ان کے بزرگوں نے بنادیا ہے۔ اگر ملکیت اور دولت نے بے اطمینانی کا جذبہ پیدا کردیا ہے۔ تو اِس جذبے کا اظہار ان لوگوں کے خلاف ہونا چاہئیے۔ جو اس قدر حقیر ورثہ چھوڑ گئے ہیں۔ ہر نسل کے ورثہ میں وہی کچھ آتا ہے۔ جو بزرگ اُن کے لئے جمع کر گئے ہیں۔ کیونکہ انسانی معاشرت کی نہایت ابتدائی حالت میں ہی ایسے لوگ مل سکتے ہیں۔ جو بزرگوں کی جمع کی ہوئی دولت یا تجربہ کی امداد کے بغیر محض اپنی کوشش کے بل بوتے پر زندگی بسر کرسکیں۔ جس ملک میں اِس قسم کی جمع کی ہوئی دولت زیادہ ہے۔ اُس کے باشندے خوش نصیب ہیں۔ اور جس سرزمین میں یہ کم ہے۔ اُس کے فرزندوں کو افلاس سے دو چار ہونا پڑے گا۔ ہندوستان کے جن لیڈروں کے نام تاریخ کے صفحے پر مرقوم ہیں انہوں نے شاذو نادر ہی اقتصادی ترقی کو اپنا مقصد بنایا ہے۔ ہندو سوسائٹی کی بنیاد اقتصادی نہیں۔ بلکہ مذہبی اصولوں پر ہے۔ جسمانی مشقت کو ابھی تک وقار کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ اور کھیتی باڑی کو دوسرے شریفانہ پیشوں سے پست تر سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے ممالک میں سوسائٹی کا دارو مدار پیداوار پر ہے۔ دولت ہی ایک ایسی قوت ہے۔ جو اربابِ دول کو سوسائٹی کی صفِ اوّل میں کھڑا ہونے کے قابل بنادیتی ہے۔ اور افلاس معاشرتی حیثیت کو مٹا دیتا ہے۔ اِس وقت ہمارا موضوعِ بحث یہ نہیں۔ کہ آیا اِس سے بہتری متصور ہے۔ یا نہیں۔ بلکہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اگر دولت پیدا کرنے پر توجہ صرف کیجائے۔ تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دولت جمع ہو جائے گی۔ اور اگر اس کی جانب سے بے پروائی اختیار کیجائے۔ تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ انگریز اقتصادی قوتوں کی مخلوق ہے۔ اور ہندوستانی مذہبی خیالات کا فرزند۔ جسطرح فصل کی اچھائی یا برائی کاشتکار کی مشقت کا آئینہ ہے۔ اسیطرح حال (موجودہ زمانہ) کو ماضی (پچھلے زمانہ) نے پیدا کیا ہے۔ اور امروز کے آئینہ میں زمانہ گذشتہ کے انوار جھلکتے نظر آتے ہیں۔ موجودہ نسل اپنے فرزندوں کے لئے ایک بہتر دنیا کی تعمیر میں مصروف ہے۔ مستقبل اِس جدو جہد کا آئینہ ہوگا۔ کیونکہ آج نہروں کی تعمیر کی اسکیم پر ہم جو روپیہ لگا رہے ہیں۔ اُس سے مستقبل میں فائدہ حاصل ہوگا۔ اگر یہ صوبہ ترقی کرنا چاہتا ہے تو اِس غرض کے لئے زیادہ سے زیادہ لوازم ترقی کی ضرورت ہے۔ ہمیں زیادہ واضح طور پر یہ ذہن نشین کرلینا چاہئیے۔ کہ ترقی کے معنی کیا ہیں۔ اور اس راہ میں کیا کیا تبدیلیاں پیش آسکتی ہیں؟

ہمیں ترقی کے لوازم کو فروغ دینے اور ان تبدیلیوں کو قبول کر لینے کے لئے آمادہ ہو جانا چاہتے ہیں اپنی توجہ زندگی کے اُن مقامی او مستقل عناصر پر لگا دینی چاہیئے۔ جو فلاح و بہبود کی منزل کیجانب راہنمائی کرتے ہیں۔ ان عناصر کو اپنا مرکز توجہ بنانا چاہیئے۔ جن کے بغیر کوئی ملک اور ملت ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم زندگی کے بنیادی حقائق کو پوری طرح سمجھنے کی اہمیت نہیں رکھتے۔ تو محض جذبات پرستی ہمیں گمراہ کر دے گی۔ اگر اس سے پیداوار کو فروغ دینے کا کام لیا جائے۔ تو اس صوبہ کو بہت فائدہ ہوگا۔ آئندہ صفحات میں آپ دیکھیں گے۔ کہ میں نے پنجاب کے نقائص کے اسباب اور اُن خوبیوں کا ذکر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو اس صوبہ کی دولت اور فلاح و بہبود کا سرچشمہ ہیں۔ اور مجھے اعتراف ہے۔ کہ میری یہ کوشش نا مکمل ہے۔

زراعت سے بے پروائی

یہ ایک مسلمہ امر ہے۔ کہ پنجاب میں زراعت سب سے بڑی سب سے قدیم اور سب سے اہم صنعت ہے زراعت صرف خوراک ہی بہم نہیں پہنچاتی۔ جس پر لوگوں کی زندگی کا دارومدار ہے بلکہ خام اجناس بھی مہیا کرتی کرتی ہے۔ جس سے درآمد شدہ مال کی قیمت ادا کیجاتی ہے۔ وہ اجناس بھی فراہم کرتی ہے۔ جس پر صوبہ کی تجارت کا انحصار ہے۔ اور صوبہ کی صنعت وحرفت کے لئے سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔

صوبہ کی تمام دولت اراضی پر مشتمل نہیں۔ بلکہ اراضی صوبہ کی نئی دولت مہیا کرتی ہے۔ اور صوبہ کے صنعتی مستقبل کا دارومدار اسی پر ہے۔ بایں ہمہ باستثنائے چند اشخاص کے تعلیمیافتہ گروہ نے اس کی جانب توجہ نہیں کی۔ اور یہ شکایت تقریباً ہر جگہ ہے[1]۔ دنیا نے بیچارے کسان کو فراموش کر دیا ہے۔ تربیت یافتہ ذہن اور دماغ رکھنے والے لوگوں نے اراضی کی جانب توجہ نہیں کی۔ ہم زمین میں جو کچھ ڈالتے ہیں۔ وہ ہمیں وہی واپس لوٹا دیتی ہے۔ اور ہم اُس میں وہی کچھ ڈالتے ہیں۔ جس کی تعلیم صدیوں کی پرانی روایات نے ہمیں دی ہے۔ اس بارے میں ہم نے جدید سائنس سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اس لئے زمین ہمیں جو کچھ دیتی ہے۔ وہ اتنا ہی ہوتا ہے۔ جتنا پرانے زمانے میں تھا۔ اس امر سے تو سب باخبر ہیں۔ کہ بعض قبائل اچھی طرح زمین کی غور و پرداخت کرنے کے بارے میں مشہور ہیں۔ اور بعض ذاتوں کے لوگ دوسروں کی نسبت زمین سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً ایک ارائیں عام طور پر ایک سکھ جاٹ سے زیادہ اچھا کسان ہوتا ہے۔ ایک سکھ جاٹ اس بارے میں ایک مسلمان راجپوت پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور پھر ایک مسلمان راجپوت بھی جب اپنے کھیت وادیٔ سندھ کے کسی بلوچ یا پٹھان کو دکھاتا ہے۔ تو ایک جذبۂ فخر محسوس کرتا ہے۔ اگر پنجاب کی تمام اراضی کی کاشت اُسی ہوشیاری اور احتیاط سے کی جاتی۔ جو بہترین کاشتکار میں پائی جاتی ہے۔ تو اس

---

[1] یہ صرف پنجاب یا ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ پر موقوف نہیں۔ بلکہ یہی الزام انگلستان امریکہ اور دوسرے ممالک کے تعلیم یافتہ شہریوں پر بھی لگایا جاسکتا ہے۔ انگلستان میں تعلیم یافتہ لوگوں نے زراعت کی اہمیت جنگ کے زمانہ میں محسوس کی جب کہ پیٹ بھرنے کے لئے کافی اجناس نہیں ملتی تھیں۔ لوگوں نے اس امر کو نظر انداز کر دیا تھا۔ کہ اگر زراعت سے غفلت برتی گئی۔ تو اس قسم کے نتائج کا امکان ہے۔ اور غالباً وہ پھر اس حقیقت کو نظر انداز کر دینگے۔

صوبہ کی دولت میں بیحد اضافہ ہوجاتا[1]۔

اگر صوبہ کے تمام کاشتکار اُن جیسے سازو سامان سے آراستہ ہوتے۔ اور اُنکی طرح احتیاط سے کام لیتے تو یقیناً صوبہ کی مجموعی پیداوار موجودہ پیداوار سے بہت زیادہ ہوتی۔ اِسلئے موجودہ حالت ہرگز ہرگز قابلِ اطمینان نہیں سمجھی چاہئے۔ یقیناً یہ کسی ملک کیلئے درست حکمت عملی نہیں۔ کہ اس کی سب اہم صنعت کی حالت یہ ہے کہ وہ توقعات سے بہت کم دولت پیدا کر رہی ہے۔ اِن بدیہی حقایق کے باوجود اِس سرزمین کے تعلیمیافتہ لوگ ملکی افلاس پر اظہار افسوس کرتے وقت اِس بنیادی سبب کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کہ افلاس کی ذمہ داری خود اُن پر عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرنے اور اُنہیں بتانے پر آمادہ نہیں۔ کہ زیادہ پیداوار کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے[2]۔

زراعت کی پستی کا باعث صرف یہی نہیں۔ کہ اِس فن کے اصولوں کی اِصلاح میں بہت کم دلچسپی لی گئی ہے۔ یا منفعت بخش طریقوں کو نظر انداز کیا گیا ہے بلکہ اس صوبہ کی فلاح و ترقی کے متعلق بعض دوسرے اہم امور بھی ہیں۔ جن پر اِس قدر توجہ نہیں کی گئی۔ جس کے وہ مستحق ہیں۔

اِن امورِ دوگانہ میں سے ایک کو زراعت پر سرمایہ لگانا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اِس غرض کیلئے جس ادارہ سے روپیہ قرض لیا جائیگا۔ وہ کس قدر سود لیگا۔ یہ مسئلہ دراصل گہری توجہ کا محتاج ہے۔ کیونکہ جب اِس ملک کے باشندے صنعت و حرفت کی ترقی سے شرح سود کے تعلق کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ تو اگر وہ زراعتی ترقی اور شرح سود کے تعلق کی اہمیّت کو نہ سمجھ سکیں۔ تو محل تعجب نہیں۔ شرح سود کی اہمیت اسی قدر نہیں۔ کہ اگر شرح سود کم ہوئی۔ تو کاروبار سے زیادہ نفع حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ بہتیرے کاروبار ایسے ہیں جن سے

---

[1] ملاحظہ ہو سٹیٹ ہلپ فار اگریکلچر صفحات ۱۱-۱۴-۱۵-۱۶-۲۸ اس کتاب میں انگلستان کے متعلق بھی یہی شکایت کی گئی ہے۔

[2] پیداوار کی کمی کا ایک باعث ناقص بیج ہے۔ بیج کی تجارت بھی وہی لوگ کرتے ہیں جن کے قبضہ میں غلہ کی تجارت ہے۔ اگر انہیں اپنے فائدہ کا ذرہ بھر بھی خیال ہوتا۔ تو وہ بہترین بیج فروخت کرتے۔ اور جو شخص ناقص بیج فروخت کر کے تجارت کی توسیع میں حائل ہوتا۔ اُسے سب مل کر سزا دیتے۔ بدقسمتی سے اِس قسم کی وسیع الخیالی ناپید ہے۔ البتہ لائل پور اور منٹگمری میں پچاس سے زیادہ ایسے دوکاندار موجود ہیں۔ جو اچھے بیج کی فروخت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ آغاز نہایت چھوٹے پیمانے پر ہوا ہے۔ بہرحال یہی غنیمت ہے۔ کہ اچھے بیج کی فروخت کا آغاز تو ہو گیا ہے۔

اسی صورت میں نفع ہو سکتا ہے۔ کہ شرح سود کم ہو۔ ورنہ اگر شرح سود زیادہ ہو۔ تو انہیں شروع ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں ریلوے سے جو منافع ہوتا ہے۔ اس کا اوسط آٹھ فیصدی ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے۔ کہ نئی ریلوے لائنوں سے بھی اسی قدر منافع کی توقع رکھنی چاہیئے۔ تو نئی ریلوے لائن کی تعمیر یا عدم تعمیر کا فیصلہ اُسی وقت کیا جائیگا۔ جب یہ معلوم ہو جائے۔ کہ سرمایہ کس قدر شرح سود پر قرض مل سکتا ہے۔ اِسی طرح ایک کسان جس قدر شرح سود پر روپیہ قرض لیکر اُس کے استعمال سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اُس کی بھی ایک حد معیّن ہے۔ ایک اہلِ قلم نے لکھا ہے۔ کہ کسان چھ[1] فی صدی سے زیادہ شرح سود پر روپیہ قرض نہیں لے سکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ شرح سود کی کوئی حد معیّن نہیں کیجا سکتی۔ بعض کاروبار ایسے ہیں۔ کہ اُن کے لئے اگر بیس فی صدی شرح سود پر بھی روپیہ قرض لیا جائے۔ جب بھی کافی نفع ہوگا اور بعض ایسے ہیں۔ کہ اُن پر لگانے کے لئے تین یا چار فیصدی سے زیادہ سود پر روپیہ قرض لینا ناممکن ہے۔ غرض کہ شرح سود ہی اس امر کا فیصلہ کرتی ہے۔ کہ آیا قرض لینے سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ یا نہیں اِس سے اِس سوال کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ کہ آیا کسان غلّہ فروخت کرے یا اِس امر کا انتظار کرے۔ کہ جب غلّے کا نرخ زیادہ ہو جائے تو اُسے فروخت کیا جائے۔ کیونکہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ فصل کی کٹائی کے وقت غلّے کا جو نرخ ہو۔ بعد میں اس سے صرف اِتنا نرخ گراں ہو جائے۔ کہ اُس سے فصل کی کٹائی اور غلّے کی فروخت کے درمیانی زمانہ کا سُود ادا کیا جا سکے۔ ایسی صورت میں غلّہ کو روک رکھنا اور فصل کی کٹائی کے وقت ہی فروخت نہ کر دینا فائدہ مند نہ ہوگا۔ اِسی طرح شرح سود کو دیکھ کر ہی کسان یہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ کہ آیا اُسے مصنوعی کھاد استعمال کرنی چاہیئے۔ جس سے دو سال کے عرصہ کے لئے پیداوار میں اضافہ ہو جائیگا۔

اِس مقام پر سرمایہ کو کسی منفعت بخش کام میں لگانے کی اہمیت واضح کرنا غیر ضروری ہے۔ زراعت اِس صوبہ کی دولت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اگر سرمایہ کو سوچ سمجھکر لگانے سے اراضی کی پیداوار اِس قدر بڑھ جائے کہ کسان سود ادا کرنے کے بعد کسی قدر منافع حاصل کر سکے۔ تو اُس کی ہمت بڑھ جائے گی۔ اور وہ آئندہ دلیری سے اِصلاح کے کاموں میں حصّہ لیگا۔ اِس طرح سرمایہ دار کو سود مل جائے گا۔ کسان کو

[1] مسکنت حیوان رپورٹ صفحہ ۱۹ ہو نمبر صفحہ ۲۳۱ پر مرقوم ہے۔ کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کسان جو قرض لیتے ہیں۔ اُنکی شرح سود کا اوسط ۵ء۷ء۷ فیصدی ہوتا ہے۔ نیو ہیمپشائر میں شرح سود کا اوسط ۵ء۶ فیصدی ہے اور اوکلاہوما میں ۵ء۱۰۔ ایک شرح سود کا اوسط ۶ء۹ فیصدی قرار دیتا ہے

منافع حاصل ہوگا۔ اور سارا ملک، دولت سے فائدہ اٹھائیگا۔ ایک ایسی صنعت کے لئے جو قانونِ تکثیر حاصل کے ماتحت ہو۔ اگر کم شرح سود پر روپیہ لیا جائے۔ تو اتنا زیادہ سرمایہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ صناع زیادہ وسیع پیمانے پر مصنوعات تیار کرکے اُن سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے۔ اور اپنے مال کی قیمت بھی گھٹا سکے۔ تاکہ خریدنے والے کو بھی نفع پہنچے۔ ایسی صورت میں صرف ایک ہی شخص نفع نہیں اٹھاتا۔ بلکہ فائدے کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ لیکن زراعت کے بارے میں خاص کر ایسے ممالک میں جہاں کسان ہی مالکان اراضی ہیں۔ سود کے مسئلہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ بعض قطعات اراضی سے جس قدر آمدنی ہوتی ہے وہ اس سود سے بھی کم ہوتی ہے۔ جو اس قطعہ اراضی کی قیمت فروخت سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ گویا اراضی پر جس قدر محنت صرف ہوتی ہے۔ اُس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔ اوسط درجے کا کسان ریاضی کا ماہر نہیں ہوتا۔ اور سود کا تعلق ریاضی سے ہے۔ بیچارہ کسان روپیہ چاہتا ہے۔ اور اُسے حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اُسے یہ شکایت بھی ہے۔ کہ وہ قرض کے پھندے میں پھنس گیا ہے۔ اس میں اتنی استعداد نہیں کہ سال کے دوران میں جو جس قدر مختلف کام کرتا ہے۔ ان کا نفع و نقصان معلوم[1] کر سکے۔

---

[1] قرض لینے والے اتنا بھی نہیں جانتے۔ کہ ساہوکار سے روپیہ لینے میں انہیں کتنا نقصان ہوتا ہے۔ پروفیسر مارشل انگلستان کے قدیم ایام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جب کوئی قابل ساہوکار خواہ وہ یہودی ہو یا بت پرست ایک دفعہ قدم جما لیتا تھا۔ تو جب تک وہ اور اس کے جانشین مستعدی سے کاروبار میں معروف رہتے تھے۔ اور ساہوکاری کا پیشہ انہیں بیحد پسند ہوتا تھا۔ وہ برابر ترقی کرتے چلے جاتے تھے۔ ہاں کبھی تشدد انکی سرگرمیوں کا خاتمہ بھی کیا کرتا تھا۔ یا بلند مرتبہ اور طاقتور مقروض بڑی بڑی رقوم قرض لیکر ادا کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ اس زمانہ کی عام شرح سود گویا بادشاہوں اور امیروں کی بیصبری اور بے خبری کا آئینہ ہے۔ انہیں یہ گوارا نہیں تھا۔ کہ کوئی شخص انکی خواہشات کو مسترد کردے۔ حساب کتاب سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ عام طور پر جلد باز لوگ جو تھوڑے عرصہ کیلئے قرض لیتے ہیں۔ تقریباً پانچ فی صدی سود ادا کرتے ہیں۔ جو سال کے عرصے میں بشرطیکہ روپیہ ادا نہ کیا جائے۔ یہ رقم سود در سود کی وجہ سے اٹھگنی ہو جائے۔ اور چوبیس سال میں اسی گنا۔ پانچ فی صدی فی ماہ شرح پر اب بھی اکثر لوگ روپیہ قرض لیتے ہیں۔ اگر آٹھ سال تک روپیہ ادا نہ کیا جائے تو ایک پونڈ کے سو پونڈ ہو جائیں گے۔ لوگ ایسے نتائج پر جو ریاضی سے تعلق رکھتے ہیں۔ غور نہیں کرتے۔ لیکن پیشہ ور ساہوکاروں کو ان باتوں کا ہمیشہ سے علم ہوتا ہے۔" (انڈسٹری اینڈ ٹریڈ صفحہ ۱۰۷) زراعت سے کم آمدنی ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ مسٹر وارڈ فاؤلر جس نے قرون وسطی کی زراعت پر جو باب لکھا ہے (جلد اول صفحہ ۲۱۲) اس میں وہ لکھتا ہے: "زراعت میں جس منافع کا تناسب رہا ہے۔ اس کا تخمینہ لگایا جا سکتا ہے لیکن اس قدر تو یقینی ہے کہ روپیہ کی عام شرح سود سے یہ منافع بہت کم ہے۔" (صفحہ ۲۲۴) "زراعتی کاروبار میں جس کا منتظم ایک قرن میں تھا منافع کا جس قدر تناسب رہا ہے وہ بہت کم تھا۔" (صفحہ ۲۲۵) "اول تو فصل ہی بہت کم تھی۔ پھر جس قدر ہوتی اس پر بھی بہت صرف ہوتا تھا۔"

بدقسمتی سے ساہوکار کا علم طریقہ اہلِ تجارت کے نزدیک محض تجارتی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے اِس سے زراعتی ضروریات پوری کرنا مقصود نہیں ۔ اور علم ساہوکار کسانوں کے مطالبات کو قابل توجہ نہیں سمجھتے ۔

تجارتی بنک علم طور پر تھوڑے عرصہ یعنی زیادہ سے زیادہ تین ماہ کیلئے قرض دیتے ہیں ۔ اُن کے فنڈ کا بہت بڑا حصہ امانت جاری یعنی چلت حساب پر مشتمل ہوتا ہے ۔ اس لئے کوئی بہت بڑی رقم زیادہ دیر کے لئے قرض میں پھنسا نہیں سکتے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ۔ کہ کسانوں کو مطلوبہ قرض کے لئے کسی اور آستانے کی جانب رُخ کرنا پڑتا ہے ۔ وہ ساہوکاروں دوکانداروں آلاتِ زراعت بیچنے والوں سے قرض لیتے ہیں ۔ اور یہ نہیں سمجھ سکتے ۔ کہ اس طرح قرض لینے میں انہیں کس حد تک نقصان اُٹھانا پڑتا ہے ۔ ہم اِس مسئلہ پر تو بعد میں روشنی ڈالیں گے ۔ اِس وقت زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے ۔ کہ کسان خواہ کسی ذریعہ سے زراعت کیلئے سرمایہ مہیا کرے ۔ اُسے شہر کے کاروباری آدمی کی نسبت زیادہ سود ادا کرنا پڑیگا ۔ بلکہ جب شرح سود وہی ہوتی ہے ۔ جس پر شہری کاروباری قرض لیتے ہیں ۔ تو کسان پر اکثر ایسے مزید خرچ آپڑتے ہیں ۔ کہ اصل سود سے بہت زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے[1] ۔ یا یوں کہنا چاہئے ۔ کہ اُسے قرض لینے میں بہت خسارہ رہتا ہے ۔ جب ایک کسان کسی بنک سے قرض لیتا ہے ۔ تو عام طور پر بنک اس کی اراضی سے دُور شہر میں ہوتا ہے ۔ آمدورفت میں کسان کا دن ہی ضائع نہیں ہوتا ۔ بلکہ سفر اور خوراک کے مصارف بھی ادا کرنا پڑتے ہیں ۔ اِس طرح چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض لینے میں بہت نقصان ہوتا ہے[2] ۔ اور طویل عرصے میں اس کے مجموعی نتائج بہت مضر ثابت ہوتے ہیں ۔ ایک امریکن اہلِ قلم نے اپنے ملک کے حالات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے ۔ کہ کسان سے بہت بڑی بے انصافی یہ ہو رہی ہے ۔ کہ اُس کے لئے قرض لینے کا کوئی مناسب طریقہ نہیں ۔ ہمارے ملک کے کسانوں کو اُن لوگوں کی نسبت جو دوسری صنعتوں میں مصروف ہیں ۔ بہت زیادہ شرح سود ادا کرنا پڑتی ہے ۔ اِس طرح درحقیقت زراعت پر ایک سالانہ زائد ٹیکس لگ گیا ہے ۔ جو باعتبار تناسب بہت بڑا ہے ۔

---

[1] ہیوبر صفحہ ۳۳ ۔

[2] ملاحظہ ہو دیہات کی ساکھ کے متعلق آئرلینڈ کی رپورٹ کا یہ اقتباس (صفحہ ۳۱) جو لوگ چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض لیتے ہیں ۔ وہ ضامن کا احسان اس طرح اُتارتے ہیں ۔ کہ یا تو اس کے کھیت میں ایک دو دن مفت کام کر دیتے ہیں ۔ یا مویشی کا چارہ مہیا کر دیتے ہیں ۔ یا اسے عاریتاً گھوڑا دیدیتے ہیں ۔ اور یا اِسی قسم کا کوئی اور فائدہ پہنچاتے ہیں ۔

زراعت پیشہ آبادی غیر ضروری غیر منصفانہ بوجھ اور مصائب کے تلے دبی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری سب سے بڑی صنعت یعنی زراعت کی ترقی میں رکاوٹ واقع ہو گئی ہے۔ ملکی ترقی کو نقصان ہو رہا ہے۔ اس کی دولت کم ہو گئی ہے۔ اور ہماری قومی حکومت کا تار و پود بکھر گیا ہے[1]۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ قسمت اس صنعت کی جسے تمدن کی بنیاد سمجھنا چاہئیے۔ دشمن ہے۔ اور اس نے ایسے ایسے اثرات کا شکار بنا رکھا ہے۔ جو اس کی ترقی کے لئے تباہ کن ہیں۔ سرمایہ کو منفعت بخش کام میں لگایا جائے۔ تو اس سے دولت پیدا ہوتی ہے۔ کسان کے لئے دو ہی صورتیں ہیں۔ کہ یا تو انگلستان کی طرح ڈیڑھ سو ایکڑ قطعہ اراضی کی صورت میں روپیہ لگائے۔ یا چھوٹے سے قطعہ اراضی میں عمیق کاشت کر کے سرمایہ تباہ کر دے زراعت میں جس قدر روپیہ لگایا جاتا ہے۔ اس سے چند سال کے بعد ایک مستقل آمدنی ہونے لگتی ہے۔ گویا اوسط درجے کا انسان جتنا زیادہ سرمایہ لگائیگا۔ اسے اتنا ہی زیادہ نفع ہوگا۔ اس لئے محب وطن ماہر اقتصادیات کی یہ یقیناً خواہش ہوتی ہے۔ کہ کسان یا تو فصل کی پیداوار بڑھائے۔ اور یا مویشی پالنے اور طاقت حاصل کرنے میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگائے[2]۔

بدقسمتی سے اراضی پر جس قدر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ اس کا بہت کم حصہ اسے ترقی دینے میں خرچ ہوتا ہے بیشتر حصہ تو کسی مالک اراضی سے اراضی خریدنے میں صرف کیا جاتا ہے۔ جو اکثر اوقات افلاس کے باعث محض مزارع رہ جاتا ہے[3]۔ اراضی کی خرید میں جو کروڑوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اس سے صوبہ کی دولت میں ذرہ بھر اضافہ

---

[1] مورگان کی کتاب لینڈ کریڈٹ امریکہ کے کسانوں کی حمایت میں لکھی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو دیباچہ صفحہ ۱۲۔ اس امر کا تخمینہ لگانا دشوار نہیں۔ کہ کثیر التعداد سود خواروں کی وجہ سے زراعت پر کس قدر بڑا بوجھ ہے۔ گذشتہ بیس سال کے سود کا میزان پچاس کروڑ روپیہ سے کم نہیں ہوگا

[2] انگلستان میں زراعت کی پستی کا باعث یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ مزارعین کے پاس سرمایہ کی قلت ہے۔ حصولِ منفعت کی پوری پوری استعداد پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ کسان اپنی عقل و دانش، طاقت و ہمت اور قابلیت کی بدولت جس قدر سرمایہ فراہم کر کے اسے منفعت بخش کاموں میں لگا سکتا ہے فراہم کرے۔ (ملاحظہ ہو آکسفورڈ سٹڈیز میں زراعت صفحہ ۱۲۹) اس جملہ سے یہ مراد نہیں لینا چاہئے۔ کہ یہاں قانون تقلیل حاصل سے انکار مقصود ہے۔ عام کسانوں کو فی الحال اس قانون سے خائف نہیں ہونا چاہئے۔ ہم نے اس سلسلے میں موسمی تغیرات ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ اس طرح مسئلہ میں پیچیدگی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

[3] ملاحظہ ہو قیمت زمین اور اس کے اثرات و نتائج کی بحث۔

نہیں ہوتا۔ مالکانِ اراضی کا محض کاشتکار رہ جانا کاشتکاری کے نقائص میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اس کے جواب میں دوسری جانب سے یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ بعض علاقوں میں محنتی مزارع مالکانِ اراضی کی زمین پر قبضہ کر رہے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ تحصیل ہوشیار پور میں ارائیں اور گوجر جو اس سرزمین میں کاشتکاروں کے بڑے بڑے گروہ ہیں۔ راجپوتوں کی اراضی خرید کر ان پر قبضہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ راجپوت ان کے مقابلے میں اچھے کسان نہیں۔ اور وہ جس قدر اراضی کی کاشت کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ اراضی اُن کے قبضے میں ہے۔ ایسی حالت میں تو یقیناً اراضی کی خرید سے ملک کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ بدقسمتی سے قانون انتقال اراضی کے منظور ہونے سے پیشتر اراضی اُن لوگوں کے قبضے میں چلی جاتی تھی۔ جو نہ تو خود اُسے کاشت کرنا چاہتے تھے۔ اور نہ اُسے ترقی دیکر اس میں پیداوار کی انتہائی صلاحیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ خطرہ پیدا ہوا۔ کہ زراعت پیشہ قوموں کے ساہوکار زمین خرید کر لگان پر کاشتکاروں کو دیدینگے۔ اور یہ کاشتکار شاید وہی مالکانِ اراضی ہونگے۔ جن میں زراعت کی جانب توجہ کا شوق نہیں تھا۔ یہاں پھر یہی اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اراضی کی خرید پر بہت سا روپیہ صرف ہو جاتا ہے۔ جسے اگر اراضی کو ترقی دینے پر صرف کیا جائے۔ تو زیادہ بہتر ہو۔

اراضی سے مزید دولت حاصل کرنے کے لئے سرمایہ کے علاوہ یہ امر بھی ضروری ہے۔ کہ کاشتکاروں کو زراعت کے متعلق تعلیم دی جائے۔ اور انکی تربیت کی جائے۔ اور اس غرض کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کو قطعاً بدل[1] دیا جائے۔ ترقی کی امید کا دارومدار تو اس امر پر ہے۔ کہ عوام میں صحتِ فکر پیدا ہو جائے۔ اور وہ اقتصادی حقائق کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ آج تک جن وسیع قانونوں کی بدولت ملک کو ترقی اور اقبالمندی حاصل ہوئی ہے۔ انہیں حکومت معرضِ وجود میں لائی ہے۔ اب جدید نظام میں ان لوگوں کی رائے پر زیادہ اعتماد کیا جائیگا۔ جن کے قبضے میں سیاسی قوت ہوگی۔ یہ ضروری ہے۔ کہ ان میں سے ایسے لیڈر پیدا ہوں۔ جو اقتصادیات کا صحیح ذوق رکھتے ہوں۔ ورنہ ایک بہت بڑی قومی ملکیت زوال پذیر ہو[2] جائیگی۔ آج زراعت سے جو بے رُخی برتی جاتی ہے۔ اس کی بجائے دیہاتی اقتصادیات میں ایک حقیقی دلچسپی کا پیدا ہو جانا

[1] ملاحظہ ہو دیہاتی تعلیم کی بحث۔

[2] ملاحظہ ہو دیہاتی لیڈروں کے متعلق بحث۔

ضروری ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے۔ کہ یہ دلچسپی اقتصادی معاملات کے صحیح علم کی بدولت پیدا ہو۔ اور آبادی کا غیر زراعت پیشہ حصّہ محسوس کرے۔ کہ زراعت کی ترقی سے خود اس کی ترقی اور خوشحالی کیونکر وابستہ ہے ترقی کی رفتار کیونکر تیز ہو سکتی ہے۔ اور اس میں کیونکر رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ اور وہ خود کس طریقہ سے اور کس حد تک صحیح اقتصادی اصولوں پر دیہات کی نشاۃ ثانیہ میں حصّہ لے سکتے ہیں۔

گاؤں اور شہر کچھ اس طرح ایک دوسرے کی اعانت کے محتاج ہیں۔ کہ جب لوگوں کو ان کے باہمی تعلقات اور ان کے لازمی نتائج سے بیخبر پاتے ہیں۔ تو بیحد تعجب ہوتا ہے۔ طریق کاشتکاری کے اچھا یا بُرا ہونے کا نتیجہ محض تجارت کے عروج یا زوال پر ہی نہیں۔ بلکہ اس سے تمام ابنائے ملک کے مصارف معیشت پر اثر پڑتا ہے۔ زراعت اچھی ہوگی۔ تو مالی حالت کے متعلق بھی اطمینان حاصل ہوگا۔ اور مستحکم مالی حالت مستقل و پائیدار ترقی کی اساس و بنیاد کا حکم رکھتی ہے۔ زراعت کے فروغ سے یہ اندیشہ نہیں۔ کہ دوسری صنعتوں سے اس کا مقابلہ شروع ہو جائیگا۔ بلکہ زراعت فروغ حاصل کریگی۔ تو دولت فراہم کرنے میں اُن کی معاون ثابت ہوگی۔ انہیں خام اجناس اور کام کرنیوالے آدمی بہم پہنچائے گی۔ بلکہ کسی حد تک مصنوعات کی فروخت کیلئے منڈی بھی مہیا کریگی۔ جس[1] کے بغیر صنعتوں کا قیام و بقا ناممکن ہے۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے طرزِ عمل کو واضح کرنے پر زور دیا ہے۔ جو شہر کے تعلیم یافتہ لوگوں نے زراعت کے متعلق اختیار کر رکھا ہے۔ اکثر ممالک کی طرح اس سرزمین میں بھی عام رجحان یہی ہے۔ کہ تعلیم یافتہ اور ہوشمند لوگ شہروں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے اگر زراعت کی ترقی ہوئی۔ تو اُس کے فوائد بھی شہر والے ہی محسوس کرینگے۔ اور یہ اغلب ہے۔ کہ شہر کے لوگوں کی بدولت ہی پنجاب کی دیہاتی زندگی کے خاص مسائل کے مطالعہ کا شوق اور ولولہ پیدا ہو۔

---

[1] اس دلیل کی مزید توضیح کیلئے سر ایچ پلینک کی کتاب "صوبجات متحدہ کی دیہاتی زندگی کے مسائل" دیکھئے۔ یہ امر قابل غور ہے۔ کہ انگلستان میں آج سے بہت عرصہ پہلے یعنی ۱۸۴۶ء میں یہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ کہ زمین قومی دولت کا بہت بڑا ذریعہ ہے جس سے محاصل ادا کئے جاتے ہیں۔ اِس لئے لگان میں اضافہ تمام باشندگانِ ملک کیلئے مفید ہے۔ کیونکہ جس فنڈ سے مالگزاری حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح اسمیں اضافہ ہو جائیگا پنجاب میں بھی اس امر سے شہر والوں کا ہی فائدہ ہے۔ کہ زمین سے زیادہ دولت حاصل کیجائے۔ تاکہ زیادہ مالگزاری ادا کیجا سکے۔ اور شہر والے اس خطرے سے محفوظ ہو جائیں۔ کہ ان سے کوئی محصول وصول کیا جائیگا۔

لیکن جہاں صوبہ کی سب سے بڑی صنعت کے متعلق باشندگان کی بے حسی اِس قدر نمایاں ہے۔ وہاں بڑے بڑے مالکان اراضی کی غفلت اور عدم توجہی اُن سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اور پھر بھی جب ہم دیکھتے ہیں کہ اِن مالکانِ اراضی کی بے اتفاقی کا ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ تو بات صاف عیاں ہو جاتی ہے کہ دیہاتی مسائل سے بے اتفاقی ایک رسمِ عام ہو چکی ہے۔ اگرچہ اِن نوآبادیوں میں جنہیں نہریں سیراب کرتی ہیں۔ اور بعض اوقات دوسرے مقامات پر بھی خوشحال مالکانِ اراضی نے اِس مسئلہ سے دلچسپی ظاہر کی ہے۔ اور زراعت کے ترقی یافتہ جدید طریقوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ مزید برآں غیر زراعت پیشہ آبادی میں سے بھی بعض لوگ اس تحریک میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ تاہم حقیقت یہی ہے۔ کہ صوبہ پنجاب میں بہیئتِ مجموعی بڑے بڑے مالکانِ اراضی نے زراعت کو فروغ دینے اور اراضی کی ترقی کیلئے روپیہ صرف کر کے مثال قائم کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور اگر بعض نے حصہ لیا۔ تو اُسے کُلیہ قرار نہیں دینا چاہئے۔ بلکہ مستثنیات میں تصوّر کرنا چاہئے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ نوآبادیوں کے وہ کاشتکار جنہیں مربعے انعام میں ملے ہیں۔ بڑے بڑے زمینداروں کی نسبت مربعوں کی غور و پرداخت میں زیادہ ہمت اور مشقت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ایسی مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ کہ ان کاشتکاروں نے نہریں تعمیر کیں۔ بند باندھے۔ کنوئیں کھودے۔ لیکن صوبہ کی مزروعہ زمین کے بہت چھوٹے سے حصّہ میں ایسا کیا گیا۔ اچھے بیج جدید آلات کشاورزی یا زراعت کے بہتر طریقوں کے متعلق نہ تو اُن لوگوں کو کوئی علم ہے۔ اور نہ انہوں نے اس قسم کا علم حاصل کرنے کی خواہش کی ہے۔ اس بحث کی ہیئتِ مجموعی پر ملتان کے چک داروں کے طرزِ عمل سے روشنی پڑتی ہے۔ ملتان میں مالکانِ اراضی نے یا تو محض کاہلی کے باعث یا سرمایہ کے نہ ہونے اور دوسرے اسباب کے ماتحت اراضی سے بے اتفاقی برتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یہاں خوشحال تاجروں کا ایک گروہ چک دار کی حیثیت سے پیدا ہو گیا۔ یہ چک دار مالکانِ اراضی کو نقد رقم اجارہ ادا کر دیتا ہے۔ کنوئیں کھودتا ہے۔ اور پھر کسی کاشتکار کو اجارہ پر اراضی دے دیتا ہے۔ لیکن نقد روپیہ کی بجائے پیداوار میں سے حصّہ لیتا ہے۔ اسی طرح مالک اراضی کو رقمِ اجارہ ادا کرنے اور کنوئیں کھودنے کے مصارف کا کفیل ہونے کے بعد جو روپیہ بچ رہتا ہے۔ وہ منافع خالص ہوتا ہے۔ ۱۸۵۹ء میں مہتمم بندوبست نے لکھا تھا۔ کہ اِس ضلع میں دوسرے اضلاع کی نسبت جو خوشحالی نظر آ رہی ہے۔ وہ سر تا سر چک داروں کے دم قدم سے ہے۔ تقریباً سب چک دار متمول کراڑ ہیں۔ جنہوں نے سرمایہ اور محنت کی وجہ سے اِس علاقہ کی پیداوار بڑھا دی ہے۔ سو جب تک معقول خالص منافع حاصل نہیں کر لیتے۔ انہیں اطمینان نہیں ہوتا۔ عام طور پر بڑے بڑے مالکانِ اراضی سے بھی

اراضی کی مخفی قوتوں کو بیدار کرنے اور کسانوں کو اعلیٰ درجہ کا طریقِ زراعت اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اِس سلسلہ میں یہ امر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کہ صوبہ کی نصف مزروعہ زمین کسانوں کے قبضہ میں ہے جن کے پاس نہ تو سرمایہ ہے نہ زراعت کے طریقوں کی اصلاح و ترقی کیجانب توجہ کرنے کی ہمّت یا سمجھ۔

کسی زمانہ میں انگلستان کی زراعت کو جو سربلندی حاصل تھی۔ اُس کی وجہ بہت حد تک یہ تھی۔ کہ انگلستان کے لوگوں میں یہ احساس تھا۔ کہ اراضی سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے اس کے انتظام کیجانب توجہ کرنا ضروری ہے۔ اس صوبہ کی طرح انگلستان کے مالکانِ اراضی کو صرف لگان وصول کرنے سے ہی غرض نہیں تھی۔ بلکہ وہ اراضی کے لئے مستقل سرمایہ بھی مہیّا کرتے تھے۔ اور یہ فیصلہ کرنے میں بھی حصّہ لیا کرتے تھے۔ کہ زراعت کے لئے کونسا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اگر کسی مزارع کو کوئی نیا طریقہ اختیار کرنے کا خیال آتا۔ یا کوئی دشواری پیش آتی تو وہ اعانت کے لئے زمیندار کی جانب رجوع کرتا۔ دوسری جانب جب زمیندار کو مزارع پر اس امر کا اعتماد ہوتا کہ وہ روپیہ کو موزوں و مناسب طریق پر استعمال کرنا اور اراضی کو اچھی حالت میں رکھنا جانتا ہے۔ تو وہ سرمایہ لگانے میں بھی دریغ نہیں کرتا تھا[۱]۔

یہ بار بار بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ زراعت کو پوری طرح فروغ دینے کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے اور انگلستان کا یہ طریقہ کہ مالکِ اراضی سرمایہ مطلوبہ کا بیشتر حصّہ فراہم کرے۔ تجربہ کے بعد بہترین طریقہ

---

[۱] یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ کہ انگلستان کے مالکانِ اراضی بھی اسیطرح کاشتکاری سے بے توجہی برتا کرتے تھے۔ لیکن [illegible] میں باشندگانِ شہر نے جو قانون دانوں اور سوداگروں پر مشتمل تھے۔ دیہات میں اراضی خریدنا اور ان پر روپیہ لگانا شروع کر دیا۔ انکی مثال نے دولتمند مالکانِ اراضی میں بیداری پیدا کر دی اور بعض تعلیم یافتہ اور صاحبِ حیثیت لوگوں نے بھی زراعت کیجانب توجہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ زراعت کو برابر ترقی ہوتی رہی۔ تا آنکہ شرفا کی ایک بہت بڑی جماعت اُن لڑائیوں میں شریک ہونے کو چلی گئی۔ جو امریکہ اور فرانس سے از ۱۷۹۳ء تا ۱۸۱۵ء جاری رہیں۔ تھورولڈ راجرس کا بیان ہے۔ کہ انگلستان کی زراعت صدیوں تک پستی کے عالم میں پڑی رہی ہے چنانچہ اٹھارویں صدی میں ہی زراعت نے سرعت سے ترقی کرنا شروع کی۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اٹھارویں صدی میں بڑے بڑے زمیندار نہایت سرگرمی سے زراعت کا علم حاصل کرتے تھے۔ اور اُنہیں نہایت دلیری سے نئے طریقوں کا تجربہ کرنے میں کوئی باک نہیں ہوتا تھا۔ (مثلاً جھلا بہم کا دیباچہ) دوسرے ملکوں میں جہاں کسان مالکانِ اراضی تھے۔ انہوں نے کسانوں میں حرکت ... پیدا ہوئی۔ جب تک امریکہ کے گیہوں کی وجہ سے انکی زندگی معرضِ خطر میں نہیں پڑ گئی۔ اور انہوں نے وہ جدید امور اختیار کئے جن کی بدولت انکی زراعت نے موجودہ حیثیت اختیار کر لی ہے کوئی شخص یہ نہیں کہیگا۔ کہ اس صوبہ کو اس وقت کا انتظار کرنا چاہئے جبکہ قحط اور فاقہ زدگی لوگوں میں اس امر کی تحریک پیدا کرے کہ وہ جدید علم طبیعات کی مدد سے اراضی سے جتنا نفع ... [illegible]

ثابت ہوا ہے[1]۔ انگلستان کے مزارعین کہا کرتے ہیں ۔ کہ انہیں زمیندار سے اپنے تعلقات منقطع کرنے یا زمین کا مالک بن کر ملکیت کی ذمہ داریوں کا بارِ گراں اٹھانے کی خفیف سے خفیف خواہش بھی نہیں ۔ جہاں ایک بہت بڑے رقبہ زمین کی کاشت مزارعین کرتے ہوں ۔ زراعت کی ترقی اراضی کے زرخیز ہونے پر نہیں ۔ بلکہ شرکائے زراعت کے باہمی تعلقات کی نوعیت پر موقوف ہے ۔ مالکانِ اراضی کے لئے ضروری ہے ۔ کہ جہاں تک اُن کے اقتصادی مصالح اجازت دیں ۔ مزارعین کی اعانت کریں ۔ اور اپنے اثر و رسوخ کے استعمال سے کوشش کریں ۔ کہ زراعت کا معیار بلند ہو جائے ۔ دوسری صنعتوں میں روپیہ لگانے سے جتنا فائدہ ہوتا ہے ۔ زراعت میں ہرگز اُن سے کم فائدہ نہیں ہوتا[2] ۔ بشرطیکہ مالکِ اراضی اور مزارع دونوں میں قابلیت اور سمجھ موجود ہو ۔ اجارہ دار کاشتکاری کے مسئلہ پر مزید بحث تو آگے چل کر کی جائے گی ۔ یہاں ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے ۔ کہ ملکیت اراضی کے مسئلہ کا دار و مدار اُس جذبہ پر ہے ۔ جس کے ماتحت اس کا حل کرنے کی کوشش کی جائے ۔ اگر مالکِ اراضی اپنی ذمہ داریاں پوری طرح محسوس نہیں کرے گا ۔ تو زراعت زوال پذیر ہوتی رہے گی ۔ اور جب تک صوبہ کے بڑے بڑے زمیندار مزارعین میں زراعت کے طریقوں کی اصلاح کی تحریک نہیں کرینگے ۔ اور اس بارہ میں اُن کی دستگیری اور اعانت پر آمادہ نہیں ہونگے ۔ صوبہ کی عام خوشحالی کو شدید نقصان پہنچتا رہیگا ۔

یہاں یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے ۔ کہ آخر حکومت قوانین نافذ کر کے زراعت کو ترقی دے سکتی ہے ۔ اور اس ضمن میں مثال کے طور پر انگلستان کا قانون بہم رسانی خوراک یا جاپان کے واقعات کو پیش کیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ جاپان میں زراعت کے متعلق قوانین و ضوابط نافذ کئے گئے ہیں ۔ جن کا منشا یہ ہے ۔ کہ کسان کو کاشتکاری کے سلسلے میں کونسے طریقے اختیار کرنے چاہئے ۔ انہیں کن امور سے احتراز لازم ہے ۔ اراضی

---

[1] پروفیسر کارور نے اپنی کتاب "پرنسپلز آف رورل اکنامکس" (دیہاتی اقتصادیات کے اصول) صفحہ ۲۲۷ پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ دنیا بھر میں انگلستان کے نظام اجارہ داری کے ماتحت بہترین زراعت ہوتی ہے ۔ کسان کو اراضی خریدنے میں چنداں نفع نہیں ہوتا ۔ کیونکہ وہ مویشی اور دوسرے ضروریاتِ زراعت پر روپیہ لگا کر زیادہ نفع حاصل کر سکتا ہے ۔

[2] اس سلسلے میں جے آور کی کتاب "ایگریکلچر ان آکسفورڈ شائر" کے چھٹے ، ساتویں ، اور آٹھویں باب کا مطالعہ غور سے کرنا چاہئے ۔

کی کاشت کیونکر کرنا چاہئے۔ کون کون سے امور ممنوعات کی ذیل میں آتے ہیں۔ اور کونسے طریقے ایسے ہیں۔
جنہیں اختیار کرنا حکومت کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ وہاں حکومت نے زراعتی تجربہ گاہ قائم کر رکھے ہیں
جن میں کسانوں کو بتایا جاتا ہے۔ کہ کن طریقوں کا اختیار کرنا اُن کے لئے مفید ہوگا۔ اِن ہدایات کا بیشتر
حصّہ ایسا ہوتا ہے۔ جس پر عمل کرنے پر کسان مجبور ہوتے ہیں۔ جاپان میں حکومت کے اہتمام سے کسانوں
کی مجلسیں قائم کی گئیں۔ جن کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ کسان ایک دوسرے کی اعانت کرنے لگے۔ سائنٹفک طریقِ زراعت
کو ترقی ہوئی۔ اراضی کی خرید و فروخت اور قرض کے لینے دینے میں سہولتیں پیدا ہوگئیں۔ اور اُن مجالس کا
ممبر بننا ہر کسان کے لئے ضروری قرار دیا گیا[1]۔ لیکن پنجاب میں تو آجکل عام رجحان اِس امر کی جانب ہے
کہ جہاں تک ہوسکے زراعتی معاملات میں سرکاری مداخلت کی مذمت کیجائے۔ اِس لئے یہاں تو زراعت کو
اِسی طرح ترقی ہوسکتی ہے۔ کہ رائے عامہ کی اِصلاح کی جائے۔ اور زمینداروں میں اپنی ذمہ داریوں کا اِحساس
پیدا ہوجائے۔ اِس باب میں حالات یاس انگیز ہیں۔ اکثر بڑے بڑے زمینداروں میں یہ عام اِحساس پیدا
ہوچلا ہے۔ کہ خالص بیج۔ جدید آلاتِ کشاورزی اور زراعت کے بہترین طریقوں کے استعمال سے زیادہ
منفعت ہوسکتی ہے۔ لیکن ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ آیا مزارعین خاص طور پر مغربی پنجاب کے مزارعین
کا بیشتر حصّہ ان طریقوں کے اِختیار کرنے پر مجبور ہوگیا ہے یا نہیں۔ کیونکہ ابھی جدید آلاتِ کشاورزی بہت
کم تعداد میں فروخت ہو رہے ہیں۔ اور اکثر دیہات میں اگرچہ خالص بیج کے نام سے کان نا آشنا تو
نہیں۔ لیکن ابھی تک اُس کے استعمال کو ایک نرالی چیز سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال اِن واقعات کے باوجود
مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ انگلستان میں یہی ہُوا تھا۔ کہ اٹھارہویں صدی کے اہلِ قلم عرصہ تک

---

[1] ڈبلیو ایم۔ میک گورن کی کتاب "ماڈرن جاپان" (جدید جاپان) صفحہ ۱۶۲ - ۱۳۵ - ۲۳۶ ملاحظہ ہو۔ یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ ہندوستان بھی بحالت موجودہ اِس امر پر آمادہ ہے۔ کہ حکومت زراعت میں اُسی طرح مداخلت دے۔ اور عوام کو مجبور کرے۔ جس طرح حکومت جاپان کر رہی ہے جاپان میں شخصی جذبات کو عوام کے سود و بہبود پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ اِسی لئے وہاں اِس طریقے سے کامیابی ہوئی ہے۔ اِس سلسلہ میں یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اشتمالِ اراضی کے لئے وہاں پہلے سب مالکانِ اراضی کی رضامندی حاصل کرنا ضروری تھا لیکن اب اکثریت کے فیصلے پر اراضی کا اشتمال عمل میں لایا جاتا ہے۔ (دیکھئے جاپان ایر بک) یہ امر یقین نہیں۔ کہ پنجاب میں اکثر کسانوں کو اسی طرح مجبور کیا گیا۔ تو اُسے پسند کیا جائیگا۔

کسانوں کو جدید طریقوں کے اختیار کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ لیکن کہیں سو سال کے عرصہ میں انگلستان کے کسانوں میں ان طریقوں کے اختیار کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس زمانہ کے تمام نقاد کسانوں کی اس قدامت پرستی کے شاکی نظر آتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں جو کچھ لکھ چکے ہیں۔ اُس کا ماحصل یہ ہے کہ زمین میں دولت تو موجود ہے۔ لیکن یہ کسان پر منحصر ہے۔ کہ اُس سے جس قدر چاہیئے فائدہ اُٹھائے اور اُس کی سستی و کاہلی کو دُور کرنے کے لئے ایسے محرکات کی ضرورت ہے۔ جو اُسے کام کرنے پر آمادہ کرتے رہیں۔ بیچارے کسان کو بھول نہیں جانا چاہیئے۔ آج سے چالیس سال پہلے تھورولڈ راجرس[1] کسان اور اراضی کے تعلقات کا ذکر ان الفاظ میں کر چکا ہے۔

"تاریخ زراعت کے طالب علم کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ جس چیز کو ماہر اقتصادیات اپنی اصلاح میں "زرخیزی" کہتا ہے۔ اُس کا دارومدار صرف زمین اور دھوپ پر ہی نہیں۔ بلکہ اُس میں کسان کی ذکاوتِ فہم۔ ہنرمندی۔ دُور اندیشی اور مشقت کو بھی دخل ہے۔ جو اِس زمانہ کے با استعداد کاشتکار کی خصوصیات ہیں۔ یہ تو صحیح ہے۔ کہ زمین زرخیز ہو۔ جس میں اچھی زراعت ہو سکتی ہے۔ لیکن اِس غرض کے لئے مزارع کا تیز فہم ہونا بھی ضروری ہے[2]"۔

اگر پنجاب اراضی کی زرخیزی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ تو اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ لوگ بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ چونکہ یہ مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اِس لئے ہم نے آگے چلکر اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

---

[1] تھورولڈ راجرس کی کتاب ہسٹری آف ایگریکلچر اینڈ پرائسنر (زراعت اور زرعی پیداوار کی قیمتوں کی تاریخ) جلد چہارم باب ۲۶۔

[2] یہ خیال اکثر ملکوں کے زراعت پیشہ گروہوں پر پوری حیثیت سے منطبق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آئرلینڈ کے متعلق حسب ذیل تنقید ملاحظہ ہو۔ "چھوٹے چھوٹے مالکانِ اراضی کا رجحان بحالتِ موجودہ یہ ہے۔ کہ مخلوط کھیتی باڑی کرتے رہیں۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے۔ کہ اُن کے آباو اجداد اسی طریقے پر عمل کرتے رہے ہیں۔ یا یہ کہ انہیں یہ طریقہ آسان ترین معلوم ہوتا ہے۔ اور یا اس کا سبب یہ علم خیال ہے۔ کہ اراضی کو دوسرے کی مدد سے بے نیاز اور اپنی مدد خود کرنے کے قابل ہونا چاہیئے ہر ضلع کی خاص چیز کی پیداوار کیلئے موزوں ہوگا۔ اور رہنماؤں کا فرض ہے۔ کہ وہ اس صلاحیت سے فائدہ اٹھائیں۔ ملاحظہ ہو ٹریڈ بزنس بابت نومبر ۱۹۲۷ء صفحہ ۳۱۴۔

زراعت میں تبدیلی!

دوسری بات جس کے متعلق بہت حد تک لوگوں کے خیالات میں اتفاق ہو چکا ہے یہ ہے کہ زراعت میں آہستہ آہستہ اس قسم کی تبدیلی ہو رہی ہے۔ جس کی وجہ سے کسان کا اپنے پیشہ سے وہ تعلق نہیں رہا۔ جو پہلے تھا۔ اِس تبدیلی پر اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے۔ کہ ۷۲-۱۸۷۱ء میں پنجاب سے صرف چار لاکھ روپیہ کا غلہ باہر بھیجا گیا۔ اب چودہ کروڑ روپئے کا غلہ برآمد ہوتا ہے۔ گویا یوں سمجھنا چاہئے۔ کہ اس صوبہ کے کسان اپنی ضروریات کے لئے اب نسبتاً کم غلہ رکھتے ہیں۔ اور بیرونی ممالک کی منڈیوں میں زیادہ غلہ بھیجتے ہیں یہ ترقی اس لئے ہوئی۔ کہ نہروں کی تعمیر کی وجہ سے پہلے کی بہ نسبت اب بہت زیادہ رقبہ میں زراعت ہوتی ہے۔ ملک کا بہت بڑا حصّہ تو محض باہر غلّہ بھیجنے کے لئے فصل کی کاشت کرتا ہے۔ اور گاؤں کے لوگ بیرونی تجارت کے مسئلہ سے بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ کسان بھی اُس چیز کی کاشت کرتا ہے۔ جس کی مانگ دنیا میں زیادہ ہے۔ پنجاب کی منڈیوں میں گیہوں کا جو نرخ ہوتا ہے۔ اُس کا دارومدار مقامی حالات پر نہیں رہا۔ بلکہ اس بات پر ہے۔ کہ لورپول میں گیہوں کا کیا نرخ ہے۔ کیونکہ لورپول دنیا کی بہت بڑی منڈی ہے۔ نرخ متعیّن کرنے میں اِس امر کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کہ یہاں سے لورپول تک غلہ بھیجنے میں کیا خرچ آئیگا۔ پہلے زمانہ میں کاشتکار اپنے گھر کی ضروریات کا خیال رکھ کر کاشت کرتا تھا۔ اب بھی بعض جگہ یہ دستور ہے۔ کہ وہ ایک قطعہ اراضی کے ایک حصّہ میں رسّی کے لئے سن کی کاشت کرتا ہے۔ اور ایک چھوٹے سے حصّے میں رُوئی بوئی جاتی ہے۔ لیکن جن علاقوں میں لوگوں نے زیادہ ترقی کی ہے۔ وہاں انہیں یہ خیال دامنگیر ہے۔ کہ کسی منفعت بخش جنس کی کاشت کی جائے۔ اور اُسے بیچ کر جو روپیہ ملے۔ اُس سے گھریلو ضروریات کی چیزیں خریدی جائیں۔ گویا اب کسان یہ محسوس کر رہا ہے۔ کہ وہ محض پیداوار پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ بلکہ پیداوار سے جو فائدہ ہوگا۔ اس سے اس کے لوازمِ زندگی مہیا ہونگے۔ اب اِس صوبہ میں علم رجحان انہی چیزوں کی کاشت کی جانب ہے۔ جو فوراً فروخت ہو جائیں۔ لیکن ابھی کسان نے اِتنی ترقی نہیں کی۔ کہ وہ اپنی زمین سے وہ کام لے۔ جس کی بدولت اُسے زیادہ سے زیادہ خالص منافع حاصل ہو سکے۔ ابھی زراعت کے متعلق اُسکا علم اتنا وسیع نہیں ہُوا۔ کہ زمین کو دیکھ کر یہ معلوم کرلے، کہ وہ کسی چیز کی کاشت کے لئے موزوں واقع

ہوئی ہے ۔ وہ گیہوں کی کاشت اِس لئے نہیں کرتا ۔ کہ گیہوں سے اُسے زیادہ سے زیادہ نفع خالص ہوتا ہے ۔ بلکہ وہ تو محض اِس لئے گیہوں بوتا ہے ۔ کہ اُس کے گردوپیش جس قدر کسان ہیں ۔ وہ اپنی اراضی میں گیہوں کی کاشت کرتے ہیں ۔ مزید براں اگر آبپاشی کا انتظام معقول ہو ۔ تو گیہوں کی فصل میں زیادہ محنت بھی صرف نہیں ہوتی ۔ اُسے فروخت کر لینا بھی آسان ہے ۔ وہ جانتا ہے ۔ کہ آلو اور پھلوں کی کاشت سے زیادہ روپیہ حاصل ہوگا ۔ لیکن کچھ تو اُسے ان چیزوں سے موروثی لگاؤ نہیں ہے ۔ اور پھر کچھ یہ خیال بھی مانع ہے ۔ کہ آلو اور پھل اتنی آسانی سے فروخت نہیں ہو سکتے جتنی آسانی سے گیہوں بک سکتا ہے ۔ اِن مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے ۔ کہ کسان پر بھی دنیا کی منڈیوں کے نرخ کا اثر پڑ رہا ہے ۔ پہلے زراعت سے اس کا مقصد یہ تھا ۔ کہ بس اِس قدر پیداوار ہو جائے جو اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو ۔ اب اُسے تجارت کا خیال آیا ہے ۔ دنیا کی منڈیاں اور نرخ کا اُتار چڑھاؤ ۔ اب اُس کے لئے بھی اہمیت رکھتا ہے[5] ۔ اب وہ ان اجناس کی کاشت نہیں کرنا چاہتا ۔ جن کی کاشت کی جانب دوسرے لوگ اُسے مائل کرتے ہیں ۔ بلکہ وہ تو وہی جنس بوئیگا جس سے اُسے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہوگا ۔ وہ جس جنس کی کاشت کرتا ہے ۔ وہ فوراً بِک جاتی ہے ۔ اِسطرح اس کی ساکھ قائم ہو گئی ہے ۔ کیونکہ وہ جب چاہئے ۔ جنس کو نقد روپیہ کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہے اور فصل اس کے لئے کافی ضمانت ہے ۔ اگر کسان عقلمند ہو ۔ اور اس ساکھ سے فائدہ اٹھا سکے ۔ تو اُسے چاہئے ۔ کہ وہ اپنے سرمایہ کا زیادہ سے زیادہ حصّہ اراضی پر لگائے ۔ وہ اپنی عقلمندی زراعت کے علم اور قابلیّت کی بدولت اس سے فائدہ حاصل کریگا ۔ تعجّب ہے ۔ کہ زراعت میں جو تبدیلی ہو رہی ہے ۔ اُس کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ۔ چند علاقوں کے باشندوں کے سوا عام طور پر اس دور سے گذر چکا ہے ۔ جب اراضی کی بجائے مویشی کے گلّوں کو اُس کی سب سے بڑی دولت تصوّر کیا جاتا تھا ۔ دوابہ سندھ ساگر اور بعض دوسرے علاقوں میں جو ابھی زراعتی ترقی کے میدان بہت پیچھے ہیں ۔ لوگ اب بھی ضرور مویشی کے گلّے پالتے ہیں ۔ اور ایسے مقامات بھی ہیں ۔ جہاں کے لوگ ابھی اُن مراحل کے طے کرنے میں مصروف ہیں ۔ جن سے زراعت عرصہ ہوا گذر چکی ہے[6] ۔

[5] کارور کی کتاب "پرنسپلز آف رورل اکنامکس"۔ [6] سالگ مان کی کتاب "پرنسپل آف اکنامکس"۔

ہندوستان کے بعض علاقوں میں ابھی تک یہ دستور ہے۔ کہ کسان ایک جگہ کھیتی باڑی نہیں کرتے۔ بلکہ خانہ بدوشوں کیطرح ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔

جو لوگ شکوہ سنج ہیں۔ کہ آج کل پُرانے زمانے کی طرح گھی کی فراوانی نہیں۔ یا اِس امر پر اظہار افسوس کر رہے ہیں۔ کہ چراگاہوں میں زراعت کیوں کی جا رہی ہے۔ وہ درحقیقت اِس تمنّا میں سرد آہیں بھر رہے ہیں۔ کہ انسان پھر رجعت قہقری کر کے گلّہ بانی کی منزل پر جا پہنچے۔ اگر اُنہیں اپنی خواہش پُوری کرنے کا موقع دیدیا جائے۔ تو صوبہ کی ساری آسودہ حالی خواب وخیال ہو جائے۔ تجارت وحرفت کو زوال آجائے۔ اور قحط و فاقہ زدگی کا ایسا دور دورہ ہو۔ کہ آبادی گھٹ کر اِتنی رہ جائے۔ جس کے لئے چراگاہوں کی تھوڑی بہت پیداوار کافی ثابت ہو۔ لیکن اِس کتاب کے مضامین کی بنیاد اِس دلیل پر ہے۔ کہ دولت اور خوشحالی کی ترقی پسندیدہ چیز ہے۔ اِس لئے تمام ہمّت اور کوشش اِس امر پر صرف ہونا چاہئے۔ کہ زراعت سے تجارتی منفعت اٹھائی جائے۔ یہ نہ ہو۔ کہ تمدّن کو کئی سو سال پیچھے ہٹا لے جائیں۔

بعض لوگوں کو شائد زراعت سے تجارتی منفعت اُٹھانا قبل از وقت معلوم ہو۔ بعض حلقوں میں اس تحریک پر اظہار افسوس کیا جاتا ہے۔ مثلاً بعض اخبارات کے مقالہ نگاروں نے اس امر پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ کہ ملک سے باہر بڑی مقدار میں گیہوں بھیجا جاتا ہے۔ حالانکہ ملک کے اندر گیہوں کا نرخ گراں ہے۔ اور اکثر لوگ ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ اِس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کہ ہر مزدور کی طرح کسان کی بھی خواہش ہے۔ کہ وہ اپنی محنت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ ملکی ضروریات پُوری کرنے کے بعد جس قدر گیہوں بچ رہتا ہے۔ اگر وہ دوسرے ملکوں کو نہیں بھیجا جا سکتا۔ تو اُسے کاشت ہی نہیں کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں ایک

[1] ۱۸۳۵ء یا اس کے لگ بھگ کا ذکر ہے۔ کہ علاقہ ماروول (امرتسر) کے کسانوں کو مالگذاری کی دو قسطیں یکمشت ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور وہ ساہوکاروں سے روپیہ قرض لینے پر مجبور ہو گئے۔ ساہوکاروں کے پاس جسقدر قیمتی اشیاء تھیں۔ اُنہوں نے انہیں فروخت کر کے روپیہ حاصل کیا اور زمینداروں کی بجائے تحصیل میں مالگذاری ادا کر دی۔ زمینداروں نے یہ رقم غلّہ کی صورت میں ادا کیا۔ لیکن غلّہ کا نرخ گر گیا۔ بازار میں غلّہ کی بھرمار ہو رہی تھی۔ بہت سا غلّہ فروخت نہیں ہو سکا۔ وہ آخر ضائع ہو گیا۔ اس طرح ساہوکاروں کو بہت نقصان پہنچا۔ (مسٹر بلائتھ کی یادداشت مطبوعہ رپورٹ صفحہ ۹۸)

کاشتکار جس میں ذرّہ بھر بھی عقل ہوگی - ایسی جنس کی کاشت گوارا نہیں کریگا جسے وہ فروخت ہی نہیں کرسکتا - اسی طرح لنکاشائر یا بمبئی میں کسی شخص کو یہ خیال نہیں آئیگا کہ محض اس بنا پر روئی کی برآمد کی مخالفت کی جاسکتی ہے - کہ اکثر افلاس زدہ لوگوں کو اچھی طرح تن ڈھانکنے کے لئے روپیہ نہیں ملتا - لوگوں کو اس بات پر بھی اعتراض ہے - کہ کیوں ایسی اعلیٰ درجہ کی کپاس بوئی جائے - جس کی روئی لنکاشائر کے کارخانوں میں استعمال کرنے قابل ہو - یہ روئی آسانی سے دیسی چرخہ میں کاتی نہیں جاسکتی - اور چونکہ ہندوستان میں کپڑا بہت قلیل مقدار میں تیار ہوتا ہے - اس لئے ایسی اچھی روئی پارچہ بافی میں استعمال نہیں کی جاسکتی - لیکن اگر کسانوں کو جدید قسم کی روئی سے بہت سا نفع خالص حاصل ہوجائے - تو وہ ان باتوں سے ہرگز متاثر نہیں ہوگا - ممکن ہے - کہ اربابِ قلم کے دلیں اس صوبہ کے سود و بہبود کی زبردست خواہش موجود ہو - لیکن وہ افلاس کو کم کرنے اور خوشحالی کو ترقی دینے کے لئے مناسب طریقے استعمال نہیں کرتے - اس مقصد کے لئے ضرورت ہے - اس بات کی - کہ زیادہ دولت پیدا کی جائے - اور چونکہ مزید دولت حاصل کرنے کے لئے مزید رقبہ کی ضرورت ہے - اور مزید رقبہ بھی ایک حدِ متعین ہے - اس لئے ضروری ہے - کہ موجودہ اراضی سے ہی مزید دولت پیدا کی جائے - یعنی جس رقبہ میں آج زراعت ہو رہی ہے - اُس کو اس قابل بنایا جائے - کہ اس سے ایسی فصل پیدا ہو - زیادہ سے زیادہ خالص نفع حاصل ہوسکے - چونکہ زمانہ جدید کی نیچرل سائنس نے زراعتی ترقی کے نئے نئے اسرار بے نقاب کردیئے ہیں - اس لئے کسان اس اراضی سے صرف مزید دولت ہی پیدا نہیں کریگا - بلکہ زیادہ اعتماد اور وثوق کے ساتھ زراعت پر روپیہ لگا سکے گا - باقی رہا یہ امر کہ وہ اُسے کس حد تک جامۂ عمل پہنا سکتا ہے - تو یہ اس بات پر موقوف ہے - کہ آیا اسے یقین بھی ہے کہ پیداوار فروخت کرکے اپنی محنت کا کافی معاوضہ مل جائیگا -

اس طرح جوں جوں سائنس ترقی کرتا چلا جاتا ہے - زراعت کا فنِ قدیم پُرانے دستور اور رواج کے بندھنوں سے آزاد ہو کر اقتصادی حیثیت اختیار کرتا چلا جاتا ہے[۱] اس لئے بیچارے کسان کو محض اسلئے

---

[۱] نورس صفحہ ۱۸ - اس سلسلے میں سکھوں کی تاریخ مصنفہ کننگھم کے حسب ذیل اقتباس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں :-

ہندوستان میں سرمایہ کو کاروبار پر لگانے یا اراضی کی اصلاح پر روپیہ صرف کرنے کا کسی کو خیال نہیں - البتہ صرف چند خاندانی رؤسا [illegible]

افلاس کی زنجیروں میں اسیر رکھنے کی کوشش کرنا کہ بعض دوسرے باشندگان ملک بھی انہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تقاضائے عقل و دانش نہیں۔

اس سلسلہ میں جتنی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ انکا سرچشمہ یہ خیال ہے۔ کہ شہر کے لوگوں کے لئے خوراک بہم پہنچانا گاؤں والوں کا فرض ہے۔ اور چونکہ اس بارہ میں ہندوؤں کے جذبات ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے لوگوں کو یہ سمجھانا مشکل ہے۔ کہ اگر گاؤں کے لوگوں کا فرض شہریوں کے لئے خوراک بہم پہنچانا ہے۔ تو شہر والے کا بھی یہ فرض ٹھہرا۔ کہ اگر باہر کا آیا ہوا غلہ سستا ملتا ہو۔ جب بھی اپنے پڑوسی کسان سے غلہ خریدے۔ اگر کسی ہمسایہ صوبہ یا آسٹریلیا سے آیا ہوا گیہوں یہاں کے گیہوں سے ارزاں ہو تو کیا وجہ ہے۔ کہ شہری باشندہ گراں قیمت پر مقامی گیہوں خرید کر مالی قربانی کرے۔ کسان تو ضرور اسی منڈی میں غلہ بیچے گا۔ جہاں اُسے زیادہ سے زیادہ روپیہ ملتا ہو۔ اُسے اس کی پرواہ نہیں۔ کہ وہ جو غلہ بیچتا ہے۔ اُس سے آخر کار کون پیٹ بھریگا۔ جس شخص کے پاس وہ غلہ بیچتا ہے۔ اسے بھی اسی طرح یہ فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ کہ اسے زیادہ سے زیادہ نفع بچ رہے۔ اسی طرح ہندوستان میں غلہ خریدنے والے کو کسی صورت میں بھی غلّہ کے باہر جانے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ منڈی کے دروازے اُسکے لئے بھی کھُلے ہیں جسطرح دوسرے لوگ غلہ خریدتے ہیں۔ وہ بھی خرید سکتا ہے۔ کسان خود ہندوستان سے باہر غلہ نہیں بھیجتا۔ بلکہ محض حریفانہ عصبیت کی بدولت خوراک کی گرانی کا الزام غلہ باہر بھیجنے والے تاجروں کی بجائے ناحق کسان کے سر تھوپ دیا جاتا ہے۔ پنجاب میں زراعت کے بہبود کا دارومدار تو اس بات پر ہے۔ کہ کسان کو اپنی محنت کا پورا معاوضہ مل جائے۔ ایک شخص محض اس لئے محنت نہیں کرتا رہیگا۔ کہ اُس کی محنت سے دُوسرے فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر اُسے معلوم ہو جائے۔ کہ اُسکی بجائے کوئی دوسرا نفع حاصل کریگا۔ تو وہ اپنے طریقوں کی اصلاح یا کام پر محنت کرنے کی جانب متوجہ نہیں

(صفحہ ۴۳ کا بقایا) کو اپنے گھروں کی مرمت روپیہ صرف کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یا بالواسطہ طریق پر دولتمند لوگ افیون اور چینی کے سٹہ پر اس لئے روپیہ لگاتے ہیں۔ کہ منفعت حاصل کریں۔ لیکن گاؤں کے یا عام دیہاتی کے پاس پیداوار میں سے صرف اسی قدر باقی رہجاتا ہے۔ کہ اُسے بیچ کر بیج یا اپنی خوراک جو ادنےٰ قسم کی ہوتی ہے۔ اور بار سامان کشاورزی خرید لیں۔ چونکہ اُن کے پاس ذرائع ہیں۔ اس لئے وہ اراضی کی اصلاح کے لئے مصارف کے کفیل نہیں ہو سکتے۔

ہوگا - اصلاحِ زراعت کی توجہ کریگا - تو صرف اِس خیال سے کہ سائینٹفک طریقے اختیار کرنے سے اُسے زیادہ مالی منفعت ہوگی - اور جس چیز سے اُس مالی منفعت میں کمی واقع ہوگی - وہ یقیناً اِصلاحِ زراعت سے اُس کی توجہ ہٹالے گی - اِس لئے زراعت کو تجارتی اصولوں پر ترقی دینا پیداوار میں اضافہ کا بہترین ذریعہ ہے - اور نہایت ضروری بھی ہے - کیونکہ ملک کی خوشحالی کا دارومدار محض پیداوار پر ہے -

دیہاتی اِقتصادیات کا مطالعہ

ہم اِس موضوع پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں - کہ زراعت سے کیونکر بے اِعتنائی برتی جارہی ہے - اور اسے تجارتی اصولوں پر ترقی دینے کے سلسلے میں کیا کیا تبدیلیاں ہو رہی ہیں - اِن ہر دو امور سے بہ ظاہر ہوتا ہے - کہ اگر ہم اراضی کو صوبہ کی جدید دولت کا سرچشمہ اور صنعت و حرفت کے لئے خام اجناس ہم پہنچانے کا واحد ذریعہ دیکھنا چاہتے ہیں - تو ضروری ہے - کہ دیہاتی اقتصادیات کا مطالعہ علمی اور فنّی زاویۂ نگاہ سے کیا جائے - چونکہ یہ فرض کر لیا گیا ہے - کہ اب صوبہ کو خوشحال اور متمول دیکھنے کی خواہش عام ہو چکی ہے - اِس لئے یہ کہنا بے سُود ہے - کہ اس کے مقصد کے اسباب و ذرائع سے واقف ہونا بھی ضروری ہے - اِقتصادیات کی حقیقی جولانگاہ تو اُن قوتوں کا مطالعہ ہے - جو سوسائٹی کی آمدنی یا عوام کی دولت مہیا کرتی ہے - اور دولت میں افراد اور طبقوں کا جس قدر حصّہ ہے - اُسے ایک نظام میں منسلک رکھتی ہیں[1] - دیہاتی اقتصادیات یا زراعتی اقتصادیات کا مطالعہ کرنے والے کے لئے سب سے پہلے اُن عناصر کا علم حاصل کرنا ضروری ہے - جنکی بدولت اراضی سے دولت حاصل کیجاتی ہے - اور جو اراضی پر محنت کرنیوالے مزدوروں کی اجرت کے کفیل ہیں - جو زیر اسے فنِ زراعت کی ایک شاخ کہتا ہے - جو ہمیں یہ سکھاتی ہے - کہ کسان کی دولت جن اجزاء و عناصر پر مشتمل ہے انہیں کیونکر منظّم و مرتب رکھا جائے - اور اس سے کیونکر خوشحالی حاصل کیجائے - خواہ نظم و ترتیب محض اُن مختلف اجزاء و عناصر کے مابین ہو - یا اس کا تعلق اشخاص و افراد سے ہو - اس فن کا مقصد یہ ہے - کہ کسان تا بحدِ امکان اُن تمام تدابیر سے پُوری طرح آگاہ ہو جائیں - جو ان کے پیشے کی کامیابی

[1] سالگ میں کی کتاب " پرنسپلز آف رورل اکنامکس " صفحہ ۲۳ -

کے لئے ضروری ہیں - جن لوگوں کے کندھے پر نظم و نسق ملک کی ذمہ داریاں ہیں - وہ بھی ان اسباب سے واقفیت حاصل کریں - جن کی مدد سے دیہاتی مسائل کا حل ہو سکتا ہے - تاکہ کاروبار کو ترقی ہو اور دولت حاصل[1] ہو سکے - چونکہ اب کھیتی باڑی کے فن نے باقاعدہ کاروبار کی حیثیت اختیار کر لی ہے اس لئے ضروری ہے - کہ کسان کاروباری شخص بن جائے - اور اِن طریقوں کا علم حاصل کرے - جو کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں - چونکہ وہ فصل کی کاشت اس لئے کرتا ہے کہ غلہ بیچ کر فائدہ اٹھائے - اس لئے اس کے لئے صرف یہی جاننا کافی نہیں - کہ فصل پیدا کرنے کے لئے کن کن چیزوں پر روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے - بلکہ اُسے یہ بھی معلوم ہونا چاہئے - کہ بازار میں غلّہ کی جو قیمت اُسے ملتی ہے - اُس پر کن باتوں کا اثر پڑتا ہے -

دنیا کی منڈیاں اور دنیا بھر کے کسانوں کے طریقے کسان[2] کی روزانہ زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں - کیونکہ اگر کسان کا ایک گروہ بہتر طریقے اختیار کر کے دوسرے گروہ سے زیادہ قیمت پر جنس فروخت کر لیتا ہے - تو دوسرے گروہ کو ضرور اُن کی تقلید کر کے اُن طریقوں کو اختیار کرنا چاہئے - ورنہ وہ نقصان اٹھائیگا - چونکہ زراعت اکثر صنعتوں کے لئے خام اجناس مہیا کرتی ہے - اسلئے کسان کے لئے اِس امر کا علم حاصل کرنا ضروری ہے - کہ مصنوعات کے لئے کن اجناس کی مانگ زیادہ ہے - اور وہ پیداوار کو کس حد تک وسعت دیکر نفع حاصل کر سکتا ہے[3] - اگر وہ کسی دُور دراز کی منڈی کیلئے فصل اُگا کر زیادہ نفع حاصل کر سکتا ہے - تو اُسے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ ایسی فصل کی کاشت تک محدود نہیں رکھنا چاہئے - جو صرف مقامی ضروریات کو پوری کر سکے - بلکہ اُسے چاہئے کہ وسعتِ نظر پیدا کرے - اور نگاہ کو گرد و پیش کی چیزوں میں ہی اُلجھائے نہ رکھے - گذشتہ صدی کے

---

[1] نورس کا دیباچہ اور جان گی گلسٹر کٹو رورل سوشیالوجی (دیہات کی تعمیری عمرانیات) صفحہ ۱۳ -

[2] رورل ویلتھ اور ویلفر (دیہاتی دولت اور سود و بہبود) صفحہ ۴ -

[3] مثلاً اُسے یہ معلوم ہونا چاہئے - کہ بنولے جیسی اجناس سے کیا کیا مصنوعات طیار ہو سکتی ہیں - تاکہ وہ اس قسم کی اجناس سے پورا فائدہ اُٹھا سکے - ہندوستان میں بنولے مویشیوں کو کھلائے جاتے ہیں - لیکن اِس سے کئی دوسری قیمتی اشیاء بھی تیار ہو سکتی ہیں - اور مویشی کی خوراک کے لئے بھی کافی بچ سکتا ہے -

وسط میں امریکہ کے اندازمین کے ایک وسیع رقبہ میں جو ابھی تک اچھوت پڑا تھا۔ پہلی مرتبہ کھیتی کی گئی۔
چونکہ لوگ زراعتی اقتصادیات کا علم نہ رکھتے تھے۔ اس لئے عجیب وغریب نتائج ظہور میں آئے اسکا
فوری اثر تو یہ ہوا۔ کہ گیہوں کی افراط ہو گئی۔ جس کا نرخ بہت ارزاں تھا۔ یہ گیہوں بہت بڑی
مقدار میں جزائر برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھیجا گیا۔ امریکہ سے اس قدر گیہوں
کی درآمد ایک ایسی چیز تھی۔ کہ یورپ کے کسان اُس کا کوئی علاج نہیں کر سکتے تھے۔ پہلے پہل
اس کے نتائج وعواقب کے بارے میں بہت غلط فہمی ہوئی۔ اس نئی اقتصادی پیچیدگی نے پُرانا
اقتصادی نظام درہم برہم کر دیا۔ اور جن لوگوں پر اس کا اثر ہوا۔ انہوں نے اپنے اپنے قومی
خصائص کے مطابق اس عقدہ کو سُلجھانے کی مختلف کوششیں کیں۔ سکاٹ لینڈ کے باشندوں
نے یہ سمجھ لیا۔ کہ اُن کی ملکی زراعت بالکل تباہ ہو گئی۔ انہوں نے ایسی مجلسیں قائم کیں جو لوگوں
کو نقل مکان کر کے امریکہ چلے جانے کی ترغیب دیتی تھیں۔ جہاں جدید زراعتی دولت کی فراوانی تھی
انگلستان کے زمینداروں نے زراعت کے طریقوں کی اصلاح کی بجائے لگان کی رقم کم کر دی
اور کھیتوں کی چراگاہوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ کسان زراعت چھوڑ کر شہروں میں پہنچے
اور کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ آئرلینڈ والوں نے امریکہ کے گیہوں کی درآمد کو انگریزوں کے خلاف وجہ
شکائت بنا لیا۔ اور سکاٹ لینڈ والوں کی تقلید میں امریکہ جا جا کر آباد ہونے لگے۔ لیکن انکی ہجرت
سکاٹ لینڈ کے باشندوں سے مختلف حیثیت رکھتی تھی۔ سکاٹ لینڈ والے تو جس قوتِ بازو کی مدد سے
نئی دولت میں حصہ لینے گئے تھے۔ لیکن آئرلینڈ والے جلاوطنوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور یہ سمجھ بیٹھے
تھے۔ کہ انگریزوں کے ظلم نے اُنہیں گھروں سے نکالا ہے۔ چونکہ بلجیم، ہالینڈ اور ڈنمارک میں نہ تو
سیاسی شکایات کا وجود تھا۔ اور نہ ایسے زمیندار تھے۔ جو نقصان برداشت کر لیتے۔ اس لئے لوگوں نے امدادِ باہمی کے
اصولوں پر زراعت کے نئے طریقے رائج کر کے مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی جرمنی میں ریفائیسن نے امدادِ
باہمی کے فواید کی تعلیم دی۔ اور اس نئے طریقے کی بدولت سائینٹیفک[1] کاشتکاری کے نئے طریقے رائج ہو گئے۔ جنہیں

---

[1] سائینٹیفک کاشتکاری کا آغاز ۱۸۴۰ء سے ہوا۔ جبکہ لیبگ کی کتاب "زراعت اور فزیالوجی سے علم کیمیا کا تعلق" شائع ہوئی۔ اس میں زمین کی خوراک اراضی کے اجزا کا تعلق بیان کیا گیا تھا
اسکی وجہ سے وہ نفرت اور تعصب دور ہو گیا جو ماہرین زراعت کو جہالت کے سبب کیمیا سے تھی۔ ملاحظہ ہو کرتمر کی کتاب مختصر تاریخ زراعت انگلستان صفحہ ۲۷۵۔

زراعت کی اصلاح کیجانب توجہ منعطف کرانے کا ذریعہ بن گئی ہے ۔مصنوعی کھاد پر مزید سرمایہ لگایا گیا گیہوں کی نسبت زیادہ منفعت بخش اجناس کی کاشت ہونے لگی ۔اور امداد باہمی کے اصولوں کو زراعت کے مفید ہی نہیں ۔بلکہ ضروری سمجھ لیا گیا ۔لوگوں نے جب دیکھا ۔کہ یورپ کی سب سے بڑی اور سب سے اہم صنعت کو ارزاں گیہوں کی درآمد سے تباہی کا خطرہ ہے ۔تو وہ زراعتی خوشحالی کے عروج و زوال کے اسباب کا مطالعہ کرنے کیجانب متوجہ ہو گئے ۔اس وقت تک ماہرین اقتصادیات نے زراعت کیجانب کوئی توجہ نہیں کی تھی ۔شاید اس کی وجہ یہ ہو ۔کہ چونکہ زراعت قانون تقلیل حاصل کے تابع ہے ۔اس لئے زیادہ باہمت لوگوں نے ان مصنوعات پر سرمایہ لگانے کو ترجیح دی ۔جن میں رقم منافع بڑھتی رہتی ہے ۔اور قدرتی طور پر ماہرین اقتصادیات پوری طرح یہ نہیں سمجھ سکتے تھے ۔کہ سائنس کی بدولت پیداوار میں کس قدر اضافہ ہو سکتا ہے ۔اس لئے انہوں نے اس موضوع کو دشوار سمجھ کر اس پر بحث نہیں کی ۔انگلستان میں جن دنوں سائنس کا مطالعہ عام نہیں تھا ۔سمجھ اور عقل نے زراعت کے بارہ میں عوام کی رہنمائی کی ۔چنانچہ ۱۸۶۲ء میں یہ مان لیا گیا تھا ۔کہ غلّہ کی برآمد پر پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ۔کہ کسان بہت ارزاں قیمت پر غلّہ فروخت کرتے ہیں ۔اس لئے یہ پابندیاں تمام ملک کے لئے مضر ہیں ۔اُسی وقت انگلستان کے لوگ یہ سمجھ گئے تھے ۔کہ زراعت کی ترقی ملکی سود و بہبود کے لئے ضروری ہے ۔یہ اور بات ہے ۔کہ عوام کو جنہیں غلّہ گراں قیمت پر ملتا ہے ۔اس سے نقصان پہنچتا ہے[1] ۔اس ملک میں ابھی تک لوگ اس خیال کی صحت سے آگاہ نہیں ہوئے ۔ابھی تک شہر کے باشندے ایسی تدابیر اختیار کرنے پر زور دے رہے ہیں ۔جن سے غلّہ تو کسی قدر ارزاں ہو جائے گا ۔لیکن ملک کو بحیثیت مجموعی بہت نقصان پہنچے گا ۔اس لئے یہ اندیشہ ہے ۔کہ کہیں دیہاتی اقتصادیات سے بے خبری کے باعث ایسے غیر دانشمندانہ قوانین نہ منظور کر لئے جائیں ۔جن کا نتیجہ یہ ہوگا ۔کہ جس غرض کو دور کرنے کیلئے یہ قوانین وضع کئے جائینگے اسی میں اضافہ ہو جائیگا ۔جسطرح شہر کے باشندے کا فرض نہیں ۔کہ خواہ اسے دوسری جگہ سے سستا غلّہ بھی ملتا ہو ۔وہ خسارہ برداشت کر کے اپنے ہاں کے کسان سے غلّہ خریدے ۔اسی طرح کسان کا

---

[1] کرٹلر کی ہسٹری آف انگلش ایگریکلچر "تاریخ زراعت انگلستان" صفحات ۶۹ ۔ ۷۰

بھی فرض نہیں۔ کہ خواہ اُسے کہیں دوسری جگہ زیادہ قیمت ملتی ہو۔ لیکن وہ شہر کے باشندوں کی تھوڑی قیمت پر غلّہ بیچدے۔ نرخ کی گرانی کا صحیح علاج یہ ہے۔ کہ پیداوار کو ترقی دی جائے۔ اِس ترقی میں جو چیزیں مانع ہیں۔ انہیں دور کیا جائے۔ اور خرید و فروخت میں جو غیر ضروری مصارف آپڑتے ہیں[1]۔ اُن سے نجات حاصل کیجائے۔ یہاں شاید یہ کہا جائے۔ کہ اِس دلیل کے معنی تو یہ ہوئے۔ کہ شہر اور گاؤں کے مفاد کا تصادم ہوجائے۔ اور کسانوں کو خود غرضانہ طریق اختیار کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ شہر اور گاؤں میں چولی دامن کا تعلق ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ گاؤں والوں کو نقصان پہنچے۔ اور شہر والوں کا کوئی نقصان نہ ہو۔ یا گاؤں والے خوشحال ہوجائیں اور شہر والے خوشحالی سے محروم رہیں۔ انفرادی مستثنیات سے قطع نظر کرکے اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو پنجاب جیسے صوبہ میں دیہات کے مفاد سے تمام باشندگان صوبہ کا مفاد وابستہ ہے۔ لیکن دیہاتی اقتصادیات کے مطالعہ کے یہ معنی نہیں۔ کہ دوسرے مسائل کو جو انسانی زندگی کیلئے مفید ہیں۔ نظر انداز کردیا جائے۔ زندگی مادیات پر منتہی ہوتی ہے۔ اور اُسکی اساس و بنیاد مادی ہے۔ انسان زمین سے خوراک حاصل کرتا ہے۔ خوراک پر زندگی کا دارومدار ہے۔ اِس لئے یوں کہنا چاہئے۔ کہ زمین زندگی کا مدار علیہ ہے۔ اگرچہ ارتقا محض مادی ترقی کا نام نہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کہ مادی ترقی کے بغیر اخلاقی اور ذہنی اصلاح و ترقی بھی نہیں ہوسکتی۔ ایسا تمدن جو پیداوار کے ترقی یافتہ طریقوں سے بھی روشناس ہو۔ روشن خیال اور سیاسی میدان میں بڑھی ہوئی اور آزاد قوموں میں ہی پایا جاتا ہے[2]۔

ایک امریکن مصنف لکھتا ہے۔ کہ معاشرتی اور گھریلو زندگی کی پاکیزہ صورت اور اخلاق کی ہر بلند سے بلند نوع نے اسی ملک میں ترقی کی ہے۔ جہاں اُس کی بنیاد کسی منفعت بخش کام پر استوار کی گئی ہو[3]۔

---

[1] لیکن دوسری چیزوں کی پیداوار میں بھی ترقی لازمی ہو۔ تاکہ لوگوں میں خریدنے کی قابلیت زیادہ ہوجائے۔ گیہوں کی قیمت بڑھ جانے [illegible]

[2] ملاحظہ ہو کنسٹرکٹو رورل سوشیالوجی مصنفہ جلیٹ صفحہ ۲۵۔

[3] کارور کی کتاب "پرنسپلز آف رورل اکنامکس" صفحہ ۲۴۔

وہ دولت وہ عشرت جس کی بنیاد دوسروں کی غلامی پر ہو۔کبھی پائیداری ثابت نہیں ہوئی۔ جیسا کہ ایک مشہور اہلِ قلم نے لکھا ہے[1]۔ایک اور امر بھی قابلِ غور ہے سادی دنیا کی قوتیں اپنے دائرہ عملی میں روشنی کی قوت سے بھی زیادہ طاقتور ہیں۔لوگوں کے ذہن پر جو مذہبی' تمدنی اور سیاسی نصب العین حکومت کر رہے ہیں[2]۔انہیں یہ مادی قوتیں برابر کمزور کرتی چلی جا رہی ہیں۔لیکن پنجاب میں یہ امید نہیں ہو سکتی۔کہ لوگوں کا مذہبی' تمدنی' یا سیاسی نصب العین بلند ہو جائیگا۔یہاں کے باشندوں میں اسی طرح اتحاد و اشتراک پیدا ہو سکتا ہے۔کہ اُن سب میں مشترک اقتصادی مفاد کا احساس پیدا ہو جائے۔ہر شخص عوام کے سود و بہبود کی کوشش کرے۔اور ہر گروہ کو اپنے خاص مذہبی زاویہ نگاہ پر قائم رہنے دے۔

اقتصادیات اور علم الاخلاق کی جولانگاہِ عمل ایک نہیں۔لیکن جو لوگ مذہب کا وعظ کہہ رہے ہیں۔یا ایک بہتر معاشرتی نظام کے قیام کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں۔اُن سے یہ بعید نہیں کہ وہ اپنے دائرۂ عمل کی حدود سے تجاوز کر کے اقتصادیات کی حدود میں قدم رکھ دیں۔اور اگر وہ محتاط نہیں۔تو ایسے عقاید کی تعلیم دینا شروع کر دیں۔جن پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا۔کہ جس راہ پر وہ لوگوں کو چلانا چاہتے ہیں۔وہ اس سے بالکل مختلف سمت اختیار کر لیں گے۔یہ خیال روز بروز زیادہ اور عام ہو رہا ہے۔کہ اخلاق کا اثر اقتصادیات پر پڑتا ہے۔پرہیزگاری اور دیانتداری کی وجہ سے زیادہ اچھی طرح محنت کی جا سکتی ہے۔اگر رفاہ عام کے کاموں اور تعلیم کو ترقی دیجائے۔فرصت کے اوقات کا صحیح استعمال کیا جائے۔تو اقتصادی ترقی کو فائدہ پہنچتا ہے۔غرض کہ اکثر چیزیں جنہیں پہلے محض حق و صداقت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔اب مادی منفعت کا سرچشمہ سمجھی جاتی ہیں۔

اِس لئے دیہاتی اقتصادیات کا وسیع تر مطالعہ کرنے پر زور دینے سے یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ جن لوگوں کی ساری توجہ انسان کی روحانی ضروریات پر لگی ہوئی ہے۔اس کی مخالفت کرینگے۔ ہاں! یہ ضرور ہے۔کہ اگر نوعِ انسان میں تعصب کی جانب کم رُجحان ہوتا۔تو حقیقی اشتراکِ عمل کا زیادہ

---

[1] رورل ری کنسٹرکشن اِن آئرلینڈ (آئرلینڈ میں دیہات کی نشاۃ ثانیہ) کا دیباچہ از جی' ڈبلیو' رسل۔

[2] مارشل اپنی کتاب کے صفحہ ۴ پر لکھتا ہے کہ انگلستان نے دنیا میں اسلئے نمایاں حیثیت کر لی ہے۔کہ اُسنے ایسے امور پر اپنی توجہ مرکوز کر رکھی تھی جنکا تعلق پائدار اور مستقل نتائج ...

امکان تھا پنجاب کے کسی معقولیت پسند باشندے کیلئے یہ تقریباً ناممکن ہے۔ کہ وہ اس صوبہ کو زیادہ خوشحال دیکھنے کی خواہش نہ رکھتا ہو۔ اِس لئے ایسے شخص کے لئے یہ بھی ناممکن ہونا چاہئیے۔ کہ اِس معینہ جدوجہد میں اعانت سے احتراز کرے۔

نیا نظامِ حکومت قائم ہوُا۔ تو لامحالہ عوام کا کوئی نہ کوئی گروہ دل میں سود و بہبودِ وطن کی خواہش سے مجبور ہو کر اقتصادیات میں مداخلت کا مطالبہ کریگا۔ چونکہ صوبجات کی مجالسِ قانون ساز میں اب نہ تو دستور و آئین کے مسئلہ پر کوئی سیاسی نزاع برپا ہو سکتا ہے۔ اور نہ ممالک خارجہ سے تعلقات کا مسئلہ زیرِ بحث آسکتا ہے۔ اس لئے وزرا کا بڑا کام یہ ہوگا۔ کہ صوبہ کے اقتصادی مفاد کو ترقی دینے کی کوشش کریں۔ چونکہ پنجاب کا بیشتر حصہ دیہات پر مشتمل ہے۔ اِس لئے یہ اندیشہ ہے۔ کہ اگر لوگوں نے دیہاتی اقتصادیات کا صحیح علم حاصل نہ کیا۔ تو اکثر غلطیوں کا ارتکاب کیا جائیگا۔ تاریخ بتاتی ہے۔ کہ لوگوں میں کوئی غلط خیال پھیلانا۔ یا ایسی تدابیر جو کوتاہ بینوں کو مفید نظر آئیں۔ اختیار کر لینا بیحد آسان ہے جب تک ہم اُن تمام اسباب سے پوری طرح واقف نہ ہو جائیں۔ جن کی بدولت خوشحالی حاصل ہو سکتی ہے یہ جاننا دشوار ہے۔ کہ اُن سے کیونکر فائدہ اٹھایا جائے۔ اِسی طرح جب تک اُن عادات و خصائل۔ اُن رسوم و رواج' نقائص و معائب سے آگاہی نہ ہو جائے۔ جو افلاس کا باعث ہیں۔ یہ معلوم کرنا مشکل ہے۔ کہ انہیں کیونکر دور کیا جائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ اگر گیہوں کی برآمد ممنوع قرار دی جائے تو اُس کی پیداوار میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ اور گیہوں ارزاں ہو جائیگا۔ لیکن یہ لوگ اُسی دلیل کو بمبئی کے بنے ہوئے کپڑے کے سلسلے میں پیش نہیں کرتے۔ کیوں کہ وہاں صاف ظاہر ہو جائیگا۔ کہ یہ دلیل ایک منطقی مغالطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعض لوگ ایسے طریقے استعمال کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ جن سے پیداوار پر ایک بھاری بوجھ پڑ جائیگا۔ یہ لوگ محسوس نہیں کرتے۔ کہ بحالتِ موجودہ ایسے وسیع رقبہ بھی ہیں۔ جنہیں کاشت کرنے پر محنت تو زیادہ صرف ہوتی ہے۔ لیکن فائدہ کم ہوتا ہے اشیائے خورونوش کی بہم رسانی اور غذا کے مابین جو تعلق ہے۔ اُسے بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جنوبی ہندوستان سے ناریل کا تیل کثیر مقدار میں انگلستان بھیجا جاتا ہے۔ جہاں اس سے ایک مصنوعی مکھن بنایا جاتا ہے۔ جسے مارجیرین کہتے ہیں۔ انگلستان کے باشندے اس ملک کے لوگوں کیطرح مسرفانہ طریق پر استعمال نہیں کر سکتے۔ اور اس ملک کے لوگ مارجیرین جو بآسانی مل سکتا ہے استعمال

نہیں کرتے۔ بلکہ کمی کی قلت سے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔

مذہبی جذبات کے باعث بہت سی اچھی کھانے پینے کی چیزیں استعمال نہیں کیجاتیں۔ اور کئی اچھی اچھی اشیائے خوردنی تیار نہیں کیجاتیں۔ جہاں جذبات کی فرمانروائی ہو۔ وہاں بیچارہ ماہر اقتصادیات صرف یہی کرسکتا ہے۔ کہ لوگوں کو حقیقت حال سے آگاہ کرکے ایسی غلطیوں سے بچانے کی کوشش کرے۔ جنکا لازمی نتیجہ عسرت و افلاس ہوگا۔ اگر ایک سیاسی لیڈر اپنے پیروؤں کو تباہی سے بچانا چاہتا ہے۔ تو اُس کے لئے ضروری ہے۔ کہ اقتصادی زاویہ نگاہ سے واقفیت حاصل کرے۔ جب زراعت اور ان اسباب کا علم نہ ہو۔ جو زراعتی خوشحالی کے لوازم ہیں۔ تو یہ خطرہ ہے۔ کہ لوگ ایسی تدابیر اختیار نہ کریں۔ جو لامحالہ اقتصادی زوال کا باعث ہونگی۔ حسنِ نیت کوئی ایسا معقول عذر نہیں۔ جو کسی شخص کی جہالت پر پردہ ڈال سکے۔ اگر ایک نیک نیت شخص کوئی حماقت کر بیٹھتا ہے۔ تو اس کی نیک نیتی اسے اپنی حماقت کے نتائج سے نہ بچا سکے گی۔ اس لئے اگر کسی اقتصادی مقصد کی خاطر کوئی قانون وضع کرنے سے پہلے اِقتصادیات کا صحیح علم حاصل کرلینا ضروری ہے زراعتی ترقی کے اسباب کی تحقیقات کرنا دیہاتی اقتصادیات کے ماہر کا کام ہے۔ وہ کسی خاص حکمت عملی کا حامی نہیں۔ لیکن اُس نے جو معلومات فراہم کی ہیں۔ انہیں ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ یہ اُسی کا فرض ہے کہ اگر کسی خاص زیرِ غور حکمتِ عملی میں اُسے غلطیاں نظر آتی ہیں۔ تو انہیں صاف صاف ظاہر کردے اور کوئی دوسرا طریق عمل تجویز کرے۔ جس سے بہتر نتائج پیدا ہو سکیں۔

آجکل جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ انمیں سے غلط طریق استدلال کی بکثرت مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ جن پر اقتصادیات سے واقفیت رکھنے والے لوگ کبھی بحث کرنا بھی گوارا نہیں کرینگے عوام کی ضروریات کی جانب جوں جوں توجہ بڑھتی جاتی ہے۔ ان بیچاروں کی مسلمہ شکایات رفع کرنے کے لئے ایسی ایسی تدابیر تجویز کیجا رہی ہیں جنہیں عمل میں لایا گیا۔ تو یہ شکایات دور ہونے کی بجائے بڑھ جائینگی۔ دیہاتی اقتصادیات سے بے اعتنائی برتنے سے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اور اس خطرہ سے اُسی صورت میں نجات ہو سکتی ہے۔ کہ اِس دشوار اور پیچیدہ فن کے مطالعہ کی ترغیب دلائی جائے فوری خطرہ تو یہ ہے۔ کہ جب اِس فن کا مطالعہ کرنیوالے سیدھے سادھے اور بدیہی حقائق کی تعلیم دینگے تو جہلا اُن کی مخالفت کرینگے۔ جب عوام علم حاصل کرکے اپنی جہالت کو دور کرنا نہ چاہیں۔ تو تباہی کا

خطرہ ہے۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں۔ جنہوں نے دستوری حکومت میں انگریزوں سے زیادہ تجربات
کئیے ہوں۔ یا ان سے زیادہ ٹھوکریں کھائی ہوں۔ لیکن انگریزوں نے اپنی غلطیوں سے بہت سبق سیکھا
ہے۔ وہ پوری طرح محسوس کر چکے ہیں۔ کہ قانون وضع کر کے خوشحالی کرنے کی راہ میں کیا کیا دشواریاں
حائل ہیں۔ اب وہ سمجھنے لگے ہیں۔ کہ تدقیق و تحقیق سے جو علم حاصل کیا جاتا ہے۔ وہ کس قدر قابل قدر ہوتا
ہے۔ اور اب وہ ان لوگوں کی باتیں سننے پر بیش از پیش آمادگی ظاہر کر رہے ہیں۔ جنہوں نے اپنا وقت
صرف کر کے خاص مسائل کا مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے۔ کہ اس صوبہ کے لوگ بھی آئندہ
انگریزوں کا سا طریق عمل اختیار کریں۔ دنیا کے ہر ملک میں حکومت نے اقتصادیات میں دخل دینے کی
بارہا کوشش کی ہے۔ اور ان کوششوں سے انسان کو جو تجربہ حاصل ہوا۔ اُسے حقیر سمجھ کر نظر انداز نہیں
کیا جا سکتا۔ آج ہمیں اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ پنجاب اور دوسرے زراعتی ممالک کے حالات
کو سامنے رکھ کر اُن کا مطالعہ بغور کیا جائے۔ اور اصلاح کی ان کوششوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے
جو ان ممالک میں کی گئی ہیں۔ یہ ہو گیا تو سمجھ لیجئے۔ کہ نئے قوانین سے مضرت کا اندیشہ نہیں رہیگا اور
یہ صوبہ ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جائیگا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ کہ اس مطالعہ سے صرف اچھے
مشورے ملیں گے۔ یا ہم خطرات سے خبردار ہو جائینگے۔ ایسا بہت کم ہوگا۔ کہ اس سے ہمیں راہ عمل
مقرر کرنے کے متعلق بھی ہدایات ملیں۔ آخر کار ہمیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ راہ عمل اور رفتار ترقی کی تعیین
انسان کی ہمت و کوشش کے ہاتھ ہے۔ قانون اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ کہ ہمارے راستہ میں جو
چیزیں حائل ہیں۔ اُنہیں دور کر کے ہمیں کام کرنے کا موقع بہم پہنچا دے۔

دوسرا باب

انسانی عنصر

زراعتی اقتصادیات کے سلسلہ میں انسانی عنصر کا جس قدر ذکر کیا جائے، کم ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ جب زراعت پر بحث کیجاتی ہے۔ تو اکثر انسانی عنصر کو ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کسان کے متعلق دنیا بھر میں مشہور ہے۔ کہ کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ اپنے طور طریقوں کے نقائص معلوم کرنے کی بجائے ہمیشہ دوسروں کی شکائت کرتا رہتا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے۔ کہ حکومت اس سے وہ سلوک نہیں کرتی۔ جسکا وہ مستحق ہے۔ کبھی کہتا ہے۔ کہ زمین ناقص ہے۔ موسم کا کوئی اعتبار نہیں۔ ادھر کھیتی پک رہی ہے۔ اور اُدھر منڈی میں نرخ گر رہا ہے۔ کبھی کہتا ہے۔ کہ اب کے تو فصل خوب ہوئی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اگلے سال اچھی فصل نہیں ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ محسوس نہیں کرتا۔ کہ دوسری صنعتوں کو بھی بعض خاص دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اراضی کی حالت کا ذمہ وار کوئی دوسرا نہیں۔ بلکہ وہ خود ہے[1]۔ زراعتی ملکوں میں تو اچھی یا بُری اراضی سے کسان کی قابلیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ کسان اچھا ہوگا۔ تو اراضی بھی اچھی ہوگی۔ اسمیں کوئی نقص ہوگا تو اراضی پر بھی اس کا اثر پڑیگا۔ پنجاب میں بھی تو وہیں اچھی فصل ہوتی ہے۔ جہاں جی کھول کر سرمایہ اور محنت صرف کی گئی ہو۔ ہندوستان میں سائینٹیفک زراعت کے متعلق لوگوں کا علم بہت محدود ہے۔ اس لئے یوں سمجھ لیجئے۔ کہ اگر یہاں پیداوار اچھی نہیں ہوتی۔ تو اس کی وجہ ہے۔ کہ یہاں کے دماغ اور عقل کی کمی ہے۔ فصل کیلئے کسان کا صرف جفاکش ہونا ہی ضروری نہیں۔ بلکہ اس میں اتنا علم اور قابلیت بھی ضرور ہونا چاہئے۔ کہ وہ اپنی محنت کا صحیح استعمال کر سکے۔ اور سرمایہ سے زیادہ

---

[1] ایگریکلچر آف آکسفورڈ شائر صفحہ ۱۲۰۔ سالگمین کی کتاب پرنسپلز آف ورلڈ اکنامکس صفحہ ۵۴۔

سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ اگر انسان ہی ترقی کرنے کے قابل نہ ہو۔ تو ترقی ہو گی کیونکر۔ جب لوگوں میں جدوجہد کرنے کی طاقت اور ہمّت ہو۔ تو ترقی کی راہ میں انہیں کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اور پھر قابلیت اور ہنرمندی بھی تو دشواریوں کا مقابلہ کرنے سے بڑھتی ہے۔ پروفیسر کارور نے سچ کہا ہے۔

بعض جماعتیں اور قومیں جنکے گردوپیش دولت حاصل کرنے کا سامان تھا۔ افلاس سے مخلصی نہیں پا سکیں۔ یا زمین کی زرخیزی اور قدرتی ذرائع کی کثرت کے باوجود افلاس کے گڑھے میں جا پڑیں۔ تو اس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ یا تو لوگوں میں قابلیت نہیں تھی۔ اور اگر قابلیت بھی تھی۔ تو وہ ضائع ہو گئی[1]۔

ہسپانیہ میں لوگوں نے زراعت کی ترقی کیلئے کوشش نہیں۔ اور نہ کسی نے اُن کی رہنمائی کی۔ اِس لئے ہم دیکھتے ہیں۔ کہ آج وہاں ہزاروں مربع میل قابلِ زراعت زمین یونہی پڑی ہے۔ اور اگر کہیں کھیتی باڑی ہوتی بھی ہے۔ تو اُس کی کیفیت یہ ہے۔ کہ یورپ کے دوسرے ملکوں کی پیداوار کے مقابلہ میں اس کی فی ایکڑ پیداوار کا اوسط چوتھائی[2] ہے۔ یہ انسان کی ہمت، اور کوشش اور صحیح رہنمائی کا ہی نتیجہ تھا۔ کہ دوآبہ رچنا کی زمین جو عرصہ سے خالی پڑی تھی۔ آج دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ زراعتی علاقوں میں شمار کی جاتی ہے۔ قدرتی ذرائع تو محض آلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن سے انسان کی کوشش دولت پیدا کر سکتی ہے۔ انگلستان کی زمین قدرتی طور پر زرخیز نہیں تھی۔ لیکن اُس پر صدیوں تک یہ سمجھ کر محنت کی گئی۔ کہ زمین قومی قوت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آج اُس کی پیداوار کا یہ عالم ہے۔ کہ کوئی دوسرا ملک عرصہ سے اس بارہ میں انگلستان سے بازی نہیں لیجا سکا۔ آج انگلستان کے دیہات میں جو زرخیزی نظر آرہی ہے۔ وہ یونہی حاصل نہیں ہو گئی۔ بلکہ چار سو سے چھ سو سال تک اس میں کھاد ڈالی جاتی رہی۔ اور اُس کی حالت بہتر کرنے کی کوشش کی گئی۔ زراعت کے مسئلہ پر سب سے پہلی کتاب آج سے چھ سو

---

[1] پرنسپلز آف رورل اکنامکس۔ صفحہ ۱۰۴۔

[2] دی ٹرتھ اباؤٹ سپین (ہسپانیہ کے متعلق حقیقت حال) مصنفہ وآرڈ صفحہ ۱۶۶، ۱۶۷۔

سال[1] پہلے لکھی گئی تھی - اس وقت سے ایک دو مرتبہ کے سوا ہمیشہ زراعت اس طرح متواتر و پیہم ترقی کرتی رہی ہے - کہ اس ملک کے باشندے اس کا احساس بھی نہیں کر سکتے - زمین کی پرواہ نہ کی جائے - تو اچھی سے اچھی زمین بھی بیکار ہو جائیگی - اور بُری سے بُری زمین پر بھی انسان عقل اور محنت صرف کرے - تو اُس سے بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے - انگلستان اور ہندوستان میں جو فرق ہے - اور جسے بعض لوگ سیاسی اسباب کا نتیجہ بتاتے ہیں - اس کا حقیقی سبب یہی ہے -

آئرلینڈ کا ایک مصنف لکھتا ہے - کہ کسی ملک کی دولت کا انحصار اس کے مادی ذرائع پر نہیں بلکہ اس کے باشندوں کی جرأت ہمت اور اخلاقی قوت پر ہے - اِن اوصاف کے بغیر کوئی ملک بھی مستقل طور پر خوشحالی حاصل نہیں کر سکتا ہے - اور یہ چیزیں میسر ہوں - تو نا مساعد[2] حالات زیادہ دیر تک اس کی ترقی میں حائل نہیں رہ سکتے - اِس حقیقت کو ہسپانیہ کے ایک روشن خیال زمیندار نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے - کہ جو قومیں یہ بھول جاتی ہیں - کہ قانونِ تخلیق کی رُو سے قومی عظمت کا دارومدار زراعت پر ہے - اور غفلت کی سزا زوال اور تباہی ہے - ضرور تباہ[3] ہونگی - بدقسمتی تو یہ ہے کوئی شخص اپنے نقائص تسلیم کرنا گوارا نہیں کرتا - اور یہی چاہتا ہے - کہ اپنی غلطیاں کسی دوسرے کے سر تھوپ دے - بہرکیف اگر پنجاب کو کبھی خوشحالی کے بامِ بلند پر جس کی راہ اس کے لئے کھلی ہے - پہنچنا منظور ہے

---

[1] والٹر ہنلے نے تقریباً ۱۲۵۰ء میں ایک کتاب لکھی - جو سولھویں صدی تک زراعت کے لئے مفید ثابت ہوتی رہی - اسکے بعض مشورے آج بھی قابلِ قدر ہیں - پیکرٹن کی کتاب شارٹ ہسٹری آف انگلش اگریکلچر صفحہ ۱۳۰ ملاحظہ ہو - مسٹر کرٹلر نے اپنی کتاب میں مختلف تجربات اور آزمائشوں کا میابیوں اور ناکامیوں کا حال لکھتا ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانونی احکام کے مقابلہ میں انسانی عنصر کو کس قدر فوقیت حاصل ہے -

شبے آور اپنی کتاب اگریکلچر ان آکسفورڈ شائر کے صفحہ ۱۳۱ پر لکھتا ہے - کہ اگر آج آکسفورڈ شائر کی صورت سات سو سال پیشتر کی نسبت زیادہ خوشنما نظر آتی ہے - اور جو لوگ زراعت سے اسباب محنت پیدا کرتے ہیں - انہیں آج اطمینان ہے - کہ انکے آباؤ اجداد زمین سے جو پیداوار حاصل کرتے تھے - وہ اُن کی نسبت زیادہ پیداوار حاصل کرینگے - جو انکی ضروریات کیلئے کافی ہوگی - تو انکی وجہ یہ نہیں - کہ زمین یا آب و ہوا میں کوئی فرق ہو گیا ہے - بلکہ یہ اختلاف محض اس وجہ سے ہے کہ انگریزوں نے بیس پشت تک محنت و مشقت کر کے زمین کو اس قابل بنا لیا ہے کہ انکی ضروریات پوری کر سکے -"

[2] رودل ری کنسٹرکشن ان آئرلینڈ صفحہ ۱۶ -

[3] دالرڈ نے اپنی کتاب "دی ٹرتھ اباوٹ سپین" میں یہ رائے نقل کی ہے - ملاحظہ ہو صفحہ ۱۷۰ -

تو اس سکے لئے ضروری ہے۔ کہ اُن تمام اسباب پر غور و فکر کر کے انہیں روشنی میں لایا جائے۔ جو اُسے مفلس بنانے یا اُسکی ترقی میں روک پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اس مسئلہ میں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ لوگوں کے موجودہ افلاس کا باعث یہ ہے۔ کہ کبھی پنجاب میں تعمیری ترقی کی کوئی مسلسل کوشش نہیں کی گئی۔ جو لوگ اس ملک کے افلاس پر افسوس ظاہر کر رہے ہیں۔ انہیں چاہئیے کہ جس ملک کو وہ رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ذرا اُس ملک کی تاریخ کا مقابلہ اپنے ملک کی تاریخ سے کریں۔ خوشحالی اور دولت تو تخلیقی صنعت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ افلاس تو اِس صورت میں آسکتا ہے۔ جب یا تو ملک میں سرے سے صنعت کا وجود ہی نہ ہو۔ اور اگر ہو۔ تو اُس کا نظام ایسا ہو۔ کہ صنعت کے منافع سے دوسرے فائدہ اُٹھائیں۔ کوئی صنعت مفت خوروں کی ایک ایسی جماعت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ جو ہاتھ پاؤں نہ ہلاتی ہو۔ اگلے زمانے میں بادشاہوں کے مصاحبوں، امیروں، سپاہیوں اور غلاموں کا ایک بہت بڑا گروہ کسان کو اُس کی محنت کے ثمرات سے محروم کر دیا کرتا تھا۔ جن سالوں میں اچھی فصل ہوتی ہے۔ اس کے پاس صرف اِتنا بچ رہتا تھا۔ کہ اپنا پیٹ پال سکے۔ اور جب اچھی فصل نہیں ہوتی تھی۔ تو اتنا بھی نہیں بچتا تھا۔ جب ان بیکار لوگوں کا وجود نہ رہا۔ تو غیر ضروری دلالوں اور ایجنٹوں کا گروہ پیدا ہو گیا۔ اور اب انگریزی عہدِ حکومت میں خوشحالی بڑھنے لگی تو دیہات میں سود خواروں نے اپنا تسلط جما لیا۔ جو اپنے پیشے سے خوب روپیہ جمع کرتے ہیں۔ بیچارے کسان کو یہ ثابت کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ کہ ترقی کے موجودہ اسباب و محرکات کے ماتحت وہ کسقدر ترقی کر سکتا ہے۔ مسٹر کیٹنگز[1] نے صحیح لکھا ہے۔ کہ چھوٹے چھوٹے مالکانِ اراضی خواہ کیسے ہی مضبوط جفاکش اور عقلمند کیوں نہ ہوں۔ اگر اُن سے اچھا کام لینا ہے۔ تو اُن میں شوق اور ولولہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب ایک کسان کے سر پر قرض کا بارِ گراں ہوتا ہے۔ پیٹ بھر کھانے کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ اور زمین کی ساری پیداوار ساہوکار کے قرضہ میں چلی جاتی ہے۔ تو اس بیچارے میں قدرتاً محنت سے کام کرنیکا ولولہ بھی نہیں رہتا۔ اُسے مفلسی حاصل کرنیکی امید نہیں ہوتی۔ لیکن اتنا سہارا ضرور ہوتا ہے کہ ساہوکار اپنے فائدے کیلئے یہ خیال رکھیگا۔ کہ بیچارے کسان کو پیٹ بھر کھانے کو ملتا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ زمین کی کاشت اچھی طرح نہیں ہو سکتی۔ اور کھیتی کو ترقی نہیں دی جا سکتی۔ کسان کو

[1] کیٹنگز کی کتاب رورل اکانومی ان بمبئی اینڈ دکن۔

کو اگلے زمانے کے فرمانرواؤں اور موجودہ زمانے کے بدنیّت سود خواروں کے تشدّد نے اقتصادی غلامی کی حد تک پہنچا دیا ہے - اور سچ تو یہ ہے - کہ کسان میں آج عام طور پر ہمّت کا فقدان پایا جاتا ہے اِس کا باعث یہی تشدّد ہے معلوم ہوتا ہے - کہ اس کے علاوہ کسان کے پیشے میں بھی کوئی ایسی بات موجود ہے - جس کی وجہ سے وہ پیداوار کے بارہ میں اپنی کوشش و محنت کو بہت حقیر اور بے حقیقت سمجھنے کا عادی ہو چکا ہے - یہ بات کوئی ہندوستان پر ہی موقوف نہیں - دوسرے ملکوں کی بھی یہی کیفیت ہے - وہاں بھی کسان نے فطرت کے سامنے سرِ تسلیم جھکا رکھا ہے - وہ تقریباً تقدیر کا قائل ہے - اُسے زمین سے جتنی پیداوار حاصل ہوتی ہے - اسی پر قناعت[1] کر لیتا ہے - یہ نہیں ہوتا - کہ وہ زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کرے[2] - اور تو اور انگلستان کے کسانوں کی اکثریت کا بھی یہی عقیدہ ہے - کہ زراعت سے محض زندگی بسر کی جا سکتی ہے انہیں یہ خیال نہیں آتا - کہ زمین کو اگر ترقی دیجائے - اس کی توسیع کی کوشش کیجائے - تو اُس سے روپیہ بھی کمایا جا سکتا ہے[3] - جن ملکوں میں یہ پُرانا عقیدہ ابھی تک موجود ہے - کہ کسان کو پیداوار کے منافع سے نہیں، بلکہ پیداوار سے سامان معیشت مہیّا کرنا ہے - وہاں تو یہ کیفیت ہے - کہ جہاں کہیں کسان کو غلّہ فروخت کرنے میں کوئی مشکل پیش آئی - یا اپنی محنت کا پورا معاوضہ نہ مل سکا - وہ اراضی پر مزید محنت صرف کرنا چھوڑ دیگا - حالانکہ مزید محنت سے مزید منافع بھی حاصل کیا جا سکتا ہے - مثلاً مشہور ہے - کہ یونان کے کسان کو یہ خواہش نہیں - کہ زمین سے جس قدر فائدہ اٹھایا جا سکے - اٹھایا جائے، چونکہ یونان میں ذرائع آمد و رفت کے متعلق سہولتیں نہیں - اِس لئے وہ زیادہ غلّہ نہیں فروخت کر سکتا، اِس لئے وہ اسی پر قانع ہے - کہ اس کی خانگی ضروریات پوری ہو جائیں - یا کبھی تھوڑا سا منافع بھی بچ رہے

[1] رورل ری کنسٹرکشن اِن آئرلینڈ صفحہ ۱۵۶ مصنف صفحہ ۲۷ پر یہ خیال ظاہر کرتا ہے - کہ آئرلینڈ میں عرصہ سے یہ خیال نشوونما پا رہا ہے - کہ ملکی سیاسیات میں یقیناً تبدیلی واقع ہوگی - اس لئے آئرلینڈ کے کسان زراعت کے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر رہے ہیں -

[2] بجلٹ کی کتاب کنسٹرکٹو رورل سوشیالوجی صفحہ ۱۶۲ - رومانیہ کے کسانوں کے متعلق لکھا ہے نہ انہیں ترقی اور کامرانی کے حصول کا جذبہ ہے نہ وہ کفایت شعاری کے خواہشمند ہیں اور عام طور پر میلے کچیلے رہتے ہیں - (دیکھئے - ایف - او - ہینڈ بک)

[3] اگریکلچر آفٹر وار (جنگ کے بعد زراعت) مصنفہ ہال صفحہ ۲۶ -

پھر تو ملکی روایات کے باعث اور کچھ آب و ہوا کے اثرات کی وجہ سے یونانی کسان کی ضروریات بہت تھوڑی اور بالکل سیدھی سادھی ہوتی ہیں۔ اس لئے زیادہ محنت صرف کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ حالانکہ ایک حیثیت سے یونان یا دوسرے ملکوں کے کسانوں کا اِس قدر تھوڑے فائدہ پر قناعت کر لینا بدبختی ہے[1]۔

ہم اِس مسئلہ پر تو کافی بحث کر چکے۔ کہ اگر کسی ملک کی زراعت کو ترقی دینا مقصود ہے۔ تو ہر جائز طریقے سے یہ کوشش کرنا چاہیئے۔ کہ کسان اِس صنعت کو اقتصادی اصولوں پر چلائیں۔ چونکہ بہت کم آدمی ایسے ہیں۔ جو صرف کام سے لطف اٹھانے کیلئے محنت کرتے ہوں۔ اِس لئے کسانوں کے دل پر یہ خیال نقش کر دینے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ کہ اراضی کو زرخیز بنانا اور اچھی طرح زراعت کرنا کسان کی قابلیت پر منحصر ہے۔ کسانوں کو یہ بھی یقین دلانا چاہیئے۔ کہ جو کسان اچھی طرح کھیتی باڑی کرتا ہے۔ اُسے اپنی محنت کا پورا پورا ثمرہ ضرور ملتا ہے[2]۔ جو چیز کسان کو اُس کی محنت کے ثمرات سے محروم رکھنے کی کوشش کرے۔ اُسے زراعتی ترقی کی راہ کا روڑا سمجھنا چاہیئے۔ ہم اسی سلسلے میں کئی مثالیں پیش کر کے ثابت کر سکتے ہیں۔ کہ کسان کے طور طریقوں کی اصلاح کیلئے یہ ضروری ہے۔ کہ اِس تحریک کو وسعت دیجائے۔ دنیا کے ہر ملک میں آپ کو یہ دکھائی دیگا۔ کہ کسان پرانی لکیر کا فقیر ہے۔ اپنے سوا کسی دوسرے سے سروکار نہیں رکھتا۔ وہ رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اور نئے خیالات قبول نہیں کرتا۔ لیکن اگرچہ کسان باہر کے لوگوں کے مشورے قبول نہیں کرتا تاہم اکثر انہی لوگوں کو زراعت کے طریقوں میں نئی نئی اصلاحیں سوجھی ہیں۔ جو بذاتِ خود کسان نہیں تھے۔ اِس لئے شہر کے دانشمند باشندوں نے اگر اِس صنعت سے بے اعتنائی برتی۔ تو اِس سے زراعت کی ترقی کو بہت نقصان پہنچے گا۔ پنجاب میں اگر کسان اچھی یا بری فصل کی ذمہ داری اپنے

---

[1] ماڈرن گریس (یونان جدید) مصنفہ آرس۔ جب صفحات ۱۰۴-۱۰۸۔

[2] ایک بوڑھے کسان سے پوچھا گیا۔ کہ آکسفورڈ شائر میں بہترین اراضی کونسی ہے۔ تو اس نے جواب دیا۔ کہ بہترین اراضی وہی ہے جسے بہترین کسان کاشت کرتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ ہوگا۔ لیکن اِس قدر بالکل صحیح ہے کہ جہاں بہترین کسان ہو وہیں بہترین کاشت ہوتی ہے۔ بہترین کاشت وہاں نہیں ہوتی۔ جہاں بہترین اراضی ہے۔ ملاحظہ ہو جے آور کی کتاب۔ اگریکلچر ان آکسفورڈ شائر صفحہ ۱۳۱۔

بجائے دوسرے اسباب کے سر تھوپ دیتا ہے۔ تو اس کی وجہ ہے۔ کہ یہاں فصل پر بارش کا بہت اثر پڑتا ہے[1]۔ بعض جگہ اِس لئے فصل اچھی نہیں ہوتی۔ کہ کاشت میں کوئی نقص رہ جاتا ہے لیکن اگر کسان سائنٹیفک طریق اختیار کرے۔ تو وہ کسی حد تک موسم کا محتاج نہیں رہیگا۔ بدقسمتی سے کسان تعلیم کی صحیح قدر وقیمت سے بھی واقف نہیں۔ اور اُسے کوئی اہمیّت نہیں دیتا۔ جس شخص کی یہ کیفیت ہو نکہ جب اچھی فصل ہوتی ہے۔ وہ اسے بہت حد تک قدرت کی مہربانی کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ اور اگر اپنی کوششوں کو اِس میں شریک سمجھتا ہے۔ تو بہت کم۔ اس سے کب یہ امید ہو سکتی ہے۔ کہ وہ کسی کا مشورہ قبول کر کے محنت و مشقت کے طریقوں میں اصلاح کی کوشش کریگا۔ چونکہ کسان کو جو تعلیم دیجاتی ہے۔ وہ اس کے لئے غیر موزوں ہوتی ہے۔ اِس لئے وہ اپنے طرزِ عمل میں اور بھی پختہ ہو گیا ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں کسان تعلیمی مدارس کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھتا۔ اِسلئے یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں۔ کہ مدارس کی تعلیم کسان کیلئے موزوں نہیں۔ پنجاب جیسے زراعتی صوبہ میں ایسی تعلیم کو جسے کسان بھی پسند کرے بہت بڑی اقتصادی اہمیّت حاصل ہے اور اِس مسئلہ پر جس قدر زور دیا جائے کم ہے۔ ہم زراعتی تعلیم کے مسئلہ پر تفصیلی بحث تو آگے چل کر کرینگے یہاں یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسان کو اگر موجودہ طریقِ تعلیم پسند نہیں۔ تو اس کی وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ہوشمند اور تعلیمیافتہ لوگوں کا عام رجحان یہ ہے۔ کہ دیہات کو چھوڑ کر شہروں میں بود و باش اختیار کر لی جائے۔ ہم اوراقِ آئندہ میں اِس رجحان پر بھی بحث کرینگے۔

ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ پنجاب جیسے صوبہ میں دوسرے صوبوں کی بہ نسبت زراعت سے جو بے التفاتی برتی جا رہی ہے۔ وہ اقتصادی حیثیت سے بہت اہمیّت رکھتی ہے۔ اب جو زراعت سے تجارتی نفع حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ تو یہ مناسب ہے۔ کہ نہایت مضبوط و مستحکم اصولوں پر اِس کی تنظیم کی جائے۔ زیادہ سرمایہ لگایا جائے۔ کسان کے طریقِ تعلیم میں اصلاح کیجائے

---

[1] مسٹر کیٹنگز بمبئی اور دکن کے سلسلے میں لکھتا ہے "کہ سالہا سال سے بارش کی وقت نے کسان کے ذہن میں یہ مبالغہ آمیز خیال پیدا کر دیا ہے۔ کہ پیداوار کی کمی یا بیشی اُس کی محنت پر موقوف نہیں"۔

تاکہ وہ سرمایہ لگا کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ بدقسمتی سے کسان[1] بعض وجوہ سے مزید کوشش اور محنت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اِس لئے اُسے یہ بتلانے کی ضرورت ہے۔ کہ اگر وہ ہاتھ پاؤں ہلائے۔ زیادہ سرمایہ، زیادہ محنت، اور زیادہ عقل صرف کرے۔ تو اُس کے سامنے کامیابیوں کا ایک وسیع میدان پڑا ہے۔ جسے وہ بآسانی طے کرسکتا ہے۔ لیکن اس کی امید نہ رکھئے۔ کہ خود کسان ہی اُٹھ کر اپنے ہم پیشہ لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرینگے۔ اب تک شہر کے باشندے کسان کی کمائی پر عیش اڑاتے رہے ہیں۔ اور غلّہ کی خرید و فروخت میں دلالی کرنے کے سوا زراعت میں انھوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ شہر کے باشندہ نے یہ کبھی محسوس نہیں کیا۔ کہ کسان کو خوشحالی نصیب ہوئی۔ تو وہ بھی خوشحال ہوجائیگا۔ بلکہ اِس کوشش میں مصروف رہا ہے۔ کہ بیچارہ کسان تنزّل کرتے کرتے اقتصادی غلامی کی حد تک پہنچ جائے۔ اِس طرح اُس نے کسان کے دل کو محنت و مشقت کے ولولہ سے محروم کردیا ہے۔ دولت پیداوار سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک ایسی جماعت میں جو ملکی پیداوار بڑھانے میں حصّہ نہ لیتی ہو۔ کسی نہ کسی حیثیّت سے کارآمد ثابت ہو۔ لیکن اگر ملک میں ایک بہت بڑی جماعت ایسی ہے۔ جس سے پیداوار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ تو اِس کے وجود سے یقیناً ملک کی اِقتصادی حیثیّت کو نقصان پہنچے گا۔

علی العموم ہر ملک کی دولت پر اس امر کا بھی اثر پڑتا ہے۔ کہ اس کی زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ آبادی کا تناسب کیا ہے۔ ایک زمانہ میں جب کہ آئرلینڈ کے لوگ مفلس تھے۔ اِمداد باہمی کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی۔ براہِ راست تجارت کرنے میں سہولتیں نہیں تھیں۔ اور تاجروں کے باہمی مقابلہ اور چنگی کی گرم[2] بازاری کی وجہ سے بہت نقصان ہوتا تھا۔ اس وقت ملک کی آبادی

---

[1] چونکہ زراعت قدیم ترین محنت ہے۔ اِس لئے ضروری ہے کہ اس پر اظہار خیال کرتے وقت وسعت سے نظر ڈالی جائے کسان اگر مزید کوشش و محنت پر آمادہ نہیں تو اسکی وجہ یہی ہے کہ ۱۸۸۰ء سے پہلے زرعی پیداوار کی فروخت کی کوئی منڈی نہیں تھی۔ پھر قیمتوں میں اسقدر اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا تھا کہ کسان میں ترقی کا خواہ کیسا ہی جذبہ اور قابلیت موجود ہوتی وہ اُسے بیدار نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ منافع کے متعلق اسے یقین و وثوق نہیں تھا۔

[2] "دی کنسٹرکشن اِن آئرلینڈ" صفحہ ۲۲۷۔

زیادہ تر تاجر پیشہ لوگوں پر مشتمل تھی۔ جن کی تعداد ضرورت سے زیادہ تھی۔ پنجاب میں یہی خصوصیت دکھائی دیتی ہے۔ بعض ذاتوں کے لوگ تو کسی ایسے کام میں حصہ نہیں لیتے جس سے پیداوار میں اضافہ ہو۔ اور ایسے پیشے اختیار کر لیتے ہیں۔ جن سے دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اور زراعت و صنعت کے علاوہ جتنے سود مند کام ہیں۔ انہیں بہت زیادہ لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ جن کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے۔ مثلاً اجناس کی تقسیم ایک سود مند کام ہے۔ لیکن اشیائے خوردنی کے چھوٹے چھوٹے تاجروں کی تعداد کا حساب کیجئے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ صوبہ کے اکیس باشندوں میں سے ایک ضرور تاجر ہے۔ اسی طرح ساہوکاروں یا سود پر روپیہ دینے والوں کی تعداد ایک فی صدی ہے۔ اس قسم کے اعداد و شمار پر اس اقتصادی حقیقت کی روشنی میں نظر ڈالنا چاہئے۔ کہ ایسے لوگ جن کی گذران دوسروں کی محنت پر ہوتی ہو۔ کسی قوم میں جسقدر کم ہوں اُتنا ہی بہتر ہے۔ اور ایسے لوگ جو ملک کی پیداوار بڑھانے میں حصہ لیں اور قوم کی خدمت کریں۔ اُن کی تعداد جسقدر زیادہ ہو ملکی ترقی اور خوشحالی کے لئے مفید ہے[1]۔

زراعت میں انسانی عنصر کے عمل و دخل کی اس طولانی بحث کے سلسلے میں گاؤں کے باشندوں کی عجیب وغریب ذہنی حالت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسان دیہات کے محدود دائرہ میں عزلت و خاموشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے۔ کہ اگر انہیں باہر کا ایک شخص کوئی مشورہ دے تو وہ اُسے ناپسند کرینگے۔ بلکہ دوسرے لوگ اُنکی زندگی کو سُدھارنے کی کوشش کریں۔ تو وہ اس سعی کو بے اعتمادی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ یہ بے اعتمادی دُور دُور پھیلی ہوئی ہے۔ پبلک مجالس میں بھی یہ جراثیم اثر کر چکے ہیں۔ لوگ ان انتظامی مجالس کے کام میں بھی کوئی سرگرمی ظاہر نہیں کرتے۔ جن کے سپرد عوام کی فلاح و بہبود کا کام ہے۔ ایک امریکن کسان کے متعلق سنا گیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو کارور کی کتاب "پرنسپلز آف رورل اکنامکس" صفحہ ۲۰۴ اگر یہ دیکھنا ہو کہ عوام کی ایک بہت بڑی جماعت کے غیر منفعت بخش مشاغل اختیار کرنے سے افلاس اور زوال کیونکر رونما ہوا۔ تو ہسپانیہ کے حالات ملاحظہ کیجئے۔ وہاں ½ آبادی زراعت میں مصروف ہے، اور ہزار میں سے چھپتر دوسری پیداوار بڑھانے والی صنعتوں میں مصروف ہیں۔ نظم ونسق حکومت کی خرابی اور غلط اقتصادی حکمت عملی کے جمے رہنے کی وجہ سے یہ ملک فاقہ زدگی اور عسرت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ (صیغہ خارجہ کے پمفلٹ)

کہ وہ ابھی اِس پرانے عقیدے پر جما ہوا ہے۔ کہ رفاہِ عام کے لئے حکومت کی معرفت روپیہ صرف کرنا مقتضائے عقل و دانش نہیں۔ حکومت گاؤں کے لوگوں سے جو محاصل لیتی ہے۔ اُنہیں دیہاتی زندگی کی دُکھتی ہوئی رگ سمجھنا چاہئے۔ شہروں میں اجتماعی طور پر رفاہِ عام کے کام کئے جاتے ہیں۔ اور اِس بات میں شہر کے باشندوں نے بہت ترقی کر لی ہے۔ مثلاً گلی کوچوں نالیوں اور آبپاشی کا اِنتظام لوگ خود کرتے ہیں۔ اور ان کے مصارف پبلک فنڈ سے ادا کئے جاتے ہیں۔ جو محصول لگا کر وصول کیا جاتا ہے۔ لیکن کسان اِس طرح روپیہ صرف نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کہتا ہے۔ کہ اِن چیزوں کو عوام کے روپیہ سے مفت خوروں کے ایک لشکر کی پرورش کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ کسان حکومت کو بھی ایک ایسی مصیبت سمجھتا ہے۔ جس سے اُسے کوئی راہِ گریز دکھائی نہیں دیتی۔ اور اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ حکومت کی سرگرمیوں کا دائرہ جس قدر ممکن ہو سکے تنگ رہے۔[1]

انگلستان کی حالت بھی تقریباً اِسی قسم کی ہے۔ وہاں یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اگرچہ زراعت کو محض اِسلئے نقصان پہنچ رہا ہے۔ کہ پبلک اداروں کے افسروں نے ضروری سہولتیں بہم نہیں پہنچائیں۔ لیکن انتظامی مینوں کی سرگرمیوں کے سلسلے میں کسان نے تقریباً حریفانہ طریقِ عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اگر مالگذاری میں اضافہ کر دیا جائے۔ خواہ یہ اضافہ کسی خدمت کے صلہ میں ہو۔ کسان کو بیحد صدمہ ہوتا ہے۔ وہ اسے ہولناک انگیز تباہی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ مالگذاری زراعت کو بالکل تباہ کر دیگی۔ وہ اِس امر کو بھول جاتا ہے۔ کہ مقامی مجالس نے کسانوں کی کیا کیا خدمات کی ہیں۔ شاید کسی حد تک اس کی وجہ یہ ہو۔ کہ ٹیکس دینے والی آبادی پر نئے جبری محاصل لگا دیئے گئے ہیں۔ لیکن بہت حد تک اس کا سبب یہ ہے۔ کہ مقامی حکام کی کارروائیوں میں دلچسپی[2] نہیں لی جاتی۔ پنجاب کے زراعت پیشہ لوگوں کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں۔ کہ ایک قطعہ اراضی کا اِنتظام

---

[1] انٹروڈکشن ٹو رورل سوشیالوجی (دیہاتی عمرانیات کا تعارف) از ووٹ صفحات ۱۹۱ و ۱۹۲

[2] اگریکلچر اِن آکسفورڈ شائر صفحات ۹۳-۹۴-۲۵ مصنفہ جے آور۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں۔ کہ پنجاب کی طرح آکسفورڈ شائر میں بھی تعلیم پر جس قدر روپیہ لگایا جاتا ہے۔ اسے کسان پسند نہیں کرتا۔ اُسے یہ سمجھانے کے لئے بہت طویل دلائل دینے کی ضرورت ہے۔ کہ مالی حیثیت سے تعلیم پر روپیہ صرف کرنا مفید ہے۔

جسقدر ضروری ہے۔ پورے ضلع کا انتظام بھی اسی قدر ضروری ہے سو یہ بھی فراموش کر جاتے ہیں۔ کہ اصلاح و ترقی کے اکثر ایسے کام بھی ہیں۔ ان کے اور ان کی صنعت کیلئے فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں۔ مقامی محصول مالگذاری کا بہت قلیل سا حصہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسمیں اضافہ کی تجویز کی جائے۔ تو فوراً اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جائینگے۔ خواہ نئی سڑکوں اور دواخانوں وغیرہ کی کیسی ضرورت ہی کیوں نہ ہو اور کسان خود اس ضرورت کو کیوں نہ تسلیم کرتے ہوں۔ اگر غلّہ کی مزید و فروخت کے متعلق سہولتیں بہم پہنچانا منظور ہے۔ اور بُری سڑکوں مویشیوں اور انسانوں کی بیماریوں سے جسقدر دولت ضائع ہوتی ہے۔ اُسے ضائع ہونے سے بچانا مدِ نظر ہے۔ اگر کسان دیہات کی اصلاح کے خواہشمند ہیں۔ تو انہیں مقامی محصول میں اضافہ ناگوار نہیں ہونا چاہئے۔ اِس کے لئے ضروری ہے۔ کہ دیہاتی اقتصادیات کا صحیح علم پھیلایا جائے۔ اور ہم سمجھتے ہیں۔ کہ اگر بالغوں کی تعلیم کا کوئی نظام قائم کیا جائے۔ تو یہ مرحلہ طے ہو جائیگا۔

دنیا کے مختلف ممالک کے زراعتی حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زراعت کی ترقی جسقدر انسانی عنصر پر موقوف ہے۔ اس کا احساس عوام کو نہیں۔ اگر انسان کے کیرکٹر میں نقص ہے۔ تو قدرت کی عطا کی ہوئی قیمتی سے قیمتی نعمتیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ اور اگر انسان اپنے علم و عقل اور قوّت کا استعمال کرے۔ تو بڑی بڑی دشواریاں بھی دُور ہو جاتی ہیں۔ اِس کی صحیح مثال ڈنمارک میں ملتی ہے۔ ڈنمارک قدرتی طور پر ایک مفلس ملک ہے۔ لیکن لوگوں نے ملک کو خوشحال بنانے کی کوشش کی۔ تدبیریں سوچیں۔ ترقی حاصل کرنے کے لئے صحیح راہ اختیار کی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ڈنمارک آج دنیا کے خوشحال ترین ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کسانوں میں بعض ایسی امتیازی اوصاف پیدا ہو گئے ہیں۔ جو دنیا بھر کے کسانوں میں مابہ الاشتراک ہیں۔ کسان محتاط اور سُست ہوتا ہے۔ اُسے تجربہ نے بتایا ہے۔ کہ فطرت کے قوانین سخت ہوتے ہیں۔ ایسے لچکدار نہیں کہ انہیں جسطرح چاہے توڑ مروڑ لیا جائے۔ ماہر سیاست کہتا ہے۔ کہ دولت حاصل کرنے کے طریقے آسان ہیں۔ انسان اُسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ شہر کا باشندہ کتاب کا کیڑہ ہے۔ اُس کا سارا علم کتابوں سے حاصل کیا ہوا ہے۔ وہ اُسے بھی نظرِ اشتباہ سے دیکھتا ہے۔ کسان سمجھتا ہے۔ کہ فصل پیدا کرنے میں اُس کی اپنی قابلیت محنت اور کوشش کا بہت کم دخل

ہے۔ وہ فصل کو فطرت کی فیاضی یا خدا کی مہربانی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اُس پر مصیبتوں کے پہاڑ پھٹ پڑتے ہیں۔ اور اگر وہ دور اندیشی سے کام لیتا۔ تو ان مصیبتوں کی پیش بندی کی جا سکتی تھی۔ لیکن کسان یہ کہہ کر خاموش ہو رہا ہے۔ مشیت ایزدی یونہی تھی۔ خدا کی مرضی۔ جو پبلک سیفٹے اس پر محصول لگا کر اسے خطرات سے بچانا چاہتے ہیں۔ یا رفاہِ عام کیلئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اُن سے بھی ناراض ہے۔ تقریباً ہر ملک میں یہ دیکھا گیا ہے۔ کہ کسان اپنے پیشے کو اس کے حقیقی مرتبہ سے بہت پست سمجھتا ہے۔ وہ محض لوازم معیشت حاصل کرنے کے لئے کھیتی باڑی کرتا ہے۔ اور جب تک اس کی زندگی کی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں۔ وہ کوشش و محنت کر کے زیادہ کمانے سے پس و پیش کرتا ہے۔ لطف یہ ہے۔ کسان بخوبی جانتا ہے۔ کہ وہ مختلف قطعات اراضی میں یکساں پیداوار نہیں ہوتی۔ ایک کسان ایک قطعہ اراضی سے زیادہ پیداوار حاصل کر سکتا ہے۔ اور دوسرا اتنے ہی سے کم۔ یعنی اچھی فصل پیدا کرنے کیلئے کسان کا قابل اور محنتی ہونا ضروری ہے۔ لیکن پھر بھی وہ صحیح طور پر اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کر سکتا۔ ہالینڈ۔ ڈنمارک۔ بلجیم وغیرہ ممالک کے زراعتی حالات کا مطالعہ کیجئے۔ تو آپ کو جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آئیگی۔ وہ ملک کے قدرتی ذرائع ہیں۔ بلکہ یوں کہئے! کہ باشندگانِ ملک کے کیرکٹر کا اثر ہے۔ اس ملک کے باشندوں میں یہی خوبی ہے۔ کہ وہ مشقت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور سختی سے سخت محنت کرنے پر آمادہ ہیں۔ بلکہ وہ ضبط و نظم کی اہمیت کو بھی سمجھتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ سارے ملک کے فائدہ کے لئے ایک شخص کو تکلیف بھی اٹھا لینا چاہیئے۔ اور اُنہیں یہ بھی معلوم ہے۔ کہ زراعت کے لئے دُور اندیشی بہت ضروری ہے۔ وہ مستقبل میں فواید حاصل کرنے کے لئے تکلیفیں اُٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ لیکن زراعت پر نظام حکومت کے اثرات نمایاں حیثیت نہیں رکھتے۔ حکومت زراعت میں مداخلت کرے۔ تو اُسے کامیابی نہیں ہوگی۔ وہ قانون وضع کر کے بعض چیزوں کو ممنوع قرار دے۔ جب بھی فیصلہ کسان کے ہاتھ ہے۔ حکومت اگر کسان کو مدد دینا چاہے۔ تو اس غرض کے لئے ضروری ہے۔ کہ کسان میں بھی حکومت کی اعانت سے فائدہ اُٹھانے کی خواہش موجود ہو۔ حکومت ایسے قوانین تو نافذ کر سکتی ہے۔ جو کسان کی دانست میں مفید ہیں۔ لیکن وہ اُسے ایسے کاموں پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ جنہیں کسان اپنے مفاد کے لئے مضرت رساں سمجھتا

ہے۔ زمین تو ایک آئینہ ہے جمیں کسان کی ہمت و محنت منعکس نظر آتی ہے۔ کسان کو یقین ہے۔ کہ وہ اپنی اراضی کی اِستعداد اور صلاحیّت سے پوری طرح واقف ہے۔ شاید اس کا یہ خیال غلط ہو۔ لیکن چونکہ سالہا سال سے وہ عملی مشکلات کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اِس لئے وہ کسی ایسے شخص پر جو اس جیسا تجربہ نہ رکھتا ہو۔ اعتماد نہیں کر سکتا۔ کسان کی شخصیت زراعتی خوشحالی کا بہت بڑا عنصر ہے۔ اگر زراعت کو ترقی دینا مقصود ہے۔ تو کسان کو ترقی پسند بننے کی تعلیم دینا چاہئے۔ اگر اس سے پہلے زمین کی مناسب طور پر غور و پرداخت نہیں کی گئی۔ تو اب اسکی تلافی کی جائے۔ کوئی قانون کوئی سیاسی انقلاب اِس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا۔ جس طرح ایسے طریقوں پر زور دینا بے سود ہے۔ جنہیں کسان منظور کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اِسی طرح کسانوں کے عجیب و غریب خصائص سیرت پر غور کئے بغیر اُن کے لئے کوئی طریق کار تجویز کرنا غیر مفید ہے۔ اگر زراعت میں کوئی تغیر پیدا کرنا مقصود ہے۔ تو سب سے پہلے کسان کی تعلیم و تربیت کی جانب توجہ کرنا چاہئے۔ حکومت میں نقصان پہنچانے کی غیر محدود صلاحیّت موجود ہے۔ اِس سلسلے میں ہسپانیہ اور ترکی کے نام مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن پنجاب کی طرح حکومت اپنے ذرائع و وسائل کو زراعت کی اِصلاح کا شوق پیدا کرنے اور زمین کے لئے آبپاشی یا دوسری ضروریات مہیا کرنے میں استعمال کر سکتی ہے۔ لیکن اگر حکومت یہ کوشش کرے۔ تو اس سے صرف اتنا ہوگا۔ کہ زراعت کی تباہی میں التوا ہو جائیگا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ حکومت کی مداخلت تباہی کو بالکل روک دے۔ حکومت کی کوششوں سے تو اُسوقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جبکہ کسان بھی اُن کی جانب مناسب[۱] توجہ کرے۔ کسان کا کیرکٹر ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جس پر کامیابی کا دارومدار ہے۔

شہروں کی تحریک

تمام متمدّن ملکوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے۔ کہ شہر دیہات کے طفیل ترقی حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جسپر بہت کچھ بحث[۲] ہو چکی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ آیا

---

[۱] نو آبادیوں میں مذہبی سکھ اس کی مثال مہیا کرتے ہیں۔ (۲ برصفحہ ۴۷)

نقلِ مکان ضرر رساں ہے یا مفید اور اس کا فیصلہ تو اس امر پر موقوف ہے۔ کہ جو لوگ نقلِ مکان کر کے شہروں میں آباد ہو گئے ہیں۔ کون ہیں اور انہیں کن اسباب نے گاؤں چھوڑ کر شہر میں بسنے پر مجبور کر دیا ہے۔ چنانچہ جب آئرلینڈ کے باشندے ہجرت کر کے امریکہ کے شہروں میں جا آباد ہوئے۔ تو اس سے آئرلینڈ کی زراعت کو نقصان پہنچا۔ لیکن جب انگلستان میں یہی تحریک پھیلی۔ اور گاؤں کے باشندے نقلِ مکان کر کے شہروں میں بسنے لگے۔ تو اس سے شہروں کی صنعت و حرفت کو فائدہ پہنچا۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ شاہ رچرڈ ثانی کو بھی اس تحریک نے پریشان کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۳۸۸ء[۲] میں اُس نے ایک قانون نافذ کیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا۔ کہ جو لوگ بارہ سال کی عمر تک زراعت کرتے رہے ہیں۔ شہر کے کارخانوں میں ملازمت حاصل نہیں کر سکتے۔ انہیں زراعت ہی کرتے رہنا[۳] چاہئے۔ چند سال کے بعد پھر اس قانون کو از سر نو نافذ کیا گیا۔ کیونکہ اکثر کسان پارچہ بافی کا کام اختیار کر رہے تھے۔ بعد کے زمانہ میں بھی یہ خیال عام ہو گیا۔ کہ لندن کسانوں کے لئے مصائب کا سرچشمہ ہے۔ کیونکہ نوجوان اور باہمت لوگ گاؤں چھوڑ کر وہاں چلے جاتے ہیں۔ اس سے جو نتائج پیدا ہوئے۔ اُن میں سے ایک نتیجہ تو زمانۂ جنگِ عظیم میں سپاہیوں کے طبی معائنہ سے پوری طرح ظاہر ہو گیا تھا۔ لیکن دوسرا نتیجہ جسے لوگ یاد نہیں رکھ سکتے۔ یہ تھا۔ کہ قطعات اراضی کو ملا کر ایسے بڑے بڑے فارم قائم کئے گئے۔ جن میں کام کر کے ایک کاشتکار اچھی خاصی آمدنی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اپنی زندگی کے معیار کو بھی بلند کر سکتا ہے۔ قطعاتِ اراضی کا یہ باہمی الحاق اس طرح ہوا۔ کہ صنعت و حرفت میں انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ مزدور گروہ در گروہ شہروں میں پہنچ رہے تھے۔ شہروں میں

---

[۱] (بقیہ صفحہ ۴۶ کا) کنسٹرکٹو رورل سوشیالوجی" مصنفہ جلیٹ صفحہ ۹۰۔ نہایت ترقی یافتہ ملکوں میں یہ رجحان ہمہ گیر ہے۔ ہمارے شہروں کی جدید آبادی تمدن کے اس گرداب میں گرفتار ہے۔ جس کا مدار سائینٹیفک اور فنی اصولوں پر ہے۔

[۲] کرٹلر کی کتاب شارٹ ہسٹری آف انگلش ایگریکلچر صفحہ ۶۴۔

[۳] ایضاً صفحہ ۲۰۹۔

مزدوروں کی تعداد بڑھ گئی - تو خوراک کی مانگ بھی زیادہ ہو گئی - اور اشیائے خورونوش خوب فروخت ہونے لگیں[1] - اسطرح یہ ہو سکتا ہے - کہ دیہات کی آبادی میں کمی ہو جائے - تو اس ملک کو نقصان پہنچنے کی بجائے نفع ہو - بڑے بڑے فارم قائم ہو جائیں - اور جو لوگ زراعت کے پیشے سے وابستہ رہیں - ان کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع تر ہو جائے[2] - یہ بھی ممکن ہے - کہ اس تحریک کے نتائج مہلک ہوں - قوم کی جسمانی حالت کو نقصان پہنچے - یا زمین کی کاشت کرنیوالوں کی تعداد کم ہو جائے مزروعہ رقبہ میں بھی کمی واقع ہو[3] - دیہات کے باشندوں کا شہروں میں جا کر آباد ہو جانا اس لحاظ سے بہت مضرت رساں ثابت ہوتا ہے - کہ دیہات کے بہترین دماغ رکھنے والے لوگ شہروں میں چلے جاتے ہیں - اور دیہات کے لوگ ذی استعداد لیڈروں سے محروم ہو جاتے ہیں - دیہات میں جو لوگ زیادہ تعلیم یافتہ اور باہمت ہوتے ہیں - انہیں شہروں کی کشش کھینچ کر لے جاتی ہے - اور جو نوجوان زیادہ قابل باہمت اور سرگرم نہیں ہوتے - دیہات میں رہ جاتے ہیں - اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا - کہ دیہات استعداد و قابلیت کے اعتبار سے زوال پذیر ہو جائیں گے - جدید علم زراعت کے لئے عقل و دانش اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم ضروری ہے - اس صنعت کے مستقبل کی نسبت اگر کوئی امید ہے - تو یہی - کہ پرانے مسائل کی گتھیاں سائنس کے ناخن تدبیر سے سلجھائی جائیں - کسی زراعتی ملک کی خوشحالی کے لئے یہ بیحد ضروری ہے - کہ یا تو کسان خود سائینٹیفک طریقوں کا علم رکھتے ہوں - یا جن لوگوں کو ان طریق سے واقفیت ہو - وہ انکی پوری پوری رہنمائی کریں - کوئی صنعت اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی - جب تک اس پر عقل اور تدبیر صرف نہ کی جائیں - اور صرف زراعت پیشہ طبقہ ہی نہیں - بلکہ سارے ملک کے

---

[1] کرٹلر صفحہ ۱۶۲!

[2] کرٹلر کنسز کٹھ رورل سوشیالوجی - صفحہ ۹۵ -

[3] کارور کی کتاب "پرنسپلز آف رورل اکنامکس" صفحہ ۷۴-۷۵ - دیہات سے نقل مکان کرنے کا نتیجہ یہ ہوا - کہ کھیتی باڑی کا پیمانہ کم ہو جانے کے بجائے متوسط درجے کی حالت میں رہا ہے - یہ تحریک حوصلہ افزائی کے قابل ہے - اور دیہات میں اعلیٰ معیارِ زندگی قائم رکھنے کا واحد ذریعہ ہے -

مفاد کا تقاضا ہے۔ کہ آج جدید معیارِ علم اور زراعت کی خاص قابلیت کے استعمال میں مخل نہ برتا جائے۔ اگر وہ مزدور جن کی نہ تو دیہات میں ضرورت ہے۔ اور نہ وہ زراعت کی قابلیت رکھتے ہیں یا وہ کسان جن کی اراضی سے کوئی اِقتصادی نفع حاصل نہیں ہو سکتا شہروں میں چلے جائیں۔ اور وہاں کسی منفعت بخش صنعت میں مصروف ہوجائیں۔ تو شہری تحریک مفید ہوسکتی ہے۔ لیکن موجودہ صورت میں اس سے قومی خوشحالی کی بنیاد کو تباہی کا خطرہ ہے کیونکہ جب ملک کی اہم ترین صنعت غیر تعلیمیافتہ لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائیگی۔ تو یہ خطرہ ضرور دامنگیر ہوگا۔ یہ امر بھی حیرت انگیز ہے۔ کہ تعلیم یافتہ لوگ جن میں اکثر دراصل دیہات میں پیدا ہوئے ہیں۔ زراعت میں کوئی نمایاں عملی دلچسپی نہیں لیتے[۲]۔ اس اہم صنعت کیجانب لوگوں کی توجہ منعطف کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق شہر کے اُن باشندوں کا جو کسی دوسری جگہ پیدا ہوئے ہیں۔ حسب ذیل تناسب ہے۔

---

[۱] پرنسپلز آف رورل اکنامکس مصنفہ کارور صفحہ ۲۰۰۔ بال کی کتاب "ایگریکلچر آفٹر وار" صفحہ ۹۴۔ آرمن کی کتاب "پلیس آف ایگریکلچر ان انڈسٹری" (صنعت و حرفت میں زراعت کا مرتبہ) اور مسٹر فری منٹل کا پمفلٹ۔ مسٹر روز بنٹری کے نزدیک یہ امر کہ بلجیم کے مزارعین انگریز مزارعین سے زیادہ لگان ادا کرتے ہیں۔ انگلستان میں درحقیقت نتیجہ ہے۔ اِس چیز کا۔ کہ کہ زیادہ عقلمند زراعت پیشہ مزدور شہروں میں چلے آتے ہیں۔ اور کسان کے پاس ادنےٰ درجہ کے مزدور رہ جاتے ہیں۔ دوسری جانب بلجیم میں کسان خود کھیتی باڑی محنت کرتا ہے۔ اور زیادہ عقل و دانش اور کام کرنے کی خواہش کے طفیل اپنی محنت کے ثمرات سے پوری طرح بہرہ یاب ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو "سبز فرام بلجیم" (بلجیم سے سبق) صفحہ ۱۵۰۔

[۲] اِس حقیقت کے بیان سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے۔ کہ انہیں قابلِ ملازمت قرار دینا مقصود ہے۔ شہر کے تعلیم یافتہ باشندے اپنی بے التفاتی کے حق میں دلائل پیش کر سکتے ہیں۔ وہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ انہیں موقع نہیں ملا۔ کوئی تنظیم نہیں۔ کوئی رہنما نہیں ملتا۔ وہ اپنی مصیبتوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ یا دیہاتی مسائل کا مطالعہ کرنے کے لئے آسانیاں میسر نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت پھر بھی حقیقت ہے۔ کہ شہروں کے تربیت یافتہ اہل دانش کو زرعی مسائل کی جانب توجہ کرنا چاہیئے۔

	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء	
دہلی	۳۶	۴۸	فیصدی
امرتسر	۲۰	۲۲	فیصدی
انبالہ	۴۳	۴۵	فیصدی
سیالکوٹ	۲۰	۳۵	فیصدی
لاہور	۴۳	۵۴	فیصدی
ملتان	۲۶	۲۰	فیصدی
جالندھر	۱۸	۳۹	فیصدی
فیروزپور	۴۹	۵۲	فیصدی

اِن اعداد سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ موجودہ شہری تحریک کس قدر وسیع ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو بڑے بڑے شہروں کی آبادی کم ہوتی جاتی۔ کیونکہ سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۱۱ء تک شرح پیدائش ۴۴.۴ تھی۔ اور شرح اموات ۴۴.۲۹ مجموعی شہری آبادی میں جو تخمیناً ۸۰۰۰۷۱۱۲ ہے' شرح پیدائش اور شرح اموات کا فرق اِتنا ضرور ہے۔ کہ ہر سال تیرہ ہزار نفوس کی کمی ہو جائے۔ اور اگر پیدائش و موت کی شرح مستقل طور پر یہی رہے۔ تو ضروری ہے۔ کہ ہر سال تیرہ ہزار اشخاص دیہات سے نقلِ مکان کر کے شہر میں آباد ہو جائیں تاکہ شہر کی آبادی جوں کی توں رہے۔ اور اگر اِس سے زیادہ لوگ نقلِ مکان کر کے شہر میں آباد ہوں۔ تو شہر کی آبادی بڑھ جائے۔ دیہات سے نقلِ مکان کر کے شہر میں آباد ہونے والے تین گروہ ہیں۔ مزدوری پیشہ لوگ۔ جو زراعت کے فن میں پوری مہارت نہیں رکھتے۔ تاجروں کے لڑکے۔ اور تعلیم یافتہ نوجوان۔ نقلِ مکان کرنیوالوں میں ایسے کسان بہت کم ہیں جو اراضی کے مالک بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ کسانوں کی اراضی میں اجتماعی حیثیت سے کوئی توسیع نہیں ہوئی۔

سب سے بڑا نقص تو یہ ہے۔ کہ زراعت مسلسل و پیہم ہوشمند اور باہمت نوجوانوں کی اعانت سے محروم ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کے دِل میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے

کہ کھیتی باڑی میں انہیں اپنی علمی قابلیت کے جوہر دکھانے کا کافی میدان نہیں مل سکتا۔ کھیتی پر محنت کرنے کو وہ خلافِ شان تصوّر کرتے ہیں۔ اور یہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ کہ شہر میں کہیں کلرک ہو جانا اُن کے مستقبل کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ حالانکہ بہت کم ایسے نوجوان ہیں۔ جو کلرک بنکر کوئی اِمتیازی اور نمایاں حیثیت حاصل کرتے ہیں۔ یہ بہت حد تک صحیح ہے۔ کہ پنجاب کی زراعت ایک ایسے مرحلے سے گذر رہی ہے۔ جب کہ اُسے علم اور دانشمندی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا جا سکتا۔ لیکن اِس کی وجہ بھی تو یہی ہے۔ کہ ابھی تک علمی قابلیت اور عقل سے زراعت کو فائدہ پہنچانے اور زیادہ سائینٹیفک طریقے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ اگر زراعت سائینس کے اصولوں پر کی جاتی۔ تو نہ صرف کسان کو اپنی قابلیّت دکھانے کا موقع ملتا۔ بلکہ اس سے بہت کافی نفع بھی ہوتا۔ تعلیم یافتہ آدمیوں کو اس حرفت سے وابستہ رکھنے کے لئے ان پر یہ ثابت کر دینا ضروری ہے[1]۔ کہ زراعت دوسری صنعتوں سے کم منفعت بخش نہیں۔ اور جس طرح شہر کی زندگی میں ایک بااستعداد شخص کے لئے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ہے۔ اِسی طرح ایک قابل شخص اِس صنعت سے وابستہ رہ کر بھی ترقی اور عروج کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ اِس سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے۔ کہ دیہات کی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کی جائیں۔ اُسے زیادہ دلچسپ بنایا جائے۔ پرانی رسوم اور قدیم قواعد میں زندگی کی نئی رُوح پھونک دیجائے۔ یا ان کی بجائے نئے قواعد رائج کئے جائیں۔ بقول مسٹر کیٹنگز ایک ایسے ملک میں جس کی آبادی کے اِس قدر بڑے حصہ کا دارومدار صرف زراعت پر ہو۔ یہ ضروری ہے۔ کہ حکومت کسانوں کے سود و بہبود کی خاطر قوانین وضع کرے۔ اور اس کے اِنتظامی صیغوں کی سرگرمیوں کا بیشتر حصّہ بھی کسانوں کی فلاح پر صرف ہو۔ زراعت کا مفاد باشندگانِ ملک کے مفادِ عمومی سے الگ نہیں۔ کیونکہ اکثر لوگ زراعت اور اراضی سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتے ہیں[2]۔

---

[1] پرنسپلز آف رورل اکنامکس مصنفہ کارور صفحہ ۱۰۴۔ کرٹلر یڈ کوآپریشن اینگ فارمرز (کسانوں میں امداد باہمی) صفحات ۱۰-۱۱۔

[2] رورل اکانومی اِن بمبئی دکن۔ صفحہ ۱۸۱۔

نئی ریفارم اسکیم کے مطابق سیاسی قوت گاؤں کے رائے دہندگان کے ہاتھ میں ہوگی - اور جو لوگ یہ چاہتے ہیں - کہ کسان اُن کے حق میں ووٹ دیں - انہیں اپنی قابلیت کے متعلق کسان کو اطمینان دلانا پڑیگا - کسان عام سیاسی جماعتوں اور انکی امتیازی خصوصیات کی چنداں پروا نہیں کرتے - لیکن جہاں کوئی ایسا مسئلہ آتا ہے - جو عملاً ان کے کام اور پیشہ پر اثر انداز ہوتا ہے - تو وہ بہت دور اندیش بن جاتے ہیں - شاید نیا نظام حکومت تعلیم یافتہ لوگوں میں دیہاتی اقتصادیات کے متعلق ایک جوش اور ولولہ پیدا کر دے - اور وہ آپس میں گفتگو کرتے وقت اُن اقتصادی مسائل پر بحث کیا کریں - جنہیں فوری طور پر جامۂ عمل پہنانے کی ضرورت ہے - اِمداد باہمی کی تحریک دیہاتی زندگی میں روح پھونکنے کا ایک اور بڑا ذریعہ ہے - یہ دیہات میں جدید انجمن قائم کر رہی ہے - تحریک مذکور کا مقصد یہ ہے - کہ زراعت کے سلسلے میں جس قدر مرحلے طے کرنا پڑتے ہیں - وہ سب کے سب کسان کے پیشِ نظر رہیں - سامانِ کشاورزی کی خرید سے پیداوار کی فروخت تک تمام امور کا انتظام وہ خود کرے - اِس تحریک کا اصل مدعا یہ ہے - کہ کسان کو اپنی صنعت کے تجارتی پہلو سے دلچسپی پیدا ہو - اور اسے یقین ہو جائے - کہ اگر اُس نے راہ میں ترقی کا کوئی قدم آگے بڑھایا - تو اس سے اسے پوری پوری مالی منفعت حاصل ہو گی - تحریک اِمداد باہمی شرح سود میں کمی کر کے زراعت کی اِصلاح و ترقی کے کام کو منفعت بخش بنا رہی ہے' اس نے ضروریاتِ زندگی کو ارزاں کر دیا ہے - اور اب یہ ممکن ہو گیا ہے - کہ کسان سابقہ مصارف زندگی پر بلند معیار کی زندگی بسر کر سکے - اجناس کو گراں سے گراں قیمت پر خریدنے والی منڈیاں بہم پہنچا کر اس نے کاشتکاروں کے لئے ترقی کا میدان مہیا کر دیا ہے - سب سے بڑی بات تو یہ ہے - کہ جن لوگوں کو فطرت نے لیڈر بننے کی استعداد بخشی ہے - انہیں یہ تحریک صفِ اوّل میں لے آئے گی - اور اب بھی لا رہی ہے' ابھی تک اس تحریک کے نتائج پر اتنی توجہ نہیں کی گئی - جس کے وہ فی الواقع مستحق ہیں' لیکن گاؤں کی زندگی میں اُن تعلیم یافتہ اور سرگرم نوجوانوں کا داخل ہونا جو اقتصادی آزادی اور اقتصادی ترقی کا ایک نیا درس دے رہے ہیں - اور کسانوں کو وہ علم بخش رہے ہیں؛

جو انہوں نے دوسرے زراعتی ممالک کے وسیع مطالعہ سے حاصل کیا ہے۔ اس قدر ہمہ گیر اور دور رس اثر کریگا۔ کہ ایک زمانہ میں بے حس سے بے حس شخص بھی اس مسئلہ سے بے اتفاقی نہیں برت سکے گا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ شہری تحریک اگر زاید از ضرورت دیہاتی مزدوروں کو اپنی جانب کھینچ لے۔ تو اگرچہ جرائم۔ بداخلاقی۔ اور صحت کی خرابی میں اضافہ ہو جائیگا۔ کیونکہ یہ چیزیں شہری زندگی کا لازمی جزو بن چکی ہیں تاہم صوبہ کو اس سے فائدہ پہنچیگا۔ دانشمند اور تعلیمیافتہ لوگوں کو شہروں میں آباد ہونے کے بجائے دیہات کیجانب رُخ کرنا چاہیئے تاکہ صوبہ کی وسیع دولت سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے[۱]۔

دیہاتی تعلیم

یہ تو ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ صوبہ کی موجودہ اور آئندہ دولت کا سرچشمہ صرف اراضی ہے۔ اگر اراضی مناسب غور و پرداخت کیجائے۔ تو اس سے اِس قدر دولت پیدا ہوگی جو ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔ اور اگر اس کی اِصلاح و ترقی کے لئے سائینٹیفک طریقے استعمال کئے جائیں۔ تو اس سے اس قدر نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ جو برابر بڑھتا چلا جائے گا۔ لیکن صوبہ کی قابل زراعت اراضی کا رقبہ محدود ہے۔ اِس لئے اگر زیادہ دولت پیدا کرنا ہے، تو

---

[۱] سرجیمز ولسن نے ۱۹۱۰ء میں رائل اکنامک سوسائٹی کے سامنے "پنجاب کی جدید اقتصادی ترقیات" کے موضوع پر جو مقالہ پڑھا تھا۔ اُس میں انہوں نے لکھا تھا۔ "مغربی ممالک کے برعکس پنجاب میں یہ عام رجحان نہیں پایا جاتا۔ کہ دیہات کے باشندے نقل مکان کر کے شہروں میں آباد ہو جائیں۔ کیونکہ دیہاتی آبادی کا تناسب گذشتہ تین مردم شماریوں میں ۱۸۷۰ - ۸۸۸۸ اور ۸۸۸۸ رہا ہے"۔

"گویا زراعت اِس قدر کامیاب صنعت ثابت ہوئی ہے۔ کہ دیہات کے باشندے اُسے ترک کر کے شہروں میں آباد ہونا نہیں چاہتے"۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہ رجحان موجود ہے۔ اور خاص طور پر ان لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ جنہوں نے کسی قدر تعلیم حاصل کر لی ہے۔

اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ دانشمندانہ طریق پر زیادہ سے زیادہ سرمایہ صرف کیا جائے۔ سرمایہ کے استعمال سے فائدہ اٹھانے کے لئے بہت استعداد اور ہمت کی ضرورت ہے۔ اِس سے ثابت ہوا۔ کہ زراعت پیشہ طبقہ کی ہمت اور استعداد کو ترقی دینا صوبہ کے لئے بڑی اقتصادی اہمیت رکھتا ہے[1]۔ اِس حد تک سب متفق ہیں۔ لیکن جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ تو اختلاف آرا کی کافی گنجائش نکل آتی ہے۔ ایک امر جو تقریباً دنیا کے ہر ملک میں شہرت اختیار کر چکا ہے۔ یہ ہے۔ کہ کسانوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ اُسے پسند نہیں کرتے۔ دوسری بات، جسے ماہرین تعلیم کے سوا سب تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ہے۔ جس قسم کی تعلیم کسان کو دی جاتی ہے۔ وہ اس کے لئے موزوں نہیں۔ تیسرا امر جسے عملی طور پر بہت اہمیت حاصل ہے۔ کہ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا۔ کہ کسانوں کے لئے کس نوع کی تعلیم موزون و مناسب ہو سکتی ہے۔ یا بحث و اختلاف سے بچنے کے لئے یہ کہنا زیادہ موزوں و مناسب ہوگا۔ کہ ابھی تک عام طور پر تسلیم نہیں کیا گیا کہ کس قسم کی تعلیم اُن کے لئے موزوں ہے۔ اِس سلسلے میں بہت کچھ نکتہ چینی ہو چکی ہے۔ کیونکہ ہر ملک کے صاحبِ فکر لوگوں کے نزدیک کہ کسانوں میں یہ پورا پورا احساس پیدا کرنا ضروری ہے۔ کہ اگر سائینٹیفک طریقِ زراعت نے تیزی سی ترقی کی۔ تو ترقی اور جلبِ منفعت کے امکانات کا دائرہ کس قدر وسیع ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر اقتباسِ ذیل ملاحظہ فرمائیے۔

"اگر ہم موجودہ زمانے کے سائینٹیفک علم کو حاصل کرنا۔ اور زمین سے بقدرِ امکان زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ تو یہ ضروری ہے۔ کہ ہم کاشتکاری کے تمام طریقوں میں تبدیلی کر دیں۔ لیکن زراعت کے لئے سب سے زیادہ مناسب تعلیم ضروری ہے۔

---

[1] صرف اسی صوبہ کے لئے نہیں۔ بلکہ دنیا کے ہر ملک کے لئے برطانیہ عظمےٰ میں زراعت کی مناسب ترقی میں جو چیزیں حائل ہیں۔ ان میں یہ چیز بھی ہے۔ کہ زراعت پیشہ لوگ زراعت کی تعلیم فن کے اعتبار سے حاصل نہیں کرتے۔ (ملاحظہ ہو وہ شہادت جو زراعت کے شاہی کمیشن کے سامنے ۱۹۱۹ء میں دی گئی تھی۔)

جس کی بدولت پیداوار کو فنی حیثیت سے فائدہ پہنچیگا - اگرچہ ہمارے ملک کی تمام آبادی
کھیتوں میں کام کرتی ہے - تاہم صاف بات تو یہ ہے - کہ ہمارے ہاں ابھی تک قابلِ
ذکر زراعتی تعلیم مفقود ہے - اِس امر پر بحث ہو چکی ہے - کہ زراعتی علاقہ میں چند مکتب
قائم کئے جاتے - جہاں عملی تجربات سے زراعت کی تعلیم دی جائے - لیکن ابھی تک ایسے
مکتب موجود ہیں - ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم نامکمل اور اقتصادی زاویہ نگاہ سے غیر مفید ہے
ہمارے اسکولوں میں طلبار کو صرف ملازم بننے یا دوسرے پیشے اختیار کرنے کی تعلیم دی
جاتی ہے - انہیں مفید باتیں نہیں سکھائی جاتیں - کسی آزاد پیشہ اور عملی زندگی اختیار
کرنے کے قابل نہیں بنایا جاتا - اِس امر کی اشد ضرورت ہے - کہ ہمارے ملک میں
خاص زراعتی تعلیم کا انتظام کیا جاتا - اور زراعت اور صنعت و حرفت کے لئے طیار
کیا جائے - لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک کے حکام اِس بات کو کماحقہٗ نہیں
سمجھ سکتے"۔

یہ اقتباس سَرویا[1] سے متعلق ہے - پنجاب سے اس کا کوئی تعلق نہیں - لیکن اِسمیں
جو باتیں بیان کی گئی ہیں - وہ حیرت انگیز صحت سے پنجاب پر منطبق ہوتی ہیں - سَرویا ایک

---

[1] "سَرویا بائی سرویینز" مرتبہ اے - سٹیڈ صفحہ ۲۴۵ - جاپان کے متعلق ڈبلیو - ایم - میک گوورن اپنی کتاب "جاپان جدید" میں لکھتے ہیں - کہ حکومت کو یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے - کہ نوجوان عام باتوں کی نسبت اِدھر اُدھر کی معلومات رکھتے ہیں - جو نہ تو اُن کے کام آسکتی ہے - اور نہ اُن کے ملک کے لئے مفید ہو سکتی ہے - ہندوستان میں جو تعلیم پائی جاتی ہے - وہ لوگوں کو ڈاکٹر - وکیل - یا اخبار نویس بنا دیتی ہے - جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے - کہ اکثر لوگ پولیٹکل ایجی ٹیٹر بن جاتے ہیں - جاپان کے اسکولوں میں بھی خاص مضامین کی تعلیم دیجاتی ہے - شہروں میں تجارت اور بک کیپنگ کی ابتدائی تعلیم دیجاتی ہے - صنعتی علاقوں میں صنعت و حرفت کے متعلق معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں - انجنیئری کی تعلیم دیجاتی ہے - زرعی علاقوں میں ہمیں بتایا جاتا ہے - کہ زمین کی کاشت کیونکر کیجائے - جو علاقے ساحلِ بحر کے قریب واقع ہیں - وہاں مچھلی پکڑنے کے سائنٹیفک طریقے سکھائے جاتے ہیں - لڑکیوں کو ہر جگہ کھانا پکانے اور سینے پرونے کی تعلیم دیجاتی ہے - بلکہ اکثر ریشم کے کیڑے پالنے کے متعلق ابتدائی باتیں بتائی جاتی ہیں" - اس اقتباس میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں - اُنسے عام اتفاق رائے نہیں کیا جائیگا - اور انہیں غیر جانبدارانہ خیالات نہیں سمجھا جائیگا -

ایسا ملک ہے۔ جس سے پنجاب کئی مفید سبق سیکھ سکتا ہے۔ اور پھر دوسرے ممالک کے حالات سے بھی اِس نوع کے سبق آموز اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ موجودہ نظامِ تعلیم کے متعلق یہ شکایت تقریباً عالمگیر ہے۔ کہ اسے شہر کے لوگوں نے بنایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ اِس نظامِ تعلیم کو وضع کرتے وقت یہ مقصد پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کہ دیہات کے نوجوان اِس سے متاثر ہو کر شہروں میں جا آباد ہوں۔ اسے دیہات کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ دیہاتی زندگی سے اِس قدر الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ کہ دیہات کے اکثر طلباء اِس میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے۔ اور اُن میں سے جو زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔ وہ یہ سمجھ کر کہ انہوں نے جو کچھ پڑھا ہے۔ دیہات میں کسی کام نہیں آسکتا۔ شہری زندگی میں اپنے علم سے فائدہ اُٹھانے کا موقع تلاش کرتے ہیں۔ گاؤں کا سکول ماسٹر اپنی جماعت کے سب سے زیادہ ذہین اور ہوشیار لڑکوں کو یہ تعلیم نہیں دیتا۔ کہ وہ گاؤں میں رہیں۔ بلکہ انہیں ہائی سکول میں بھیجنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو آبادی کے بڑے بڑے مرکزوں میں واقع ہیں۔ یہ ہائی اسکول اُن کی توجہ دیہات کی جانب سے ہٹا دیتے ہیں۔ اور اُن میں ایسے پیشے اختیار کرنے کا ولولہ پیدا کر دیتے ہیں۔ جن میں کم مشقت صرف ہوتی ہے صرف پنجاب میں ہی کالجوں کے لڑکے ہل چلانے کو ناپسند نہیں کرتے[1]۔ اور صرف اِسی سرزمین میں اسکولوں پر یہ الزام نہیں لگایا جاتا۔ کہ اسکولوں کی فضا دیہاتی زندگی کی صحیح روح کے قطعاً مخالف ہے۔ بلکہ ہر جگہ یہی دکھائی دیتا ہے۔ کہ اسکول طلباء میں زراعت کے خلاف ایک چھپی ہوئی نفرت یا کم از کم بے اعتنائی کا جذبہ پیدا کر دیتے ہیں سو نوجوانوں کے دماغ ہر ملک کی سب سے بڑی منفعت بخش حرفت کے وقار اور اہمیت کا نقش نہیں بٹھا سکتے۔ انہوں نے نوجوانوں میں یہ ولولہ نہیں پیدا کیا۔ کہ وہ جس اضلاع کے باشندے ہیں۔ اُنکی اصلاح و ترقی میں اپنی زندگی، قوت و ہمت صرف کرنا اُن کا فرض ہے۔ اُنہوں نے طلباء میں زراعتی ترقی کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے اکثر موقعے کھو دیئے ہیں۔ اُنہوں نے

---

[1] رورل لائف پرابلمز آف یونائیٹڈ اسٹیٹس۔ ریاستہائے متحدہ کی دیہاتی زندگی کے مسائل صفحہ ۱۳۱۔ امریکن ایویڈنس (امریکہ کی شہادت) باقی بر صفحہ ۵۷

طلباء کو یہ نہیں بتایا۔ کہ زراعت ایک ایسا پیشہ ہے۔ جس میں اصلاح و ترقی کا میدان بہت وسیع ہے۔ اور اگر انسان اُسے ترقی دینے کی کوشش کرے۔ تو اُس کی سعی بہت جلد بار آور ہوگی۔ اور اس بارہ میں کوئی دوسرا پیشہ اس سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اسکولوں کے اساتذہ اور عملہ کے اعلیٰ ارکان کی غفلت کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ صوبہ کی اِس سب سے بڑی صنعت سے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی جاتی۔ جہاں زراعت پستی کی حالت میں ہے۔ وہاں تعلیم کی حالت بھی ویسی ہے۔ ایک مرتبہ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ سائنٹیفک طریقوں سے زراعت کو ترقی دینا ضروری ہے۔ تو دیہاتی تعلیم کا مسئلہ بھی آسانی سے حل ہو سکے گا۔ انگلستان میں تو زیادہ تر تعلیم اِس مقصد کیلئے پھیلائی گئی۔ کہ جن لوگوں کو فراغت اور فرحت حاصل ہے۔ وہ تعلیم حاصل کریں۔ اسے ترقی بھی ہوئی۔ تو اسی حیثیت سے یعنی اس سے فارغ البال لوگوں کی تربیت کا کام لیا گیا۔ اور عہد جدید کی زندگی میں اگرچہ باہمی مقابلہ کی گرم بازاری روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ تاہم تعلیم کا مقصد صرف یہی سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں کے دماغ کی جلا اِس طرح کی جائے کہ وہ اپنے ہم چشموں سے اچھی طرح میل جول کر سکیں انگلستان کے پبلک اسکول اور پرانی وضع کی یونیورسٹیاں ان لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لئے تو بینظیر ہیں جنہیں دوسروں کے بل پر زندگی بسر کرنا یا لوگوں کی رہنمائی یا ملک کا انتظام کرنا ہے۔ لیکن یہ تعلیم اُن لوگوں کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔ جنہیں فطرت کی قوتوں پر قابو پانا اور انکی رہنمائی کرنا ہے۔ بقولِ پروفیسر کارور۔ وکیل۔ ایکٹر۔ واعظ۔ معلم یا تجارت پیشہ لوگوں کا سب سے بڑا کام باتیں کرنا ہے یا اُنکی کامیابی کا دارومدار فطرتِ انسانی کا مطالعہ کرنے پر باقی سب لوگوں کی کامیابی اشیاء کی ہیئتِ ظاہری اور اُن کے اجزائے ترکیبی و خواص کا علم حاصل کرنے

(۵۶ صفحہ کا بقایا) الیف۔ ای گرین کی "اویکنگ آف انگلینڈ" (انگلستان کی بیداری) مزید ان ڈبلیو۔ ایچ ۔ ولسن کی "ایوولیوشن آف کنٹری کمیونٹی" (دیہاتی جماعت کا ارتقا) صفحہ ۹۶۔ فرانسیسی فلسفی ڈیمالن نے لکھا ہے کہ اینگلوسیکسن قوموں کے اقتدار اور تفوق کی وجہ یہ ہے۔ کہ اِن اقوام کی زراعت اور تعلیم سے محبت ہے۔ امریکہ والوں میں یہ دونوں جذبات موجود ہیں اور ان دونوں میں سے تعلیم کی محبت کا جذبہ قوی تر ہے جس جماعت میں تعلیم کی کمی ہے۔ اُس میں تنظیم نہیں رہ سکتی۔

اور اس علم کو صحیح استعمال کرنے کی قابلیت پر منحصر ہے[1]۔

کسان سے زیادہ علم اور قابلیت کسی کے لئے ضروری نہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ باشندگان صوبہ کے مادی خوشحالی کے ایک بلند سطح پر پہنچ جانے کو ہم اپنا اقتصادی نصب العین قرار دے چکے ہیں۔ اس لئے یہ سوال کہ فرصت کے اوقات کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ انہی لوگوں سے تعلق رکھتا ہے جنہیں فرصت کے اوقات نصیب ہو سکتے ہیں۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ تعلیم سے ایک خاص معیار قابلیت کا قانون دان۔ معلم اور کلرک تو پیدا ہو سکتا ہے لیکن ایک با استعداد کسان کا پیدا کرنا ایسا ہی مشکل ہے۔ جیسا مکمل ترین معلم کا پیدا کرنا۔ یہ یاد رہے کہ زراعت اس صوبہ کی سب سے بڑی اور سب سے اہم صنعت ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ اور اراضی جدید دولت کا سب سے بڑا اور سب سے اہم ذریعہ ہے جس کی دولت کبھی ختم ہونے میں نہیں آئیگی۔ اور اگر کوئی صحیح تعلیمی نظام قائم کیا گیا۔ تو صرف ان باتوں کا خیال ہی نہیں رکھا جائیگا۔ بلکہ اس کی بنیاد انہیں باتوں پر ہوگی۔ زراعت سے تعلیم کا جتنا قریبی تعلق ہوگا۔ کسان کا لڑکا اپنے آبائی پیشہ میں اتنی ہی زیادہ عملی دلچسپی ظاہر کریگا۔ اس قسم کی تعلیم میں جس قدر آزادی دیجائیگی۔ جتنا فیاضانہ برتاؤ کیا جائیگا۔ اقتصادی مسائل کے حل میں اُسی قدر زیادہ مدد ملیگی۔ اس سلسلہ میں یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسانوں کے خیالات اور رجحانات کا علم یا انہیں قابو میں رکھنے کی قوت وطاقت بڑے بڑے زمینداروں یا اُن لوگوں کے لئے تو بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جن کے ہاں بہتیرے نوکر چاکر ہیں۔ لیکن چھوٹے چھوٹے مالکانِ اراضی کے نزدیک اسے چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ اگر ایک آوارہ گرد شخص انسان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہو۔ تو وہ بھی زمین کی زرخیزی سے فائدہ اُٹھا کر اس پر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا صوبہ جس میں چھوٹے چھوٹے کسان اراضی کے مالک ہوں،

---

[1] پرنسپلز آف رورل اکنامکس صفحہ ۱۲۔ یہ اقتباس نقل کرنے سے نظامِ تعلیم پر حملہ کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ ہم اس دلیل کو تقویت دینا چاہتے ہیں کہ نوعِ انسان کا مطالعہ انسان کے لئے بہترین مطالعہ تو ہے۔ لیکن کسان کے لئے مفید ترین آلہ کا کام نہیں دے سکتا۔

اپنے دامن میں بالکل جداگانہ حیثیت کے مسائل پنہاں رکھتا ہے۔ کونسلوں کے ارکان اور قانون دانوں کی ضرورت سے کس کو انکار ہے۔ ان لوگوں کی ضرورت تو ہمیشہ رہیگی۔ لیکن ایسا نظامِ تعلیم نہیں ہونا چاہیئے۔ جس کا مقصد محض ایسے لوگ پیدا کرنا ہو۔ یہ بتانا آسان نہیں کہ نظامِ تعلیم کیسا ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم وثوق اعتماد کے ساتھ اس کے متعلق چند عام اصول بیان کر سکتے ہیں یعنی نظامِ تعلیم کم از کم ایسا ہو۔ کہ انسان کو فطرت پر جو قابو حاصل ہے' اسے نوجوان پوری طرح محسوس کریں۔ اور یہ جان لیں۔ کہ ترقی جبھی ہو سکتی ہے۔ کہ انسان میں فطرتی قوتوں کو قابو میں لانے اور ان کے استعمال سے فائدہ اٹھانے کی قوت بڑھتی چلی جائے۔

جہاں اِفلاس کا دور دورہ ہو۔ وہاں تعلیم نوجوانوں کے دماغ پر کم از کم یہ تو نقش کر دے۔ کہ افلاس کو تموّل میں تبدیل کرنا ممکن ہے۔ تعلیم کا یہ کام نہیں۔ کہ طلبار کو محض گذرے ہوئے زمانہ کے بھولے بسرے قصّے سناتی رہے۔ خواہ زمانہ ماضی عظمت و شوکت کے واقعات سے معمور ہو یا سر تا سر نکبت و ادبار۔ کیونکہ افلاس زدہ ملکوں کو زمانہ ماضی کی داستانوں سے بیحد نقصان پہنچا ہے۔ تعلیم کو نوجوانوں کے دل میں قوی امید پیدا کر دینا چاہیئے۔ کہ اِنسان اگر کوشش و محنت کرے۔ تو اُس کا مستقبل شاندار بن سکتا ہے۔ اسے طلبار کی توجہ اِس طرف منعطف کرانا چاہیئے۔ کہ سکول کی چار دیواری سے باہر نکل کر ان کے سامنے ایک وسیع میدانِ عمل ہے۔ انہیں ترقی کے بڑے بڑے موقع حاصل ہیں۔ اور یہ ضروری ہے۔ کہ قوم اِن موقعوں کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔ اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ طریقِ تعلیم میں یہ قوت ہونا چاہیئے۔ کہ وہ لوگوں کو علم حاصل کرنے پر آمادہ کر دے۔ تعلیم خواہ جبری ہو جائے۔ یا اختیاری رہے۔ وہ کم از کم ایسی ہونا چاہیئے۔ کہ دیہاتی طلبار کے والدین اُسے پسند کر سکیں۔ تہذیب و تمدّن کا پھیلنا اور جبری تعلیم کا نفاذ تو باہم لازم و ملزوم ہیں۔

جبری تعلیم سے صرف انہیں ملکوں میں فائدہ ہو سکتا ہے۔ جو تہذیب و شائستگی کے میدان میں بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور پنجاب ابھی اِس منزل تک نہیں پہنچا۔ کہ یہاں طلبار کے والدین کی عملی اعانت کے بغیر جبری تعلیم رائج کر دی جائے۔ کھتری اپنے لڑکے کو اِس لئے سکول میں بھیجتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ لڑکے کو تعلیم دلوانے سے اُسے فائدہ ہوگا۔

لڑکا تعلیم حاصل کرکے ملازمت کے لائق تو ہو جائیگا - خواہ اُسے کلرک کی اسامی ہی ملے۔
جو لوگ تعلیم کے متعلق ایک بلند نصب العین پیش نظر رکھتے ہیں - وہ اس سلسلہ میں خواہ کچھ کہیں
حقیقت یہ ہے - کہ لوگ اسی وقت اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں جب اُنہیں معلوم ہو جائے
کہ ان کے نو نظر بالغ ہونے کے بعد اِس تعلیم سے کوئی فائدہ حاصل کرینگے - زمیندار کا لڑکا سکول
جاتا ہے - تو محض اِس لئے کہ وہ حکومت کی ملازمت حاصل کر لیگا - اِس لئے نہیں - کہ تعلیم
اُسے اچھا زمیندار بنا دیگی - تعجب ہے - کہ لوگوں میں اکثر چرچا ہوتا رہا ہے کہ کسی خاص صنعت
کی تعلیم دینا طلبا رکے خیالات کو محدود کر دیگا - اِس مسئلہ پر اکثر خامہ فرسائی بھی کی گئی ہے
لیکن یہ دلیلیں وہی لوگ پیش کرتے ہیں - جو اپنے لڑکوں کو ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں - جو
انہیں اپنے طبقہ کے لوگوں سے ربط ضبط پیدا کرنے اور میل ملاقات بڑھانے میں معاون
ثابت ہو - ضرورت اِس بات کی ہے - کہ کسانوں کے لڑکوں کو بھی ایسی تعلیم دی جائے
جس کی مدد سے وہ کسانوں کے حلقہ میں میل جول پیدا کر سکیں - تجربہ سے ثابت ہوا ہے - کہ
کسانوں کے لڑکوں کو اسکول میں بھیجنے کی راہ میں بہت بڑی دشواریاں حائل ہیں - اِس لئے
یہ ضروری ہے - کہ کسانوں کے لڑکے اسکول میں نہ آئیں - بلکہ اسکول اُن کے گھر پہنچ جائے
یعنی اگر وہ اس تعلیم سے جو اُن کے لئے تجویز کی گئی ہے - فائدہ نہیں اٹھا سکتے' تو اُن کے
لئے ایسی تعلیم کا انتظام کیا جائے - جو اُن کے ذوق سے مطابقت رکھتی ہو - زراعت پیشہ
طبقہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - اور نہ اسے تنزل کی گہرائی میں پڑا رہنے دیا جا سکتا ہے۔
پنجاب کی زمین میں قدرتی دولت کا بہت بڑا ذخیرہ مخفی ہے - جسے زر و مال کی صورت میں
منتقل کیا جا سکتا ہے - کسان کو جسقدر جلد اِس دولت سے فائدہ اٹھانیکی تعلیم دیجائیگی -

---

لہ زراعت کے شاہی کمیشن کے سامنے ۱۹۱۹ء میں حسب ذیل شہادت دی گئی تھی " زراعت کو اِس امر
کا انتظار ہے - کہ مستقبل قریب میں تعلیم کو وسیع پیمانہ پر رائج کیا جائے - اس پر بہت روپیہ خرچ ہوگا - اکثر
نوجوان ہمارے اضلاع سے شہروں میں چلے جاتے ہیں تاکہ مختلف صنعتوں میں معاش حاصل کریں - اِسطرح ہمیں تعلیم
بہت مہنگی پڑتی ہے - کیونکہ ہم دوسرے مقامات کے لئے بچوں کو تعلیم دلا رہے ہیں -

وہ اسی قدر جلد اس سے تمتع حاصل کریگا۔ اس سے پہلے وہ اس دولت کو روپیہ پیسہ کی صورت میں منتقل نہیں کر سکتا۔ کسان اور صرف کسان اس کروڑوں ایکڑ زمین کا محافظ ہے۔ جسکی پیداوار کا ہر شخص محتاج ہے۔ اگر ہم کہیں۔ کہ ماہران تعلیم کا فرض ہے۔ کہ وہ کسان کے لڑکے کو زیادہ روشن خیال کاشتکار اور زیادہ دانشمند اور قابلِ قدر شہری بناکر گھر واپس بھیجیں۔ خواہ اس مقصد کے لئے انہیں کتنے اصول اور نصب العین قربان کیوں نہ کرنا پڑیں۔ تو یہ مبالغہ نہ ہوگا زراعت سے جن فائدوں کے حصول کا امکان ہے۔ اُن سے اگر کسی شخص کو ایک دفعہ دلچسپی پیدا ہو جائے۔ تو پھر زراعت کی کشش اُس کے تمام ذہنی شکوک اور دشواریاں دُور کر دے گی۔ اگر ایک شخص کو ایسا معلم مل جائے۔ جو فنِ زراعت سے پوری پوری طرح واقف ہو۔ اور یہ جانتا ہو۔ کہ زراعت بچوں میں عقل و دانش کے جذبہ کو کیونکر بیدار کر سکتی ہے۔ تو بہت کم ایسی باتیں جاننے کے قابل رہ جاتیں ہیں۔ جنکا علم صحیفۂ فطرت کے مطالعہ سے حاصل نہ ہو سکے۔ جس چیز نے کسان کو سیاسی دنیا میں ایک کوہِ وقار بنا رکھا ہے۔ وہ محض فطرت اور فطرت کی قوتوں کے اثر و نفوذ کا گہرا علم ہے۔ فطرت اُسے خود سکھا دیتی ہے کہ وہ کون کونسی چیزیں ہیں۔ جنہیں وہ اپنے قبضے میں رکھ سکتا ہے۔ اور جس سانچے میں چاہے ڈھال سکتا ہے۔ اور کون کونسی چیزیں ایسی ہیں۔ جو اس پر تصرف رکھتی ہیں۔ اور جن سے وہ سرتابی اور انحراف کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کرم کلہ کے بیج سے بُرا یا بھلا کرم کلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن آجتک جتنے سیاسی نصب العین انسان کے ذہن میں آئے ہیں۔ جسقدر سیاسی تقریریں کی گئی ہیں۔ وہ سب کی سب مل کر کرم کلہ کے بیج سے گوبھی کا پھول نہیں پیدا کر سکتیں۔ کسان عموماً صحیح سیاسی شعور رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ فطرت کے قوانین ایسے اٹل ہیں۔ جن سے انسان کو نہ تو مجالِ گریز ہے۔ اور نہ انہیں نظر انداز کرنے کی طاقت۔ اُسے صرف تعلیم کی ضرورت ہے تاکہ وہ محسوس کرلے۔ کہ انسانی دماغ میں فطرت کی اُن صنعتوں کو حاصل کرنے کی قوّت موجود ہے۔ جو انہیں لوگوں کو مل سکتی ہے۔ جنہوں نے قانونِ فطرت کا مطالعہ کیا ہے۔ اُس کے ذہن پر یہ نقش کر دینا چاہئے کہ پنجاب کو اس بات کی ضرورت نہیں۔ کہ کسان پرانے طریق زراعت میں اصلاح کی

کوشش کرے۔ بلکہ ضرورت تو اِس بات کی ہے۔ کہ جدید طریقِ زراعت رائج کیا جائے، جسے صرف جدید سائینس کا علم حاصل کرنے کے بعد رائج کیا جا سکتا ہے۔ سر ہاریس پلنکٹ نے درست کہا ہے۔ کہ کسان کو چاہئیے۔ وہ اپنے پیشے کو صرف دیہات کی بقار کا سامان ہی نہ سمجھے۔ بلکہ ایک فن، ایک تجارت، اور ایک دلچسپ زندگی کی نظر سے[1] دیکھے۔

جب یہ سوال کیا جاتا ہے۔ کہ اِن عام اصولوں کو کیونکر عملی جامہ پہنایا جائیگا۔ تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ ابھی وہ زمانہ نہیں آیا۔ جب ایک ایسا جچا تُلا لائحہ عمل پیش کر دیا جائے۔ جس سے اِس مسئلہ کا پورا پورا حل ہو جائے۔ لیکن دو نکات ایسے اہم ہیں، جنکا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے۔ کہ اگر کسان کبھی طریقِ تعلیم سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ تو اسی صورت میں جبکہ تعلیم کی عنان خود اُنکے ہاتھوں میں ہو چنانچہ امریکن کمیشن نے جو شہادتیں فراہم کیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صرف شمالی ڈکوٹہ میں تعلیم کے متعلق کسانوں کے خیالات امید افزا ہیں۔ اور شمالی ڈکوٹہ ایک ایسا مقام ہے۔ جس کی یونیورسٹی میں زراعتی کالج کے تجربہ گاہوں، کسانوں کے اداروں، اور دیہاتی اسکولوں کا انتظام خود کسان کرتے ہیں۔ یورپ کے ممالک میں ڈنمارک کا نظامِ تعلیم بہترین ہے۔ وہاں بھی کسانوں نے منتظم ہو کر ایک ایسا تعلیمی لائحہ عمل تیار کر لیا ہے۔ جو اُن کے نزدیک اپنی ضروریات کے لئے عین موزوں و مناسب ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے۔ کہ اس صوبہ کے تعلیمی مسئلہ کا کوئی مستقل اور پائیدار حل تلاش کرنے کے سلسلہ میں تحریکِ اِمداد باہمی سے بہت مدد ملیگی۔ ہم یہ بیان کر چکے ہیں۔ کہ بچوں کو یہ تعلیم دینا چاہئیے۔ کہ ہمارے سامنے فائدہ حاصل کرنے کے جو موقعے ہیں۔ اُن سے نفع اٹھانے کے لئے تمام جماعت کا مصروفِ عمل ہونا ضروری ہے۔ انہیں یہ بھی سکھانا چاہئیے۔ کہ وہ مشترکہ سود و بہبود کیلئے متحد ہو کر کوشش کریں۔ اور اپنے ہمسایوں اور اس طبقہ سے وفاداری کریں۔ جو اُن کا مبدار اور سرچشمہ[2] ہے۔ اگر کامیابی حاصل کرنا ہے، تو انسانی عنصر کے

---

[1] رورل لائف پرابلمز آف یونائیٹڈ سٹیٹس، صفحہ ۸۰۔

[2] رورل سوشیالوجی (دیہاتی عمرانیات) کا دیباچہ صفحہ ۲۷۔

حالات کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ کہا جاتا ہے۔ کہ آئرلینڈ کے چھوٹے چھوٹے کسان جس حالت میں ہوتے تھے۔ اُسی پر قناعت کئے بیٹھے رہتے تھے۔ اُن میں نہ تو کسی کام کا آغاز کرنے کی ہمت ہوتی تھی۔ اور نہ اِس قدر خود اعتمادی کہ دوسروں سے ہدایات حاصل کر کے اُن پر عمل کریں۔ صرف اُس وقت اُن میں وہ اعتماد جو کسی پیشہ کے نکات سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے۔ پیدا ہو جاتا تھا۔ جب وہ دوسرے کسانوں کی محفل میں ہوتے تھے۔ یہ نتیجہ تھا اِس امر کا کہ انہیں ادنےٰ درجہ کی تعلیم دی گئی تھی۔ کہیں بھی ایسا نہیں ہوا۔ کہ کسانوں نے اپنے کاروبار کو تجارتی اصولوں پر چلایا ہو۔ اُن کے نزدیک زراعت کا ماحصل یہ ہے[1]، کہ اچھے سالوں میں اچھا سامانِ معیشت مہیا ہوتا ہے۔ اور جن سالوں میں فصل اچھی نہیں ہوتی۔ زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پنجاب کے متعلق بھی بہت حد تک یہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ دوسری بڑی بڑی صنعتوں کو تو بہترین قابل اشخاص کی مدد مل سکتی ہے۔ بیچارے کسان کو محض اپنے آپ اپنے دماغ اور اپنے ذرائع کا آسرا ہے۔ پنجاب میں کسان تو ایک بے بضاعت شخص ہے۔ جس میں اگر کسی کام کو شروع کرنے کی ہمت ہو۔ جب بھی اُسے اپنے حوصلے نکالنے کیلئے وسیع میدان نہیں ملتا۔ ایسے موقع پر امداد باہمی کی تحریک بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ یہ تحریک کسان کو اپنی صنعت کے تجارتی پہلو سے روشناس کر دیتی ہے۔ اور اُس کی فطرت میں تجارت اور کاروبار کی جس قدر صلاحیت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اُسے بیدار کر دیتی ہے۔ تحریک امداد باہمی تعلیم کا دائرہ اثر وسیع کر دیتی ہے۔ کیونکہ اِس تحریک کا منشا یہ ہے۔ کہ زیادہ عقلمند لوگ اپنی عقل کے طفیل جو منافع حاصل کرتے ہیں، وہ اُنہیں کی جیب میں جائے۔ یہ کسان کے لئے اقتصادیات کی عملی تعلیم کا سامان مہیا کر دیتی ہے۔ اور اجتماعی مفاد کے اس جذبہ کو فروغ دیتی ہے جس سے اُس کا قیام و بقا وابستہ ہے۔ دوسرے ممالک میں انجمن ہا[2] امداد باہمی دیہات کے لئے تجارتی اسکولوں کی حیثیت رکھتے ہیں،

---

[1] رورل ری کنسٹرکشن ان آئرلینڈ" صفحہ ۲۳۸۔

[2] سٹیٹ ہلپ فار ایگریکلچر" (زراعت کے لئے حکومت کی اعانت) صفحات ۱۶-۲۳۔

انجمنوں سے عملی طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ تعلیم کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اور لوگ خود خواہش کرتے ہیں۔ کہ اُن کے لئے مزید تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ بلکہ ان انجمنوں کی وجہ سے لوگ اِس بات پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کہ جو چیز اُن کے پسند خاطر ہے۔ اُس کے حاصل کرنے کیلئے روپیہ صرف کرنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ امداد باہمی کی تحریک نے ہر ملک میں تعلیم کی خواہش پیدا کر دی ہے۔ ڈنمارک میں اِس تعلیم کی وجہ سے کسانوں نے مشترکہ سرمایہ سے کمپنیاں قائم کرلی ہیں۔ جو ہائی اسکولوں اور زراعتی اسکولوں کو چلاتی ہیں پنجاب میں یہ تحریک بالغوں کے لئے مدارسِ شبینہ[1] کے قیام کے بارے میں لوگوں کی رہنمائی کر رہی ہے۔ اور نئے مڈل اسکول (ثانوی مدارس) کھولنے میں بہت معاون ثابت ہوئی ہے۔ اس تحریک میں ایک خوبی یہ ہے۔ کہ یہ کاروبار کے قیام و بقا کی ضامن ہے۔ ہر کسان کو ایک دن مرنا ہے۔ مگر یہ موت انفرادی موت ہے۔ اجتماعی حیثیت سے کسان زندہ رہتے ہیں۔ اُن کی مجلس کو غیر محدود زندگی حاصل ہے۔ ایک کسان کا مرنا یہی حیثیت رکھتا ہے۔ کہ کاروبار کے ایک منتظم کی بجائے دوسرا منتظم مقرر کر دیا گیا۔ اسی طرح ان میں وسعتِ نظر پیدا ہو جاتی ہے۔ سرمایہ مشترکہ سے کمپنی قائم کرنے کو انفرادی ملکیت پر ترجیح حاصل ہے یہ مانا کہ ایک فردِ واحد جو خاص قابلیت کا مالک ہے۔ کاروبار کو بہت فروغ دے سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے۔ کہ اُس کا بیٹا یا جانشین اپنی موروثی جائیداد کو سنبھالنے کی بھی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ لیکن اگر مشترکہ سرمایہ سے ایک مجلس قائم کرلی جائے۔ تو اس مجلس کے ارکان کوشش کرینگے۔ کہ منتظم کی موت پر بہترین استعداد رکھنے والے شخص کو اُس کا جانشین بنایا جائے۔ پنجاب جیسے صوبہ میں جہاں کسان ہی مالکانِ اراضی ہیں۔ انجمن امداد باہمی کی بدولت کسان اراضی کو وسعت دینے پر زیادہ سے زیادہ روپیہ صرف کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتا ہے۔ کہ اُس کا بیٹا مجلس امداد باہمی کے مشورہ اور تجربہ اور سائنٹیفک طریقِ زراعت

---

[1] دیہات میں بالغوں کی تعلیم کا انتظام کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ایسے تعلیم یافتہ لوگ نہیں ملتے۔ جو استادی کے فرائض انجام دے سکیں چونکہ تعلیم یافتہ لوگ شہروں میں چلے جاتے ہیں۔ اِسلئے دیہات میں تعلیم نہیں پھیل سکتی۔

کے ماہرین کی اعانت سے تمام مشکلوں کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوگا۔ کسان اسکول کھولنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتا۔ کیونکہ اُسے معلوم ہے۔ کہ امدادِ باہمی کی تحریک کے باعث اسکول کا انتظام بہترین ہاتھوں میں ہوگا۔

ایک اور حیثیت سے بھی امداد باہمی کی تحریک دیہاتی تعلیم کو ترقی دینے کا باعث ثابت ہوگی۔ یہ تحریک کاروباری ہے۔ اس کے اصول تاجرانہ ہیں۔ جنمیں ایک یہ بھی ہے۔ کہ مجلس کے متعلق ضروری حالات ضبطِ تحریر میں لائے جائیں۔ اور انہیں محفوظ رکھا جائے۔ مزید برآں اس کے حسابات بھی محفوظ رکھے جائیں۔ اور اس غرض کے لئے کسی تعلیم یافتہ کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب تک گاؤں میں ایک آدھ تعلیم یافتہ شخص نہ ہو۔ لوگ امداد باہمی کی تحریک سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اسی طرح امدادِ باہمی کی تحریک تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے گاؤں میں کام مہیا نہیں کرتی۔ بلکہ اس کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگوں کی مانگ بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب ایک مجلس کو ترقی ہونے لگتی ہے۔ تو اس کے ممبر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ مجلس کا کام کیونکر چلتا ہے۔ چونکہ یہ معلوم کرنے کیلئے تعلیم ضروری ہے۔ اسلئے اُن میں تعلیم حاصل کرنیکی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

اگر پنجاب کے عام معیارِ[1] خوشحالی کو بلند کرنا ہے۔ تو وہ لوگ جن کے دماغوں پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ یا توہمات کے شکار ہو رہے ہیں۔ اُس کی پیداوار میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ کسانوں کے قلب میں ترقی پسندی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اور ہمیشہ اصلاح و ترقی کا قدم بڑھاتے رہنے کی خواہش بیدار ہو جائے۔ اس غرض کے لئے ایک ایسے تعلیمی نظام کی ضرورت ہے۔ جو لوگوں کو اس حد تک روشن خیال بنا دے۔ کہ وہ ترقی کی راہ کی مشکلات کو خاطر میں نہ لائیں۔ اور جو چیزیں انہیں اپنی جدید فنی قابلیت[2] سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں مانع ہیں۔ اُن سے نجات حاصل کریں۔

---

[1] جلیٹ کی کتاب "کنسٹرکٹو رورل سوشیالوجی"۔ صفحہ ۲۲۷۔

[2] "پرنسپلز آف رورل اکنامکس" مصنفہ کارور۔ صفحات ۲۰۲ - ۲۴۸ +

گذشتہ صفحات میں ہم نے اسکولوں کی جانب خاص طور پر توجہ منعطف کرائی ہے یہ بیان کرنا غیر ضروری ہوگا۔ کہ کسانوں کی تعلیم کو اسکولوں تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیئے۔ اب لوگ اسکول سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کسی مخصوص فن کی تعلیم حاصل کرنے کے مخالف نہیں ہوئے پندرہ[۱۵] سال کی عمر کے بعد ایک نوجوان کو اس کے اقربا کی رضامندی سے کسی خاص پیشے کی تعلیم دینا چاہیئے۔ یہ تو تجربہ سے معلوم ہوگا۔ کہ یہ تعلیم کس قسم کی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ پنجاب کو ایسے کسانوں کی ضرورت ہے۔ جنہیں سرمایہ منفعت بخش کاروبار میں لگانے کا ایسا سلیقہ ہو۔ کہ وہ بہت حد تک محض اپنے سلیقہ کی وجہ سے سرمایہ حاصل کر سکیں۔ ایسی دانشمند اور ترقی خواہ جماعت پیدا کرنے کے لئے صرف زراعتی کالج ہی کافی نہیں۔ اتنا ضرور ہے۔ کہ چند کالجوں کا وجود آئندہ ترقی کے لئے ضروری ہوگا۔ لیکن صوبہ کی ضرورت محض چند سو تربیت یافتہ گریجویٹوں سے پوری نہیں ہو سکتی۔ اسے بیس لاکھ تربیت یافتہ کسانوں کی ضرورت ہے۔
وادیٔ چناب کی نوآبادی کا ترقی پسند کسان ہی تعلیم کا محتاج نہیں۔ بلکہ صوبہ کے ہر صفحے میں لاکھوں ایسے کسان ہیں۔ جن میں ترقی کا جذبہ موجود نہیں۔ اور انہیں تعلیم دینا ضروری ہے ایک امریکن اہلِ قلم نے صحیح کہا ہے "ہمیں کسی نہ کسی ذریعہ سے سب سے پھسڈی کسان کے پاس بھی پہنچنا چاہیئے۔ جو بدترین قطعۂ اراضی کی کاشت کر رہا ہے۔ حکومت کا فرض ہے۔ کہ اُس کی رعایا میں سے جو لوگ دشواریوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اُنکی مملوکہ اراضی کو مفید اور منفعت بخش بنانے کے لئے بہترین ذرائع اختیار کرے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ جسطرح وہ زرخیز علاقوں کی کوشش کرتی ہے۔ اسی طرح اُن قطعاتِ اراضی کی زراعت کو ترقی دینے اور کسانوں کے اطمینان کا سامان مہیا کرنے کی کوشش بھی کرے۔ جو چنداں زرخیز نہیں۔ اسی طرح کسانوں میں جذبہ مدنیّت ترقی کرے گا۔ اور ملک کی دولت کو

لے گویا خاص کالجوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ پیشوں کی تعلیم کے لئے مڈل اسکول اور نارمل اسکول قائم کیے جائیں جنہیں زراعت کی ابتدائی تعلیم دی جائے۔ بیس لاکھ کسانوں کے لئے کالج کی تعلیم ضروری نہیں۔ بلکہ انہیں جدید اصولوں پر زراعت کی عملی تعلیم دینا چاہیئے۔

فروغ حاصل[1] ہوگا۔ صوبہ کی خوش قسمتی سے گذشتہ چند سالوں سے یہ کوشش ہو رہی ہے۔ کہ کسان کے لئے ایک ایسا نظامِ تعلیم قائم کیا جائے۔ جو اس کی ضروریات کے لئے زیادہ موزوں ومناسب ہو۔ لیکن ایسا نظامِ تعلیم کہیں بہت مدت کے بعد مکمل طور[2] پر قائم ہوگا۔ جب تک کسان اپنے پیشے میں علمی اور کاروباری حیثیت سے پوری پوری تربیت حاصل نہیں کر لیتے ختم ہونیوالا سال ان کے لئے نقصان و اتلاف مال کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ اُن کی تربیت مکمل ہوجاتی۔ تو وہ ہر سال اپنی دولت میں معقول اضافہ کر سکتے تھے۔ اِس سلسلہ میں تیزی سے ترقی کرنے اور اِس مرحلہ کو جلد از جلد طے کرنے کے لئے رائے عامہ کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ اگر لوگوں کے خیالات ترقی پسند نہ ہوں۔ تو حکومت کا ترقی پسندی کی حکمت عملی اختیار کرنا بالکل بے سود ہوگا۔ ہمیں اس چیز کی ضرورت نہیں۔ کہ اندھا دھند یہ کہنا شروع کر دیں۔ کہ کسان مالگذاری اور دوسرے مصارف میں جو کسان کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ کمی کر دی جائے۔ بلکہ وقت کی اہم ضرورت تو یہ ہے۔ کہ زراعت کو اِس طرح فروغ دیا جائے۔ کہ کسان ہر سال زیادہ آسانی کیساتھ یہ مصارف برداشت کر سکے۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ اِس مقصد کے لئے کون سے ذرائع بہترین ہیں۔ اگر نمونہ کے طور پر نمائشی کھیت قائم کرکے اُن میں نئے زراعتی طریقے استعمال کئے جائیں۔ اور کسانوں کو سائینٹیفک طریقوں سے روشناس کرایا جائے۔ تو اُس سے فائدہ تو ضرور ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کے فوائد کے بارہ میں عجیب وغریب غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ ۲۷-۱۹۲۶ء تک کی سالانہ انتظامی رپورٹ میں ہمیں یہ الفاظ نظر آتے ہیں۔ کہ امرتسر میں زراعتی تجربات کا جو فارم قائم کیا گیا ہے۔ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور یہ اغلب نہیں۔ کہ وہ کسی مالی حیثیت سے کامیاب ہو سکے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ زراعت کے جدید طریقوں کا تجربہ کرنے کے لئے جو فارم قائم کئے جاتے ہیں۔ اُن سے مالی نفع حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ اسی طرح نمائشی فارم

---

[1] بیلے کی کتاب "سٹیٹ اینڈ دی فارمر" (حکومت اور کسان) فٹ۔

[2] معلموں کے انتخاب اور تربیت پر ہی کئی سال صرف ہو جائیں گے۔

کے قیام کا بھی یہ مقصد نہیں۔ نمائشی فارم اِس لئے قائم کئے جاتے ہیں۔ کہ کسانوں کو کاشتکاری کے طریقے بتائے جائیں۔ یا نئی فصل اور بیجوں کی نمائش کی جائے۔ اگر ایک نمائشی فارم سے یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ تو سمجھ لیجئے۔ کہ محنت اکارت نہیں گئی۔ قیام کا مقصد پورا ہو گیا۔ اگر اِس قسم کے فارم سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہ زراعت سے کس قدر نفع ہو سکتا ہے۔ تو اُسے بالکل جداگانہ اصولوں پر چلانا چاہئے۔ اِس قسم کے فارم کی حمایت پروفیسر اے۔ ڈی ہال الیف۔ آر۔ ایس نے کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"معلوم ہوتا ہے۔ کہ تجارت میں ایک جدید قسم کا طریقہ تعلیم رائج کرنے کی کافی گنجائش ہے یعنی ایسے نمائشی کھیت قائم کئے جا سکتے ہیں۔ جن سے محض مالی نفع مقصود ہو۔ لیکن اُن کا حساب کتاب نہایت پابندی سے رکھا جائے۔ اور کھیت کے تمام مصارف اور نتائج سے لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے[1]۔ اِس امر میں شبہ ہے۔ کہ آیا پنجاب ایسے نمائشی فارم قائم کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ یا نہیں"۔

چونکہ پنجاب کی دیہاتی اقتصادیات کا مطالعہ بہت کم کیا گیا ہے۔ اِس لئے اس امر کی تعیین نہیں کیجا سکتی۔ کہ کھیت کس قدر وسیع ہو۔ اور اگر بفرضِ محال کھیت کی وسعت کے متعلق کوئی فیصلہ کر لیا جائے۔ تو یہ بات کیونکر طے ہو۔ کہ اس میں کس جنس کی کاشت کی جائے۔ بحالتِ موجودہ کسانوں میں سائینٹیفک زراعت کا ذوق پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے۔ کہ ہر تحصیل ضلع گاؤں میں سے ایک دو اشخاص جو سب سے زیادہ بالغ نظر اور ہوشمند ہوں۔ منتخب کر لئے جائیں۔ اور انہیں اس امر پر آمادہ کیا جائے۔ کہ وہ اپنی مملوکہ اراضی کو نمونہ کے کھیتوں کی حیثیت دے دیں۔ یا کم از کم چند قطعاتِ اراضی کو نمونہ کے کھیت بنا دیں صیغہ انجمن ہائے امداد باہمی اِس طریقہ کو مقبولِ عام بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

---

[1] ایگریکلچر آفٹر وار۔ صفحہ ۶۹۔ زراعتی ترقی کے لئے جو کمیشن انگلستان میں مقرر کیا گیا تھا۔ اُس نے اِس غرض کے لئے چالیس ہزار منظور کئے ہیں۔ کہ خالص قابلِ زراعت زمین پر مکھن اور مرغی کے نمائشی فارم کھولے جائیں جنہیں تجارتی حیثیت سے کامیاب کیا جائے۔

تعلیم کی بحث کو ختم کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذکاوتِ فہم کے علاوہ دوسرے اوصاف کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ جن پر کسان کی قابلیّت کا انحصار ہے۔ یہاں یہ کہنا تو غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اچھی صحت اور جسمانی قابلیّت بھی اقتصادی حیثیت سے بھی نہایت قابلِ قدر چیزیں ہیں۔ اور انسان کا موجودہ علم یہ صحیح طور پر نہیں بتا سکتا۔ کہ سخت جسمانی محنت سے اِحتراز کرنے کی بدولت کس قدر امراض پھیلتے ہیں۔ لیکن جب تک کسان اقتصادی فوائد حاصل کرنے کے لئے مزید محنت مشقت پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ انہیں یہ تعلیم دینا بے سود ہے۔ کہ وہ اپنی موجودہ اقتصادی حالت کی اِصلاح کیونکر کر سکتے ہیں۔ اِن امور کے علاوہ یورپ کے لوگوں کو جو ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دو چیزیں نہایت نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہندوستان کے کسان چابکدست نہیں، اور دوسرے یہ کہ جن مویشی سے وہ زراعت میں کام لیتے ہیں۔ اُن پر بھی انہیں قابو حاصل نہیں۔ پہلے نقص کی وجہ تو شاید یہ ہے۔ کہ گاؤں میں چند کاریگر بھی ہوتے ہیں۔ جن کی خدمات کا معاوضہ کسان غلّہ کی صورت میں ادا کرتا ہے۔ اس طرح اگر کوئی کسان مرمت طلب اشیاء کی مرمت خود نہیں کرتا۔ تو صرف اس کا تھوڑا سا وقت بچ رہیگا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اپنی انگلیوں سے کام لینے میں اُس نے چنداں ترقی نہیں کی۔ کسان کے ہاتھ میں کوئی نیا آلہ دے کر دیکھئے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ وہ اُسے استعمال کرنے پر آمادہ نہیں۔ اگر زراعت میں صحیح ترقی کرنا ہے۔ تو کسان کو چابکدست بنانا ضروری ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے۔ کہ وہ اپنے مویشی کے متعلق علم رکھتا ہو اور اُسے اُن پر قابو بھی حاصل ہو۔

دیہاتی لیڈری

اوراقِ گذشتہ میں ہم نے دولت حاصل کرنے کے سلسلہ میں اس عنصر کا بھی ذکر کیا ہے جسے عام طور پر "اقدام" کہا جاتا ہے۔ صوبہ میں کافی اراضی موجود ہے۔ کارکنوں اور سرمایہ کی بھی کمی نہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایک ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے۔ جو ان تمام اجزاء کو باہم اس طرح متحد کر دے۔ کہ ان تمام اجزائے ترکیبی کا تناسب صحیح ہو اور کسی قسم کی کمی بیشی

نہ ہو۔ تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کیجا سکے۔ یہ ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ کسان اپنی مملوکہ اراضی سے صرف اس بات کی توقع کرتا ہے۔ کہ اُس کی خانگی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور اتنا باقی بچ رہے۔ کہ وہ مالگذاری ادا کر سکے۔ وہ بہت کم یہ کوشش کرتا ہے۔ کہ زیادہ روپیہ اور زیادہ محنت صرف کر کے اراضی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ اس کی وجہ کسی حد تک تو یہ ہے۔ کہ زیادہ دانشمند اور تعلیم یافتہ لوگ شہروں میں چلے جاتے ہیں۔ اور کسی حد تک اس کا باعث یہ بھی ہے۔ کہ کسان کے نزدیک موجودہ تعلیم اس کے پیشے کے لئے کسی طرح مفید نہیں یہ بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ اگر اس کی مادی خوشحالی کو ترقی دینا مقصود ہے۔ تو اُس کے ذہن پر یہ نقش کر دینا ضروری ہے۔ کہ وہ اپنی محنت اور مشقت سے ترقی کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ وہ اس طرح اپنی زندگی کو بہتر بنائے۔ کسان رجعت اور پستی کا عادی ہو چکا ہے۔ اس سے یہ عادت چھڑا دینا چاہیئے۔ تاریخ سے ہمیں یہ فائدہ ضرور ہے۔ کہ اُس کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ہم نے زمانۂ ماضی میں جن غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ اُن سے اجتناب کر کے اب کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن زمانۂ گذشتہ کی عظمت و شوکت یا مصیبت و نکبت کی داستانیں خواہ وہ حقیقی ہوں یا خیالی۔ اقتصادی حیثیت سے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ بلکہ انہیں اقتصادی نقصان بھی پہنچتا ہے۔ کیونکہ ہمارا وقت۔ دماغ اور طاقت انکی نذر ہو جاتا ہے۔ حالانکہ جس قدر وقت' دماغ' اور طاقت اُن پر صرف ہوتی ہے اس سے کوئی تعمیری کام کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں ماضی سے نہیں بلکہ مستقبل سے دوچار ہونا ہے اور مستقبل میں صرف، اپنے آپ پر اعتماد رکھنے والے مضبوط اور پرجوش انسانوں کیلئے کشش موجود ہے۔ زمانۂ گذشتہ صرف کمزور' کاہل الوجود اور زوال پذیر لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔
فرض کر لیجئے! کہ ان تمام اصولوں کو عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک اہم چیز ایسی رہ جاتی ہے۔ جس کے بغیر انسان بھیڑوں کا گلہ ہے۔ یہ چیز رہنمائی یا لیڈری ہے۔ دیہات کے باشندوں کی معاشرتی حالت ایسی ہے جو یہ قابلِ قدر وصف نہیں پیدا ہونے دیتی۔ دانشمند، تعلیم یافتہ اور باہمت لوگوں کے گاؤں سے شہروں میں چلا جانا۔ دیہات کو لیڈروں سے محروم کر دیتا ہے۔ برطانیہ عظمے میں زراعت کو

جس قدر تنزل ہوا اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ دیہات تعلیم یافتہ نوجوانوں سے محروم[1] ہو گئے۔ یورپ کے اکثر ملکوں میں پادریوں، اسکول ماسٹروں اور ڈاکٹروں نے حتی المقدور کسانوں میں اپنے حالات کی اصلاح کا ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر پادریوں نے تحریک امداد باہمی کو فروغ دینے میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ کیونکہ یہ تحریک[2] اخلاقی حیثیت سے بہت قابل قدر ہے۔ ہندوستان میں لیڈروں کا فقدان ہے۔ اور اس امر کی کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔[3] کہ آج اس ملک میں جو افلاس اور پستی نظر آ رہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ یہاں اچھے رہنما نہیں ملتے اور ایسے لوگوں کی کمی ہے۔ جو معمولی معمولی مسائل کو لیکر انہیں عملی طور پر حل کریں۔ اور لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیں۔ شاید موجودہ پستی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ یہاں تاریخی ریکارڈ نہیں۔ یہ تو ممکن نہیں۔ کہ اگلے لوگوں میں غیر معمولی تمیز و ہوش اور اعلیٰ تعمیری قابلیت کے لوگ پیدا نہ ہوئے ہوں۔ اور انہوں نے اس زمانے کی مشکلات کو پوری طرح سمجھ کر ان کا حل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ لیکن چونکہ اس صوبہ کے معاشرتی حالات کچھ ایسے تھے تاریخ محفوظ رکھنے کا کوئی آسان ذریعہ بھی نہیں تھا۔ بیرونی حملہ آور برابر حملے کرتے رہے۔ اور سیاسی کشمکش برابر جاری رہی۔ اس لئے آج ہم اسلاف کی عقل و دانش سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے پروفیسر مارشل نے لکھا ہے۔ کہ جب سے دنیا قائم ہوئی ہے۔ اکثر لوگ تقریباً سارا وقت کھیتوں میں صرف کرتے رہے ہیں۔ آبادی کے ایسے گنجان مرکز بہت کم تھے جہاں لوگ مل جل کر زندگی بسر کریں۔ اور ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوں۔ چھاپے کی ایجاد سے پہلے آبادی بکھری ہوئی تھی اس لئے لوگوں کو یہ موقعہ نہیں ملتا تھا۔ کہ ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے اپنے اندر کوئی حرکت یا ولولہ پیدا کر سکیں۔ رسم و رواج اور قدیم روایات کا سکہ چلتا تھا۔ اور بہت کم ایسا ہوتا تھا۔ کہ کسی چیز کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر ترقی کا قدم بڑھایا جائے چنانچہ گذشتہ چند

---

[1] (صفحہ ۷۰ کا بقایا حاشیہ) جلبیٹ کی کتاب "کنسٹرکٹو رورل سوشیالوجی"۔

[2] "ایگریکلچر آفٹر دی وار" مصنفہ ہال صفحہ ۴۹۔

[3] "رورل لائف پرابلمز آف دی یونائیٹڈ سٹیٹس" صفحہ ۱۶۳

سالوں سے پہلے زراعت نے باعتبارِ فن بہت ترقی کی یہ بھی شاید صحیح ہو۔ کہ ہندوستان میں افراد کی دماغی قوت نے زیادہ ترقی نہیں کی۔ اور یہ تو واقعی درست ہے۔ اور خاص موقع اور ضرورت کیوقت بارہا یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ زراعت پیشہ آبادی کی دولت جس قدر وسیع ہے۔ اُسی قدر اُن کا عزم بھی قوی ہے۔ لیکن ابھی تک زراعت پیشہ آبادی کے معاشرتی حالات ایسے نہیں۔ کہ ایسے لوگ جو وقت اور موقعہ سے فائدہ اٹھانے کا وصف رکھتے ہوں۔ آگے بڑھیں۔ اور منظرِ عام پر آجائیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے۔ کہ صنعتی دولت سے بھی کہیں زیادہ زمین کی ملکیت لوگوں کو ورثہ میں ملی ہے۔ مزید براں ہر زراعتی مسئلہ کی بعض مختص خصوصیات ہوتی ہیں۔ اور اس کے بعض پہلوؤں پر عبور حاصل کرنے کے لئے مدلل علمی بحث سے کہیں زیادہ جبلی قوت، تمیز و فیصلہ کا ذکی الحس، تجربہ کار، اور ہوشیار ہونا ضروری ہے۔ اِس لئے کسان نے کبھی خصوص میں عموم اور عموم میں خصوص کی تلاش و جستجو کی کوشش نہیں کی۔ وہ بہت حد تک جبلی اِستعداد اور دُور رس نگاہ سے محروم ہو چکا ہے۔ اس کے فن نے جسقدر ترقی کی ہے۔ وہ اس وقت تک تجربہ سے حاصل کئے ہوئے علم سے شرمندۂ احسان رہی ہے۔ جب تک ایسے لوگوں نے جو صنعت و حرفت یا تجارت کی تربیت حاصل کر چکے تھے۔ یا اُنکی تعلیم سائینٹیفک اسکولوں میں ہوئی تھی۔ اُسکی امانت[1] نہیں کی۔ انگلستان کی تاریخ زراعت میں جو غیر معمولی طور پر صحیح تفاصیل سے لبریز ہے تقریباً چھ سو سال کے عرصے میں بمشکل چند ایسے لوگوں کے نام نظر آئے ہیں۔ جنہیں رہنما کی حیثیت سے امتیاز حاصل ہے۔ امریکہ کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے۔ کہ وہاں بھی دیہاتی علاقوں میں ابھی تک زیادہ لیڈر پیدا نہیں ہوئے۔ یا اگر پیدا بھی ہوئے۔ تو اُنکی تعداد امریکہ جیسے دولتمند اور آباد ملک کے لئے شایانِ[2] شان نہیں۔ اور عام طور پر دیکھا گیا ہے۔ کہ امریکہ کی دیہاتی تحریکوں کی رہنمائی جن لوگوں نے کی۔ وہ خود زراعت پیشہ نہیں تھے۔ صنعت و حرفت کی تو یہ کیفیت ہے،

---

[1] انڈسٹری اینڈ ٹریڈ" (صنعت اور تجارت) ۱۹۱۸ء صفحہ ۲ یہ حوالہ زراعت کی عمومی حالت سے متعلق ہے۔ ہندوستان کے خاص حالات سے تعلق نہیں رکھتا۔

[2] جلیٹ۔ کنسٹرکٹو رورل سوشیالوجی"۔

کہ ذی ہوش مالکانِ کارخانہ فراست سے ایسے صاحبِ ہوش و تمیز کارکنوں کو پہچان لیتے ہیں۔ جو بڑی بڑی ذمہ داریاں اُٹھا سکتے ہیں۔ لیکن زراعت پیشہ افراد میں کوئی ایسا نہیں۔ کہ وہ کسی ایسے شخص کو جو رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہو منتخب کر کے عنانِ اختیار اس کے ہاتھ میں دے دے۔ پھر بھی دیہات میں ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے جو تعمیری قابلیت رکھتے ہوں جو دیہات کے باشندوں کی تنظیم تجارتی اصولوں پر کریں۔ موجودہ دشواریوں کا حل بتائیں۔ اور باشندگانِ دیہات کیلئے ایک ایسا زینہ تعمیر کریں۔ جو انہیں آسودگی اور خوشحالی کے بامِ بلند پر پہنچا دے رہنما کیلئے ضروری ہے۔ کہ وہ زراعت کا ٹھوس علم رکھتا ہو۔ بڑے بڑے زمیندار اسوقت تک مزارعین کی رہنمائی کرنے اور اراضی کو ترقی دینے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ جب تک وہ محنت و مشقت اور ان تھک محنت نہ کریں۔ جب تک صحیح وضع و قماش کے رہنما موجود نہ ہوں۔ اچھی سے اچھی اور مکمل سے مکمل تجاویز بھی خاک میں مل جائینگی۔ اگر پنجاب کے شہری زراعت کے بجائے دوسرے مسائل میں اِس قدر اُلجھے نہ ہوتے۔ انہیں دیہاتی معاملات کے متعلق زیادہ اچھی طرح تعلیم دیجاتی۔ تو اپنی ذکاوتِ فہم اور تربیت یافتہ اوصاف کیوجہ سے وہ دیہاتی رہنمائی کی خالی اسامی پُر کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ لیکن جب تک ایسے معاملہ فہم لوگ نہیں پیدا ہوتے جو دیہاتی اقتصادیات کی تعلیم حاصل کر چکے ہوں۔ رہنما کی تلاش کیلئے دیہات کے اُن باشندوں کیجانب توجہ کرنی چاہئے۔ جو دیہات کے مخصوص حالات اور دیہات کی مختلف جماعتوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ اِس غرض کے لئے امدادِ باہمی کی تحریک ہماری امیدوں کی سب سے بڑی جائے پناہ ہے۔ بقول سر ہاریس پلنکٹ یہ تحریک ہر جگہ ایک نئی قسم کے مقامی رہنما پیدا کر رہی ہے۔ جو باتیں کرنا تو نہیں جانتے۔ لیکن دیہاتی مسائل کا علم رکھنے کی وجہ سے جماعت کے سُود و بہبود کا کام اچھی طرح کر سکتے ہیں[1]۔ یہ میدان بہت وسیع ہے۔ لیکن اسکے

---

[1] رورل لف پر ابلمز آف یونائیٹڈ سٹیٹس ص۱۲۳ تاریخ بتاتی ہے کہ دیہاتی لیڈر نما ماہر فن کسانوں میں ہی پیدا ہونا ضروری نہیں آرتھر ینگ کوئی کامیاب کسان نہیں تھا۔ البتہ یہ سرے سے کسان ہی نہیں تھا یہ صحیح ہے۔ کہ انگلستان کی تاریخ زراعت میں بعض زمینداروں کے نام بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ شخصیات اُن جوہر خداداد اور فطری ذہانت رکھنے والے لوگوں کا حوصلہ بڑھانے کا باعث ہونگی جو خود مالکِ اراضی نہیں۔

لئے بھی تو وقت چاہئے۔ کہ ایک غیر معمولی تمیز و ہوش اور صلاحیت کا شخص خود اپنی قابلیت سے آگاہ ہو جائے یا دوسرے لوگ اس کی استعداد پر مطلع ہوں۔ اس وقت کئی اشخاص ایسے ہیں۔ جن پر اُنکے بہت سے ابنائے جنس اعتماد کرتے ہیں۔ اور جو باشندگانِ دیہات کی تنظیم کے سیدھے سادے معاملات میں رہنمائی کر سکتے ہیں۔ لیکن ابھی تک کسی ایسے رہنما کے پیدا ہونے کی امید نہیں جسے قدرت نے بھی رہنمائی کی صلاحیت بخشی ہو۔ اور ساتھ ہی فنِ زراعت کی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کر چکا ہو۔ اور جب تک صوبہ میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوتے زراعت کی ترقی کا دارومدار تربیت یافتہ سرکاری افسروں کی سرگرمیوں پر ہے۔

لیکن مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہندوستان میں اگر اقتصادی رہنما پیدا نہیں ہوئے تو اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ لوگوں کی توجہ مذہبی اور رُوحانی معاملات پر مرکوز رہی ہے۔ بہت تھوڑا عرصہ ہوا۔ کہ ہندوستان کے باشندوں نے دولت جمع کرنے کیجانب توجہ کی ہے۔ اور ایسے لوگ ابھی پیدا نہیں ہوئے جنہوں نے پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں کوئی عظیم الشان مہم فتح کی ہو۔ اس صوبہ میں سائینٹیفک طریقِ زراعت کو رواج پائے ہوئے صرف چند سال ہوئے ہیں۔ لیکن اِس عرصہ میں اس نے بہت سی قابلِ قدر کامیابیاں حاصل کر لی ہیں۔ ایک نئی نسل پیدا ہو رہی ہے۔ جسے جدید طریقِ زراعت اِس قدر نامانوس اور اجنبی نہیں معلوم ہوگا۔ تعلیم فروغ پا رہی ہے۔ اور وہ زمانہ قریب ہے جب تعلیم پر روپیہ صرف کرنے کی اہمیت تسلیم کر لی جائیگی۔ سائنس، تعلیم، اور امدادِ باہمی کی اعانت سے ایسے رہنما پیدا ہونگے۔ جو رہنمائی کے تمام ضروری اوصاف کے مالک ہونگے، آج لوگ اپنے اندر ترقی کا ولولہ پیدا کرنے کے لئے سرکاری افسروں کی سرگرمیوں کے محتاج ہیں۔ اسے بھی ترقی کی ایک علامت سمجھنا چاہئے۔ آثار سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ زیادہ قوت و محنت کو منتشر اور پراگندہ کر دینے سے جدید رہنماؤں کو چنداں فائدہ نہیں ہوگا۔ کیوں؟ کہ اقتصادی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ ایک ہی چیز پر اپنی تمام کوششیں مرکوز کر دی جائیں۔ لیکن مشکل یہ ہے۔ اپنی محنت کو ایک کام پر مرکوز کر دیا جائے۔ تو عارضی اور نقش بر آب ہر دلعزیزی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اِس لئے صوبہ کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے،

جو اپنے گھروں میں کام کریں۔ اور چند ایسے مکمل حقائق پیش کر کے اپنے دلائل کو تقویت پہنچائیں جو مسلمہ حیثیت رکھتے ہوں۔ اس لئے اُنکے لئے یہ ضروری ہوگا۔ کہ دلائل پیش کرنے سے پہلے محنت و مشقت کر کے یہ حقائق فراہم کرلیں۔ ایک شخص کامیاب ہوتا ہے۔ تو اُس کے بہتیرے نقال پیدا ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے دیہاتی باشندوں کا حقیقی رہنما اگر انہیں تعمیری اقتصادی ترقی کی دشوار گذار راہ پر چلانا چاہتا ہے۔ تو اُسے یہ معلوم ہونا چاہئے۔ کہ کس چیز میں کامیابی ہو سکتی ہے۔

تیسرا باب

کسان کیوں کاشت کرتا ہے

دیہاتی اقتصادیات کے ابتدائی مسائل زمین کا مصرف کیا ہو۔ کسان کو زمین اور سرمایہ سے کیا کرنا چاہئیے۔ اُس کی ضروریات اور انکے پورا کرنیکا طریقہ۔ کسان کی سرگرمیوں میں تبدیلی۔ منڈی پیداوار کا فیصلہ کرتی ہے۔

یہ سوال کہ کسان کیوں کاشت کرتا ہے۔ بادی النظر میں ایک ایسا معمہ معلوم ہوتا ہے جس کا جواب پُورے تیقن اور وثوق کیساتھ نہیں دیا جا سکتا یا یوں کہئے۔ کہ حیرت و تعجب کے سوائے اِس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ سوال پُوری سنجیدگی سے کیا گیا ہے۔ اِس سے اُس اہم ترین مسئلہ کا تذکرہ مقصود ہے۔ جو آج ہمارے ملک کو پیش ہے کیونکہ زراعت دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے اہم ترین صنعت ہی نہیں۔ بلکہ تقریباً دنیا کے ہر ملک میں اسکو یہ حیثیت حاصل ہے۔ اِنگلستان، سکاٹ لینڈ، اور ویلز میں بھی دوسری صنعتیں خاص رقبہ تک محدود ہوں۔ اور بڑے بڑے علاقے صرف زراعت کے لئے مخصوص ہیں۔ آئرلینڈ کا تیس چوتھائی حصہ حصولِ دولت کیلئے زراعت کیلئے محتاج ہے۔ فرانس کے شمال مغرب میں جہاں جرمنوں نے یورش کی تھی۔ صنعتی کارخانے بھی ہیں۔ لیکن ملک کے باقی تمام حصّوں کا ذریعہ آمدنی زراعت ہے۔ پیرس کے جنوب مغرب میں جو مصنوعات طیار ہوتی ہیں۔ وہ ایسی ہیں جنکا دارومدار کھیتوں کی کاشت پر ہے۔ جرمنی میں جہاں کوئلہ، لوہا، یا کوئی چیز پائی جاتی ہے۔ مصنوعات طیار ہوتی ہیں

لیکن ملک کے اکثر و بیشتر حصے میں زراعت ہی معاش کی کفیل بنی ہوئی ہے۔ اِس طرح دوسرے ملکوں کی مثالیں پیش کیجا سکتی ہیں۔ جن کی بجنسہٖ یہی کیفیت ہے۔ امریکہ کی ریاستوں میں سے صرف نیویارک کی ریاست ایسی ہے۔ جس میں صنعتی کارخانے بہت وسیع پیمانے پر قائم ہیں۔ باقی ملک کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ پورے امریکہ میں کوئی ریاست ایسی نہیں۔ جسکی مصنوعات ایک شہر کے برابر ہوں۔ آجکل ہندوستانیوں کو جاپان کے خواب آیا کرتے ہیں۔ لیکن اِس کم نصیب اور افلاس زدہ ملک کی سب سے بڑی صنعت زراعت ہے۔ اِس کے بعد ریشم کی پیداوار کا نمبر آتا ہے۔ کارخانوں کی مصنوعات سے دوسرے ملکوں کیلئے مال فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُنکی فروخت کا دارومدار جاپان کی منڈیوں پر نہیں۔ موجودہ طریقِ تعلیم کے مخصوص نتائج میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ اس کی بدولت لوگوں کی توجہ مصنوعات تیار کرنے کی جانب مبذول ہوگئی ہے۔ اور ملک کی سب سے اہم ترین صنعت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ہمیں اِس امر کا اعتراف ہے۔ کہ ماہرینِ اقتصادیات بھی اِس گناہ میں حصہ لینے کے مجرم ہیں۔ کیونکہ وہ سب بھی تجارت اور کارخانوں کے مسائل پر اپنی توجہ صرف کر دیتے ہیں۔ اور زراعتی مسائل سے جو انکی توجہ کے محتاج ہیں۔ قطع نظر کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ہر ملک میں ہر شخص یہ تسلیم کرتا ہے۔ کہ زمین قومی دولت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن ساری دنیا کا عام رجحان اِسی جانب ہے۔ کہ زراعت کے سلسلے میں جو سادہ سے سادہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اُن پر بھی توجہ نہ کی جائے۔ یہی سوال لے لیجئے، کہ زمین کا صحیح مصرف کیا ہے۔ اِس ملک میں زمین کو کیونکر استعمال کرنا چاہیئے۔ قوم کی زندگی میں زمین کا کیا حصہ ہے۔ یہ سوال سادہ تو معلوم ہوتا ہے لیکن اِس کا جواب تلاش کرنا مشکل ہے۔ اگر موجودہ لٹریچر میں آپکو چند نظریات کا سُراغ ملے گا۔ جنہیں کبھی علانیہ بیان نہیں کیا گیا۔ لیکن وہ مصنفین کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ یہ نظریات بھی اُن مسائل کی پیچیدگیوں کو سُلجھا نہیں سکتے۔

ایک خیال عام ہے۔ کہ زمین کا مقصد شہروں کے لئے خوراک مہیا کرنا ہے۔ کسان کا فرض ہے۔ کہ وہ شہروں میں بسنے والوں کے لئے گھی۔ دودھ اور

گیہوں[1] سستی قیمت پر پہنچائے لیکن دوسری جانب شہر کے باشندوں پر یہ ذمہ داری نہیں عائد کی گئی۔ کہ اگر آسٹریلیا کا گیہوں سستی قیمت پر مل سکے۔ تو اِس صُورت میں بھی کسان سے ہی گیہوں خریدیگا۔ آج یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ کہ صوبہ سے گیہوں کی برآمد ممنوع قرار دیجائے۔ تو یہ درحقیقت اسی خیال کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ انگلستان میں بھی آج سے سو سال پیشتر یہی صورت پیش آئی تھی۔ اگر یہاں گیہوں کی درآمد ممنوع قرار دی گئی۔ تو کسان کو نقصان ہوگا۔ اور شہر کے لوگ اِس سے فائدہ اُٹھائینگے۔ جنگ کے زمانے میں انگلستان میں بھی اِسی نوع کے حالات پیش آئے تھے۔ کسانوں کو حکم دیا گیا تھا۔ کہ گائیں پالنے کے بجائے گیہوں کی کاشت کریں۔ لیکن وہاں تو اِس سے نہایت نازک حالات کا مقابلہ کرنا۔ اور جنگ میں فتحمند ہونا مقصود تھا۔ لیکن یہاں یہ خیال، کہ اراضی کا مقصد محض شہر والوں کی خوراک بہم پہنچانا ہے جنگ سے پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ اور اب تک برابر موجود ہے۔ ایک اور خیال یہ ہے۔ کہ اراضی سے تجارت کا سامان فراہم کیا جائے۔ اور اگر کوئی جنس مصنوعات کی طیاری میں کام آسکے۔ تو اُسے مالکانِ کارخانہ کے ہاتھ سستے داموں فروخت کر ڈالا جائے۔ جو لوگ پارچہ بافی کے کارخانے کھولنا چاہتے ہیں۔ یہ تحریک کر رہے ہیں۔ کہ روئی کی برآمد پر محصول لگایا جائے۔ تاکہ اِس ملک میں روئی ارزاں ہو جائے خواہ اِس سے کسان کو نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ اِس امر پر بھی زور دے رہے ہیں۔ کہ ملکی صنعت کی حفاظت کے لئے باہر سے آئے ہوئے کپڑے پر بھی محصول لگایا جائے۔ تاکہ وہ ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑے کو گراں قیمت پر فروخت کر سکیں۔ کبھی یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے۔ کہ اراضی کا مقصد زراعتی مزدوروں کے لئے کام بہم پہنچانا ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اراضی کو اُن لوگوں کیلئے کام بہم پہنچانا چاہئے۔ جو شہروں میں معاش پیدا نہیں کر سکتے۔ آجکل اِس خیال پر اِس لئے زور دیا جا رہا ہے۔ تاکہ اُن لوگوں کیلئے جو فوج میں ملازمت کر چکے ہیں۔ اور اب بیروزگار ہیں۔ وسیلۂ معاش فراہم کیا جائے۔ علاوہ بریں اراضی کو اُن لوگوں کی اعانت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ جنہیں سال بھر میں کافی کام نہیں ملتا۔

[1] مالی کمیشن کے سامنے ایک گواہ نے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا۔ کہ لوگوں کو حق حاصل ہے کہ وہ گیہوں سولہ سیر فی روپیہ خریدیں۔

اِس طرح یہ خیال کہ اراضی کا مقصد کام بہم پہنچانا ہے۔ مختلف ممالک کے اندر مختلف صورتوں میں
پایا جاتا ہے۔ بعض اہلِ قلم بھی یہ عقیدہ قبول کر چکے ہیں۔ اور یہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ کہ ایک شخص کو جسکے
پاس نہ سرمایہ ہو۔ نہ زراعت کی ترقی کا تجربہ چند ایکڑ زمین دیکر چھوڑ دینا چاہئے۔

ایک اور خیال جو اگر کہیں نہیں۔ تو کتابوں میں ضرور موجود ہے۔ یہ ہے۔ کہ زمین ایسے
شجاع لوگ پیدا کرتی ہے۔ جو ضرورت کے وقت جنگ کر سکتے ہیں۔ اور شہر کے باشندے جو
دیہاتیوں کی نسبت کمزور ہوتے ہیں۔ گھر بیٹھے کاروبار سے منافع کثیر حاصل کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ
جرمنی کی زراعتی حکمت عملی کی تہ میں اِس قسم کا عقیدہ سالہا سال تک کام کرتا رہا۔ بہرحال اس خیال
کی اساس مضبوط ہے۔ ملک کو ایسے تنومند لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو جنگی ضروریات کے وقت
کام آسکیں۔ اور ایسے لوگ زراعت پیشہ طبقہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اِس لئے حکومت کا
فرض ہے کہ وہ زراعت کے نشوو ارتقا پر نظر رکھے۔ اور کسانوں کو خوشحالی اور مسرّت سے
لذّت آشنا کرنے کے لیے تدابیر عمل میں لائے۔ اگر زراعت کو زوال کا خطرہ ہو جس کی وجہ سے
لوگ دیہات کو چھوڑ کر شہروں میں سکونت اختیار کر لیں۔ تو ایسی صورت میں زراعت کو
محض اقتصادی قوتوں کے رحم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے ساتھ یہ خیال بھی ہے۔ کہ
اراضی میں مردوں اور عورتوں کی کافی تعداد ہونا چاہئیے۔ تاکہ اگر شہروں کو آبادی بڑھانے
کی ضرورت پڑے۔ تو دیہات کے لوگ نقل مکان کر آسکیں۔ شہری آبادی عام طور پر زوال[1] پر
ہوتی رہتی ہے۔ دیہات کی نسبت شہروں کی شرح پیدائش کم ہے۔ اور شرح موت زیادہ۔ اِس لئے
اگر دیہات کے لوگ نقلِ مکان کر کے شہروں میں نہ آئیں۔ تو شہروں کے ویران ہو جانے
کا اندیشہ ہے۔ جو لوگ صنعت و حرفت کو ترقی دینے پر زور دیتے ہیں۔ دیہات کو محنت کی فراہمی
کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دیہات میں بچے پیدا ہوتے ہیں۔ زمین کی کمائی پر اُن کی پرورش ہوتی ہے

---

[1] یہ کہا گیا ہے۔ کہ صنعتی اداروں کی ملازمت اپنے فرزندوں کو اوسطاً تین پشتوں کے عرصہ میں جذب کر لیتی ہے
اِس سلسلے میں اس امر پر بھی غور کرنا چاہئیے۔ کہ جاپان میں لڑکیوں کی محنت سے کیونکر فائدہ اٹھایا
جاتا ہے۔

اُن کی تعلیم کے اخراجات ادا کئے جاتے ہیں - اور پھر انہیں کارخانوں کی نذر کر دیا جاتا ہے - اکثر ممالک میں بہت حد تک یہی کیفیت پیش آتی ہے جزائر برطانیہ میں کسان تعلیمی اخراجات کے شاکی نظر آتے ہیں - کیونکہ وہ کہتے ہیں - کہ انہیں اُن لوگوں کی تعلیم کے مصارف کا متحمل ہونا پڑتا ہے، جو شہروں میں چلے جاتے ہیں۔ اِس طرح گویا شہروں کو مزدوروں کی تعلیم و تربیت پر کچھ صرف نہیں کرنا پڑتا - بلکہ یہ بوجھ بھی دیہات کے باشندے اٹھاتے ہیں چنانچہ مختلف لوگ زمین کا مختلف مصرف بیان کرتے ہیں - لیکن سب کی تہ میں یہی خیال کام کرتا نظر آتا ہے - کہ دیہات کا مقصد شہروں کو فائدہ پہنچانا ہے - جب شہروں کو مزدوروں کی ضرورت ہو - تو دیہات کو چاہیئے - کہ مزدور بہم پہنچائے اور جب شہروں کو اُن کی ضرورت نہ رہے - تو اُن کے لئے کام مہیّا کرے - دیہات کے لئے یہ بھی ضروری ہے - کہ جب ملک خطرہ میں ہو - تو جنگ کرنیوالے لوگ فراہم کریں - اور جب خطرہ کی ساعت گذر جائے - تو لنگڑے لولوں کی پرورش کا بار اٹھائیں - جب باہر سے آیا ہوا غلہ مہنگا ہو - تو غلّہ بہم پہنچائیں - اور جب باہر سے آیا ہوا غلہ سستا ہو - تو نقصان اٹھائیں - دیہات کے لئے یہ بھی ضروری ہے - کہ تجارت کے لئے ضروری اشیاء اور مصنوعات کے لئے خام اجناس مہیّا کریں - لیکن اگر باہر سے آئی ہوئی خام اجناس دیسی خام اجناس سے زیادہ ارزاں ہو - تو دیہات یہ بھی مطالبہ نہیں کر سکتے - کہ بدیشی خام اجناس کی بدولت انہیں جو نقصان ہو رہا ہے اُن سے انہیں محفوظ رکھا جائے قصہ مختصر بیچاری زمین اور کسان پر تو ملکی فرائض کا بھاری بوجھ ہے لیکن اگر شہر کا باشندہ اُس کے حقوق کو نظر انداز کرنا چاہے - تو اُس کا کوئی حق قابلِ التفات نہیں -

اِن مختلف خیالات سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے - کہ مختلف اغراض و مقاصد آپس میں متضاد واقع ہوئے ہیں - صناع کی یہ خواہش ہے - کہ اُسے خام اجناس سستی مل جائیں - کسان اپنی پیداوار کے لئے زیادہ سے زیادہ قیمت چاہتا ہے - تاجر اور سوداگر اپنی تجارت و حرفت میں ترقی کے آرزومند ہیں - اور اس سے زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنا چاہتے ہیں - کسان آمدنی سے زیادہ منفعت کی جانب توجہ کرتا ہے - شہر کے باشندوں کو یہ فکر دامنگیر ہے - کہ انہیں اتنی خوراک ملتی رہے جو اُن کی ضروریات کے لئے کافی ہو - اور شاید کسان کو تجربہ سے یہ معلوم ہو کہ اشیائی خورد و نوشی

سے زیادہ دوسری اشیاء مثلاً تیلوں کے بیج اور رُوئی کی کاشت فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ صناع کی یہ فطری خواہش ہے۔ کہ عوام اس کی مصنوعات خریدیں۔ اور استعمال کریں۔ اور لوگ یہ چاہتے ہیں۔ کہ وہ اپنا روپیہ اچھی سے اچھی چیز کے خریدنے پر صرف کریں۔ مختلف اشخاص کے مفاد کا یہی تضاد ہے۔ جسکی وجہ سے شہر اور گاؤں ایک دوسرے کے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔ شہر اور دیہات کا یہ نزاع اُس وقت سے برابر چلا آتا ہے۔ جب سے شہر آباد ہوئے ہیں۔ جب کسی ملک کے باشندوں نے تجارت و حرفت کی جانب توجہ کی۔ وہ خرید و فروخت اور مصنوعات کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اور شہروں میں اُنکا اجتماع ہونے لگا۔ تو ان کے مفاد میں بھی فوراً تضاد پیدا ہو گیا۔ اس باہمی تضاد و نزاع کو سمجھ لینا آسان ہے۔ لیکن یہ سمجھنا مشکل ہے۔ کہ شہر کے باشندوں کو دیہات والوں سے یہ توقع کیونکر ہے۔ کہ دوسرے لوگ جن باتوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہ انہیں ملحوظ نہ رکھیں بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر اس ملک میں زراعت کو ایک صنعت کی حیثیت بھی نہیں دیجاتی ہے یہ شور تو سنا جاتا ہے۔ کہ صنعت و حرفت کو فروغ دینا چاہیئے۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے۔ کہ ملک میں ایک ایسی صنعت موجود ہے۔ جو دراصل دنیا کی سب سے قدیم سب سے اہم اور سب سے بڑی صنعت ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے۔ کہ کیا زراعت کو بھی ایک باعزت پیشہ سمجھا جا سکتا ہے۔ تمام دنیا کے شہروں میں یہ ایک مسلّم امر ہے۔ کہ زمین کی کاشت کے لئے عقل و دانش کی قطعاً ضرورت نہیں۔ زراعت میں تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے کوئی میدان نہیں۔ ناخواندہ اشخاص اور غیر تربیت یافتہ مزدوروں کے لئے تو یہ اچھا پیشہ ہے۔ لیکن جو نوجوان کالجوں میں تعلیم حاصل کر چکے ہوں۔ اُن کے لئے زراعت کا پیشہ اختیار کرنا قطعی طور پر ناممکن ہے۔ یہ خیال صرف اسی صوبہ میں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ہر ملک میں جہاں تعلیم یافتہ لوگ موجود ہیں یہ خیال موجود ہے۔ خاص طور پر امریکہ کے اہلِ قلم اس کی جانب توجہ منعطف کراتے رہے ہیں۔ برطانیہ کے مصنفین اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ اور دنیا کے دوسرے ممالک کے جن لوگوں نے اس امر پر غور کیا ہے۔ کہ اعلیٰ تعلیم کے لوگ سائنس کے جدید انکشافات کی مدد سے زراعت کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ وہ سب سے سب متفق اللفظ ہو کر اس خیال کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ کہ زراعت تعلیم یافتہ نوجوانوں کا پیشہ بننے کے قابل نہیں۔ بلکہ غلاموں اور گنواروں کیلئے مخصوص ہے

اب جبکہ یہ امر منظرِ عام پر آیا ہے۔ کہ زراعت اس صوبہ کی جدید دولت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور ہمیشہ اسے یہ حیثیت حاصل رہے گی۔ اور اب اس سے دولت بڑھانے کا زیادہ موقعہ ہے۔ تو تعلیم یافتہ لوگوں کے طرزِ عمل کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اب اِس مسئلہ کی تحقیق اِس خیال سے کرنا چاہیئے۔ کہ اصل حقائق کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں۔

اِس طرزِ عمل کے کئی وجوہ ہیں۔ کسان خود بھی اپنے کام میں زیادہ دماغ عقل یا تعلیم سے کام نہیں لیتا۔ وہ بھی یہی خیال کرتا ہے۔ کہ اُس کا تعلیم یافتہ بیٹا شہر چلا جائے۔ کیونکہ زمین کی کاشت میں اُس کی تعلیم کسی کام کی نہیں۔ اور زراعت[1] کے اہم ترین مسائل کو وہی لوگ نظر انداز کرتے ہیں۔ جو اگر انہیں اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ تو اُن سے بہت فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک شخص جو کپڑے یا جہاز یا ریل گاڑیاں۔ اور یا دوسری اشیاء تیار کرتا ہے۔ اتنا ہی مال طیار کرتا ہے جتنے آرڈر اُسے موصول ہوئے ہوں۔ کوئی جہاز ساز یہ سمجھکر جہاز تعمیر نہیں کرتا کہ کسی دن کوئی شخص آکر اُس کا جہاز خرید لیگا۔ کوئی شخص ریلوے انجن اِس لئے نہیں بناتا۔ کہ ایک دن کسی شخص کو اُن کی ضرورت پڑیگی۔ اور تو اور پارچہ بافی کی صنعت میں بھی یہ دستور ہے کہ جتنا آرڈر آجاتا ہے۔ اُس کے مطابق رُوئی خریدی جاتی ہے۔ اور مزدور بھرتی کئے جاتے ہیں؛ کسان اسی لائحہ عمل کے مطابق کام کرتا ہے۔ جو قدرت نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ اگر گیہوں کی کاشت کے بعد اس کی مانگ زیادہ ہو جائے۔ تو کسان کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اس امر کا انتظار نہیں کرتا۔ کہ کوئی غلّہ خریدنے والا مِل جائے۔ تو فصل کی کاشت کروں۔ وہ اِتنا ضرور کرتا ہے۔ کہ جس غلّہ کی مانگ عام ہوتی ہے۔ اُس کی کاشت کرتا ہے۔ اور ایسی فصل بوتا ہے۔ جو فروخت ہو جائے۔ صناع اور کسان کے اِسی فرق کی بدولت شہر کے باشندے کا یہ عقیدہ ہو گیا۔ کہ کسان گیہوں یا کپاس کی کاشت کرتا رہیگا۔ خواہ ان کی قیمت کم ہو یا زیادہ؛ وہ نہیں جانتا۔ کہ کسان کیوں کاشت کرتا ہے۔ لیکن شہر کے باشندے نے فرض کر لیا ہے۔

---

[1] امریکہ میں کپاس کی کاشت کرنیوالے اسی قدر کاشت کرتے ہیں۔ جتنی کپاس سے مانگ پوری ہو سکے۔ اس طرح وہ اپنے منافع کی تعیین کرنا چاہتے ہیں۔ ربڑ اور بعض دوسری اجناس کی بھی یہی کیفیت ہے ؛

کہ کسان کو اپنی پیداوار زیادہ سے زیادہ قیمت پر بیچنے کا جو حق حاصل ہے۔ اس سے محروم رکھنے اور اس کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ وہ برابر کاشت کرتا رہیگا۔ درحقیقت شہر کا باشندہ دیہاتی اقتصادیات سے بالکل بے خبر واقع ہوا ہے۔ لیکن اگر شہر کا باشندہ اِس سوال کا جواب نہیں دے سکتا "کہ کسان کیوں کاشت کرتا ہے" تو اُسے قصوروار نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیوں کہ کسان خود اِس سوال کا جواب پُورے وثوق سے نہیں دے سکتا۔ اور اُسے اپنے اعمال و افعال کی توجیہ کرنے میں بھی دشواری محسوس ہوتی ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ اِس صوبہ میں زراعت کی بنیاد اقتصاد پر نہیں رکھی گئی۔ اور ابھی تک نہ تو کسانوں اور نہ فنِ زراعت کے طلباء کو یہ معلوم کرنے کا کوئی موقع دیا گیا ہے۔ کہ زراعت کو اِقتصادی اصولوں پر کیونکر چلایا جا سکتا ہے۔

"کسان کیوں کاشت کرتا ہے"۔ ایک ایسا سوال ہے۔ کہ جس کے معنے سمجھنے کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے دوسری طرح پیش کیا جائے۔ فرض کر لیجئے! کہ ایک نوجوان کے پاس سرمایہ موجود ہے۔ جسے وہ کسی منفعت بخش کاروبار میں لگانا چاہتا ہے۔ وہ صنعت و حرفت پر روپیہ لگانا پسند کرتا ہے۔ لیکن اُسے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ اسی راہ میں نقصان کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے علم۔ قابلیّت اور ضبط و نظم کی ضرورت ہے۔ اور وہ اِن چیزوں سے محروم ہے۔ پھر وہ زراعت کی جانب توجّہ کرنے کے مسئلہ پر غور کرتا ہے اور اُس کے ذہن میں کئی مشکل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ آیا وہ زمین کی خرید پر سارا سرمایہ صرف کر دے۔ اور پھر مزید مصارف کا متحمل ہوئے بغیر اُسے کاشت کرنے کی کوشش کرے یا سرمایہ کا صرف ایک حصّہ زمین کی خرید پر صرف کرے۔ اور باقی دوسری ضروریات کے لئے رکھے۔ اور اگر یہ طریق بہتر ہے۔ تو زمین کتنے روپے سے خریدی جائے۔ اور باقی اخراجات کے لئے

لہ انگلستان میں چودھویں صدی کے اندر ایک اچھی مزروعہ زمین کے مویشی اور دُوسرے ذخائر کی قیمت زمین کی قیمت سے تگنی ہوا کرتی تھی۔ (تھورولڈ راجرس جلد اوّل) پنجاب میں جب سکھ حکمران تھے۔ تو مویشی اور دوسری ضروریات پر زمین کی نسبت زیادہ روپیہ صرف ہوتا تھا۔ مغربی اضلاع کے بعض حصّوں میں اب بھی یہی کیفیت ہے +

کتنا روپیہ محفوظ رکھا جائے۔ آیا وہ زمین اجارہ پر لے لے اور اپنا سارا سرمایہ اسکی کاشت پر صرف کر دے۔ یا ایک چھوٹا سا قطعۂ زمین خرید کے باقی سرمایہ سے اسمیں اچھی طرح کاشت کیجائے۔ اور یا جس قدر زمین خریدی جاسکے خرید لے۔ اور ایک وسیع رقبہ کی کاشت کر کے اپنی قسمت آزمائے آیا وہ زرخیز ترین قطعۂ زمین تلاش کرے جس سے بآسانی سامانِ معیشت فراہم ہوسکے۔ یا "تھورولڈ راجرس" کے اِس مقولہ پر عمل کرے کہ زمین کی حقیقی زرخیزی دراصل کاشتکار کی ترقی کرنیوالی قابلیت ہے۔ ایک زرخیز سے زرخیز قطعۂ زمین بھی زیادہ فصل اُگانے کی وجہ سے اپنی زرخیزی کھو بیٹھتا ہے۔ اور نکمّی سے نکمّی زمین بھی جو اصلاح و ترقی کی اہلیت رکھتی ہو۔ دانشمندانہ طریق عمل کی بدولت پُربہار باغ بن سکتی ہے[1]۔ اگر وہ راجرس کے اِس مقولہ پر عمل کرے۔ تو وہ ایسی زمین خریدے۔ جسکی اِصلاح کیجا سکتی ہو۔ اور پھر اپنی ساری طاقت سارا سرمایہ سارا دماغ اور عقل اس سے نفع اُٹھانے پر صرف کر دے۔ اگر یہ نوجوان اپنے لئے ذریعۂ معاش کا اِنتخاب کرنے سے پیشتر اپنے گرد و پیش نظر ڈالے۔ تو اُسے بہت سی توضیح طلب چیزیں نظر آئیں گی۔ کیا وجہ ہے۔ کہ ایک شخص پچیس ۲۵ ایکڑ زمین کا مالک ہے۔ نصف زمین کی کاشت خود کرتا ہے۔ اور نصف لگان پر دے دیتا ہے۔ کیا لگان پر دینے میں اسے خود کاشت کرنے کی نسبت زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ جس قطعۂ زمین کی کاشت وہ خود کرتا ہے۔ اُس پر وہ سرمایہ صرف نہیں کرتا۔ کیوں وہ اپنی ساری کوشش ایک چھوٹے سے قطعۂ زمین پر مرکوز نہیں کر دیتا۔ اور چند کھیتوں کی کاشت پر اکتفا کر کے باقی زمین لگان پر کیوں نہیں دے دیتا۔ دو کھیتوں میں آٹھ آٹھ مرتبہ ہل چلانے کی بجائے ایک میں ہی سولہ ۱۶ مرتبہ کیوں نہیں چلاتا۔ اگر یہ نوجوان غور و خوض سے کام لے۔ تو اُسے کئی ایسے جواب طلب سوالات نظر آئینگے۔ جن کی تحقیق میں ساری زندگی صرف ہوسکتی ہے۔ قصہ مختصر اگر ایک نوجوان جسکے پاس سرمایہ موجود ہے۔ زراعت کو ذریعۂ معاش بنانا چاہتا ہے۔ تو اُسے دیہاتی اِقتصادیات سے کسی قدر باخبر ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اُسے اپنی جہالت کی بدولت نقصان اٹھانا پڑے گا۔

---

[1] ہسٹری آف اگریکلچر اینڈ پرائسز جلد پنجم صفحہ ۹۹۔

لیکن پنجاب میں اِس مسئلہ نے ایک مختلف صورت اختیار کر لی ہے۔ ایک نوجوان شخص کو جب ترکہ میں تھوڑی سی زمین اور زیورات کی صورت میں کچھ سرمایہ ہاتھ آتا ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیا وہ اس زمین کی کاشت کرے یا اُسے لگان پر دے کر شہر میں چلا جائے۔ اور وہاں اپنی معاش تلاش کرے۔ آیا وہ زیورات کو بیچ کر روپیہ کو زمین کی کاشت پر صرف کرے۔ یا اُسے محفوظ رکھنے کی غرض سے زمین میں دفن کر دے۔ اگر وہ اپنی آبائی زمین کی کاشت کرنا ہی پسند کرے۔ تو اُسے کئی حل طلب مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اُس کا باپ گیہوں کی کاشت کرتا تھا۔ آیا اُسی کے نقشِ قدم پر چلے' یا اپنے لئے کوئی نئی راہ تجویز کرنے کی کوشش کرے۔ وہ دیکھتا ہے۔ کہ اُس کا ایک پڑوسی جس کے پاس پندرہ[۱۵] ایکڑ زمین ہے۔ گیہوں کی کاشت کرتا ہے سو اُسے بتاتا ہے۔ کہ زراعت کا دارومدار بارش پر ہے۔ گیہوں کی جڑیں بہت دور تک زمین میں چلی جاتی ہیں۔ اور اسکی فصل خشک سالی کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اِس لئے گیہوں کی کاشت کرنا ہی موزوں ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک اور کسان رہتا ہے۔ جس کے پاس صرف چار ایکڑ زمین اور ایک کنواں ہے۔ اور وہ بھی گیہوں کی کاشت کرتا ہے وہ کہتا ہے۔ کہ میرے پاس کنواں ہے۔ اس لئے گیہوں کی فصل سب سے اچھی ہے۔ دوسری جانب ایک نہر ہے۔ وہاں بھی کسان گیہوں کی کاشت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ چونکہ زمین کی آبپاشی نہر کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اِس لئے گیہوں موزوں ترین فصل ہے۔ اب اُس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیا میں بھی گیہوں کی کاشت کروں۔ یا کوئی دوسری جنس کاشت کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیا ایک ہی فصل بارانی چاہی اور نہری زمینوں کے لئے موزوں ترین ہو سکتی ہے۔ بہترین فصل سے کیا مراد ہے۔ جس سے زیادہ نفع ہو یا زیادہ پیداوار ہو۔ زیادہ فروخت ہونے والی جنس اور یا وہ جنس جسے بآسانی کاشت کیا جا سکے۔ بعض اہلِ قلم کہتے ہیں۔ کہ ایسے شخص کے لئے جو سائینٹیفک طریقوں سے کاشت کرنا چاہتا ہو۔ گیہوں کی کاشت میں کوئی وسیع میدان نہیں۔ دوسری اجناس کی کاشت میں سائینٹیفک طریقوں کے استعمال سے جس قدر فائدہ ہو سکتا ہے۔ گیہوں میں اُس قدر نہیں ہوتا۔ گیہوں کاہل اور جاہل لوگوں کیلئے تو اچھی فصل ہے۔ لیکن تعلیم یافتہ باستعداد اور سرمایہ رکھنے والے لوگوں کو اِس کی کاشت نہیں کرنا

چاہئیے۔ بعض لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ نہری زمینوں میں گیہوں کی بجائے دوسری اجناس کی کاشت کیجائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ چاہی زمینوں میں گیہوں کی کاشت ترقی کے بالکل منافی ہے۔ اور ایک جرم کی حیثیت رکھتی ہے جب یہ کیفیت ہے۔ تو پھر کسان[1] کیوں گیہوں کی کاشت کرتا ہے؟

یہ سوالات بیکار نہیں۔ بلکہ اس صوبہ کی ترقی سے انکا بہت تعلق ہے۔ کسان کیلئے یہ ضروری نہیں۔ کہ زمین اور فصل کے متعلق محض فنی اور سائینٹیفک معاملات کا علم رکھتا ہے پیداوار مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ ذریعہ ہے۔ منزل نہیں۔ بلکہ راہ ہے۔ کسان کو جو کچھ جاننا چاہئیے۔ یہ اس کا ایک جزو ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ اہم جزو ہے لیکن بہر حال جزو ہے۔ اسے ہم کل نہیں کہہ سکتے۔ کسان فصل اُگانے کی خاطر کاشت نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا فرض طلب معیشت ہے۔ اور چونکہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس لئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ سرمایہ پر گذر اوقات کرے۔ اُسے اپنی محنت۔ زمین اور سرمایہ کے نفع پر زندگی بسر کرنا[1] ہے۔ گویا کسان نفع کے لئے کاشت کرتا ہے۔ اور ذی فہم کسان اِس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کاشت کرتا ہے۔ کہ اُس سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھائے وہ بنی نوع انسان کا اِتنا بڑا ہمدرد نہیں۔ جو محض شہر کے باشندوں کا پیٹ بھرنے کے لئے محنت کرے۔ اور نہ وہ غلام ہے۔ جو محض اِس لئے محنت کرنے پر مجبور ہو۔ کہ شہر والوں کے لئے خوراک بہم پہنچائے۔ دراصل شہر والوں کو خوراک بہم پہنچانا۔ اس کی محنت و مشقت کا مقصد نہیں۔ شہر پیداوار کی منڈی ہے۔ اور کسان منڈی سے ہی نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔

کسان اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کاشت کرتے ہیں۔ اِنسان ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کا محتاج ہوتا ہے۔ اِس لئے وہ ہر وقت اپنی ضروریات پوری کرنے میں لگا رہتا ہے ہر شخص کی ضروریات خود اُس کی ذات اور اُس کی زندگی کے حالات واسباب کے ماتحت مختلف ہوتی ہیں

---

[1] یہ کہنا غلط ہے۔ کہ کسان زمین کی پیداوار پر زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ تو اس زائد پیداوار پر زندگی بسر کرتا ہے۔ جو مصارف پیداوار منہا کرنے کے بعد باقی بچ رہتی ہے۔

یہی ضروریات اور حالات و اسباب اسکی محنت کی ایک راہ معین کر دیتی ہیں۔ انسان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ صرف اسی قدر محنت کرتا ہے۔ جو اس کے محتاج کی کفیل ہو سکے اگر اس کی ضروریات مختصر ہیں۔ اور انہیں بآسانی پورا کیا جا سکتا ہے۔ تو وہ تھوڑا کام کرتا ہے۔ جوں جوں اسکی ضروریات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے کام میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بالفاظ دگر، وہ جس معیار کی زندگی بسر کرنے کا آرزومند ہے۔ اُسی کے مطابق کام کرتا ہے۔

لیکن اِس صوبہ کے متعلق اِس عام اصول کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے تقریباً تمام کسانوں کی یہ کیفیت ہے۔ کہ وہ جس چیز کی کاشت کر رہے ہیں۔ وہ موروثی طور پر اُن کے حصہ میں آئی ہے۔ انہوں نے اپنے قصد اور ارادہ سے زراعت کو ذریعہ معاش منتخب نہیں کیا۔ چنانچہ اکثر اشخاص محض اس لئے زراعت کرتے ہیں۔ کہ اُن کے پاس حصولِ معاش کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ اور حالات و اسباب نے انہیں مجبور کر رکھا ہے۔ کہ تن بتقدیر ہو کر کاشتکاری پر بسر اوقات کریں۔ گویا بہت حد تک زراعت ایک ایسی حرفت ہے۔ جس پر بہت محنت کرنے کے بعد اکثر ایسے لوگوں کی گذر کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ جو کوئی دوسرا کام نہیں جانتا۔ انہیں خوراک اور پوشش کے سوا اور کچھ میسر نہیں ہوتا۔ اور بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح نہیں کر سکتے۔

اِس سے قطع نظر کر کے دیکھئے، تو آپ کو معلوم ہو گا۔ کہ ایسے لوگوں کی بھی کثیر تعداد موجود ہے۔ جو محض خوراک اور پوشش کے سوا کسی قدر دوسری اشیاء کے بھی خواہشمند ہیں، اور اُن سرگرمیوں کا معائنہ بنظرِ غور کیا جائے۔ تو معلوم ہو گا۔ کہ اُن کی ضروریات نے اُنکے کام کی مقدار معین کر دی ہے۔ ایک شخص جس کے پاس پچاس ایکڑ ایسی زمین موجود ہے، جس کی آبپاشی کا باقاعدہ انتظام ہے۔ اُس سے معاش حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اس زمین کا نصف حصہ کسی دوسرے شخص کو لگان پر دے دیتا ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے، خود ساری زمین کی کاشت کیوں نہیں کر سکتا۔ اِس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اگرچہ اُسے جو چیزیں میسر ہیں۔ اُن کے علاوہ بھی اُسے بعض چیزوں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ اُن کا اس قدر خواہشمند نہیں۔ جتنا فرصت کا تمنائی ہے۔ زیادہ کام کرنے سے اُسے جو نفرت ہے۔ وہ اِس

جذبہ کو دبا دیتی ہے۔ کہ اُسے بعض اور اشیاء کی بھی ضرورت ہے۔ جو مزید محنت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ اگر اُسے پچاس ایکڑ زمین اور بھی مل جائے۔ تو وہ غالباً سب کو لگان پر دے دیگا۔ اور خود ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیگا۔ وہ مزید محنت کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے پر اپنی خواہشوں کا دائرہ محدود کر لے کو ترجیح دیگا۔ جب کسان کی ضروریات کاشتکاری کے بغیر پوری ہونے لگتی ہیں۔ تو وہ کاشت کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

ہم ایک اور مثال پیش کرتے ہیں۔ اِس صوبہ میں بہت سی زمین غیر مزروعہ پڑی ہے اگر یہ سوال کیا جائے۔ کہ زمین کے اِس طرح غیر مزروعہ پڑے رہنے کی وجہ کیا ہے۔ تو جواب دیا جائیگا کہ مزارعین کی تعداد کافی نہیں۔ قرب و جوار کے علاقہ میں بہت سے مزارعین موجود ہیں لیکن وہ اسی قدر زمین کی کاشت کرنا چاہتے ہیں۔ جو اُن کے پاس موجود ہے۔ وہ غالباً مفلس بھی ہیں۔ اور اِس طرح اپنی آمدنی میں اِضافہ کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ مزید محنت کرنے کے بجائے اپنی ضروریات کو محدود کر دینا پسند کرتے ہیں[1]۔

اِس سلسلے میں ایک اور واقع کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک مشہور انگریز اہلِ قلم آرتھر ینگ کو ایک مرتبہ فرانس (۸۷-۱۷۸۹ء) جانے کا اتفاق ہوا۔ اُس ملک میں اس نے زراعت کا جو طریقہ دیکھا اُس کا اس کے دِل پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اس نے بیان کیا۔ کہ فرانس میں مسلسل و پیہم محنت کی بدولت ریگ زاروں کو پُر بہار باغ بنا دیا گیا ہے۔ اور اُس پر یہ جملہ اس کی زبانِ قلم پر آ گیا۔ کہ "ملکیت کا جادو ریت کو سونا بنا دیتا ہے"۔ اُس نے انگلستان میں بڑے بڑے کھیت دیکھے تھے۔ جن کی کاشت مزارعین کرتے تھے۔ اس لئے اُسے قدرتاً یہ خیال گذرا کہ فرانس کے ریتلے علاقوں کی اِصلاح کا سبب ہے۔ کہ جو لوگ زمین کی کاشت میں مصروف تھے۔ وہ مزارعین نہیں۔ بلکہ خود مالکانِ اراضی تھے۔ اور یہ واقعیت اُن کی ملکیت کا ہی نتیجہ تھا۔ کہ زمین پر اِس قدر محنت صرف کیجاتی ہے۔ لیکن غالباً اِس کی حقیقی وجہ یہ تھی۔ کہ انگلستان میں

---

[1] ۱۹۵۸ء میں یہ دیکھا تھا۔ کہ ہر کسان چار ایکڑ زمین سے صرف ۲½ ایکڑ کی کاشت کرتا تھا۔ لیکن جوں جوں نفع کا یقین ہوتا گیا۔ مزروعہ رقبہ کا اوسط بڑھتا گیا۔

کسان کے پاس بہت بڑا رقبۂ زمین ہوتا ہے۔ اور اس طرح اپنی اور اپنے خاندان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے جو نفع حاصل کرتا ہے۔ وہ ایک وسیع حصہ اراضی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس لئے فی ایکڑ منافع کا اوسط تو کم ہوتا ہے۔ اور مجموعی طور پر پورے رقبۂ زمین کا منافع زیادہ۔ دوسری جانب فرانس میں کسانوں کی مملوکہ اراضی بہت چھوٹے رقبہ پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جن سے شوہر بیوی اور کنبہ کی ضروریات پوری کیجاتی ہیں۔ اِس لئے یہ ضروری ہے کہ فی ایکڑ منافع کا اوسط زیادہ ہو۔ فرانس کے کسان نے اگر سر توڑ محنت کی۔ تو اس خیال سے نہیں۔ کہ وہ اپنی زمین کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے سامنے دو ہی راہیں تھیں۔ یا تو سخت محنت کرے اور یا فاقوں مرے اُسے زمین کی اصلاح کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا۔ تو اُس کی پیداوار اس کے مایحتاج کے لئے کافی ثابت نہ ہوتی۔ ملکیت میں کوئی جادو یا طلسم نہیں۔ فرانس میں ملکیت کی وجہ سے زراعت نے ترقی نہیں کی۔ بلکہ محض اس لئے کہ رقبۂ زمین محدود تھا۔ اور وہ قدرتی طور پر بنجر واقع ہوئی تھی۔ اِس لئے مالکِ اراضی نے زیادہ محنت و مشقت کی۔ اور ریت کو کندن بنا دیا۔ آرتھر ینگ نے جن مالکانِ اراضی کو دیکھا۔ اگر ان کے پاس بھی وسیع رقبۂ اراضی ہوتا۔ تو وہ اُسے لگان پر دیدیتے۔ اور اسطرح جو کچھ حاصل ہوتا۔ اُس پر بیکاری اور فراغت کی زندگی بسر کرتے۔

پھر جو کچھ بیان کر چکے ہیں۔ اُس سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ کسان اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے زمین کی کاشت کرتا ہے۔ حصولِ معاش کے لئے وہ فصل پیدا کرتا ہے۔ اور مویشی رکھتا ہے۔ فصل کی کاشت کرنے اور مویشی رکھنے کے لئے مصارف کی ضرورت ہے۔ اور یہ ضروری ہے۔ کہ کسان منافع میں سے اپنی بسر اوقات کے لئے کچھ روپیہ لینے سے پیشتر ان مصارف کی فکر کرے یعنی غلّہ یا دودھ اور گھی بیچ کر اِن اخراجات کا کفیل ہو۔ گویا کسان اپنی ضروریات مویشی یا فصل کی بدولت پوری نہیں کرتا۔ بلکہ وہ فاضل روپیہ جو فصل اُگانے اور مویشی کی پرورش کرنے کے اخراجات ادا کرنے کے بعد بچ رہتا ہے۔ اُس کی ضروریات کا کفیل ہوتا ہے۔ کسان اپنی صرفت کے منافع پر زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ منافع کے لئے کاشت کرتا ہے۔ اور یہ منافع کی توقع کا کرشمہ ہے۔ کہ وہ

لہ کسان تو ملکیت کی نسبت حقوق مزارعانہ کی تعیین کا زیادہ خواہشمند ہے۔

اُس کے اندر محنت کا ولولہ پیدا کر دیتی ہے۔ اِس منافع مین کمی ہو جائے۔ تو محنت کے ولولہ مین بھی کمی ہو جاتی ہے۔ اور اگر منافع کا وجود نہ رہے۔ تو کام کرنے کا جذبہ بھی خود بخود مٹ جاتا ہے۔

یہ باتیں بظاہر مبتدیانہ اور معمولی معلوم ہونگی۔ لیکن اِن کا ذکر ضروری ہے۔ اور بد قسمتی سے یہ مبتدیانہ باتیں بھلا دی جایا کرتی ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ اگر غیر ملکی تجارت پر قیود عاید کر دی جائیں۔ تاکہ اس کی قیمت کم ہو جائے۔ اِس طرح کسان کو اتنا فایدہ نہیں ہوگا۔ جو گیہوں کی آزادانہ تجارت میں اُسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور شہر کا باشندہ سستے داموں گیہوں حاصل کریگا۔ شہر کے باشندے کا فائدہ کسان کے لئے نقصان کا سبب ہو گا۔ اور اُس میں فصل کی کاشت کا جذبہ اور ولولہ کم ہو جائیگا۔ اگر دوسری اشیاء کی قیمت بھی ساتھ ہی کم کر دی جائے۔ تو یہ طریقہ فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ ورنہ اس کا یہی نتیجہ ہو گا۔ کہ گیہوں کی فصل غیر منفعت بخش ہو جائیگی۔ اسی طرح یہ تجویز بھی پیش کی جاتی ہے۔ کہ ہندوستان سے روئی کی برآمد ممنوع قرار دی جائے۔ تاکہ ہندوستانی صناع پارچہ بافی کے کارخانوں کے لئے ارزاں نرخ پر روئی حاصل کر سکیں۔ لیکن اگر اِس طریق پر عمل کیا گیا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ روئی کی فصل بھی زیادہ منفعت بخش نہیں رہے گی۔ اور لوگوں کو یہ خیال نہیں آئیگا۔ کہ وہ روئی کی کاشت کریں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اگر کسان کی ضروریات محنت کے بغیر پوری ہو جائیں۔ تو وہ کاشت نہیں کریگا۔ یا اگر اُسے کم محنت سے ہی ضروریاتِ زندگی حاصل ہو جائیں۔ تو وہ زیادہ محنت کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہو گا۔ اگر آج بہت سی زمین غیر مزروعہ پڑی ہے۔ تو اس کا سبب یہی ہے کہ لوگ اس کے بغیر اپنی حاجتیں پُوری کر سکتے ہیں۔ اور اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے۔ جو اپنی محنت اور مشقت کا دائرہ وسیع کرنے کی بجائے اپنی ضروریات میں کمی کرنا پسند کرتے ہیں۔ اِس سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ جس چیز سے کسان کے قلب میں محنت کرنے کا ولولہ کم ہو جاتا ہے۔ اُس سے فصل کی پیداوار میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔

اِس ملک میں یہ امر خاص طور پر نظر آتا ہے۔ کہ لوگ زیادہ محنت کر کے اعلیٰ درجہ کی زندگی بسر کرنے کے بجائے تھوڑی محنت کر کے ادنےٰ معیار کی زندگی بسر کرنا قبول کر لیتے ہیں۔

سطورِ بالا میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ کسان کے نزدیک شہر کی حیثیت منڈی ہے جہاں وہ زائد از ضرورت فروخت کرتا ہے۔ اگر وہ اپنے پیشے کے علمی اور فنی پہلو سے بھی واقف ہے۔ تو اپنی زمین سے ایسا کام لیگا۔ جس سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو سکے۔ اور سامانِ خورونوش شہر کی منڈیوں سے خریدیگا۔ کیونکہ شہر کے باشندوں کے لئے خوراک فراہم کرنا اُس کا فرض نہیں۔ بلکہ اگر اُسے دوسری اجناس سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے۔ تو اُسے غلّہ کی کاشت ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ یہاں ہم اس امر پر زور دینا چاہتے ہیں۔ کہ ایک صناع کی طرح کسان بھی اہلِ حرفہ ہے۔ جب ایک صناع کا یہ فرض نہیں۔ کہ اُس کے پڑوسی جس چیز کو استعمال کرنا چاہیں۔ وہی تیار کرے۔ تو کسان کیلئے بھی یہ ضروری نہیں۔ کہ اُسی چیز کی کاشت کرے جس سے اس کے پڑوسی پیٹ بھر سکیں۔ اُسے بھی صناع کی طرح اِس بارے میں آزادانہ اِختیار و اِنتخاب سے کام لینا چاہئے۔

اگر اس امر کو پوری طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ کہ کسان زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی خاطر کاشت کرتا ہے۔ تو زمین کے متعلق اکثر خیالات باطل اور بودے قرار پاتے ہیں۔ جرمنی میں جو لوگ اراضی پر کام کرتے ہیں۔ اگر انکا اندازہ لگایا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ جرمنی میں ہر سو ایکڑ اراضی پر انگلستان کی نسبت زیادہ آدمی کام کرتے ہیں۔ اور چونکہ وہاں اراضی پر زیادہ محنت صرف ہوتی ہے۔ اِس لئے وہاں فی ایکڑ پیداوار کا اوسط انگلستان سے زیادہ ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ انگلستان میں فی کس نفع کا اوسط جرمنی کی نسبت زیادہ ہے۔ انگلستان میں امریکہ کی نسبت فی ایکڑ زمین کی پیداوار کا اوسط زیادہ ہے۔ لیکن امریکہ میں فی کس نفع کا اوسط انگلستان سے بڑھا ہوا ہے یہاں عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ فی ایکڑ کتنے من غلہ پیدا ہوتا ہے۔ اِسطرح یہ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ فی ایکڑ پیداوار کیا ہے۔ لیکن زراعت کی صحیح حالت معلوم نہیں ہو سکتی۔ اور اس سے فی ایکڑ نفع یا فی کس نفع کا حال معلوم نہیں[1] ہوتا۔

---

[1] کپاس کی کاشت کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور مجموعہ قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ فی ایکڑ اضافہ پیداوار سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ قیمت پیداوار فی ایکڑ میں اضافہ ہو جائے یا منافع فی ایکڑ بڑھ جائے۔

اِس سلسلہ میں حسب ذیل نکات ضروری ہیں۔ جو ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔
اگر فی ایکڑ خام پیداوار سے فی ایکڑ پیداوار کے مصارف کو منہا کر دیا جائے۔ تو فی ایکڑ نفع خالص رہ جاتا ہے۔ پورے قطعہ زمین کی پیداوار خام سے پورے قطعۂ زمین کے اخراجات منہا کر دیئے جائیں۔ تو باقی جو کچھ رہیگا۔ وہ اِس قطعۂ زمین کا منافع خالص ہوگا۔ فی کس پیداوار خام سے فی کس اخراجات نکال دیئے جائیں۔ تو معلوم ہو جائیگا۔ کہ فی کس محنت سے کس قدر نفع خالص ہوا ہے۔ تجارتی نقطۂ خیال سے عام طور یہی بہتر سمجھا جاتا ہے۔ کہ پیداوار خام بہت زیادہ ہو۔ کیونکہ اِسطرح تجارت کا مال زیادہ سے زیادہ مقدار میں حاصل ہو سکے گا۔ ایک مالک اراضی جو لگان کے بجائے پیداوار میں سے حصہ لیتا ہے جسے اصطلاح میں بٹائی کہتے ہیں۔ یہ چاہتا ہے۔ کہ فی ایکڑ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو۔ لیکن ادھر مزارع کی خواہش ہے۔ کہ اسے منافع اتم حاصل ہو۔ (maximum profit) اگر وہ اراضی کی کاشت خود کرتا ہے۔ تو اس کا مدعا محض زیادہ سے زیادہ منافع خالص کا حصول ہوتا ہے۔ اگر وہ مزدوروں کو اُجرت دیکر کاشت کراتا ہے۔ تو زیادہ سے زیادہ منافع خالص فی کس اس کا مقصود ہوتا ہے۔ ایک حکومت جو منافع خالص فی ایکڑ میں سے حصّہ طلب کرتی ہے۔ صرف فی ایکڑ منافع سے سروکار رکھتی ہے۔ اور پوری اراضی کے نفع کی جانب توجہ نہیں کرتی۔ لیکن اگر اُسے اراضی سے انکم ٹیکس وصول کرنا ہو۔ تو حکومت کا کلکٹر پوری اراضی کے منافع کی جانب زیادہ توجہ کریگا۔ عملی طور پر یہ ہوتا ہے۔ کہ فی ایکڑ پیداوار زیادہ ہو۔ تو فی ایکڑ منافع بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ کسان کو یہ صورت بہت کم پیش آتی ہے۔ کہ تفصیل حاصل کی وجہ سے اُسے نقصان ہو۔ مزید براں ہمیشہ بھی ایسا نہیں ہوتا۔ کہ فی ایکڑ پیداوار زیادہ ہونے کے باعث فی کس پیداوار یا فی کس منافع بھی زیادہ ہو۔ حالانکہ کسان کا زیادہ تعلق فی کس پیداوار سے ہے۔ یہی اختلاف ہے۔ جس کی بناء پر مصنفین کے مابین بھی اختلاف و تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ ان میں ہر شخص ایک مختلف پہلو کا معائنہ کرتا ہے۔ اور اس اہم سوال کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ کہ کسان کیوں کاشت کرتا ہے؟ جس ملک سے اجناس دوسرے ملکوں میں جاتی۔ اُس کی یہ کیفیت ہوگی۔ کہ جب فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ ہو جائیگا۔ تو رقبہ مزروعہ کم ہوتا جائیگا۔ کیونکہ مقامی ضروریات کے لئے چھوٹے سے رقبہ کی پیداوار بھی کافی ثابت

ہو گی۔ اِس لئے یہ سوال بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ کہ کسان کو زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے کیا طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ اِس سوال کے حل کے لئے مختلف مباحث کا علم ضروری ہے۔ اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ کہ زراعتی اقتصادیات کا مطالعہ خاص توجہ سے کیا جائے۔ ہر علاقہ میں کسی خاص جنس کی پیداوار کی خاص سہولتیں مہیا ہوتی ہیں۔ اور اگر اس علاقہ کے لوگ اس خاص جنس کی کاشت پر اپنی توجہ صرف کر دیں۔ تو اُن کا علاقہ متموّل ترین بن جائیگا۔ اِس کے لئے فنِ زراعت کا علم حاصل رکھنا ہی ضروری نہیں۔ اگر کسان زراعت کے فنی نکات سے باخبر ہو۔ تو وہ ایک ایسی جنس کی کاشت کر سکتا ہے۔ جس کی بدولت اُسے زراعتی نمائش میں انعام مل جائے۔ لیکن اگر وہ اُس جنس کو کہیں فروخت نہ کر سکے۔ تو اُسے نقصان ہوگا۔ اور اُس کی ساری فنی معلومات طاق پر دھری رہ جائینگی۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ علاقہ کی زمین جس جنس کے لئے موزوں ہے۔ اس کی کاشت بھی کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ کسان کو کئی امور پیشِ نظر رکھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہوگا۔ کہ کس جنس کی کاشت کی جائے۔ کُلّو جیسے علاقہ میں جہاں ذرائع آمد و رفت ناقص ہیں یہ ضروری ہے۔ کہ اسی قدر پھل پیدا کئے جائیں۔ جو فوراً فروخت ہو جائیں۔ اور اُن کے بجائے اجناسِ خوردنی کی کاشت کی جائے۔ جو عام طور پر ادنیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ انگلستان میں جہاں ذرائع آمد و رفت مکمل و منظم ہیں۔ اور ہر ملک سے تعلقاتِ رسل و رسائل قائم ہیں گیہوں اور دوسرے اشیائے خوردنی کی درآمد آسان ہے۔ اِسلئے وہاں کے باشندوں کے لئے یہی بہتر ہے۔ کہ اسی جنس کی جانب توجہ کریں، جو گراں قیمت پر بِک سکے مثلاً دودھ فراہم کرنے کے لئے گائیں بھینسیں پالی جائیں۔ یا ثمردار درختوں کے باغ لگائے جائیں، پنجاب میں ثمردار درختوں کی کاشت مفید ہو گی۔ لیکن یہ صوبہ سمندر سے اِس قدر دُور ہے۔ کہ اِس کے لئے اجناسِ خوردنی کی فصل ہی مفید ہو گی۔ کیونکہ یہاں اِسے سارے پھلوں کے لئے کوئی منڈی نہیں مل سکتی۔ اِسی وجہ سے گیہوں کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی ہے گیہوں ایسی جنس نہیں۔ جس سے کسی ایک کسان کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ گیہوں مجموعی طور پہ تمام کسانوں کے لئے ایک منفعت بخش جنس کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ ہمیشہ فروخت ہو سکتا ہی اِس طرح گویا اصل سوال یعنی "کسان کیوں کاشت کرتا ہے" کا جواب تلاش کرنے کیلئے

ہمیں مال کی فروخت کے مختلف مسائل کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ پیداوار کا انحصار منڈی پر ہے۔

کیلئے فورنیا میں جہاں[1] بیرونی علاقوں سے بھی اشیاء خوردونوش لائی جاسکتی ہیں۔ کسانوں کے لئے یہ ممکن ہے پھلوں کی پیداوار پر اپنی توجہ صرف کردیں۔ اور ذرائع آمدورفت کے مکمل ہونے کے باعث اُنہیں جو سہولتیں حاصل ہیں۔ اُن کی وجہ سے پھلوں کے لئے منڈی بھی تلاش کرلیں۔ ڈنمارک میں یہ آسان ہے۔ کہ زمین کو مویشیوں اور دودھ مکھن پنیر وغیرہ کے لئے وقف کردیا جائے۔ کیونکہ اس ملک کے ذرائع رسل ورسائل اچھے ہیں۔ اور اس کی خاص پیداوار کی جزائر برطانیہ میں بہت کھپت ہے۔ اسی طرح ہالینڈ۔ فرانس کے بعض حصوں اور جزائر رود بار میں زمین میں پھلوں پھولوں اور دوسری چیزوں کی جو انگلستان کی منڈی میں فروخت ہو سکتی ہیں۔ کاشت ہوتی ہے۔ اور منڈی یہ فیصلہ کردیتی ہے۔ کہ کس چیز کی کاشت کی جائے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں اُون بہت پیدا ہوتی ہے۔ اور دور دور کی منڈیوں میں جاکر فروخت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تجارت پر دور کی منڈیوں کا بھی اثر پڑ سکتا ہے۔ لیکن اُون میں یہ خوبی ہے۔ کہ اس کی قیمت بڑی ہوتی ہے۔ اور جب اُسے دباکر بوریوں میں رکھ دیا جاتا ہے۔ تو اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے میں اس کی قیمت کے مقابلہ میں بہت کم لاگت آتی ہے۔ آسٹریلیا کی زمین زیادہ گیہوں بھی پیدا کرسکتی ہے۔ لیکن اگر اس گیہوں کو انگلستان بھیج دیا جائے۔ تو وہاں کناڈا کے گیہوں سے اُن کا مقابلہ ہوگا۔ اور زیادہ قیمت نہیں ملے گی۔ چونکہ کناڈا میں اُون پیدا نہیں ہوتی۔ اس لئے آسٹریلیا کی اُون اچھے داموں بک جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ اس کے علاوہ بعض اور عناصر بھی برسرکار نظر آتے ہیں۔ لیکن اُن سے اس مقولہ کی صداقت کی تردید نہیں ہوتی۔ کہ پیداوار کا انحصار منڈی پر ہے۔

---

[1] لاہور جیسے بڑے بڑے شہروں میں جب چارہ کی مانگ زیادہ ہوتی ہے۔ تو اکثر کسان چارہ کی کاشت پر اپنی توجہ مرکوز کردیتے ہیں۔ تمام بڑے بڑے شہر قرب وجوار کی زمین کے مصرف پر بہت اثر ڈالتے ہیں۔

خوراک کا حصول ہر شخص کے لئے مقدم ہے۔ پنجاب کا کسان یہ کر سکتا ہے۔ کہ خوراک جو دوسرے ملکوں سے بھی مہیا کیجا سکتی ہے۔ بازار سے خریدے۔ اور خود ایسی اشیار کی زراعت کرے۔ جن سے اُسے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو سکے۔ لیکن ملک کے لئے بحیثیت مجموعی اس امر کا کوئی نہ کوئی انتظام ہونا چاہیئے۔ تمام آبادی کے لئے کافی خوراک فراہم ہو سکے گی۔ کسان کو خواہ اجناس خوردنی کی کاشت دوسری اجناس کے مقابلہ میں منفعت بخش معلوم نہ ہو۔ کیونکہ باہر سے آئے ہوئے غلّہ کی وجہ سے اجناس خردنی کی قیمت اس قدر کم ہو جائے گی۔ کہ کسان کو کوئی نفع نہیں ہوگا۔ لیکن چونکہ انسان کو خوراک کی ضرورت ہے۔ اس لئے وہ اسکے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلکہ خوراک کے لئے اس سے جسقدر قیمت طلب کی جائے گی۔ دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اگر باہر سے آئے ہوئے غلّہ پر محصول لگا دیا جائے۔ تو شاید اس ملک میں غلّہ کی کاشت زیادہ منفعت بخش ثابت ہوگی۔ گویا کسان کے منافع میں اضافہ کرنے والے طریقے اختیار کر کے اسے ایک ایسی جنس کی کاشت پر مائل کیا جائے۔ جو عام حالات میں منفعت بخش ثابت نہیں ہوتی۔ اور جس طرح پچھلے دِنوں انگلستان میں حکومت نے گیہوں کے خاص منفعت بخش قیمت پر بکنے کا سامان مہیّا کر دیا تھا۔ اِسی طرح یہاں بھی کیا جائے۔ یہاں یاد رکھنے کے قابل تو یہ نکتہ ہے۔ کہ از بس کاشتکار نفع کے لئے کاشت کرتا ہے۔ اِس لئے اگر اُسے اِس امر پر آمادہ کرنا مقصود ہو۔ کہ وہ اس وقت جس قدر زمین کاشت کرتا ہے۔ اُس سے بڑی زمین کی کاشت کرے۔ تو اُس کے نفع میں اضافہ کرنے کا انتظام مہیّا کرنا چاہیئے لیکن اگر غلّہ کی برآمد ممنوع قرار دی گئی۔ تو فصل کی پیداوار کم ہو جائیگی۔ اگر شہر والوں کی یہ خواہش ہے۔ کہ انہیں ہمیشہ کافی خوراک بہم پہنچتی رہے۔ تو انہیں چاہیئے۔ کہ وہ ایسے طریقوں کے اختیار کرنے پر زور دیں۔ جن سے کسان کے منافع میں اضافہ ہوتا رہے۔ لیکن اُن سے اُس وقت تک اس امر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جب تک انہیں اِس سوال کا صحیح جواب نہ معلوم ہو جائے۔ کہ "کسان کیوں کاشت کرتا ہے؟"

چوتھا باب

پنجاب کی اِقتصادی حالت

جغرافیائی محلِ وقوع۔ سڑکیں۔ ریلیں۔ اور نہریں۔ تجارت میں اضافہ!!

اس وقت تک کسی ملک کے اِقتصادی معاملات پر طویل بحث نہیں کی جا سکتی۔ جب تک اس کے جغرافیائی محلِ وقوع کا پورا پورا علم نہ ہو جائے۔ ہر شخص اپنی ضروریات کی تمام چیزیں خود پیدا نہیں کرتا۔ وہ کسی نہ کسی ضروری چیز کے لئے ضرور دوسرے کا محتاج ہوتا ہے۔ ہر ملک میں کوئی نہ کوئی چیز اِس کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ کہ ملک کی ضروریات پوری کرنے کے بعد کچھ حصہ بطور فاضل بچ رہتا ہے۔ اِسی طرح ہر ملک میں کوئی نہ کوئی چیز اُس قدر کم پیدا ہوتی ہے کہ وہ تمام ملک کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ زائد از ضرورت چیز کو ٹھکانے لگانے اور کمی کو پورا کرنے کا نام ہی مختلف ملکوں کی باہمی تجارت ہے۔ اور اِسی کو درآمد اور برآمد کہتے ہیں۔ بعض حلقوں میں یہ خیال بہت پھیلا ہؤا ہے۔ کہ برآمد ملک کی قوت کو ضعیف کرتی ہے۔ اور درآمد ضعف کے موجود ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ جو چیزیں باہر بھیجی جاتی ہیں۔ وہ اسی ملک میں رکھی جائیں۔ تاکہ اُن کے باشندے اُن سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اشیاء ارزاں ہو جائیں۔ اور جو چیزیں باہر سے منگوائی جاتی ہیں۔ وہ ملک کے اندر ہی پیدا کی جائیں۔ عام طور پر ہر سال پنجاب میں جس قدر گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہاں کے باشندوں کی اپنی ضروریات سے زیادہ[1] ہوتا ہے۔ چنانچہ جسقدر اُن کی ضروریات

---

[1] اِس مسئلہ کی بحث کیلئے پروفیسر کیل کی کتاب انڈین اکنامکس (ہندوستانی علم الاقتصاد) کا مطالعہ کیجیے۔ تیسرا ایڈیشن صنہ ۱۱۔ اگر بعض بدیہی حقایق کو نظرانداز کر دیا جائے تو لکیر تاریک تصویر کھینچ دی ممکن ہے۔ سر جیمز ولسن نے ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کی سالانہ زائد ضرورت غلہ کا اندازہ پندرہ[۱۵] لاکھ ٹن کیا تھا۔

سے بچ رہتا ہے۔ اُسے باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ کسان یا تاجر کیلئے یہ امر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کہ آیا یہ زاید از ضرورت غلہ بنگال نے مزید یا انگلستان نے۔ ان کے لئے یہ جاننا ضروری ہے۔ کہ جس نے اس کی زیادہ قیمت دی۔ اُن کے ہاتھ فروخت کیا گیا۔ اور یہ چیز ان دونوں کے لئے مفید ہے۔ پنجاب کے متعلق بحث کرتے ہوئے اِس بحث کو چھیڑ دینا غیر ضروری ہے۔ کہ آیا سارے ہندوستان میں جس قدر غلہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس کے باشندوں کی صحت اور قابلیت کو پوری پوری طرح قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ اِس صوبہ کے لوگوں کے بیشتر حصّہ کی خوراک گیہوں ہے۔ اور از بسکہ یہاں سے بڑی مقدار میں گیہوں باہر بھیجا جاتا ہے۔ اِس لئے یہ ثبوت ہے۔ اِس امر کا کہ اِس صوبہ میں زائد از ضرورت غلّہ پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستان کے باقی حصّوں کی صحیح حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ بہر حال اِس امر میں تو شبہ نہیں۔ کہ اِس صوبہ میں اجناس خوردنی کی پیداوار آبادی کی نسبت زیادہ سرعت سے ترقی کر رہی ہے۔ اگر اِس زائد غلّہ کا کوئی نکاس نہ ہوتا۔ اور اُس کے لئے کوئی گاہک نہ ملتا تو اُسے پیدا ہی نہیں کیا جاتا۔ زمین کی زراعت کے لئے وقت اور سرمایہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر محنت اور سرمایہ کے ایک حصّہ کے صرف کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو۔ تو اہلِ زراعت محنت اور سرمایہ کا وہ حصہ ضائع نہیں کرینگے۔

بعض لوگوں کی رائے میں یہ زاید گیہوں باہر نہیں بھیجنا چاہیئے۔ اگر یہ جواب دیا جائے۔ کہ اِس صورت میں اِس قدر غلّہ کی کاشت ہی نہ کی جائے گی۔ کہ کچھ باقی بچ رہے۔ تو اس کے جواب میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے۔ کہ اس طرح جو وقت اور محنت بچ رہے گی۔ اسے اُن چیزوں کی ساخت پر صرف کرنا چاہیئے۔ جو اب باہر سے اِس ملک میں لائی جاتی ہیں۔ یہ دلیل ایک ملک کے اسبابِ خوشحالی کے متعلق ایک عجیب و غریب اور مکمل غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اور اس میں یہ ملک کی جغرافیائی حیثیت اور اس کے متعلقہ امور کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اگر کسی ملک کو خوشحالی حاصل کرنا ہے۔ تو اس کے باشندوں کو چاہیئے۔ کہ وہ ایسی چیزوں کے پیدا کرنے پر توجہ صرف کریں۔ جنہیں پیدا کرنا حالات و اسباب کے عین مطابق ہو۔ اور جن سے بہت سے فوائد اور منفعتیں حاصل ہو سکیں۔ یہ سوال زیر بحث نہیں۔ کہ آیا علمی اور فنی زاویۂ نگاہ سے پنجاب میں فلاں فلاں اشیاء کا پیدا کرنا ممکن ہے۔ جو کسی دوسرے

صوبہ یا ملک سے یہاں لائی جاتی ہیں بلکہ دیکھنا تو یہ ہے۔ کہ آج جو جنس اِس صوبہ میں باشندوں کی ضروریات سے زیادہ پیدا کی جاتی ہے ۔اس کے بجائے اگر فلاں چیز کی پیدائش پر توجہ کی جائے۔ تو کیا اُس سے زیادہ فائدہ ہوگا ۔اکثر ممالک میں بعض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں۔ جن کی بدولت بعض اشیا کا پیدا کرنا آسان ہوتا ہے۔ اور بعض کا مشکل آب و ہوا۔ قدرتی ذرائع جغرافیائی محلِ وقوع بہت حد تک اس امر کی تعیین کر دیتے ہیں۔ کہ ملک کے باشندوں کو کس منزل کی جانب رُخ کرنا چاہیئے جس زمانہ میں رسل و رسائل اور آمد و رفت کے ذرائع نے اِس قدر ترقی نہیں کی تھی۔ اکثر مقامات کے باشندے ایسی اجناس پیدا کرتے تھے ۔جن کے لئے مقامی حالات موزوں نہیں تھے۔ جب سے ذرائع آمد و رفت میں ترقی ہو رہی ہے۔ اور رسل و رسائل کا سامان ارزاں ہو گیا ہے ۔باہمی مقابلہ کی بدولت اکثر مقامی صنعتوں کا وجود اُن مقامات پر نہیں دکھائی دیتا ۔جہاں حالات اُن کے مطابق نہیں تھے ۔اور جہاں اُنکی ترقی کے لئے سہولتیں مہیا ہیں۔ وہاں انہوں نے قدم جما لئے ہیں ۔ اِسلئے یہ ضروری ہو جاتا ہے ۔کہ پنجاب کے اُن مخصوص مقامی حالات کا مطالعہ بدقّت نگاہ کیا جائے جو دراصل اُس کے جغرافیائی محلِ وقوع کے باعث پیدا ہو گئے ہیں ۔پنجاب کے جغرافیائی محلِ وقوع میں کوئی تغیّر ناممکن ہے۔ ہاں ایسے طریقے ضرور اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ جن سے اُس کے فوائد کا دائرہ وسیع کیا جا سکے ۔یا اس کے نقائص کو کم کیا جا سکے ۔اگر ترقی کا جذبہ پیدا کرنا مقصود ہے' تو اِس سعی کے تمام متعلقہ امور پر پوری وضاحت سے اِطّلاع حاصل کر لینا چاہیئے ۔اور ان کے اثرات و نتائج کی تفصیل معلوم کر لینا چاہیئے ۔مثلاً صنعت کی ترقی کے سلسلے میں ان مسائل کا حل سب سے زیادہ آسان ہے ۔جو اصطلاحی حیثیت رکھتے ہیں۔ مصارفِ پیداوار کا مسئلہ اس کا بہت اہم عنصر ہے ۔لیکن اہم ترین حیثیت نہیں رکھتا۔ کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے ۔کہ مال اس مقام پر پہنچا دیا جائے ۔جہاں اُس کی کھپت ہو سکے ۔اور مال اپنی خوبی اور قیمت کے اعتبار سے ایسا ہو۔ کہ گاہک کو دوسرے مال کے مقابلہ میں جو اُسی وقت اس مقام پر فروخت ہو رہا ہو۔ حقیر نظر نہ آئے ۔پنجاب میں گیہوں کے بجائے اور چیزیں بھی پیدا کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً نارنگیوں کا فی ایکڑ نفع خالص گیہوں سے زیادہ ہے ۔اور اُنکی قیمت خام بھی گیہوں کی نسبت زیادہ ہے ۔یہی فروخت کا مسئلہ ہے ۔جو زراعت اور دوسری صنعتوں کی آئندہ ترقی

پر بہت اثر انداز ہوگا۔ اگر اس صوبہ کو دوسرے علاقوں کے ساتھ کامیابی سے مقابلہ کرنا ہے تو اس میں کوئی ایسا وصف ہونا چاہیئے، جو اس حد تک دوسرے صوبوں میں موجود نہ ہو۔ گویا اس صورت میں صوبہ کے پیشِ نظر وہ چیزیں نہیں ہونگی۔ جنہیں تیار کرنا عوام کے مرغوبِ خاطر ہے۔ بلکہ اُسے ایسی اشیاء کی ساخت مدِنظر ہوگی۔ جنہیں بنانے کے لئے صوبہ کے مقامی حالات خاص طور پر موزوں واقع ہوئے ہیں۔ اپنے ملک کی منڈی میں تو اشیاء کی فروخت پر جذبات و احساسات اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ لیکن غیر ملکی شہروں سے تجارت کی جائے۔ تو وہاں محض جذبات کا خیال نہیں رکھا جائیگا۔ بلکہ مادی منفعت پیشِ نظر ہوگی۔ اِس امر کا فیصلہ خریدار کے ہاتھ ہے۔ کہ آیا پنجاب کو بیرونی ممالک میں کپڑا بھیجنے کے لئے پارچہ بافی کرنا چاہیئے یا نہیں۔ اسی طرح اِن صنعتوں کی ترقی بھی خریدار کے ہاتھ میں ہے۔ جن کی پیداوار بحالتِ موجودہ مقامی ضروریات سے زائد ہے۔ اِس لئے یہ امر نہایت غور و توجہ کا محتاج ہے۔ کہ مال کی فروخت کے لئے منڈی کیونکر فراہم کی جائے۔ جاپان کئی جزیروں پر مشتمل ہے۔ جنمیں کئی اچھی بندرگاہیں ہیں۔ جہاں سے ایشیا اور امریکہ کا سفر آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اِس ملک کی وہ تمام صنعتیں جنہیں حکومت فروغ دینے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ دوسرے ملکوں کو مال بھیجنے کی وجہ سے زندہ ہیں۔ خود جاپان میں بہت کم ملکی مصنوعات کی کھپت ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ جاپان کی صنعت بیرونی خریداروں کے رحم و کرم پر ہے۔ جب بیرونی خریدار نے مال خریدنے سے انکار کر دیا۔ تو ایک شدید صنعتی مشکل پیدا ہوگئی۔ چین، جاپان کی بندرگاہوں کے قریب واقع ہُوا ہے۔ اِس لئے رسل و رسائل سے بھی جاپانی نفع حاصل کرتے رہے ہیں۔ لیکن اِس صوبہ کے لوگوں کی بدقسمتی ہے۔ کہ یہاں کی چیزیں جس منڈی میں بِک سکتی ہیں۔ وہ بہت فاصلہ پر واقع ہے۔ اور اُن کے وہاں بھیجنے سے جو نفع حاصل ہوگا۔ وہ پنجابیوں کی بجائے دوسروں کی جیب میں جائیگا۔

اِس صوبہ کے ہر چہار جانب خشکی ہی خشکی نظر آتی ہے۔ یہاں ایسے دریا بھی موجود نہیں[1] جن میں درمیانہ جسامت کی کشتیاں چل سکیں۔ اور جن کی مدد سے سمندر سے تعلق قائم ہو سکے۔

---

[1] گویا اس صوبہ کا کوئی دریا ایسا نہیں۔ جس میں اس قسم کی ملکی کشتیاں بھی چل سکیں۔ جیسی یورپ کے باقی دیکھو برصفحہ ۱۰۰)

ایک اور نقص یہ ہے۔ کہ اسے تین جانب سے ایسے ممالک گھیرے ہوئے ہیں۔ جہاں پنجاب کی پیداوار فروخت نہیں ہو سکتی۔ یہ صوبہ ایک گنجان آبادی رکھنے والے جزیرہ نما کی مانند ہے۔ کیونکہ اس کے شمال مغرب کی جانب ایک ایسا علاقہ ہے جہاں آبادی بہت کم ہے۔ شمال میں کشمیر لداخ اور تبت ہیں۔ اُن سے آگے ترکستان کا صحرا ہے۔ مغرب کی سمت افغانستان اور بلوچستان واقع ہیں۔ اور اُن سے آگے ایران۔ جنوب کی جانب بیکانیر اور راجپوتانہ ہیں جن کی آبادی بھی نسبتاً بہت کم ہے۔ ان تمام ملکوں میں اتنے خریدار نہیں، کہ پنجاب کی پیداوار کے لئے منڈیاں مہیا کر سکیں۔ اس لئے سالہا سال تک ان سے بڑے پیمانے پر تجارت نہیں ہو سکتی۔

پنجاب کے مشرق کی جانب صوبجات متحدہ کا علاقہ ہے۔ جہاں پنجاب کا مال بک تو سکتا ہے لیکن پنجاب اور صوبجات متحدہ زمین اور آب و ہوا اور باشندوں کے اعتبار سے آپس میں بہت ملتے جلتے ہیں۔ انکی پیداوار بھی ایک جیسی ہے۔ اس لئے وہ تجارت کے بارہ میں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔

پنجاب کے جغرافیائی محل وقوع کے نتائج بہت اہم اور دور رس ہیں۔ اور ہمیشہ رہینگے۔ یہ صوبہ چونکہ ریگ زاروں کے ایک گوشہ پر آباد ہے۔ اس لئے یہاں معقول تجارت نہیں ہو سکتی اور نہ یہاں کے باشندوں کو انگلستان والوں کی طرح ایجنٹ اور دلال بنکر اور اپنی سرحد سے آگے بڑھ کر تجارت کرنے کا موقع حاصل ہے[1]۔ ریلوے کی تعمیر سے پہلے پنجاب کی تجارت لے دے کے صرف افغانستان اور وسط ایشیا سے تھی۔ لیکن نہ تو یہ تجارت زیادہ اہم اور نہ وسیع اور کبھی

(بقیہ از صفحہ ۹۹) دریاؤں میں چلتی ہیں۔ ایک ہی لفظ کے متعلق ہندوستان میں بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ جب کوئی یورپین اس کا استعمال کرتا ہے۔ تو اس کے کچھ اور معنی لئے جاتے ہیں۔ اور جب کسی ہندوستانی کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ تو کچھ اور معنی +

[1] پنجاب کے حالات کا مقابلہ ہالینڈ سے کیا جا سکتا ہے۔ پچھلے دنوں تک نہ تو اس ملک میں معدنیات کا وجود تھا۔ مصنوعات بھی نہیں تھیں۔ زراعت بھی منظم نہیں تھی لیکن دلّال کی حیثیت سے اُسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ لیکن ہالینڈ کی جغرافیائی حالت اس کی کامیابی کا بہت بڑا ذریعہ تھی۔

یہ ظاہر نہیں ہوا۔ کہ اس میں وسعت کی اہلیت بھی ہے یا نہیں عملی طور پر بمبئی سے کوئی اہم تجارتی تعلق نہیں تھا کراچی سے بہت تھوڑی تجارت تھی۔ انگریزوں سے پہلے جو لوگ اس صوبہ پر حکمران تھے۔ انہوں نے بڑی بڑی سڑکیں تعمیر نہیں کیں۔ پختہ سڑکیں بنانے سے لوگ عملی طور پر بے خبر تھے۔ بڑے بڑے دریاؤں پر پل نہیں تھے۔ رسل و رسائل کی سہولتیں مفقود تھیں۔ کبھی غلہ اتنا سستا ہو جاتا تھا کہ اسے فروخت کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ کیونکہ زائد از ضرورت غلہ کے نکاس کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اب بھی جہاں جہاں پل ہیں۔ دریا تجارت کے لئے راہ بنے ہوئے ہیں۔ دہلی سے انبالہ تک دریائے جمنا کو کشتیوں پر عبور کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح زیادہ آمد و رفت نہیں ہوتی مغرب کی جانب سندھ ایک اور دشوار گذار حد فاصل بنا ہوا ہے۔ ہر سال عام طور پر کئی کئی صوبہ کے پانچوں اندرونی دریا چڑھے رہتے ہیں۔ اس لئے ریلوے یا پلوں کے سوائے ان سے آر پار گذرنے اور تجارت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔

رسل و رسائل کے لئے منظم طریق پر آسانیاں مہیا نہ ہوں۔ تو ذرائع آمد و رفت کو وسیع کرنے کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ (اب اس اہمیت کا احساس کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ رسل و رسائل کے لئے ایک مستقل کمیٹی قائم کر دی گئی ہے) اس زمانے کے رسل و رسائل کے جو نئے سامان مہیا کئے گئے ہیں۔ وہ نہ ہوں، تو ان علاقوں میں جو بڑے بڑے شہروں سے فاصلہ پر واقع ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی زراعت کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ زراعتی پیداوار میں سے اکثر چیزیں ایسی ہیں۔ جن کے لئے کسی منڈی کا قرب نہایت ضروری ہے۔ ذرائع آمد و رفت اچھے ہوں۔ تو زراعت بھی اچھی طرح ہوگی۔ پیداوار کا انحصار تو منڈی پر ہے۔ منڈی اچھی نہ ہو تو پیداوار کو زوال ہوگا۔ اور منڈی اچھی ہوئی۔ تو فروغ حاصل کرے گی جب تک ریلوے اور پختہ سڑکیں نہیں تھیں شہروں کے قرب و جوار کے علاوہ کسی جگہ اچھی طرح زراعت کرنا ممکن نہیں تھا۔ پہلی ریلوے لائن ۱۸۵۶ء میں تعمیر ہونی شروع ہوئی۔ اور ۱۸۶۱ء[1] میں اس پر آمد و رفت شروع ہونے لگی۔ لیکن اسوقت

[1] ایک اور بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سے امرتسر کو جو ریلوے لائن جاتی ہے۔ اس میں ۱۰ اپریل ۱۸۶۲ء کو آمد و رفت شروع ہوئی۔

ریل کو چلانے کے لئے کوئلہ کے بجائے لکڑی جلائی جاتی تھی۔ لاہور سے ملتان کو جو اُس وقت کراچی سے سندھ کی کشتیوں کے ذریعہ ملا ہوا تھا ۱۸۶۵ء میں ریلوے لائن کے ذریعہ ملا دیا گیا۔ ریل کو چلانے کے لئے کوئلہ کا استعمال ۱۸۷۰ء میں کیا گیا۔ اسی سال ہر روز لاہور سے ایک گاڑی غازی آباد تک جانے لگی۔ لیکن کلکتہ اور بمبئی تک ۱۸۸۳ء سے پہلے ریلوے لائن نہیں بن سکی اس کے بعد ترقی کی رفتار تیز تو نہیں رہی۔ لیکن مسلسل و پیہم ترقی ہوتی گئی۔ جیسا کہ ذیل کے نقشہ سے ظاہر[1] ہوتا ہے۔

بڑی لائن

لاہور سے جنوب کی جانب	۱۳۲ میل لائن کا افتتاح ۱۸۷۸ء میں کیا گیا
لاہور سے مغرب کی جانب	۱۸ " " " ۱۸۷۸ء " "
لاہور سے شمال کی جانب	۲۴۲ " " " ۱۸۸۰ء " "

شاخیں

گولڑہ باسل	۷۴ میل لائن کا افتتاح ۱۸۸۱ء میں کیا گیا
امرتسر پٹھانکوٹ	۶۷ " " " ۱۸۸۴ء "
راجپورہ بھٹنڈا	۱۰۷ " " " ۱۸۸۹ء "
سندھ ساگر	۲۴۲ " " " ۱۸۹۰ء "
سیالکوٹ جموں ۱۸۸۴ء	۳۶ " " " ۱۸۹۰ء "
رائے ونڈ فیروزپور	۴۳ " " " ۱۸۹۲ء "
جنوبی پنجاب بڑی لائن	۴۰۰ " " " ۱۸۹۷ء "
نروانا کیتھل	۲۳ " " " ۱۸۹۹ء "

[1] پنجاب کی زراعت کے متعلق جو رپورٹ بابت ۱۹۱۱ء و ۱۹۲۲ء شائع ہوئی تھی وہ ملاحظہ ہو۔ اس سال میں پنجاب کے اندر ۴۰۴۳ میل ریلوے لائن زیر تعمیر تھی جس میں ۳۰۰۷ میل دوہری پٹڑی کی لائن تھی *

کنڈیاں۔کیمبل پور ...	۲۰۰ میل لائن کا افتتاح	۱۸۹۹ء میں کیا گیا
فیروزپور بھٹنڈا ...	۵۵ " "	۱۸۹۹ء " "
وزیرآباد۔خانیوال ...	۲۰۱ " "	۱۹۰۰ء " "
لدھیانہ۔جاکھل ...	۷۹ " "	۱۹۰۱ء " "
کالکا۔شملہ ...	۵۹ " "	۱۹۰۳ء " "
لدھیانہ۔میکلوڈ گنج ...	۱۵۲ " "	۱۹۰۶ء " "
بیچ دوآبہ ...	۱۴۹ " "	۱۹۰۶ء " "
شاہدرہ۔سانگلہ ...	۵۵ " "	۱۹۰۷ء " "
خانیوال لودھراں ...	۵۶ " "	۱۹۰۹ء " "
امرتسر۔پٹی (۱۹۰۷) قصور ...	۵۴ " "	۱۹۱۰ء " "
قصور لودھراں ...	۲۰۸ " "	۱۹۱۰ء " "
خانپور چاچڑاں ...	۲۲ " "	۱۹۱۱ء " "
چیچوکی۔شورکوٹ روڈ ...	۱۲۶ " "	۱۹۱۱ء " "

اگر ریل و رسائل کے ذرائع ارزاں ہوں تو مقامی ضروریات سے زیادہ غلہ پیدا کرنا منفعت بخش ہوتا ہے۔ چونکہ فروخت سے پہلے منڈی تک پہنچنا ضروری ہے۔ اِس لئے اندرونی ترقی کا دارومدار اس امر پر ہے۔ کہ یا تو منڈیاں ایسی جگہ واقع ہوں۔ جہاں پہنچنا آسان ہو۔ اور ذرائع آمدورفت کو ایسی وسعت دی جائے۔ کہ دور دراز منڈیوں سے بھی منفعت بخش تجارت ہو سکے۔ جب تک ریلوے کا سلسلہ قائم نہ ہو جائے۔ جس کی وجہ سے زائد از ضرورت پیداوار دور دراز منڈیوں تک پہنچائی جا سکے اس وقت تک پیداوار کو بڑھانے کے طریقے اختیار کرنے پر زور دینا مفید نہیں ہوگا۔ یہ امر بدیہی ہے۔ کہ اگر مزید اجناس کی جائے۔ اور اُنکی فروخت کا سامان نہ ہو سکے۔ تو اُن کی کاشت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اسلئے اُن کی کاشت ہی نہیں کی جائیگی۔ اِس لئے جب تک ریلوے کی سہولتیں مہیا نہ ہو جائیں آبپاشی کے لئے نہریں بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اِسی طرح جب تک بہت سے مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ ریلوے کی تعمیر کرنا نفع بخش نہیں۔ یہ دونوں چیزیں

آبپاشی لازم و ملزوم تھیں۔ اسلئے ہر سال انکی تعمیر ہوتی رہی۔ اور صوبہ گذشتہ پچاس سال کے عرصے سے نہایت سُرعت کیساتھ نمایاں ترقی کر رہا ہے۔

باری دوابہ کی نہر کا افتتاح ۱۸۵۹ء میں[1] ہُوا۔ اور سرہند کی نہر ۱۸۷۰ء میں بنکر تیار ہو گئی اس لئے صوبہ نے نہایت تیزی سے ترقی کی۔ جس کی کیفیت اعداد و شمار ذیل سے معلوم ہوتی ہے۔

پنجاب کی اصلاح و ترقی!

(صفحہ ۱۰۳ کا حاشیہ) اس سیدھی سادی دلیل کی صداقت انسان پر ہے لیکن چونکہ اکثر اشخاص کے عقاید سے اسکا تصادم ناگزیر ہے اسلئے اسے نظرانداز کردیا جائیگا۔ حقیقت یہ ہے کہ زائد از ضرورت غلّہ کی پیداوار ہی نہیں ہوتی۔ رقبہ مزروعہ فی کسان بہت تھوڑا تھا لیکن جب منڈی سے جہاں زائد از ضرورت غلّہ کی کھپت ہو سکتی تھی تعلقات رسل و رسائل قائم ہو گئے۔ رقبے کے اوسط میں اضافہ ہونے لگا۔ یہ حقائق ضبطِ تحریر میں آچکے ہیں اور محفوظ کر لئے گئے ہیں۔ اس لئے اُن کی صحت پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

[1] یعنی نہر میں پانی داخل کیا گیا ۱۸۶۰ء سے پہلے آبپاشی شروع نہیں ہوئی تھی۔

[2] ۱۹۱۰ء میں سر جیمز ولسن نے رائل اکنامک سوسائٹی کے ایک جلسے میں ایک مقالہ پڑھا تھا جس کا عنوان "پنجاب کی جدید اقتصادی ترقیات" تھا۔ اس میں انہوں نے حسب ذیل اعداد و شمار پیش کئے تھے۔

	۱۸۸۶-۷ء	۱۹۰۸-۹ء
رقبہ زیر کاشت کا اوسط	دو کروڑ بیس لاکھ ایکڑ۔	دو کروڑ اسی لاکھ ایکڑ۔
سیراب شدہ رقبہ کا اوسط	ساٹھ لاکھ ایکڑ۔	ایک کروڑ دس لاکھ ایکڑ۔
اُس رقبہ کا اوسط جس میں بیج بویا گیا ہے	دو کروڑ پانچ لاکھ ایکڑ۔	دو کروڑ اسی لاکھ ایکڑ۔
مجموعی آبادی	ایک کروڑ اسی لاکھ ایکڑ۔	دو کروڑ ایکڑ۔
آبادی کے اعتبار سے فی کس کاشت شدہ رقبہ	گیارہ لاکھ ایکڑ	چودہ لاکھ ایکڑ۔

گذشتہ بائیس ۲۲ سال کے عرصہ میں (یہ بیان ۱۹۱۰ء میں لکھا گیا ہے) کاشت شدہ رقبہ کا اوسط ۲۰ فیصدی زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ذرائع آبپاشی کی توسیع کی وجہ سے جو اضافہ ہُوا ہے۔ اس کی وجہ سے اوسط پیداوار میں بھی اضافہ ہو۔ کیونکہ جس رقبہ میں آبپاشی ہوتی ہے اُسکی پیداوار غیر سیراب شدہ رقبہ کی پیداوار سے دگنی ہوتی ہے۔ پیداوار کا مجموعی اضافہ ۵۰ فیصدی ہوگا۔ اور فی کس اوسط پیداوار میں ۲۶ فیصدی کا اضافہ ہو گیا ہوگا۔

سال	ریلوے کی طوالت	نہروں کی طوالت	پکی سڑکوں کی طوالت	رقبہ مزروعہ	مالگزاری
۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۳ء	۴۱۰ میل	۲۷۴۴ میل	۱۰۳۶ میل	ایک کروڑ اٹھاسی لاکھ ایکڑ	دو کروڑ ایک لاکھ روپیہ
۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۳ء	۶۰۰ "	۴۵۸۳ "	۱۴۶۷ "	دو کروڑ چونتیس لاکھ ایکڑ	دو کروڑ چھپن لاکھ روپیہ
۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۳ء	۱۷۲۵ "	۱۲۳۶۸ "	۲۱۴۲ "	دو کروڑ ستر لاکھ ایکڑ	دو کروڑ تینتیس لاکھ روپیہ
۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۳ء	۰۰ "	۱۶۸۹۳ "	۰۰ "	دو کروڑ اٹھتر لاکھ ایکڑ	دو کروڑ چھتیس لاکھ روپیہ
۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۳ء	۴۰۰۰ "	۱۶۹۳۵ "	۲۶۱۴ "	دو کروڑ نوے لاکھ ایکڑ	تین کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ
۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء	۴۴۴۱ "	۱۹۶۶۴ "	۲۹۳۸ "	تین کروڑ ایکڑ	چار کروڑ روپیہ

بعض غیر اہم مستثنیات کے سوا ریل گاڑیاں پنجاب کے چار گوشوں میں آمدورفت رکھتی ہیں، جو سرحدیں ان سے ہٹ کر واقع ہوئی ہیں۔ اُن سے ریلوے لائن نہیں گذرتی۔ تقریباً تمام لائنوں کا نظام ایک ہے۔ یعنی سب کی سب نارتھ ویسٹرن ریلوے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دنیا میں کوئی اتنی بڑی ریلوے نہیں جس کا انتظام نارتھ ویسٹرن ریلوے کی طرح ایک ادارۂ اہتمام کے ماتحت ہو۔ صوبہ بھر میں ۶۶۰ ریلوے اسٹیشن ہیں یعنی تقریباً پچاس دیہات اور قصبات کے لئے ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔ اِس صوبہ میں ریلوے لائن پر جو مصارف آئے ہیں اُن سب کا بیان مشکل ہے لیکن ریلوے کے نظام پر جس قدر سرمایہ صرف ہوا ہے اور اُس سے جتنی خالص آمدنی ہوئی ہے اس کی تفصیل ذیل میں دیجاتی ہے۔ ۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۸ء میں ۵۲۲۶ میل ریلوے لائن پر گاڑیوں کی آمدورفت ہونے لگی۔ اس پر چھیانوے کروڑ اکہتر لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ اور اس سرمایہ کا ۹ و ۷ فی صدی خالص آمدنی ہوئی۔

۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء میں ۵۲۴۱ میل ریلوے لائن پر گاڑیوں کی آمدورفت ہونے لگی۔ اس پر ایک ارب سولہ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اور ۴ و ۶ فیصدی خالص آمدنی۔

ابھی تک اِس صوبہ میں رسل و رسائل اور آمد و رفت کی سہولتیں بہم پہنچانے کے منفعت بخش کاروبار میں لاکھوں روپے لگانے کی ضرورت ہے۔ اور صوبہ کی اِقتصادی ترقی کا انحصار بہت حد تک اِس توسیع وسائلِ آمدورفت پر ہے۔

صوبہ کے بڑے بڑے آبپاشی کے کارخانے کئی دیسی ریاستوں کو بھی پانی بہم پہنچاتے ہیں اِسلئے

ان کے معلومات فراہم کرنے میں یہ احتیاط کرنا چاہئیے۔ کہ کہیں حساب میں غلطی نہ ہو جائے۔ مزید برآں ابھی تک اُن میں برابر اصلاح و ترقی ہو رہی ہے۔ اس لئے ہر سال اعداد و شمار مختلف ہوتے ہیں۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۱ء تک اس پر چوبیس کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا۔ جس میں سے ایک کروڑ پچپن لاکھ روپیہ دیسی ریاستوں نے دیا۔ اور بائیس کروڑ باون لاکھ روپیہ حکومت انگریزی نے۔ مارچ ۱۹۲۱ء تک جو بڑی نہریں زیر تعمیر تھیں۔ اُن کی لمبائی ۲۹۲ء۴ میل تھی۔ اس کے علاوہ ۱۵۲۴۰ میل معاون نہریں بالیں کھیئے۔ کہ کل ۱۹۶۲۲ میل نہریں زیر تعمیر تھیں۔ خام آمدنی چار کروڑ اڑسٹھ لاکھ تھی۔ اور مصارفِ تعمیر ایک کروڑ اکتالیس لاکھ ساٹھ ہزار۔ اس طرح گویا خالص آمدنی تین کروڑ چھبیس لاکھ اسی ہزار رہ جاتی تھی۔ یہ گویا صرف شدہ سرمایہ کا ۱۵ و ۱۴ فیصدی تھی۔ اور اگر سود منہا کر دیا جائے۔ تو ۲۵ و ۱۱ رہ جاتی ہے۔

چھوٹی نہروں پر چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اُن میں ۱۰ میل پر بڑی نہریں ہیں۔ اور ۶۰ میل ان کی معاون شاخیں۔ ان سے خالص آمدنی تقریباً دس فیصدی ہوئی۔

انہوں نے ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں ایک کروڑ چار لاکھ ساٹھ ہزار ایکڑ رقبہ کی آبپاشی کی، حالانکہ کل رقبہ مزروعہ دو کروڑ ترپن لاکھ ساٹھ ہزار ایکڑ تھا۔ اور ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء میں ایک کروڑ اکہتر لاکھ اسی ہزار ایکڑ رقبہ مزروعہ میں سے ایک کروڑ دو لاکھ پچاس ہزار ایکڑ کو سیراب کیا۔ آخر الذکر اعداد خاص غور و توجہ کے محتاج ہیں۔ کیونکہ مزروعہ رقبہ میں پہلے سال کی نسبت اِس لئے کمی واقع ہوئی۔ کہ مان سون اپنی عام حالت سے ۲۴ فی صدی کم تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ رقبہ مزروعہ بقدرِ اسی لاکھ ایکڑ کے کم ہو گیا۔ اور محض آبپاشی کے وسیع نظام سے صوبہ قحط کا شکار ہوتے ہوتے بچ گیا۔ مختلف نہروں سے جو خالص آمدنی ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل ذیل میں دیجاتی ہے، اس میں سے سود منہا نہیں کیا گیا۔

مغربی جمنا	۱۸۷۰ء میں افتتاح ہوا	۲۷ و ۱۱ فیصدی آمدنی
سرہند	۱۸۸۲ء " "	۶۳ و ۱۲ " "
لوئر جہلم	۱۹۰۱ء " "	۱۶ و ۱۹ " "
اپر جہلم	۱۹۱۵ء " "	۲۵ و ۰۰ " "

اپر باری دوآب	سنہ ۱۸۶۰ء و سنہ ۱۸۶۱ء میں افتتاح ہوا	۱۳و۷ فیصدی آمدنی
لوئر باری دوآب	سنہ ۱۹۱۲ء " "	۱۵و۶۸ " "
لوئر چناب	سنہ ۱۸۹۲ء " "	۴۴و۲۵ " "
اپر چناب	سنہ ۱۹۱۲ء " "	۸و۶۴ " "
اپر ستلج کی طغیانی	.. .. ..	۱۵و۶۴ " "
سندھ کی طغیانی	.. .. ..	۳و۰۶ " "
سدھنائی	.. .. ..	۱۷و۶۵ " "

مندرجہ بالا اعداد و شمار کا تعلق صرف سنہ ۱۹۲۰ء و سنہ ۱۹۲۱ء سے ہے۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے۔ کہ نہروں کی وجہ سے صوبہ کے چارہ میں کمی ہوگئی ہے۔ اور اس لئے گھی کی افراط نہیں رہی۔ لیکن جس زمین پر سے اب نہریں گذرتی ہیں اُس کا بیشتر حصّہ پہلے بنجر تھا۔ جہاں یا تو لوگوں کی آبادی ہی نہیں تھی۔ اور اگر آبادی تھی بھی تو بہت کم۔ یعنی خانہ بدوش قبائل کے سوا وہاں کوئی نہیں رہتا تھا۔ اس سے صوبہ کی دولت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ اور یہ دلیل سنجیدگی سے پیش نہیں کی جاسکتی۔ کہ ایک ایکڑ نہری زمین میں جسقدر فصل ہوتی ہے اس سے زیادہ چارہ ایک ایکڑ خشک اور بنجر صحرا میں پیدا ہوسکتا ہے۔

یہ تو درست ہے۔ کہ حکومت کو نہروں کی تعمیر سے کافی منافع حاصل ہوا ہے۔ اِسلئے نہایت سرعت سے ان کی تعمیر مکمل کردی گئی۔ لیکن نہروں کی تعمیر کا اصل باعث یہ نہیں۔ کیونکہ ابتدا میں سالہا سال تک نہروں سے انکا خرچ بھی پورا نہیں ہوسکا۔ درحقیقت ذمہ داری کے احساس نے حکومت کو نہروں کیجانب متوجہ کیا۔ کیونکہ وہ محسوس کرتی تھی۔ کہ قحط کو روکنے کیلئے کوئی نہ کوئی طریقہ اِختیار کرنا اُس کا فرض ہے۔ پختہ سڑکوں کی تعمیر کا محرک بھی صنعت کا خیال نہیں تھا۔ کیوں کہ اُن سے کوئی بلاواسطہ

ل (صفحہ ۱۰۶ کا حاشیہ) اپر جہلم ایک ایسی نہر ہے جو دوسری نہروں میں تین طریقوں سے پانی پہنچاتی ہے۔ یہ راستہ میں ایک چھوٹے سے رقبہ کو سیراب کرتی ہے۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مغربی جمنا کی نہر کئی بار تعمیر ہوئی ہے۔ فیروز شاہ نے تقریباً سنہ ۱۳۲۶ء میں اسکا ایک حصہ تعمیر کیا تھا۔ علی مردان خاں نے تقریباً سنہ ۱۶۲۶ء میں اسکے اندر کافی اصلاح کی۔ یہی علی مردان خاں ہے جس نے ہسلی کی نہر سنہ ۱۶۲۳ء میں تعمیر کی۔ جو نہر دوآبہ باری کی پیشرو تھی +

منفعت نہیں تھی - اور اُن سے خشک سالی کے زمانہ میں لوگوں کو جو مدد مل سکتی تھی - وہ ریلوے کی تعمیر کے مطالبہ کی وجہ سے نظر انداز کر دی گئی -

ملک کی زراعت کو وسائل آمد و رفت کے عمدہ ہونے کے باعث جو عظیم فائدہ ہو سکتا ہے، اس میں کسی کو جائے کلام نہیں - لیکن جب تک صحیح طور پر اس کا اندازہ نہ کیا جا سکے - کہ مستقبل میں ریلوے لائن کہاں بچھائی جائیگی - ایسی پختہ سڑکوں کی تعمیر ناممکن ہے - جو ریلوے کی تعمیر کے بعد بھی بہت مفید ثابت ہو سکیں - اس کا نتیجہ ہے - کہ آج پنجاب میں کافی پختہ سڑکیں نہیں ہیں - ہر ریلوے اسٹیشن کے لئے پانچ میل پختہ سڑک ہے - یا دس گاؤں کے لئے ایک میل پختہ سڑک ان اعداد و شمار پر غور کرتے وقت اِس امر کا خیال رکھنا چاہئے - کہ ۱۸۹۷ء سے پہلے یہ صوبہ مالی مشکلات پر قابو حاصل کرنے کے قابل نہیں ہؤا تھا - اسوقت تک ہندوستان کے محاصل محفوظ و مستقل حالت میں نہیں تھے - اس وقت یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آئندہ سالوں میں کس قدر روپیہ کی بچت ہوگی - اور اِس غرض کے لئے مزید قرض لینا بھی مناسب نہیں سمجھا گیا چنانچہ جس قدر آمدنی ہوئی - اُسی سے پختہ سڑکیں بنائی گئیں - اور چونکہ آمدنی محدود تھی - اس لئے سڑکوں کو بھی وسعت نہ دی جا سکی - یہ کہنا غیر موزوں نہ ہوگا کہ اِس کوتاہی سے امر کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ حکام نے اچھی سڑکوں کی قدر و قیمت اور فوائد کا اندازہ نہیں کیا - اکثر اشیاء علی الخصوص پھلوں جیسی اشیاء پیدا کرنے میں جو جلد خراب ہو جاتی ہیں یہ ضروری ہے کہ انہیں منڈی تک آسانی پہنچانے کا سامان مہیا ہو - پروفیسر مارشل نے لکھا ہے - کہ انڈے کی سب سے بڑی خوبی اس کی تازگی ہے - اور اس کی تازگی قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے - کہ اُسے گاہک کے پاس جلد پہنچا دیا جائے - کئی قسم کے پھلوں اور ترکاریوں کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے - بحالتِ موجودہ بڑے بڑے شہروں کے قرب و جوار میں اچھی طرح زراعت ہوتی ہے - کیونکہ وہاں زمین کی قیمت اور لگان زیادہ ہوتا ہے - اچھی سڑکوں کی بدولت وہ تمام نقائص رفع ہو جائینگے - جن سے کسان کو نقصان پہنچتا ہے - کھیتوں میں کھاد جلد پہنچ سکے گی - اور پیداوار کو جلد دوسری جگہ منتقل کیا جائیگا - وہ ایسی چیزوں کو بھی کاشت کر سکے گا - جن کی کاشت صرف شہروں کے قرب و جوار میں ہوتی ہے - جو علاقے دور و دراز مقامات پر آباد ہیں - وہ اچھے علاقوں کی برابری کرنے لگیں گے اور

ان کی قدروقیمت بڑھ جائے گی۔ یہ اغلب ہے۔ کہ اگر حکومت راہگیروں سے محصول وصول کرنے کی حکمت عملی اختیار کرتی۔ تاکہ سڑکوں کو استعمال کرنیوالے انکی نگہداشت پر بھی کچھ صرف کریں۔ تو سڑکوں کو بہت توسیع ہوجاتی۔ انگلستان میں سڑکوں اور پلوں سے عبور و مرور کرنے والوں سے محصول وصول کرنے کی حکمت عملی سڑکوں کی تعمیر کی محرک ثابت ہوئی (حالانکہ اکثر پل لوگوں نے اپنے ذاتی مصارف سے بنائے تھے) یہ اور بات ہے کہ آخر کار اس طریقہ کے نقائص فوائد سے زیادہ[1] نکلے۔

ہم صفحاتِ گذشتہ میں جو کچھ بیان کرچکے ہیں۔ اس سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب تک پنجاب برطانی عملداری میں نہیں آیا تھا۔ اسے زیادہ اقتصادی ترقی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ابتدائی زمانہ میں جن لوگوں نے یہاں نہریں تعمیر کیں۔ اگر وہ اتنی بڑی نہریں بھی تعمیر کردیتے۔ جو کچھ ہمیں اس صوبہ میں نظر آرہی ہیں۔ پھر بھی ان مشکلات کا کوئی علاج نہیں تھا۔ جو سرمایہ اور محنت کی فقدان کے باعث پیدا ہوجاتی ہیں۔ مزید برآں سڑکوں اور ریلوے کے نہ ہونے کے باعث زائد از ضرورت پیداوار کو منڈیوں میں منتقل کرنا بھی ناممکن تھا۔ برطانیہ میں بھی ریلوے اور پختہ سڑکوں کی تعمیر انیسویں صدی کے اوائل سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ اور ہندوستان میں سڑکوں کی تعمیر کا خیال کہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد پیدا ہوا۔ اگرچہ انگلستان کا بہت تھوڑا حصہ ایسا ہے جو تری سے اس قدر دور ہو۔ کہ وہاں جہاز یا ایک چھوٹی سی کشتی بھی نہ چل سکتی ہو تاہم اس چھوٹے

---

[1] جاپان میں سڑکوں کے متعلق جو قواعد نافذ ہیں۔ انکے رو سے جو لوگ سڑکوں پر کوئی کام کرکے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انہیں سڑکوں کے مصارف کے ایک حصہ کا متحمل ہونا پڑتا ہے۔ اور جو لوگ کاروبار کے سلسلے میں سڑکوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ انہیں مرمت کے جزوی مصارف برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو جاپان ایر بک ۱۹۱۹ء ۱۹۲۰ء) ہسپانیہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔ کہ محض رسل و رسائل کی دشواریوں کے باعث اس ۵۴ فیصدی رقبہ کو اقتصادی حیثیت سے نقصان ہو رہا ہے۔

[2] پرنسپلز آف اکنامکس مصنفہ سالگ مین ص۱۱۴ زرخیز سے زرخیز زمین کی بھی یہ کیفیت ہوسکتی ہے کہ پیداوار کی کثرت کے باوجود منڈی سے دور ہونے کے باعث اسکی کوئی قدروقیمت نہ ہو۔ ایسی صورت میں اسکی پیداوار کی مانگ نہیں ہوگی۔ اس زمانہ میں زمین کی زرخیزی قیمت پر اسقدر اثر انداز نہیں ہوتی جسقدر اسکا محل وقوع اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ کہ ریاستہائے متحدہ کا محکمہ زراعت سڑکوں کی تعمیر کے متعلق تحقیق و تدقیق اور تجربات کر رہا ہے۔

سے علاقہ کی آبادی بھی زیادہ گنجان نہیں ہونے پائی۔ اور محض سڑکوں کی عدم موجودگی کے طفیل انگلستان انیسویں صدی کے آغاز سے پیشتر پستی کے غار میں پڑا رہا ہے۔

پنجاب اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کے اعتبار سے اسوقت تک ترقی نہیں کرسکتا تھا جب تک ریلوے اسے بڑی بڑی بندرگاہوں، اور دنیا کی بڑی بڑی منڈیوں سے ملحق نہ کردیتی - ایک مرتبہ ذرائع آمدورفت قائم ہو گئے - تو تجارت و حرفت نے نہایت سرعت سے فروغ حاصل کرلیا حسب ذیل اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے - کہ ریلوے کی وجہ سے تجارت کو کس قدر ترقی ہوئی -

	درآمد		برآمد	
	وزن	قیمت	وزن	قیمت
سنہ ۱۸۸۲ء و سنہ ۱۸۸۳ء	۶۲ لاکھ من	۷ کروڑ ۱۰ لاکھ روپیہ	ایک کروڑ ۳ لاکھ من	۳ کروڑ ۳۷ لاکھ روپیہ
سنہ ۱۸۹۲ء و سنہ ۱۸۹۳ء	ایک کروڑ ۲۲ لاکھ من	۹ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ	ایک کروڑ ۲ لاکھ من	۶ کروڑ ۴۹ لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۰۲ء و سنہ ۱۹۰۳ء	۲ کروڑ ۱۵ لاکھ من	۱۵ کروڑ ۴ لاکھ روپیہ	۲ کروڑ ۴۹ لاکھ من	۱۱ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۱۱ء و سنہ ۱۹۱۲ء	۵ کروڑ ۱۸ لاکھ من	۲۹ کروڑ ۴۸ لاکھ روپیہ	۵ کروڑ ۶۶ لاکھ من	۶۶ کروڑ ۸۸ لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۱۹ء و سنہ ۱۹۲۰ء	۶ کروڑ ۵۵ لاکھ من	۵۲ کروڑ ۷۸ لاکھ روپیہ	۴ کروڑ ۱۳ لاکھ من	۴۴ کروڑ ۵ لاکھ روپیہ

(سنہ ۱۸۹۲ تا ۱۸۹۳ کے متعلق جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں - وہ درحقیقت تین سال کی تجارت کا اوسط ہے - کیونکہ اس سال تجارت غیر معمولی طور پر زیادہ ہوئی تھی -)

قیمت کے اعداد و شمار وہ ہیں - جنکا اندازہ پنجاب میں لگایا گیا ہے - اسطرح درآمد شدہ مال کی مصارف آمدورفت بھی اس میں شامل ہے - لیکن برآمد شدہ کی قیمت لگانے میں مصارف آمدورفت شامل نہیں کئے گئے -

اس نقشہ سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے - کہ اگر ریلوے نہ ہوتی - تو بعض بڑے بڑے قطعاتِ اراضی میں گیہوں کی یہ افراط دکھائی نہ دیتی - رُوئی کی بھی یہی کیفیت ہوتی - بنگال میں سن کی کاشت کو اس وقت تک فروغ حاصل نہیں ہوا - جب تک یورپ کی منڈیوں سے سلسلۂ رسل و رسائل قائم نہیں ہو گیا - ریلوے کے بغیر پیداوار کی تعیین نہیں

ہو سکتی [1] ۔

لیکن غیر ملکی تجارت کا اِس قدر فروغ حاصل کرنا اس امر کی دلیل نہیں ۔ کہ ملکی خوشحالی کو بھی اسی حد تک ترقی ہوئی ہے ۔ جیسا کہ پروفیسر مارشل نے کہا ہے ۔ بہیئتِ مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے ۔ کہ جب کسی ملک کی غیر ملکی تجارت میں ترقی ہو ۔ تو اس کا اثر اس کی عام خوشحالی پر بھی [2] پڑتا ہے ۔ اور اِس امر کی کافی شہادتیں موجود ہیں ۔ کہ گذشتہ پچاس سال کے عرصہ میں صوبہ کی عام خوشحالی نے معتدبہ ترقی کر لی ہے ۔ پنجاب کے محلِ وقوع نے نرخوں پر جو اثر ڈالا ہے ۔ اُس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو سکتا ہے ۔ جنگ کے پہلے کے اعداد پہلے دیئے گئے ہیں ۔ اور جنگ کے بعد کے اعداد بعد میں [3] ۔

ایک پیٹی جسمیں مردانہ جوتوں کے ایک سو جوڑے ہیں !

	جنگ سے پہلے پونڈ	شلنگ	پنس	جنگ کے بعد ۱۹۲۰ء میں	پونڈ	شلنگ	پنس
کارخانہ میں ۴ شلنگ فی جوڑہ کی حساب سے تیار ہوئے ۔	۲۰	—	۰	۱۸ شلنگ فی جوڑہ کے حساب سے ۔	۹۲	۱۰	۰
گتے کے ایک سو بکس بحساب ½۱ پنس فی جوڑہ ۔	۰	۱۲	—	۴ پنس فی جوڑہ ۔	۱	۱۳	۰
پیٹی جسکے کنارے جست لگائی ہے ۔	۰	۱۸	—	پیٹی جسکے کنارے کاغذ لگا ہوتا ہے ۔	۱	۱۰	—
بندرگاہ تک لیجانے کے مصارف ۔	۰	۲	۶	.. .. ..	۰	۶	۰
باربرداری اشٹامپ اور ڈاک کے اخراجات ۔	۰	۵	۳	.. .. ..	۰	۱۰	۶
بندرگاہ کے مصارف ۔	۰	۲	۳	.. .. ..	۰	۵	۶
کراچی تک جہازی کرایہ ۔	۱	۱۱	۶	.. .. ..	۶	۰	—
انگلینڈ ہنڈ پر بیمہ اور اشٹامپ ۔	۰	۲	۱۰	نوّے پونڈ پر بیمہ ۔	۰	۱۳	۶

---

[1] لیکن نیل جیسی قیمتی چیز دور دور لیجائی جا سکتی ہے ملاحظہ ہو انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر " (ہندوستان اکبر کی موت کے وقت) مصنفہ مورلینڈ صفحات ۱۸۵ - ۱۹۰ ۔ اقتصادی کامیابی کے اسباب و لوازم کے متعلق جو علم حاصل ہو چکا ہے سو وہ گذشتہ عظمت و شوکت کی پرانی داستانوں پر اعتماد کرنے میں مانع ہے ۔

[2] انڈسٹری اینڈ ٹریڈ صفحہ ۱۶ ۔ لیکن اسکی خوشحالی کا اندازہ اسکی غیر ملکی تجارت سے نہیں کرنا چاہیئے ۔

[3] ان اعداد و شمار کیلیئے میں مسٹر ڈبلیو ایچ ۔ لیوی کا مرہونِ منت ہوں ۔

	جنگ سے پہلے		جنگ کے بعد
مال بھیجنے والے کا نفع بحساب پانچ فیصدی	پونڈ شلنگ پنس ۱ — ۳ — ۹	.. .. ..	پونڈ شلنگ پنس ۳ — ۴ — ۵
میزان	۲۴ — ۱۸ — ۷	میزان	۷۷ — ۲ — ۳
مبادلہ بحساب ایک شلنگ چار پنس فی روپیہ۔	روپے آنے پائی ۳۷۳ — ۱۵ — ۰	مبادلہ بحساب ۲ شلنگ فی روپیہ۔	روپیہ آنہ پائی ۷۷۱ — ۲ — ۰
محصول چنگی[۱]۔	۲۸ — ۳ — ۰	.. .. ..	۴۹ — ۹ — ۰
بندرگاہ پر اتارنے اور گودام تک لیجانے کا خرچ۔	۲۵ — ۸ — ۰	.. .. ..	۲ — ۸ — ۰
راولپنڈی تک ریل کا کرایہ۔	۱۲ — ۸ — ۰	.. .. ..	۱۲ — ۸ — ۰
میزان	۴۱۷ — ۲ — ۰	میزان	۸۸۳ — ۱۱ — ۰

دس گٹھریاں (ہر ایک میں پندرہ تھان) قمیصوں کا کپڑا ہر تھان ۳۰ انچ عرض اور ۴۰ گز طول

	جنگ سے پہلے		جنگ کے بعد
کارخانہ میں ۴۰ گز کیلئے آٹھ شلنگ کے حساب سے	پونڈ شلنگ پنس ۶۰ — ۰ — ۰	۴۰ گز کیلئے ۲۴ شلنگ کے حساب سے۔	پونڈ شلنگ پنس ۱۸۰ — ۰ — ۰
ہر تھان کو تہ کرنے اور مہریں لگانے وغیرہ کے اخراجات ۴ پنس فی تھان۔	۲ — ۱۰ — ۰	۱۰ پنس فی تھان۔	۶ — ۵ — ۰
پیکنگ کے اخراجات ۲ شلنگ چھ پنس فی بوری۔	۱ — ۱۰ — ۰	۸ شلنگ فی بوری۔	۴ — ۰ — ۰
بندرگاہ تک پہنچانے کے مصارف۔	۰ — ۱۰ — ۰	.. ..	۱ — ۵ — ۰
بندرگاہ کے اخراجات۔	۰ — ۱۰ — ۰	.. ..	۱ — ۰ — ۰
باربرداری اور اسٹامپ وغیرہ۔	۰ — ۳ — ۶		۰ — ۱۰ — ۰
کراچی تک جہاز کا کرایہ۔	۲ — ۵ — ۰		۱۰ — ۰ — ۰
اسی پونڈ پر بیمہ۔	۰ — ۹ — ۰	۲۵۵ پونڈ پر بیمہ۔	۱ — ۱۲ — ۰

[۱] چنگی کا محصول اس کتاب کے دائرہ بحث سے باہر ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ محصول درآمد ۱۸۸۲ء میں منسوخ کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں پھر ۵ فی صدی محصول لگا دیا گیا۔ ۱۹۱۶ء میں یہ محصول ۷½ فی صدی کر دیا گیا۔ اور ۱۹۲۱ء میں گیارہ فی صدی۔ اگر آج کل کا نرخ لگانا مقصود ہو۔ تو چنگی کے محصول میں اضافہ کر لینا چاہئے۔ ہم نے محصول ۱۹۲۰ء کے حساب سے اس لئے لگایا ہے۔ کیونکہ دوسرے اعداد اسی سال سے متعلق ہیں۔

مد	پونڈ	شلنگ	پنس		پونڈ	شلنگ	پنس
مال بیچنے والے کا منافع بحساب پانچ فیصدی۔	۳	۷	۱۰	.. ..	۱۰	۴	۸
میزان	۷۱	۵	۴	میزان	۲۱۴	۱۸	۵
	روپیہ	آنہ	پائی		روپیہ	آنہ	پائی
مبادلہ بحساب ایک شلنگ ۴ پنس فی روپیہ۔	۱۰۶۸	۴	۰	مبادلہ بحساب ۲ شلنگ فی روپیہ	۲۱۴۹	۲	۰
محصول چنگی۔	۲۸	۰	—	.. .. ..	۷۴	۱۵	۶
بندرگاہ پر اترنے اور مالگدام تک پہنچانے کا خرچ۔	۱۲	۸	۰	.. .. ..	۱۵	۰	۰
لاہور تک ریلوے کا کرایہ	۴۰	۰	۰	.. .. ..	۴۰	۰	۰
میزان	۱۱۵۸	۱۲	۰	میزان	۲۲۶۹	۲	۶

گھوڑے کی زین اور لگام کی تین پٹیاں

مد	جنگ سے پہلے				۱۹۲۴ء میں		
	پونڈ	شلنگ	پنس		پونڈ	شلنگ	پنس
کارخانہ میں جو اخراجات آئے۔	۷۵	۱۲	۰	..	۱۸۷	۱۰	۰
بٹن کے کنارے والی پٹیاں۔	۲	۵	۰	..	۶	۰	۰
بندرگاہ تک لیجانے کے اخراجات۔	۰	۶	۶	..	۰	۱۵	۰
بندرگاہ کے مصارف۔	۰	۴	۳	..	۰	۱۰	۰
باربرداری اور اسٹامپ وغیرہ۔	۰	۵	۳	..	۰	۱۲	—
جہاز کا کرایہ۔	۲	۵	۶	..	۸	—	۰
بیمہ ۹۰ پونڈ پر۔	۰	۱۰	۰	۲۴۰ پونڈ پر بیمہ	۱	۱۶	۰
مال بیچنے والے کا منافع بحساب ۵ فیصدی	۶	۱	۵	..	۱۰	۵	۲
میزان	۸۵	۹	۱۱	میزان	۲۱۵	۸	۲
	روپیہ	آنہ	پائی		روپیہ	آنہ	پائی
مبادلہ بحساب ایک شلنگ ۴ پنس فی روپیہ	۱۲۸۷	۷	۰		۲۰۵۴	۱	۰
محصول چونگی۔	۹۶	۲	۰		۱۲۸	۷	۶
بندرگاہ تک اترنے اور مالگدام تک پہنچانے کا خرچ	۶	۱۲	۰		۱۰	۰	۰
لاہور تک ریل کا کرایہ	۲۰	۰	۰		۲۰	۰	۰
میزان	۱۴۰۵	۶	۰	میزان	[illegible]	۸	۶

اِن اعداد و شمار سے پنجاب کے عجیب و غریب محلِ وقوع کے بعض اثرات واضح ہو جاتے ہیں۔ لورپول سے کراچی تک کپڑے کی دس بوریوں کے لانے پر جو کچھ صرف آتا ہے۔ اُسکی نسبت کراچی سے لاہور تک کے مصارف زیادہ ہیں گھوڑے کا ساز و سامان لانے کے اخراجات بھی اِسی قدر ہیں لاہور سے کراچی تک ریلوے کا سفر ۷۵۰ میل ہے۔ اور لاہور سے بمبئی تک ۱۲۵۰ میل۔ اِس طرح گویا پانچ ہزار میل بحری سفر تجارت کی راہ میں اتنی بڑی رکاوٹ نہیں۔ جس قدر ساڑھے سات سو میل خشکی کا سفر۔ چونکہ پنجاب خشکی سے گھرا ہوا ہے۔ اِس لئے یہ ضروری ہے۔ کہ غیر ملکی تجارت سے اسے کم نفع حاصل ہو۔ یعنی یہاں جو مال آئے۔ اس کی قیمت اسے زیادہ دینا پڑے۔ اور باہر مال بھیجنے کے عوض جو قیمت اسے ملے وہ کم ہو۔

ایک اور قابلِ غور امر یہ ہے۔ کہ چنگی کے محصول کی وجہ سے پنجاب کی صنعت کا جس قدر تحفظ ہو سکتا تھا۔ بندرگاہ سے پنجاب تک مال منتقل کرنے کی وجہ سے اس میں اضافہ ہو گیا ہے لورپول سے لاہور تک کا کرایہ جہاز اور ریل اِس قدر ہے۔ کہ اس طرح مقامی صنعتیں یورپ کے مال کی دستبرد سے محفوظ ہو جائیں گی۔ مزید براں ایک اور نکتہ یہ بھی ہے۔ کہ چنگی کا محصول مال کی قیمت کے حساب سے لگایا گیا ہے۔ اور چونکہ یورپ میں مال کا نرخ بہت بڑھ گیا ہے۔ اِسلئے محصول چنگی خود بخود زیادہ ہو گیا ہے۔

پنجاب سے بندرگاہ تک ریلوے کا جس قدر کرایہ ہے۔ اُس کی وجہ سے پنجاب کو ایک فائدہ تو ہوگا۔ کہ کراچی اور بمبئی سے پنجاب میں مال آئیگا۔ تو پنجاب کی مصنوعات اُس کا مقابلہ اچھی طرح کر سکیں گی۔ لیکن ایک دشواری بھی ہے۔ کہ پنجاب کی مصنوعات بمبئی کی منڈی میں بمبئی کی مصنوعات کا[1] مقابلہ نہ کر سکیں گی۔

---

[1] یہ امر قابلِ غور ہے۔ کہ تمام مصارف میں اضافہ ہو گیا لیکن ہندوستان کی ریلوے کے کرایہ میں اضافہ نہیں ہوا۔ اس لئے مقامی صناع ایک فائدے سے محروم ہو گئے اگر مقامی منڈیوں میں مقامی مصنوعات فروخت کرنے کی کوشش صمیم قلب سے کی جائے۔ تو ریلوے کے کرایہ کے متعلق غلط فہمی رفع ہو جائیگا۔ صناعوں کی یہ خواہش ہوگی۔ کہ ملک کے اندر تو ریلوے کے کرایہ کی شرح زیادہ ہو اور ملک کے باہر کم۔ دوسری جانب وہ لوگ جو مصنوعات استعمال کرتے ہیں۔ اِس بات پر زور دینگے۔ کہ ملک کے اندر کرایہ کی شرح کم ہو۔

اس طرح پنجاب کی مصنوعات کے مقابلے میں جہاز کے کرایہ جنگی کے محصول اور ریل کے کرایہ کی وجہ سے اور بمبئی کی مصنوعات کے مقابلہ میں ریل کے کرایہ کے باعث محفوظ ہو جائیگی - اس لئے اُن صنعتوں کے لئے جو مقامی ضروریات بہم پہنچاتی ہیں - ترقی کا وسیع میدان ہے - لیکن یہی چیزیں جو پنجاب کی مقامی صنعت کے لئے اِس قدر مفید ہیں - تجارت برآمد کے حق میں نہایت مضرت رساں ہیں - لیکن اگر اشیاء کی قیمت ان کی جسامت کے مقابلے میں زیادہ ہو - تو اس خیال کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہتی - آپ نے دیکھا ہوگا - کہ گھوڑے کے ساز و سامان پر جو مصارف آتے ہیں - وہ باعتبارِ تناسب کپڑے کے مصارف سے بہت کم ہیں - کیونکہ کپڑا اس کی نسبت زیادہ جگہ گھیرتا ہے -

اگر پنجاب کبھی اپنی مصنوعات کو باہر بھیج کر فائدہ اٹھانا اور تجارت برآمد کو فروغ دینا چاہتا ہے - تو اسے ایسی اشیاء کی تیاری پر اپنی ساری توجہ صرف کر دینی چاہیئے - جو کم جگہ گھیریں - اور زیادہ قیمتی ہوں - مثلاً ریشم یا وہ اشیاء جو پنجاب سے مخصوص ہوں - مثلاً تارپین - اس مسئلہ پر بحث کرتے وقت اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے - کہ خام اجناس کے بارہ میں بھی اس امر کا خیال اس حد تک نہیں رکھا جا سکتا - کیونکہ دنیا کو خام اجناس کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے پنجاب کے گیہوں اور تیل کے بیجوں کی ضرورت دنیا کی ہر منڈی کو ہے - البتہ یہ اغلب ہے - کہ مستقبل میں پنجاب کے کپڑے کی ضرورت نہ رہے - جس رقبہ میں بعض خاص پودے اُگتے ہیں - وہ آب و ہوا اور بعض دوسرے اثرات کے ماتحت کسی ایک ملک سے مخصوص ہوتا ہے - حالانکہ مصنوعات ان اثرات کے ماتحت نہیں ہوتیں - اور اگر ہوتی ہیں - تو بہت کم - جو لوگ بکمالِ تاسّف کہا کرتے ہیں - کہ پنجاب میں صرف خام اجناس ہی پیدا ہوتی ہیں - اور یہاں معدودے چند کارخانے ہیں یقیناً اِس وجہ کو نظر انداز کر دینگے - کہ صوبہ قدرتی طور پر خام اجناس پیدا کرنے کے لئے موزوں واقع ہوا ہے - اور بعض فطری نقائص کی وجہ سے مصنوعات کی صلاحیت نہیں رکھتا - یہ فطری نقائص کیا ہیں؟ کوئلہ کی عدم موجودگی - سمندر سے دوری وغیرہ وغیرہ - اگر ہم لنکا شائر اور پنجاب کے حالات کا موازنہ کریں - تو ہمیں معلوم ہوگا - کہ لنکا شائر بہت بڑی رُوئی کا مالک ہے - جس کا انتظام بہت اعلیٰ ہے - اس کے پاس کافی سرمایہ ہے - شرح سود بہت کم ہے - جس کی وجہ سے وسیع پیمانہ پر

پارچہ بافی میں آسانیاں مہیا ہو گئی ہیں - اور استقرار حاصل سے جو وسیع پیمانہ پر کپڑا تیار کرنے کا نتیجہ ہے - پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے - لورپول دنیا کی جہاز رانی کا مرکز ہے - اس لیئے نسبتاً بہت کم خراجات پر دنیا کی تمام بندرگاہوں تک خواہ وہ مشرق و مغرب شمال اور جنوب میں کہیں واقع ہوں - نہائت کم اخراجات پر مال پہنچایا جا سکتا ہے - برخلاف اسکے پنجاب میں سرمایہ موجود نہیں - شرح سود بہت زیادہ ہے - سمندر تک بلا واسطہ نہیں پہنچ سکتا - شمال مغرب اور جنوب میں کوئی منڈی ایسی نہیں - جہاں آسانی سے پہنچایا جا سکے - اس لئے اس صوبہ کیلئے یہ ممکن نہیں - کہ ایسے وسیع پیمانہ پر کپڑا تیار کرے - کہ استقرار حاصل سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے -

سطور بالا سے یہ واضح ہو جاتا ہے - کہ محض یہ امر کہ پنجاب میں کپڑا تیار کرنا ممکن ہے اس بات کی دلیل نہیں - کہ یہاں کپڑا تیار کرنا چاہیئے - وہی سرمایہ محنت اور ہمت جو پارچہ بافی پر صرف کی جائیگی - کیوں نہ کسی دوسری صنعت پر صرف کی جائے - جس کے لئے یہ صوبہ قدرتی طور پر موزوں واقع ہوا ہے - (مثلاً رال اور تارپین) یا کسی ایسی چیز پر توجہ مرکوز کر دی جائے - جو اپنی جسامت کے مقابلہ میں بہت زیادہ قیمتی ہو - تا کہ وہ قدرتی نقائص جن سے یہ صوبہ نقصان اٹھا رہا ہے تجارت برآمد کو فروغ دینے میں سدِ راہ ثابت نہ ہوں - مثلاً کیوں نہ ریشم پیدا کر کے دوسرے ملکوں کو بھیجا جائے - ماحصل یہ ہے - کہ پنجاب خام اجناس کی پیداوار کے بارے میں جس کی مانگ ہمیشہ رہتی ہے - فطری صلاحیت رکھتا ہے - اسے پہلے ان خام اجناس کی جانب توجہ کرنا چاہیئے جنہیں لوگوں کے استعمال میں آنے کے لئے کم مرحلے طے کرنا پڑتے ہیں - مثلاً منطقہ حارہ کے ممالک میں ایسے پودوں کی کثرت ہے - جن سے نباتی تیل پیدا ہوتے ہیں - اور انکی بہت مانگ ہے - پنجاب تیل کے بیج باہر بھیجتا ہے - حالانکہ تیل استعمال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان بیجوں سے تیل نکالا جائے -

اس صوبہ کا صنعتی مستقبل خواہ کچھ ہو یہ امر یقینی ہے - کہ اس کا جغرافیائی محل وقوع اس کا بڑا عنصر رہیگا اور اگر اسکی اہمیت کو ذہن نشین کر لیا جائے تو مفید ہو گا - ایسی صنعتوں کو فروغ دینے کی کوشش بیسود ہے - جنہیں صحیح ترین اقتصادی اصولوں پر چلانے کیلئے وسیع تجارت برآمد کی ضرورت ہو - یہ امر مشتبہ اور غیر یقینی ہے - کہ یہ صوبہ دوسرے ممالک کی تقلید کر کے ان جیسی صنعتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتا - کیونکہ اگر نئے کارخانے قائم کئے

گئے۔ تو وہ دوسرے ممالک کے مال کا مقابلہ نہیں کر سکینگے۔ کیونکہ دوسرے ملکوں میں بہت سا مال بجلی تیار کرنے کی وجہ سے بہت کفایت ہوتی ہے۔ ہم اس مسئلہ پر بعد میں بحث کرینگے یہاں اقتصادیات پر جغرافیائی محل وقوع کے اثرات بتانا اور اس امر پر زور دینا مقصود تھا۔ کہ انہیں چیزوں پر ساری کوشش منعطف کر دینا چاہیئے۔ جنہیں پیدا کرنے کے لئے اس صوبہ کو خاص آسانیاں میسر ہیں۔

جغرافیائی محل وقوع کی اہمیت اس امر سے اور زیادہ ہو گئی ہے۔ کہ پچھلے دنوں کراچی اور انگلستان کے مابین کرایہ جہاز کی شرح بڑھ گئی ہے۔ اور جب نارتھ ویسٹرن ریلوے کے اخراجات میں اضافہ ہونے کے باعث مال کا کرایہ کا نرخ زیادہ کر دیا گیا۔ تو جغرافیائی محل وقوع کی اہمیت پیش از بیش ہو جائیگی۔ مثلاً جب گیہوں یہاں انگلستان بھیجا جاتا ہے۔ تو لورپول میں اُسکا نرخ پنجاب کے نرخ سے صرف اِسقدر زیادہ ہوتا ہے۔ کہ اس سے راستہ کے اخراجات اور بیمہ وغیرہ کے مصارف نکل آئیں۔ اور تھوڑا سا منافع بھی لگا لیا جائے۔ جب یہ اخراجات بڑھ جائینگے۔ تو گیہوں کی برآمد سے اسی صورت میں کوئی نفع حاصل ہو سکے گا۔ جب لورپول میں اُس کا نرخ غیر معمولی طور پر گراں ہو یا ہندوستان میں غیر معمولی طور پر ارزاں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ کم مقدار میں گیہوں کی برآمد ہوگی۔ اور مقامی نرخ گندم میں بھی کمی واقع ہو جائیگا۔ اسکا مقابلہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ شرح مبادلہ میں کمی کر دیجائے، یا انگلستان میں گیہوں کا نرخ بدستور گراں رہے۔

یہ چیز باہر کی آئی ہوئی مصنوعات کے مقابلے میں مقامی مصنوعات کی حفاظت کا سامان بہم پہنچا دے گی اور پنجاب کی وہ صنعتیں بھی جنکا انتظام اعلیٰ درجہ کا نہیں، یورپ کے صنعتی مرکزوں کی وسیع پیمانے پر طیار کی ہوئی مصنوعات کے مقابلے میں زندہ رہ سکیں گی۔ دوسری جانب پنجاب کی مصنوعات کو غیر ملکی منڈیوں میں فروخت کرنے کی دشواری نسبتاً بہت بڑھ جائیگی۔ اور جب تک رسل و رسائل اور تقسیم کے مصارف کم نہ ہونگے۔ جن عناصر نے اِس صوبہ کو دنیا کے دوسرے ممالک سے الگ رکھا ہے، اُن کے اثرات پہلے سے بھی زیادہ ہو جائینگے۔

زمین

اقتصادی دباؤ میں کمی اور اُسکے نتائج۔ ترقی یافتہ معیارِ زندگی کے اثرات

مالگذاری کے مطالبہ[1] کا اثر

پنجاب کی اقتصادی صلاحیتوں پر جغرافیائی محلِ وقوع کے بعد یہ حقیقت سب سے زیادہ اثرانداز ہوتی ہے۔ کہ اِس صوبہ کا حصّہ گہری دریائی زمین رکھتا ہے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے۔ کہ آیا آجتک پنجاب کو اِس خصوصیت کی وجہ سے فائدہ ہُوا ہے۔ یا نقصان بہرحال دریائی زمین قدرتی طور پر بہت زرخیز ہوتی ہے۔ اس میں بہت تھوڑی سی کاشت سے اچھی فصل اُگ آتی ہے۔ اسے دوسری زمینوں کی طرح کھاد کی ضرورت نہیں پڑتی بعض جگہ تو بہت زرخیز زمین ہے۔ اور بعض مقامات پر کسی قدر ریت کی آمیزش بھی ہے۔ اور چکنی مٹی بہت کم ہے۔ اگر اس کی قدرتی حالت بکثرت آبپاشی کی وجہ سے تبدیل نہ ہو گئی ہو۔ تو اُسے موریوں اور نالیوں کی بھی ضرورت نہیں۔ اس کی کاشت کرنے اور فصل سے فائدہ اٹھانے کے لئے بہت کم سرمایہ چاہئے۔ اِس اعتبار سے پنجاب کے لوگ دوسرے ملکوں کے زراعت پیشہ باشندوں کی نسبت بہت زیادہ خوش قسمت ہیں۔

انگلستان کی زمین قدرتی طور پر زرخیز نہیں۔ پرانے زمانے میں ملک کا بہت بڑا حصّہ دلدلوں، جنگلوں، اور بنجر زمین پر مشتمل تھا۔ چھ سو سال تک تو انگلستان میں بحث چھڑی

[1] سلگمین کی کتاب "پرنسپلز آف اکنامکس" صفحہ ۳۱۲-۳۱۳

رہی۔ کہ آیا گیہوں کی کاشت مفید ہے یا نہیں۔ اور حکومت کیجانب سے متواتر ایسے طریقے استعمال
کئے جاتے رہے۔ کہ کسان کی ہمت بندھے۔ اور گیہوں کی کاشت[1] پر آمادہ ہو۔
اگرچہ چودھویں صدی سے چونے کو کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ سہاگے کا استعمال
۱۶۰۰ء میں کیا گیا سیرمہ ۱۷۰۱ء میں ایجاد ہوا۔ اُس زمانے میں جو اجارہ نامے لکھے جاتے تھے
ان میں ایک شق بھی ہوتی تھی۔ کہ پیال زمین کی کھاد کے طور پر استعمال کی جائیگی۔ اس طرح گویا
صدیوں تک محنت سے کاشت کرنے اور کھاد ڈالنے کے بعد انگلستان کی زمین زرخیزی کی
موجودہ حالت تک پہنچی ہے۔ لیکن اب بھی کوئی کسان اس امر کا تصور نہیں کر سکتا۔ کہ کھاد ڈالے
بغیر زمین کی کاشت ہو سکتی ہے۔ جزائر برطانیہ میں اب بھی ایسے بڑے بڑے قطعاتِ زمین پڑے
ہیں۔ جنہیں کوئی فصل اُگ نہیں سکتی۔ اور بہیئت مجموعی زمین میں جو کچھ ڈالا جاتا ہے۔ وہ اُسی قدر
واپس دیدیتی ہے۔ ہندوستان میں لوگوں کو اس امر کا احساس نہیں۔ کہ برطانیہ بلکہ شمالی یورپ
کے تمام کسان زمین سے فصل اور اشیائے خوردونوش کی صورت میں جسقدر حاصل کرتے ہیں اسی قدر
کھاد کی صورت میں واپس دیدیتے ہیں۔ جنگِ عظیم کے زمانہ میں مصنوعی کھاد اور مویشیوں کی
خوراک بھی مہیا نہیں ہو سکتی تھی۔ اتنے مزدور بھی نہیں تھے۔ جو زمین کو صاف رکھ سکیں۔ اور پانی
کے نکاس کا انتظام کر سکیں۔ چنانچہ زراعت کے شاہی کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے
بیان کیا گیا ہے۔ کہ اس وجہ سے انگلستان کی زرخیزی کو بہت نقصان پہنچا۔ اور اگر اب
اسے ویسا ہی زرخیز بنایا جائے۔ جسقدر وہ جنگ سے پہلے زرخیز تھی۔ تو اس غرض کے لئے اُسپر
پانچ پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے خرچ کرنا پڑیگا۔
ڈنمارک میں نہ تو آب و ہوا اور نہ زمین کسان کے لئے موزوں تھی۔ بڑے بڑے ریتلے
قطعات تھے۔ جن پر بحری ہوائیں چلتی تھیں۔ لیکن ڈنمارک کے کسان نے سائنس اور تنظیم کی
تمام قوتوں اور انسانی مساعی کے استعمال سے اسے زرخیزی کی موجودہ منزل تک دیا۔ کہا جاتا ہے
کہ بلجیم کی زمین یورپ بھر میں ناکارہ زمین و اِس قدر بنجر ہے۔ کہ صدیوں کی محنت و مشقت کے باوجود

[1] تفصیل کے لئے کہ لیٹر دیکھئے +

آج بھی اگر اس میں کھاد[1] نہ ڈالی جائے۔ تو ایک مرتبہ بھی فصل پیدا نہ ہو سکے۔ ملک کا کوئی حصہ قدرتی طور پر زرخیز نہیں۔ اور ملکیتِ زمین کا جو نظام بلجیم میں رائج ہے۔ اُس نے کسانوں کی استعداد اور ولولہ میں بھی کمی پیدا کر دی ہے۔ باینہمہ بلجیم کی تاریخ اِس امر کا روشن ثبوت ہے۔ کہ علم اور محنت کی بدولت قدرتی حالات و اسباب پر بھی فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ بلجیم نے سائینس اور ہنرمندی کی بدولت خوشحالی حاصل کی ہے۔ وہاں فی ایکڑ جس قدر کھاد ڈالی جاتی ہے۔ کسی دوسرے ملک میں نہیں ڈالی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ بلجیم والوں کو اس لئے کامیابی[2] ہوئی ہے۔ کہ وہاں تعلیم پانے اور زراعتی طریقوں کے سیکھنے کے لئے خاص سہولتیں مہیا کی گئیں ہیں۔ انجمن ہائے امداد باہمی کے قیام نے ملکیتِ زمین کے اکثر نقائص رفع کر دیئے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی زراعتی تعلیم کی وجہ سے بیجوں کے انتخاب اور مصنوعی کھاد کے استعمال میں بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیا جاتا ہے۔

ہسپانیہ کے متعلق یہ اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ دس فیصدی زمین تو محض چٹانوں پر مشتمل[3] ہے ۳۵ فیصدی زمین قدرتی طور پر پیداوار کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ یا تو بہت بلندی پر واقع ہے۔ یا پانی سے محروم ہے۔ ۴۵ فیصدی زمین قابلِ زراعت ہے لیکن ایسے مقامات پر واقع ہے جہاں رسل و رسائل کے ذرائع موجود نہیں۔ یا پانی کی کمی ہے۔ کیونکہ اس کا دارومدار محض بارش پر ہے۔ اور اندرونی حصہ ملک میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ باقی رہی دس فی صدی زمین وہ البتہ اچھی جگہ واقع ہے۔ ملک کی دولت کے ذرائع دو ہیں۔ زراعت یا مویشی پالنا۔ اور انہیں کی جانب کم توجہ کی جاتی ہے۔ ملک کی زراعت ان لوگوں پر چھوڑ دی گئی ہے۔ جو مفلس اور جاہل ہیں۔ ملکیتِ زمین کا نظام نہایت مضر ہے۔ زراعت کا معیار نہایت پست ہے۔ یونان کی زمین کا ایک بہت بڑا حصہ تو بیکار ہے۔ یا تو اس میں چٹانیں اور یا دلدلیں۔ صرف یونان قدیم کا ۱۴ فیصدی علاقہ قابلِ زراعت ہے۔ کشاورزی کے آلات اور طریقے بہت ابتدائی اور پرانے ہیں۔ وہاں

---

[1] لینڈ اینڈ لیبر لسنز فرام بلجیم صفحہ ۱۲۸ مصنفہ روسٹری +

[2] صیغہ خارجہ کی ہینڈ بک متعلقہ بلجیم صفحات ۱۱۲ و ۱۱۳ +

[3] صیغہ خارجہ کی ہینڈ بک متعلقہ ہسپانیہ۔ صفحات ۴۲ و ۴۳ +

لوگ کھاد سے بھی واقف نہیں جھنجھنی میں آج جو لکڑی کے ہل استعمال کئے جاتے ہیں، وہ اُن ہلوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ جو آج سے دو ہزار سال پیشتر انسان کے زیر استعمال تھے[1]۔

جاپان کا ایک بہت بڑا حصّہ جنگلوں کے سوا اور کسی مصرف کا نہیں۔ اور ملک کے رقبہ کے صرف ⅙ میں زراعت ہوتی ہے۔ اطالیہ میں بھی جس حصّہ زمین پر زراعت ہوتی ہے، وہ ملک کے رقبہ کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہے۔ اور روس میں بنجر قطعات اراضی دور تک پھیلتے چلے گئے ہیں[2]۔

قدیم سرویا کا ⅓ مزروعہ علاقہ تھا۔ لیکن جنگ بلقان میں اُسے جو نیا علاقہ ملا۔ اُس کی آٹھ فی صدی زمین میں زراعت ہوتی ہے۔ بلغاریہ میں مزروعہ علاقہ ۴۲ فی صدی۔ اور رومانیہ میں ۶۰ فی صدی[3]۔

جب ہم پنجاب کی جانب توجہ کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ صوبہ زمین کے اعتبار سے یقیناً خوش قسمت ہے۔ صوبہ کے نصف رقبہ میں زراعت ہو رہی ہے۔ اور جب نہروں کی نئی اسکیم کی تکمیل ہوئی۔ تو رقبہ مزروعہ میں اضافہ ہو جائیگا۔ اور جب لوگ دولت کے اس غیر محدود ذریعہ سے بہترین طریق پر نفع حاصل کرنا سیکھ جائینگے۔ تو ملک بہت زیادہ خوشحالی حاصل کرلیگا۔ اب تک کھاد کی فراہمی یا زمین کی اصلاح و ترقی پر معقول صرف کئے بغیر زمین سے اسقدر پیداوار ہوتی رہی ہے۔ کہ پیداوار کے ایک بہت بڑے حصّے کو زراعت کا منافع تصوّر کرنا چاہیئے بدقسمتی سے یہ فطرتِ انسانی کی ایک بڑی کمزوری ہے۔ کہ جب بآسانی دولت حاصل ہو جاتی ہے، تو اس میں کام کرنے کا حوصلہ اور ولولہ ترقی نہیں کرتا۔ یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں۔ کہ زمین

---

[1] صیغہ خارجہ کی ہینڈ بک متعلقہ یونان صفحہ ۹۰ اسکے علاوہ جب کی کتاب "ماڈرن گریس" (یونان جدید) بھی ملاحظہ ہو۔

[2] رونٹری کا بیان ہے۔ کہ بلجیم میں زیر کاشت زمین کا تناسب ۶۴ فی صدی ہے۔ جرمنی میں ۶۳ فی صدی۔ فرانس میں ۶۵ فی صدی۔ انگلستان میں ۴۳ فی صدی۔ اور سکاٹلینڈ میں ۲۵ فی صدی +

[3] ملاحظہ ہوں صیغہ خارجہ کی ہینڈ بکیں +

کی قدرتی زرخیزی جس کی بدولت کم از کم محنت سے پیداوار حاصل ہو جاتی ہے۔ کسی حد تک زراعت کی پستی کی ذمہ دار ہے۔ جب دشواریاں پیش آتی ہیں۔ تو محنتی لوگ آگے بڑھتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی ہنرمندی شدید ترین مشکلات میں پیدا ہوتی ہے۔ اور عام طور صرف اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے محنت کرتے ہیں۔ اور اسی حد تک محنت کرتے ہیں۔ جس سے اُن کی ضروریات پوری ہو جائیں۔

جب تک زمین کی زرخیزی کے ختم ہو جانے کے آثار ہویدا نہ ہوں۔ لوگ قدیم ممالک کی زراعت کی اِس خصوصیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ کہ زمین سے نسبتاً گراں بہا چیز حاصل کرنے کے لئے اُس میں ارزاں چیز ڈالی جاتی ہے۔ جب تک کسان زیادہ محنت اور عقل صرف کئے بغیر فصل کاٹ سکتا ہے۔ قدرت اُسے جسقدر عطا کرتی ہے۔ وہ اُسی پر قناعت کئے بیٹھا رہیگا جب قدرت بخشش اور فیاضی کا ہاتھ کھینچنے پر آمادہ ہو جائے۔ اور کسان دیکھے۔ کہ جب تک قدرے کھاد نہ ڈالی جائے۔ اور کچھ جسمانی محنت صرف نہ کیجائے۔ قدرت کی فیاضی سے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ تو وہ اپنے گردوپیش زمین کو زرخیز بنانے والی چیزوں کی تلاش میں نظر دوڑائیگا۔ اور ایسے طریقوں کی جستجو کریگا۔ جس سے اُسے فائدہ حاصل ہو سکے۔ کسان جسقدر محنت کریگا۔ اُس کا دارو مدار اس امر پر ہے۔ کہ فطرت کی فیاضی کس حد تک مساعدت کرتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں کسان زمین کو دولت جمع کرنیکا ذریعہ نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسے محض سامان معیشت کی فراہمی کا وسیلہ جانتا ہے۔ اور جو آمدنی بآسانی حاصل ہو جائے۔ اس کی بدولت ترقی کو نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں حالات قدرتی طور پر یا دوسرے اسباب کے ماتحت زراعت کے لئے سازگار نہیں۔ وہیں زراعت پر بہت زیادہ محنت کی جاتی ہے۔ دوآبہ سندھ ساگر کے چاہی قطعات اراضی کو جن کی بہت نگہداشت کی جاتی ہے۔ اور کوہستانی کھیتوں کو اِس سلسلے میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بیچارہ اہیر جو ریواڑی کی ریتلی اور بارانی زمین میں مصروفِ جدوجہد ہے۔ لائل پور کے زرخیز علاقہ کے کسان سے زیادہ محنت کرتا ہے۔ جہاں زیادہ لگان دینا پڑتا ہے۔ جیسا کہ شہروں کے نواح میں دیکھا گیا ہے۔ یا جہاں کسانوں کے قبضے میں چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی

ہیں۔ وہاں زراعت[1] کی حالت بہتر ہے۔

تجربہ شاہد ہے۔ کہ زراعت کی اصلاح و ترقی یا عمیق کاشت کا خیال اُسی وقت آتا ہے جب اقتصادی دباؤ زیادہ ہو جائے۔ کسان اس وقت تک ایک قطعہ اراضی پر سرمایہ اور محنت صرف نہیں کرتے۔ جب تک وہ اس پر مجبور نہ ہو جائیں۔ جاپان میں زمین کی بہت عمیق کاشت کی جاتی ہے۔ اور یہ اُس کی زراعت کی ایک خصوصیت ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ جاپانی فطری طور پر مشقت پسند واقع ہوئے ہیں۔ بلکہ اس کا باعث یہ ہے۔ کہ پچھلے دنوں تک جاپان کی روز افزوں آبادی کے نکاس کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اِس لئے ایک ہی چارہ کار رہ گیا تھا۔ یا تو فاقہ کشی کریں۔ یا زمینوں کی کاشت نہایت عمیق کی جائے۔ امریکہ میں جہاں ابھی تک بہت زمین موجود ہے۔ کسان کی توجہ اس امر پر رہی ہے۔ کہ ایک بہت بڑے قطعہ زمین میں کاشت کی جائے۔ جس سے فی ایکڑ زیادہ پیداوار حاصل نہ ہو۔ لیکن اُنہوں نے اِس طرف توجہ نہیں کی۔ کہ ایک چھوٹے سے قطعہ زمین میں عمیق کاشت کی جائے جس سے فی ایکڑ زیادہ پیداوار ہو۔ کسان کا مقصد ہمیشہ یہ رہا ہے۔ کہ وہ اپنے لئے کافی آمدنی حاصل کر لے۔ اور قانونِ تقلیلِ حاصل کے مطابق یہ آسان ہے۔ کہ ایک بڑے قطعہ زمین کی وسیع کاشت کر کے اُسی قدر آمدنی حاصل کر لی جائے۔ جو ایک چھوٹے سے قطعۂ زمین عمیق کاشت سے حاصل ہو سکتی ہے جب اسی وسیع قطعۂ زمین نہیں ملتا تو وہ محنت و مشقت سے عمیق کاشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ آرتھر ینگ[2] کا مشہور

[1] پنجاب کے بندوبست کی رپورٹ سے اِس قسم کی کافی شہادتیں مل سکتی ہیں۔ اکثر ایسے دیہات میں جہاں مالکانِ اراضی محنتی ہیں۔ اور اراضی چھوٹی چھوٹی ہیں۔ زراعت بہت اچھی ہے۔ (مثلاً تحصیل گوجرانوالہ) یہ کہنے سے یہ مدعا نہیں کہ اگر ہر جگہ لگان میں اضافہ کر دیا جائے۔ تو پیداوار میں بھی اضافہ ہو جائیگا۔ زیادہ لگان زیادہ عمیق کاشت کی جانب متوجہ کر دیتی ہے۔ اور یہ اس لئے ہوتا ہے۔ کہ صوبہ میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو عمیق کاشت کے طریقوں کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اور ایسا کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اگر لگان میں تخفیف ہو جائے۔ تو وہ بھی ایسے طریقے اختیار نہیں کرینگے جنپر زیادہ محنت صرف ہوتی ہے۔

[2] آرتھر ینگ زراعت پر کتابیں لکھنے والے انگریز مصنفین میں سب سے بڑا تھا۔ اس کی ولادت ۱۷۴۱ء میں ہوئی اور ۱۸۲۰ء میں انتقال کیا۔

مقولہ ہے۔ کہ ملکیت کا جادو ریت کو سونا بنا دیتا ہے۔ ینگ نے یہ مقولہ برطانیہ کے مزارعین کا مقابلہ یورپ کے کسان مالکانِ اراضی سے کرتے وقت کہا تھا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ انگلستان کے مزارعین ڈیڑھ سو ایکڑ زمین میں کاشت کرتے ہیں۔ اور اس قدر وسیع قطعۂ اراضی سے اپنا سامانِ معیشت مہیا کرتے ہیں۔ برخلاف اِس کے یورپ کے کسان مالکانِ اراضی کی کائنات صرف پچیس ۲۵ تیس ۳۰ ایکڑ زمین ہوتی ہے۔ جس میں وہ شدید ترین مشقت کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیز جس سے آرتھر ینگ اِس قدر متاثر ہوا ہے۔ اختیاری نہیں۔ یورپ کے کسان اس امر پر مجبور ہیں۔ کہ ایک مختصر قطعۂ اراضی سے وجہ معاش حاصل کریں۔ ملکیت کے جادو سے نہیں۔ بلکہ بمشقت تمام کام کرنے سے ریت سونا بن جاتی ہے۔ البتہ ملکیت کی وجہ سے کسان کو اس امر کا یقین ہو جاتا ہے۔ کہ اس کی محنت سے جو کچھ حاصل ہوگا۔ اسی کے قبضہ میں رہیگا۔ حقوق ملکیت کی تعیین تو البتہ اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن محض ملکیت اعلیٰ درجہ کی زراعت کے لئے ضروری نہیں[1]

ہم نے بیان کیا ہے۔ کہ کسان میں اپنے طریقوں کی اصلاح اور محنت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے اقتصادی دباؤ ضروری چیز ہے۔ اِس لئے جب اقتصادی دباؤ سے نجات حاصل ہوگی تو یہ جذبہ بھی مٹ جائیگا۔ اور اس طرح یہ چیز ترقی کے لئے کسی حد تک مضر ثابت ہوگی۔ ایک اور بحث کے سلسلے میں ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ زمین کی اصلاح کی راہ میں ایک بڑا سنگِ گراں یہ بھی ہے۔ کہ کسان میں یہ احساس پیدا کرنا دشوار ہے۔ کہ زمین کی پیداوار کس حد تک اس کی اپنی محنت اور طریق زراعت کا نتیجہ ہے۔ جب کسان اپنے آپ کو نہایت اچھی حالت میں اور ایک قیمتی جائیداد کا مالک پاتا ہے۔ جس سے بہت بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ اور اُسے کوئی غیر معمولی محنت اور کوشش کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ تو فصل کے متعلق اس کی ذمہ داری کے احساس کا جذبہ کمزور ہو جاتا ہے۔ پنجاب کی یہی کیفیت ہے۔ برطانی حکومت کی وجہ سے زراعت پیشہ لوگوں کے ہاتھ میں دولت آگئی ہے۔ جب پنجاب کا الحاق قلمروئے برطانیہ سے

[1] انگلستان کی تاریخ زراعت ملاحظہ ہو۔

نہیں ہوا تھا۔ تو زمین کا کوئی تسلیم شدہ نرخ نہیں تھا۔ ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء میں حکومت زمین کی جو قیمت ادا کیا کرتی تھی۔ اُس کا اوسط آٹھ روپیہ فی ایکڑ تھا۔ ۱۸۶۲ء و ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۶ء و ۱۸۶۷ء تک یعنی پانچ سال کے عرصہ میں یہ کیفیت ہوگئی۔ جو زمین پبلک مقاصد کے لئے خریدی جاتی تھی۔ اُس کی قیمت ۱۳/۴ فی ایکڑ ادا کی جاتی تھی۔ آئندہ پانچ سالوں میں زمین کی قیمت کا اوسط پچاس روپیہ دو آنہ فی ایکڑ ہوگیا۔ ۱۸۹۵ء و ۱۸۹۶ء تک زمین کی قیمت برابر بڑھتی چلی گئی پھر نہر چناب کا افتتاح ہوا۔ اس نوآبادی اور اس کے آبادکاروں سے صوبہ کو دولت حاصل ہونے لگی۔ اور مسلسل خوشحالی اور فراغت کے عہد کا آغاز ہوگیا۔ مزروعہ زمین کی قیمت ۱۸۹۵ء و ۱۸۹۶ء میں ۵۹ روپے فی ایکڑ تھی۔ جو ۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۹ء میں ۲۸۵ روپے ہوگئی۔

اسی زمانہ میں حکومت نے مالگذاری میں تخفیف کردی۔ مالکانِ اراضی کو اس سے قوت حاصل ہوئی۔ اور منڈیوں کے دروازے کھل گئے۔ جب تک وسائل رسل و رسائل قائم نہیں ہوئے۔ اور ریلوے کے ذریعہ صوبہ کا تعلق بڑی بڑی بندرگاہوں سے نہیں ہوگیا۔ اجناس کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہیں۔ چنانچہ یکم جون ۱۸۶۵ء کو گیہوں کا نرخ ساڑھے نو سیر فی روپیہ تھا۔ ایک سال کے بعد تیرہ سیر ہوگیا۔ یکم جون ۱۸۷۱ء کو بیس سیر چودہ چھٹانک تھا۔ اور ۱۸۷۷ء کو ستائیس سیر پانچ چھٹانک۔ دو سال کے بعد پھر چودہ سیر ہوگیا۔ بعض دور دراز علاقوں مثلاً ضلع میانوالی میں ایسا بھی ہوتا تھا۔ کہ فصل ہو۔ تو گیہوں روپے کا ایک من ہوجائے۔ کیونکہ وہاں عملی طور پر گیہوں ناقابلِ فروخت ہوجاتا تھا۔ اِن حالات کے ماتحت زراعت جس طرح بارش کے اعتبار سے جوا بن گئی تھی۔ اِسی طرح قیمتوں کے اعتبار سے بھی اس کی حیثیت قماربازی کی سی تھی۔ لیکن جب ریلوے کی تعمیر ہوئی۔ تو نرخ بھی مستقل ہوگئے۔ اوسطاً نرخ گراں ہوگیا۔ اور اس طرح کسان کی پیداوار کی قیمت فروخت بعض ایسے ذرائع کی بدولت بڑھ گئی۔ جو اُس کے دائرۂ اختیار سے باہر تھے۔

اس کے بعد دو اور عناصر بروئے کار آگئے۔ جن سے آمدنی کے اوسط کو اور زیادہ کردیا۔ ان ایک تو نو تعمیر نہریں جن سے لاکھوں ایکڑ زمین سیراب ہوئی۔ اور پیداوار میں بہت اضافہ ہوگیا۔ اور بعض ایسے قطعاتِ زمین میں بھی کاشت ہونے لگی۔ جو پانی کی عدم موجودگی کے باعث

غیر مزروعہ پڑے تھے۔ گذشتہ پچاس سال کے عرصہ میں پنجاب کا رقبہ مزروعہ بہت بڑھ گیا ہے اور اس کا باعث محض آبپاشی کا انتظام ہے۔ مزروعہ رقبہ کے متعلق ذیل کے اعداد ملاحظہ ہوں[۱]

	وہ زمین جسے نہریں سیراب کرتی ہیں	جسے کنوئیں سیراب کرتے ہیں	جس کی سیرابی کا کوئی انتظام نہیں	میزان رقبہ مزروعہ
۱۸۶۸ء و ۱۸۶۹ء	۱۳۷۳۰۰۰	۴۶۱۲۰۰۰	۱۴۱۸۷۰۰۰	۲۰۱۷۲۰۰۰
۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء	۹۰۰۰۰۰۰	۳۵۰۰۰۰۰	۱۶۵۰۰۰۰۰	۲۹۰۰۰۰۰۰

نہروں کی آبپاشی کی وجہ سے جو فصل ہوئی۔ اُن کی قیمت سنہ ۱۹۱۹ء میں پچپن کروڑ لگائی گئی تھی ریلوے اور نہروں کی وجہ سے جو فائدہ ہوا ہے۔ اس کا اندازہ تجارت برآمد کی حیرت انگیز ترقی (بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ تجارت برآمد کے قیام اور ترقی) سے کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب کے الحاق سے پہلے کوئی زراعتی پیداوار کی کوئی قابل ذکر تجارت برآمد نہیں تھی سنہ ۱۸۷۱ء تا سنہ ۱۸۷۴ء میں صرف چار لاکھ روپیہ کا گیہوں باہر بھیجا گیا تھا۔ اور چالیس سال کے بعد ۱۴ کروڑ اڑتالیس لاکھ روپیہ کا گیہوں باہر بھیجا گیا۔

پہلے جس رقبہ میں گیہوں کی کاشت ہوتی تھی۔ وہ پچپن لاکھ ایکڑ تھا۔ لیکن بعد میں وہ ۹۵ لاکھ ایکڑ ہو گیا۔ اور اب تقریباً ایک کروڑ ایکڑ میں گیہوں کی فصل ہوتی ہے۔ اور اس طرح مزروعہ رقبہ میں بہت اضافہ ہوا ہے، اور فی مزروعہ ایکڑ کی پیداوار بڑھ گئی ہے۔ مزید برآں زرعی پیداوار کی قیمت[۲]

---

[۱] سنہ ۱۸۶۸ء و سنہ ۱۸۶۹ء کے متعلق جو اعداد دیئے گئے ہیں، وہ درحقیقت اس زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ پنجاب کی ہیئت ترکیبی کچھ سے مختلف تھی۔ اسلئے اضافہ پیداوار حقیقت میں اس سے بہت زیادہ ہے سنہ ۱۹۱۸ء و سنہ ۱۹۱۹ء کے متعلق جو اعداد دیئے گئے ہیں۔ وہ محض تخمیناً ہیں۔ ماہرین اقتصادیات یقیناً یہ سمجھیں گے۔ کہ رقبہ مزروعہ کی توسیع کے باعث اوسط پیداوار میں کمی واقع ہو گئی ہوگی کیونکہ زرخیز ترین اراضی میں پہلے زراعت ہوتی ہے۔ اور توسیع رقبہ مزروعہ کی وجہ سے ناقص اراضی کی بھی کاشت ہونے لگتی ہے لیکن پنجاب میں کیفیت ہی دوسری ہے یہاں تو تعمیر نہروں کی وجہ سے زرخیز زمین میں کاشت ہونے لگی جو اچھوتی پڑی تھی۔ اسلئے رقبہ مزروعہ کی توسیع کے باعث اوسط پیداوار میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ملاحظہ ہو۔ "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر" مصنفہ مولینڈ۔ صفحات ۱۱۵ تا ۱۱۸ +

[۲] تخمیناً یوں کہنا چاہیئے کہ جن نہری زمینوں میں آجکل کاشت ہوتی ہے اگر انمیں نہروں کے بغیر کاشت کی جاتی۔ تو زرعی پیداوار کی قیمت موجودہ پیداوار کی قیمت سے بقدر ۱۲ کروڑ روپیہ کے کم ہوتی۔ لیکن اس سے بھی نہروں کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ (باقی بر صفحہ ۱۲)

میں بھی معتد بہ ایزدی ہوئی ہے۔ لیکن آبادی جس پر یہ دولت تقسیم ہوجاتی ہے۔ اسی تناسب کے ساتھ نہیں بڑھی۔ صوبہ کے موجودہ حدود کے مطابق مختلف سالوں میں حسب ذیل آبادی رہی ہے[1]۔

سال	آبادی	سالانہ شرح کا اوسط
۱۸۶۸ء	۱۶۲۲۵۰۰۰۰	ر۴۷
۱۸۸۱ء	۱۷۲۸۰۰۰۰	+ر۴۷
۱۸۹۱ء	۱۹۰۰۰۰۰۰	+ر۹۶
۱۹۰۱ء	۲۰۳۳۰۰۰۰	+ر۶۷
۱۹۱۱ء	۱۹۹۷۵۰۰۰	-ر۱۸
۱۹۲۱ء	۲۰۶۸۵۰۲۴	

چونکہ ۱۸۶۹ء کے متعلق جو اعداد دیئے گئے ہیں۔ وہ صحیح تخمینہ سے کم معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ آبادی میں بیس فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ حالانکہ زراعت نے پچاس فیصدی ترقی کی ہے۔ اور پیداوار کی قیمت خام تقریباً ۳۵ کروڑ روپیہ سالانہ سے ایک ارب[2] روپیہ سالانہ تک جا پہنچی ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے۔ کہ زمین پر دباؤ کم ہوگیا ہے۔ ۱۸۶۲ء میں ہر سو ایکڑ مزروعہ زمین پر آبادی کا اوسط ۸۳ تھا۔ اور ۱۹۱۹ء میں ۴ و ۶۷ ہو گیا۔ پہلے ہر سو ایکڑ مزروعہ زمین پر ۴۶ کسان تھے اب ۴۲ ہو گئے۔ (۱۸۶۸ء میں مردم شماری کی جو رپورٹ شائع ہوئی۔ اس میں مذکور ہے۔ کہ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۸ء تک آبادی میں ۵ و ۱۱ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اور زراعت ۶ و ۳۱ فیصدی بڑھ گئی) پہلے فی کس خام پیداوار کا اوسط ۲۲ روپیہ سے کم تھا۔ اب ساٹھ روپیہ سے زیادہ ہوگیا۔ اور یہ کہنا یقیناً صحیح

(صفحہ ۱۲۱ کا بقایا حاشیہ) نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر نہریں تعمیر نہ ہوتیں۔ تو آج جن اراضی پر نہروں کی بدولت فصل کھڑی ہے۔ وہ غیر مزروعہ اور بنجر زمینیں نظر آتیں۔

[1] ملاحظہ ہو مردم شماری کی رپورٹ بابت ۱۹۱۱ء۔

[2] مالگذاری کی رپورٹ بابت ۱۹۱۸ء میں پیداوار کی قیمت خام کا اندازہ ۲۵ روپیہ فی ایکڑ یا ۷۰ کروڑ روپیہ سے زیادہ کیا گیا تھا۔ غالباً سرکاری افسروں نے ان اعداد کے بارے میں حد درجہ کی احتیاط برتی ہے۔ آجکل ڈیڑھ ارب روپیہ سے کم تخمینہ لگایا جائے۔ تو اسکی قیمت محل نظر ہوگی۔

ہے۔ کہ زراعت پیشہ خاندانوں کی خام آمدنی دگنی ہو گئی ہے۔

آمدنی میں یہ اضافہ انگریزی نظم و نسق کا نتیجہ ہے۔ یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ آمدنی کے اضافہ میں کسان کی مساعی کو بھی کوئی معقول دخل ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے۔ کہ اب کسانوں میں اصلاح و ترقی کا ذوق پیدا ہو گیا ہے۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کہ کسان نے زراعت میں اس حد تک محنت و مشقت کی ہو۔ کہ ملک کی عمومی فارغ البالی پر اس کا کوئی مفید اثر پڑا ہو۔ صرف مزدوروں کی تعداد میں ہی کمی واقع نہیں۔ بلکہ پہلے ہر سو ایکڑ زمین میں جس قدر بیل ہوا کرتے تھے۔ اب اتنے نہیں رہے۔ بندوبست کی بعض رپورٹوں میں تو یہ بھی مذکور ہے۔ کہ زراعت باعتبار کیفیت[1] زوال پذیر ہے۔ اور اقتصادی دباؤ کے اثرات کے متعلق جو دلیل پیش کی گئی ہے۔ اگر وہ صحیح ہے۔ تو اس کی توقع ہو سکتی تھی۔ کسان دیکھتے ہیں۔ کہ اُن کی آمدنی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے انہیں۔ مزید محنت و مشقت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ان میں سے بعض تو یہ محسوس کر رہے ہیں۔ کہ محنت کرنا قطعاً غیر ضروری ہے۔ کیونکہ مزارعین کے قبضے میں جتنا رقبہ تھا۔ اسمیں اضافہ ہونے لگا۔ اور مالکان الارضی نے بڑی بڑی رقموں پر اپنی جائیداد کو رہن رکھنا شروع کیا۔ تاکہ زمین کی روز افزوں قیمت سے فائدہ اٹھائیں۔

اس طرح گویا پنجاب بعض نہایت دلچسپ اقتصادی خصوصیات کا مالک ہے۔ حکومت نے نہایت وسیع پیمانے پر اصلاحات نافذ کی ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ عوام کی دولت میں نہایت سرعت سے ایک نمایاں اضافہ ہو گیا ہے۔ اور وہ افلاس کے چنگل سے رہا ہو چکے ہیں۔ حکومت کی ان اصلاحی کارروائیوں کی بدولت زمین کی قیمت غیر متوقع طور پر بڑھ گئی ہے۔ زمین کی قیمت میں اس غیر معمولی اضافہ کی ایک وجہ یہ ہے۔ کہ اب زمین کی نقد رقم لگان بہ نسبت سابق بہت زیادہ ہو گئی ہے

---

[1] مثال کے طور پر بندوبست کی رپورٹ کا صفحہ ۱۱ ملاحظہ کیجئے۔ جو تحصیل گوجرانوالہ سے متعلق ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۱۸۹۲ء میں ایک ہزار ایکڑ مزروعہ اراضی میں ۱۴۳ بیل ہوا کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۱۰ء میں انکی تعداد ۱۰۶ رہ گئی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض علاقوں میں مویشی کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ لیکن اسکے جواب میں بھی یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔ کہ خام آمدنی میں اضافہ بہت حد تک حکومت کی سرگرمیوں کا شرمندۂ احسان ہے۔ جس نے نہریں اور ریلوے کی تعمیر کر کے آمدنی کو بڑھا دیا ہے۔

ایک اور سبب یہ بھی ہے۔ کہ متذکرہ بالا طریقوں کی وجہ سے ملک کی جدید دولت کو بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔ اور چونکہ ملک کی دوسری صنعتیں اور تجارت ابھی تک پستی کی حالت میں ہیں۔ اِس لئے لوگ زراعت پر سرمایہ لگا رہے ہیں۔ زمین کی قیمت میں اِس روزافزوں اضافہ نے سود خواروں کو اور اُن تمام اشخاص کی توجہ کو ادھر منعطف کرا دیا ہے۔ جو وافر روپیہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ زمین کی قیمت میں اضافہ کے باعث مالکانِ اراضی کی ساکھ قائم ہو گئی ہے۔ اور اس جماعت کو جس کی آج تک کوئی ساکھ نہیں تھی۔ قرض لینے کے معاملے میں اس قدر سہولتیں مہیا ہو گئی ہیں۔ کہ اس کے لئے قرض لینے کی کشش سے بچنا مشکل ہو گیا ہے۔ دوسرے زراعتی ممالک کے مالکانِ اراضی کو جن دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ وہی یہاں کے زمینداروں کو بھی پیش آرہی ہیں یعنی جب سے اراضی کی قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ کسان دھڑا دھڑ اراضی رہن رکھ کر قرض لے رہے ہیں۔ جو لوگ ساکھ سے فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ ان کے لئے یہ ایک قابل قدر چیز ہے۔ لیکن جو لوگ اس کے مصرف سے واقف ہیں اُنکے لئے یہ ایک خطرناک چیز ہے۔ اور دوسرے ممالک کی طرح پنجاب میں بھی ایسے لوگوں کی کثرت ہے۔ جن کے لئے ساکھ خطرہ کا باعث ہے۔ ہم زمین کی قیمت کے اضافہ اور اُس کے اثرات اور ساکھ کے غلط استعمال کے متعلق اوراق آئندہ میں تفصیلی بحث کرینگے۔ زیر بحث مسئلہ کے سلسلے میں اِتنا کہنا کافی ہے۔ کہ ہمیں مستقبل کا پردہ اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اور یہ معلوم کرنا چاہیئے۔ کہ اقتصادی اثرات سے آئندہ زمانہ کیونکر متاثر ہوگا۔ اور اس سے کیا نتائج پیدا ہونگے۔

اب تک صوبہ کی آبادی میں جو اضافہ ہوا۔ اس کے لئے بہم رسانی خوراک کا پورا پورا انتظام کر دیا گیا ہے۔ یعنی نہروں کی وجہ سے اب وسیع بنجر زمینیں بھی قابلِ زراعت ہو گئی ہیں۔ دوآبہ سندھ ساگر کی نہر سے بیس لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہو گئی۔ وادیٔ ستلج کی نہر سے پچیس لاکھ ایکڑ سیراب ہونگے۔ (جن میں ریاستہائے بہاولپور اور بیکانیر کے وسیع علاقے شامل ہیں) اس کے علاوہ بھکر کے بند کی اسکیم بھی نہری علاقہ میں توسیع کر دیگی۔ اِس لئے یہ اغلب نہیں۔ کہ کسان محض آبادی کے بڑھ جانے کی وجہ سے زراعت کے اصلاح یافتہ طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیگا۔ البتہ ایک چیز ہے۔ جو کسان میں مزید محنت و مشقت کا ولولہ پیدا کر سکتی ہے۔ اور وہ اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کرنے کا جذبہ ہے۔ جو

ہر شخص کے قلب میں پرورش پا رہا ہے - اس میں کوئی شک نہیں - کہ گذشتہ بیس سال کے اندر صوبہ
نے اس سلسلہ میں بہت ترقی کر لی ہے - لنکا شائر سے جو کپڑا ہندوستان میں آتا ہے - اس سے یہ معلوم
ہوتا - کہ لوگ بہ نسبتِ سابق اچھا لباس پہننے لگے ہیں - ادنیٰ درجہ کی اجناس مثلاً باجرہ وغیرہ کے بجائے
اب گیہوں استعمال کیا جاتا ہے - بھینس جو خوشحالی کی علامت سمجھی جاتی تھی - گائے کے بجائے ہر جگہ
نظر آتی ہے - صوبہ کے باشندے پہلے کی نسبت زیادہ گوشت کھاتے ہیں - یہ درست ہے کہ اخلاقی
حیثیت سے زیادہ ترقی نہیں ہوئی - لیکن اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنیوالے طلبار کی تعداد میں اضافہ
ہو رہا ہے - اور ہر قسم کی کتابوں کی اشاعت بڑھ رہی ہے - یہ اغلب ہے - کہ اعلیٰ معیار کی زندگی
بسر کرنے کی خواہش کو مملوکہ اراضی میں اضافہ کر کے یا آمدنی بڑھا کر اور یا پیداوار کی زیادہ قیمت حاصل
کر کے پورا نہیں کیا گیا - بلکہ قرض لینے کے متعلق جو سہولتیں میسر ہو گئی ہیں - اُن سے فائدہ اٹھایا گیا
ہے - کروڑوں روپیہ کی زمین رہن و بیع کی گئی ہے - اور اس روپیہ کا ایک حصہ ایسی بلند معیار کی
زندگی بسر کرنے پر صرف کیا گیا ہے - جو آمدنی کے اعتبار سے مسرفانہ ہے - گویا زمیندار سرمایہ پر زندگی
بسر کر رہے ہیں - اور حالات کو بہتر بنانے کے لئے ضروری ہے - کہ ساکھ کے غلط استعمال کو روک
دیا جائے[1] -

اگر مصارف کو محض مداخل تک ہی محدود رکھا جائے - تو بہتر زندگی بسر کرنے کی خواہش اقتصادی
ترقی کا جذبہ پیدا کر سکتی ہے - اس سلسلہ میں پانچ باتیں جنہیں عناصر پنجگانہ کہنا چاہیئے - آپس میں اسطرح
لازم و ملزوم واقع ہوئی ہیں - کہ اگر ایک میں کوئی تغیر واقع ہوا - تو دوسرے میں بھی تغیر رونما ہوگی -
یہ پانچ چیزیں آبادی، رقبہ مزروعہ، رقبہ کی پیداوار، معیار زندگی اور انتقالِ مکان ہیں - اگر آبادی میں
اضافہ ہوا - اور مزروعہ رقبہ میں کوئی اضافہ نہ ہوا، تو لوگوں کو چاہیئے - کہ جسقدر رقبہ میں زراعت ہو رہی
ہے - اُس کے طریقِ زراعت کی اصلاح کر کے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کریں - اور اگر

[1] مسٹر ڈارلنگ کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے - کہ ... ۲۴۴ مالکانِ اراضی میں سے جو سب کے سب مجالس امداد باہمی کے ممبر
تھے - صرف ستر فی صدی قرض سے آزاد تھے - بڑھی ہوئی ساکھ کو بے سود اور رائیگاں صرف کرنیکا جو رجحان پایا جاتا ہے - اُس پر غور
کرنا چاہیئے - کیونکہ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی - تو یہ رجحان قوی ہو جائیگا اور اس سے سخت خطرات پیدا ہو جائینگے -

یہ نہیں ہوسکتا - تو یا اپنی زندگی کا معیار اس قدر بلند نہ رکھیں - یا جن زراعت پیشہ لوگوں کے لئے زراعت کام مہیا نہیں کر سکتی - وہ دوسری صنعتیں اور پیشے اختیار کر لیں - یا دوسرے ملکوں کو چلے جائیں - ہندوستان میں آج جو پست معیار زندگی نظر آرہا ہے - اسکی بہت حد تک یہ وجہ معلوم ہوتی ہے - کہ آبادی پیداوار کی نسبت زیادہ سرعت سے بڑھتی رہی ہے - لوگ زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا نہیں جانتے تھے - اور حالات اِس امر کی اجازت نہیں دیتے تھے - کہ زراعت کو وسعت دی جائے یا لوگ[1] اِس سرزمین سے انتقال مکان کر کے دوسرے ممالک میں جا آباد ہوں - مزید برآں اُس وقت یہ سہولت بھی مہیا نہیں تھی - کہ کہیں سے روپیہ قرض لیا جائے - اگر یہ وجوہ صحیح ہیں - تو اس کے معنے یہ ہوئے - کہ جسطرح بعض دوسرے ملکوں میں اقتصادی دباؤ کیوجہ سے لوگوں کی قوتِ ایجاد و اکتشافات کے جوہر نمایاں ہو گئے تھے - یہاں نہیں ہوا - لوگوں نے اکتشافات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا - انہیں اتنی جرأت نہیں ہوئی - کہ اِن دشواریوں کا مقابلہ کر سکیں - انگلستان میں جب یہ صورتِ حال پیش آئی - تو باہر سے اہلِ حرفت منگوائے گئے جن سے انگلستان کے باشندوں کی قوتِ ایجاد کو بہت فائدہ پہنچا - پروفیسر الفرڈ مارشل کے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے - کہ انگلستان نے سب سے پہلے جو عظیم کام شروع کیا - وہ نالیوں کی تعمیر کا تھا یہ کام بھی ہالینڈ کے باشندوں کا مرہونِ منت تھا - انگلستان میں جو سب سے پہلے آہنی توپیں بنائی گئیں - انہیں سسکس میں ایک فرانسیسی نے ڈھالا تھا - چنانچہ فرانسیسیوں، اطالیوں، وسندیزوں، فلمنگ اور سویڈن کے باشندوں اور جرمنوں سے انگریزوں نے جو سبق حاصل کیا - اُس کی بدولت وہ کپڑے

---

[1] جب تک حمل و نقل اور رسل و رسائل کے ذرائع کا ایک باقاعدہ نظام قائم نہ ہو جائے - لوگ اسی قدر اجناس پیدا کرینگے جو موجودہ ضروریات کے لئے کافی ہوں - اگر زائد از ضرورت اجناس پیدا کی گئیں - تو اُن کے نکاس کا کوئی ذریعہ نہیں ہوگا - اور لوگوں کو پیداوار کا معاوضہ نہیں ملیگا - اِس لئے یہ ضروری ہے - کہ کسان اُتنے ہی رقبہ میں فصل کی کاشت کرینگے - جس کی پیداوار مقامی ضروریات کے لئے کافی ہوسکے - جب کبھی موسم میں کوئی ناخوشگوار تغیر پیدا ہوا - تو ہنگامی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے غلہ فراہم نہیں کیا جاسکے گا - پنجاب کے موجودہ حالات ایسے ہیں - کہ یہاں پیداوار کو محدود کر دیا جائے - تو اسے قحط و فاقہ زدگی کا خطرہ نہیں ہوگا +

ریشم، کاغذ اور مٹی کی اشیاء بنانے اور کانیں کھودنے اور دھاتیں صاف کرنے میں ماہر ہو گئے
انگلستان کے قدیم بادشاہوں نے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے اور لوگوں کو تعلیم دلانے کے خیال
سے بیرونی اہل حرفہ کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں اپنے ملک میں آباد کیا۔ اُنکی تعلیمی حکمتِ عملی صحیح طور پر
تعمیری مقاصد پر مبنی تھی۔ اُن کی مدد سے انگلستان اپنی مصنوعات دوسرے ملکوں میں فروخت
کرنے کے قابل ہوا۔ اور انہیں لوگوں اور اُنکے بھائی بندوں کی وجہ سے جو عدالت کے پنجے سے
بچنے کے لئے انگلستان میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ اشیاء کی ساخت کے مختلف اور متنوع
طریقے اختیار کئے گئے۔ اور یہ چیز بالآخر انگلستان کی خصوصیت بن گئی۔ انگریزوں نے اپنے
اُستادوں سے جو کچھ سیکھا تھا۔ اس پر انہوں نے اپنی ذہانت کی بدولت اضافہ کیا اور بعد میں ایجاد و اختراع
کی قوت نے نہایت نمایاں ترقی کی۔

انگلستان کی اراضی پر اقتصادی دباؤ کے اثرات اس قدر نمایاں نہیں تھے۔ جیقدر جاپان
میں۔ کیونکہ جاپان دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا۔ آخر اُسے غیر ملکی تجارت پر بزورِ شمشیر
مجبور کیا گیا۔ لیکن بہت عرصہ کے بعد جاپان کی حکومت کو یہ خیال ہوا۔ کہ وہ خود لوگوں میں صنعت و
حرفت سیکھنے کا جذبہ پیدا کرے۔ چنانچہ اُس نے غیر ملکی ماہرینِ فن کو طلب کیا۔ کہ وہ جاپانیوں کو مغربی
طریقے سکھائیں۔ انہوں نے بیرونی ممالک میں اُن علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے آدمی بھیجے۔
جو جاپان کی ضروریات کے عین مطابق تھے۔

اس وقت تک جاپانی متواتر اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتے رہے ہیں۔ کہ اُن میں ایجاد و اختراع
کا مادہ تو نہیں۔ لیکن نقل کرنے کی قوت ضرور موجود ہے۔ انہوں نے صنعت و حرفت کے نئے طریقے
تو معلوم نہیں کئے۔ البتہ پرانے طریقوں کی نقل کی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان بھی اس
بارے میں جاپان کا تتبع کریگا۔ اگر اقتصادی دباؤ نے ہندوستانیوں کی توجہ زراعت اور صنعت و حرفت
کی ترقی کی جانب منعطف کر دی تو ان چیزوں کو فروغ دینے کیلئے انہیں تعلیم دینا ضروری ہے۔
بیرونی ممالک سے ماہرینِ فن کو طلب کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہئے۔ حُبِ وطن کا وہ جذبہ قابلِ افسوس ہے

ملاحظہ ہو "انڈسٹری اینڈ ٹریڈ" صفحات ۴۰ و ۴۱ +

جو اختلافِ رنگ و نسل کو اُن تمام اوصاف سے زیادہ اہم سمجھے۔ جن سے ملک آسودگی اور خوشحالی
حاصل کر سکتا ہے۔ آجکل ہندوستان کی کیفیت عجیب و غریب ہے۔ اکثر لوگوں کی خواہش ہے۔ کہ
ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ لیکن اب تک جس قدر خوشحالی
میسر ہوئی ہے۔ وہ انگریزی نظم و نسق کی مرہونِ منت ہے۔ لوگوں کی محنت اور کوشش کو اس میں
کوئی دخل نہیں۔ حکومت کی کوششوں کو جو کامیابی ہوئی ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ افلاس کی
شدت میں کمی واقع ہوگئی۔ اور از بسکہ افلاس کی شدت انسان کے قلب میں کام کرنے کا جذبہ پیدا
کر دیتی ہے۔ اِس لئے افلاس کی کمی نے پیداوار بڑھانے کے جذبہ کو بھی کم کر دیا۔ تاہم امید ہے۔ کہ
حکومت افلاس کو مٹانے کی کامیاب کوششوں کا اعادہ کریگی۔ اور جو وسیع تجاویز اس کے پیشِ نظر
ہیں۔ انہیں عملی صورت دیجائیگی۔ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ حکومت کی کوششوں کے باعث محنت و مشقت
کے جذبہ میں جو کمی واقع ہوگئی ہے۔ بلند معیار کی زندگی بسر کرنے کی خواہش اُس کی تلافی کر دے۔
لیکن یہ باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں۔ کہ گذشتہ زمانہ میں جب کبھی نکبت و مصیبت کا دور آیا۔ تو
اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کرنیکا جذبہ خود بخود مٹ گیا۔ ہاں! یہ ممکن ہے۔ کہ لوگ سرمایہ کو جسے محفوظ رہنا
چاہیئے صرف کر کے اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کریں۔ اور اپنے مستقبل کو خطرہ میں ڈال دیں۔ کیونکہ یہ جذبہ
ایسا ہے۔ جسے صرف قانون انتقال اراضی ہی کسی حد تک روک سکا ہے۔ اور قانون ساہوکارہ بھی
اس خلا کو پُر نہیں کر سکا۔ اِمداد باہمی کی تحریک نے بھی بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ لیکن اِس تحریک کو
فروغ دینے کے لئے ضروری ہے۔ کہ اُن لوگوں کے لئے سخت قانون نافذ کئے ہیں۔ جو بیسود اور غیر
منفعت بخش مقاصد کیلئے روپیہ قرض دیتے ہیں۔ اِس کے علاوہ زرعی تحقیق اور تعلیم کے لئے ایک اسکیم
مرتب کی جائے۔ جس سے لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔ کہ اگر عقل اور سمجھ سے کام لیا جائے۔ زمین پر سرمایہ
صرف کیا جائے۔ ہنر مندی اور سلیقہ سے زراعت کی جائے۔ تو زندگی کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ایسی
چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو ترقی دیجائے۔ جن سے زراعت کو مدد ملتی ہے۔ اور جن سے چھوٹے چھوٹے
مالکانِ اراضی خوشحالی اور فراغت حاصل کر سکتے ہیں۔ چونکہ دولت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ
خرچ کی نسبت آمدنی زیادہ ہو۔ اس لئے یہ ضروری ہے۔ کہ اسراف اور فضول خرچی سے احتراز کیا جائے۔
اِس سلسلہ میں جو اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں۔ انکے متعلق ہم کچھ کہہ دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ سطورِ بالا میں ہم نے جو کچھ کہا ہے۔ اُسے عمل میں لانے کیلئے ضروری ہے۔ کہ سرکاری افسروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ اور زراعت پر حکومت کی گرفت زیادہ مضبوط ہو جائے۔ حالانکہ اِس صوبہ میں دونوں چیزیں کافی موجود ہیں۔ اِس کے جواب میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ گذشتہ مردم شماری میں سرکاری ملازموں اور اُن کے متوسلین کے متعلق جو اعداد و شمار فراہم ہوئے ہیں۔ (ان میں فوجی ملازم بھی شامل ہیں) اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سرکاری ملازمین صوبہ کی پوری آبادی میں ۳۷ ء ۱ فیصدی ہیں۔ حالانکہ گداگر ۴۲ ء ۲ فیصدی ہیں اسطرح گویا اس صوبہ میں سرکاری افسروں کی نسبت گداگروں کی تعداد زیادہ ہے۔ مزید برآں جاپان نے گذشتہ سالوں میں جو ترقی کی ہے۔ اُس کا ولولہ سرکاری افسروں نے پیدا کیا۔ اور ترقی و بہبود کے تمام کاموں میں وہ صرف حصّہ ہی نہیں لیتے رہے۔ بلکہ لوگوں کو حصّہ لینے پر مجبور کرتے رہے۔ ساتھ ہی یہ کہدینا بیجا نہ ہوگا۔ کہ ضروری نہیں۔ کہ صرف سرکاری عہدہ دار ہی صوبہ میں نئی زندگی کی رُوح پھونکیں۔ حکومت کو اُس وقت اپنے ملازمین سے کام لینے کی ضرورت ہوگی۔ جب عوام کی کوششیں ناکام ثابت ہونگی۔ اگر غیر سرکاری مجالس میں اِس قدر دُور اندیشی اور نکتہ رسی پیدا ہو جائے۔ کہ وہ مقامی مزدوروں کی تعلیم و تربیت کے لئے دوسرے ممالک سے ہنرمند کاریگر طلب کر سکیں۔ تو حکومت کو دخل دینے کی بہت کم ضرورت محسوس ہوگی۔ اصل چیز تو یہ ہے۔ کہ غیر سرکاری ذرائع سے لوگوں کو فراغت اور آسودہ حالی سے ترقی دیجائے۔ اور جہاں اُنہیں ناکامی ہو۔ حکومت یہ فرض انجام دے۔ لیکن جہاں تک زراعت کے مستقبل کا تعلق ہے۔ ہمیں اس کا یقین نہیں۔ کہ کوئی غیر سرکاری مجلس یہ خدمت انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کسانوں کی تعداد اِس قدر زیادہ ہے۔ اور اُنکی آمدنی کا اوسط اس قدر کم ہے۔ کہ یہ توامید ہی نہیں ہو سکتی۔ کہ وہ خود رضا کارانہ اِس مقصد کے لئے کافی چندہ دے سکیں۔ اِس لئے لامحالہ یہی چارۂ کار نظر آئیگا۔ کہ سرکار کے خرچ پر زراعت کو ترقی دی جائے۔ اور ترقی کے انہیں طریقوں پر اکتفا کیا جائے۔ جنہیں حکومت کا روپیہ فراہم کر سکے۔

یہ مسئلہ کہ ترقی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے کسی نہ کسی قسم کے اقتصادی دباؤ کی ضرورت ہے اُس وقت تک تشنہ رہیگا۔ جب تک اِس امر کا ذکر نہ کیا جائے۔ کہ زراعت کے معیار پر شرح مالگذاری

کا کیا اثر پڑتا ہے۔ پرانے زمانے میں حکومت خام پیداوار کا ایک تہائی اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ مالگذاری کے طور پر وصول کر لیا کرتی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ کسان جس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کم از کم اتنی پیداوار تو بچ رہے۔ جس سے اس کا گذارہ ہو سکے۔ جب یہ دیکھے گا۔ کہ اس سے زیادہ مالگذاری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ تو زیادہ غلہ پیدا کرنے کی کوشش کریگا۔ جس ملک میں لے دیکھے ایک زراعت ہی کسانوں کی زندگی کا سہارا ہو۔ اور کوئی دوسری صنعت موجود نہ ہو۔ وہاں تو اُن سے زیادہ سے مالگذاری کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ زراعت کو ترک کر دیں گے۔

ہم نے دوسرے ابواب میں بیان کیا ہے۔ کہ انگریزی تسلط کے بعد شرح مالگذاری میں جو کمی واقع ہو گئی ہے۔ اُس کے باعث کئی نقائص بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ یعنی کسان کی ساکھ بآسانی قائم ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ قرض کے پنجہ میں گرفتار ہے۔ زمین کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ اور غیر زراعت پیشہ لوگ اُس پر روپیہ لگا رہے ہیں۔ گویا شرح مالگذاری سے کسان کو فائدہ پہنچانا مقصود تھا لیکن اس چیز نے اُلٹا اُسے نقصان پہنچایا یعنی اس کے لئے تحریص کا سامان مہیا کر دیا ہے جس سے وہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اور اِس طرح وہ کئی نئی مشکلات میں پھنس گیا ہے۔ تجربہ بتاتا ہے۔ کہ کسان اُسی صورت میں خوشحالی حاصل کر سکتے ہیں۔ کہ شرح مالگذاری معتدل ہو۔ اگر اُن سے بہت کم مالیہ وصول کیا جائے۔ تو اِس سے اُنہیں فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ اگر کسانوں سے زیادہ مالگذاری کا مطالبہ کیا جائے۔ تو اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اُنکی خوشحالی میں نمایاں ترقی نظر آئیگی البتہ اِس قدر صحیح ہے۔ کہ مالگذاری میں تخفیف کی وجہ سے ترقی کا ولولہ مٹ جاتا ہے۔ پہلے مالگذاری خام پیداوار کا ۱/۳ ہوا کرتی تھی۔ اور "کورٹ آف وارڈ" کے اعداد کے مطابق اب مالگذاری کا اوسط خام پیداوار کے پانچ فیصدی سے بھی کم ہے[1]۔ چونکہ کسان صرف اسی قدر غلہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس پر وہ زندگی بسر کر سکے۔ اس لئے یہ ضروری تھا۔ کہ شرح مالگذاری میں کمی کے باعث کسان کی

---

[1] سر جیمز ولسن نے ۱۹۱۰ء میں اِس مسئلہ پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ مالگذاری خام زرعی پیداوار کی اوسط قیمت کا ۔ فیصدی ہے۔ اِس میں وہ آمدنی شامل نہیں۔ جو مویشی سے حاصل ہوتی ہے۔

محنت و مشقت میں بھی کسی قدر کمی واقع ہو جاتی۔ ہم دوسرے ملکوں کی مثالوں سے یہ ثابت کر سکتے
ہیں۔ کہ ہمارا استخراج دور از کار نہیں۔ جب امریکہ کے وسیع میدانوں میں نہایت سرعت کیساتھ گیہوں
کی کاشت ہونے لگی۔ اور یورپ کی زراعتی پیداوار کی قیمت کم ہو گئی۔ تو یورپ والوں کی آمدنی میں
جو کمی واقع ہو گئی تھی۔ اُس نے اُن میں پیداوار کو فروغ دینے کی استعداد بہت بڑھا دی۔ چنانچہ
سائینٹفک اصولوں پر زراعت کو ترقی دی گئی۔ کئی بہتر طریقے اختیار کئے گئے۔ اور کاروبار کی تنظیم
بہتر اصولوں پر کی گئی ہے۔ اس وقت یورپ میں زیادہ تر کسان ہی مالکانِ اراضی ہوا کرتے تھے۔
چونکہ فرانس میں اُن کی تعداد ۷۰ فیصدی تھی۔ جرمنی میں ۸۸ فیصدی اور ڈنمارک میں ۸۰ فیصدی سے
کسی قدر زیادہ اس کا تجربہ ہوا۔ کہ غلہ کی ارزانی سے جو نتائج پیدا ہوئے[۱]۔ اُنکا مقابلہ کسی دوسرے کو نہیں
بلکہ اُن کو خود کرنا پڑا۔ آئرلینڈ میں اُس کا یوں مقابلہ کیا گیا۔ کہ رقمِ لگان میں کمی کر دی گئی۔ لیکن زراعت
کے طریقوں کو ترقی دینے کیجانب کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ پھر جب بیع اراضی کی اسکیم عالمِ وجود میں
آئی۔ اور رقم لگان کی بجائے رقم بیع سالانہ قسطوں میں ادا کی جانے لگی۔ جو عموماً تعداد میں کم ہوتی تھی
تو پیداوار میں مزید کمی واقع ہونیکا خطرہ پیدا ہو گیا۔ لیکن آئرلینڈ کو انجمن ہائے امدادِ باہمی[۲] اور محکمہ زراعت
کے قیام نے اِس خطرہ سے بچا لیا۔ کہ اسی طرح انگلستان میں بھی جدید طریق زراعت کو اس لئے ترقی
نصیب نہیں ہوئی۔ کہ مالکانِ اراضی نے یہ تو گوارا کر لیا۔ کہ رقم لگان میں تخفیف کر دی جائے۔ لیکن انہیں
یہ منظور نہ ہوا۔ کہ زراعت پر زیادہ محنت صرف کیجائے۔ اور بہتر طریقے رائج کئے جائیں۔ چنانچہ جس مصیبت
نے یورپ کے دوسرے ممالک کے کسانوں کو زراعت کے طریقوں میں کلیتہً تبدیل و تغیر پر مجبور کر دیا تھا
اسکا مقابلہ انگلستان میں اسطرح کیا گیا۔ کہ رقم لگان میں تقریباً تیس فیصدی کی کمی کر دی گئی۔ اِسطرح گویا انگلستان کے مالکانِ
اراضی نے مزارعین سے جو شفقت آمیز سلوک کیا اُس سے بہت مجموعی زراعت کو فائدہ نہیں بلکہ الٹا نقصان[۳] پہنچا۔

---

[۱] رورل ری کنسٹرکشن اِن آئرلینڈ" صفحہ ۲۴ + [۲] ایضاً صفحہ ۳۲ +

[۳] سٹیٹ ہلپ فار ایگریکلچر" صفحہ ۱۴۱۔ کرٹلر کی شارٹ ہسٹری آف انگلش ایگریکلچر صفحہ ۳۱۲ آل کی کتاب "ایگریکلچر آفٹر وار صفحہ ۶۴"
مالینڈ کے ایک باشندے نے جنوری ۱۹۲۲ء میں ٹائمز کے نام ایک مکتوب لکھا تھا جسمیں انگلستان کی زراعت پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اُسنے
منجملہ اور اسباب کے ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے۔ کہ زمیندار مزارعین سے بہ نسبت سابق کم لگان لیتے ہیں +

پنجاب کے متعلق قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا - کہ یہاں پیداوار پر مالگذاری کا کیا اثر ہوا لیکن شہروں کے قرب وجوار میں اراضی کا لگان زیادہ ادا کیا جاتا ہے - اور اس سے معلوم ہو سکتا ہے - کہ اِس سلسلہ میں عوام کا رجحان کیا ہے - جو لوگ اِن اراضی پر مزارع کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے ہیں - وہ بڑی بڑی رقوم لگان دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں - کیونکہ وہ جانتے ہیں - کہ اِن اراضی کی عمیق کاشت کرکے وہ اسبابِ معیشت فراہم کر سکیں گے - اگر ایک مزارع زیادہ لگان ادا نہ کر سکے تو اُسے نکال دیا جائیگا - اور اس کے بجائے کوئی دیگر مزارع زمین پر آباد ہو جائیگا صوبہ کے دوسرے حصّوں میں یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے - کہ مزارعین ابھی تک اراضی پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر لگان پیش نہیں کرتے - لیکن جب باہمی مقابلہ کے اِس سلسلہ نے جو بعض نہری نوآبادیوں میں شروع ہو گیا ہے - سارے صوبہ میں قبولِ عام حاصل کر لیا - تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لگان کی رقمیں زیادہ ہو جائینگی - اور ساتھ ہی پیداوار کے طریقے بھی اِصلاح پذیر ہو جائینگے - اگر ایسا زمانہ آجائے - کہ ہوشمند نوجوان جو زراعت کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں کاشتکاری کیجانب توجہ کریں - تو وہ غیر ترقی پسند کسانوں سے گوئے سبقت لیجائینگے - اور ایسے بڑے بڑے قطعاتِ اراضی پر قبضہ کرینگے جنمیں وہ پوری طرح اپنی ہمت کے جوہر دکھا سکیں اور اچھی طرح زندگی بسر کر سکیں - اُس وقت پرانی وضع کے مزارع کو یا تو اپنے طریقِ زراعت میں تبدیلی کرنی پڑیگی - یا وہ تباہ ہو جائیگا - مالگذاری کے موجودہ طریقہ میں یہ اہلیت نہیں کہ اُسے توڑ مروڑ کر وہ کام لیا جائے جو ایک عقلمند زمیندار سے لیا جا سکتا ہے لیکن یہ ممکن ہے - کہ آبپاشی کے نرخ کا انتظام اسطرح کیا جائے - کہ کسان کو جس سے تھوڑی آمدنی ہوتی ہے - چھوڑ کر کسی زیادہ قیمتی فصل کی کاشت شروع کر دیں +

لے زراعت کی صنعت میں جو عظیم اضافہ ہو رہا ہے - کسی حد تک اس کا باعث یہ ہے - کہ زیادہ تعداد میں مزارعین زمین کی کاشت کر رہے ہیں - مالکانِ اراضی کو یہ معلوم ہو چکا ہے - کہ خود اراضی پر محنت کرنیکے بجائے وہ اُسی لگان پر دیکر زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں +

چھٹا باب

پنجاب کی اراضی!

گذشتہ ابواب میں ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ کہ پنجاب کے جغرافیائی محلِ وقوع اور اس کے دریائی میدان کا اس صوبہ کی اقتصادی حالت پر کیا اثر پڑا ہے۔ اِس سلسلہ میں تیسرا نہایت اہم عنصر یہ ہے۔ کہ پنجاب کی اکثر اراضی وسعت کے اعتبار سے بہت چھوٹی ہیں۔ صوبہ کا مجموعی رقبہ مزروعہ دو کروڑ نوّے لاکھ یا دو کروڑ تیس لاکھ ایکڑ ہے۔ اور یہ ایک کروڑ سے زیادہ اراضی میں بٹا ہوا ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ ایک زمیندار ایک سے زیادہ اراضی کی ملکیت میں حصہ دار ہے۔ مثلاً لائل پور اور شاہ پور کے آبادکار اپنے ضلع میں اراضی کے مالک ہیں۔ اور بہت سے ایسے ہیں۔ جن کی زمین ایک ہی ضلع کے دو تین دیہات میں واقع ہے۔ سرکاری رپورٹوں سے ہمیں معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ مالکانِ اراضی کی صحیح تعداد کیا ہے۔ مردم شماری کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صوبہ میں چالیس لاکھ سے زیادہ مالکانِ اراضی موجود ہیں۔ لیکن یہ تعداد سرکاری بیان کے مطابق نہیں۔ کیونکہ مالگذاری ادا کرنیوالے اشخاص کی مجموعی تعداد پینتیس لاکھ بیان کی گئی ہے۔ مالگذاری کا اوسط دس سے بارہ روپیہ تک ہے۔ اور اراضی کے رقبہ کا اوسط سات اور آٹھ ایکڑ کے درمیان ہے۔ سرسری طور پر اِس طرح تخمینا لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ۲۷۰۰ کسان جنمیں سرکاری مزارعین بھی شامل ہیں۔ ۲۵۰ روپیہ یا اس سے زیادہ مالگذاری ادا کرتے ہیں۔ جنکی مملوکہ اراضی کا اوسط ایک پچاس ایکڑ سے کم ہے۔ ایک لاکھ کسان پچاس روپیہ یا پچاس روپیہ سے زیادہ لگان دیتے ہیں۔ اُن مملوکہ اراضی کا اوسط تقریباً پینتیس ایکڑ ہے۔ تین لاکھ کسان پچیس روپیہ یا

اس سے زیادہ مالگذاری داخل کرتے ہیں - اُن کی اراضی کا اوسط اٹھارہ ایکڑ ہے - اور تقریباً تیس لاکھ کسان پچیس روپیہ سے کم مالگذاری ادا کرتے ہیں - اور انکی اراضی کا اوسط اٹھارہ ایکڑ سے کم ہوتا ہے لیکن اس تعداد میں چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی بھی شامل ہیں - جو مندروں یا مکانات وغیرہ سے ملحق ہیں - یا نوکروں کو عطا کر دیئے جاتے ہیں یا مالک اراضی کے بعد کسی برہمن کو دان کے طور پر دیدیئے جاتے ہیں - اگر ان اراضی کو جنہیں وسیلۂ معاش کی حیثیت حاصل نہیں الگ کر دیا جائے تو اغلب ہے - کہ تیس[1] لاکھ مالکانِ اراضی کی مملوکہ زمین کا اوسط دس سے بارہ ایکڑ تک رہ جائیگا سر جیمز ولسن[2] نے اندازہ لگایا تھا کہ ہر مالک اراضی کے پاس جسقدر زمین ہے - اس کا اوسط پندرہ ایکڑ ہے - اور وہ رقبہ جس کی زراعت خود مالکانِ اراضی کرتے ہیں - اُس کا اوسط سترہ ایکڑ ہے - اور جس رقبہ کی کاشت مزارعین کے سپرد ہے - اس کا اوسط پانچ ایکڑ - لیکن اس اوسط سے صوبہ کے صحیح حالات معلوم نہیں ہو سکتے - جالندھر - گورداسپور - ہوشیارپور کے علاقوں میں جہاں زمینوں کو کنوؤں کے پانی سے سیراب کیا جاتا ہے - مملوکہ اراضی کا اوسط چار ایکڑ ہے - جنوب مشرق میں جہاں آبپاشی کا کوئی انتظام نہیں - اراضی بڑی بڑی ہیں - اور مغرب کی سمت بھی یہی کیفیت ہے -

ذیل میں پنجاب کے قطعاتِ اراضی کا مقابلہ دوسرے ممالک سے کیا جاتا[3] ہے -

	ایک ایکڑ کے کم رقبہ کے قطعاتِ اراضی شامل کر کے	ایک ایکڑ کے قطعاتِ الگ کر کے
بلجیم	۵ و ۷	۵ و ۱۴
فرانس	۰۵ و ۱۵	۲۴

---

[1] (۱۴۱ صفحہ کا حاشیہ) یہ سرکاری رپورٹ ریفارم اسکیم کے حلقہائے انتخاب کے سلسلے میں مرتب کی گئی ہے -

[2] اینٹ اکنامک ڈویلپمنٹ ان دی پنجاب " (پنجاب کی تازہ اقتصادی ترقیات) ۱۹۱۰ء -

[3] روئنٹری کی کتاب " لینڈ اینڈ لیبر " میں سے بلجیم سے سبق صفحہ ۱۰۶ - یہ اعداد جنگ سے پہلے کے ہیں قیمت امرتسر کے اعداد و شمار کی رپورٹ مرتبہ ۱۹۱۶ء سے معلوم ہوتا ہے - کہ اراضی کے رقبہ کا اوسط اور اوسط مالگذاری حسب قرار ذیل ہیں - امرتسر میں ۱۰ ایکڑ اور ۱۳ روپیہ گورداسپور میں ۱۵ ایکڑ اور بیس روپیہ - اور سیالکوٹ میں ۱۷ ایکڑ اور ۱۶ روپیہ -

	ایک ایکڑ کے کم رقبہ کے قطعات اراضی شامل کر کے	ایک ایکڑ کے قطعات اراضی کے علاوہ
جرمنی	۲۵ و ۱۹	۵ و ۳۲۳
ڈنمارک	۵۹ و ۳۵	۴۹
انگلستان	۹۵ و ۴۶	۷۰
سکاٹ لینڈ	۱۳ و ۵۶	۵۷
ویلز	۰۵ و ۳۸	۶۲

لیکن جب تک ساتھ ہی یہ بھی نہ بتایا جائے۔ کہ ان ممالک میں زراعت کیونکر ہوتی ہے۔ یہ اعداد و شمار گمراہ کن ثابت ہونگے۔ امریکہ میں اراضی کا اوسط گذشتہ ساٹھ یا ستر سال سے زوال پذیر ہے۔ اب امریکہ میں زمین کا اوسط ایک سو تیں ایکڑ ہے۔ لیکن اس ملک میں کھیت سے عام طور پر ایسا رقبہ مراد لیا جاتا ہے۔ جس کی وسعت ایک سو پچاس ایکڑ سے دو پچاس ایکڑ تک ہو۔ انگلستان میں کھیت سے تقریباً ایک سو پچاس ایکڑ زمین مراد لی جاتی ہے۔ سات فی صدی زمین ایسی ہے۔ جو ایک سو ایکڑ سے زیادہ وسیع کھیتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ لیکن چھوٹی چھوٹی اراضی کی کثرت ہے۔ جنکا رقبہ پچاس ایکڑ سے کم ہے۔ اگرچہ امور عامہ سے دلچسپی لینے والے حضرات اِس خیال کی حمائت کرتے رہے ہیں۔ کہ اِن چھوٹی چھوٹی اراضی کو اپنے حال پر رہنے دیا جائے۔ لیکن اراضی کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے۔ اور عام رجحان اس امر کی جانب ہے۔ کہ اراضی پچاس ایکڑ سے تین سو ایکڑ تک ہوں۔ چنانچہ پانچ ایکڑ سے کم اراضی کو اصطلاح میں کھیت نہیں بلکہ قطعۂ مفوضہ کہنا چاہئیے۔

بلجیم میں سات لاکھ مالکانِ اراضی ہیں۔ اُن میں تقریباً ۵۲۰۰۰ ایسے ہیں۔ جن کے قبضے میں پانچ ایکڑ سے کم رقبہ کی زمین ہے۔ صرف پینتیس ہزار ایسے مالکانِ اراضی ہیں۔ جن کی مملوکہ اراضی کا رقبہ پچیس ایکڑ سے زیادہ ہے۔ اور چار لاکھ مالکانِ اراضی ایسے ہیں۔ جن کے قبضہ میں اڑھائی ایکڑ سے بھی کم زمین ہے۔ لیکن اس کے باوجود اراضی کی وسعت میں مزید

۱؎ آرتھر ینگ نے ۱۷۶۸ء میں ہی یہ اندازہ لگایا تھا۔ کہ انگلستان کے اکثر حصوں میں کھیتوں کے رقبہ کا ۳۰۰ ایکڑ تھے۔ ملاحظہ ہو شارٹ ہسٹری آف انگلش اگریکلچر مصنفہ کرٹلر صفحہ ۲۰۱

کمی واقع ہو رہی ہے۔ کیونکہ پنجاب کی طرح بلجیم کے کسان بھی اپنی جائیداد کے بیشتر حصہ کو اپنی اولاد میں مساویانہ طور پر تقسیم کر دیتے ہیں۔ انگلستان میں اراضی کے وسیع ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہاں بڑا بیٹا جو اپنے باپ کی جائیداد کا وارث ہوتا ہے۔ اراضی پر قبضہ کر لیتا ہے۔

اب دوسرے ملکوں کو لیجئے۔ بلغاریہ میں زمین کا اوسط گیارہ ایکڑ کے قریب ہے۔ رومانیا میں زمین پر بڑے بڑے مالکانِ اراضی قابض ہیں۔ اور مزارعین کی حالت غلاموں سے اچھی نہیں۔ سرویا میں ۹۵ فیصدی مالکانِ اراضی کے قبضے میں پچاس ایکڑ سے کم رقبہ کی زمین ہے۔ اور نصف کے قریب ایسے ہیں۔ جن کے قبضے میں آٹھ ایکڑ زمین ہے۔ جاپان میں اراضی کا اوسط اڑھائی اور تین ایکڑ کے درمیان ہے۔ اِن اعداد سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صرف پنجاب میں ہی چھوٹی چھوٹی اراضی نہیں۔ بلکہ دوسرے ملکوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہاں جو چیز عجیب و غریب نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ مالکانِ اراضی اتنی زمین کی کاشت خود کرتے ہیں۔ جو اُن کی ضرورت پورا کرنے کے لئے بھی کافی نہیں ہوتا۔ غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا۔ کہ ہر مالکِ اراضی جسکے قبضہ میں پچیس ایکڑ سے زیادہ زمین ہے۔ اُس کا ایک حصّہ مزارع کو لگان پر ضرور دیتا ہے۔ یہ کوشش نہیں کی جاتی۔ کہ وسیع کھیت قائم کئے جائیں۔ اور وہ لوگ بھی جن کے قبضے میں کافی زمین ہے۔ ایسا نہیں کرتے۔ اِسی طرح شاذونادر ہی یہ دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ کسی مزارع نے پچیس ایکڑ سے زیادہ زمین کی کاشت کی ہو۔ حالانکہ اگر وہ چاہے تو اتنی زمین تو لگان پر لے سکتا ہے بلکہ دیکھا گیا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص ایک وسیع رقبہ زمین لگان پر لیتا ہے۔ تو وہ اس کا ایک حصّہ کسی دوسرے مزارع کو اجارہ پر دے دیتا ہے۔

پنجاب کی اِس خصوصیت سے قطع نظر کر لیجئے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ اِس صوبہ کو اکثر ممالک پر فوقیت حاصل ہے۔ جاپان کے حالات کا مطالعہ کیجئے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ جب ایک ملک جدید علم و فن خصوصاً بذریعہ سائینٹیفک زراعت اور طریقِ تنظیم کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ تو اُس کی کیا حالت ہو جاتی ہے ۱۸۵۵ء تک اس ملک کو عمداً مغربی اقوام سے تعلقات پیدا نہیں کرنے دیئے گئے ۱۸۶۷ء میں فیوڈل سسٹم کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور شاہنشاہی قائم ہوئی۔ جو اب تک چلی آتی ہے۔ جاپان میں گذشتہ پچاس سال کے اندر بہت اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

لیکن جاپانی ابھی تک نکبت و افلاس کے پھندوں میں گرفتار ہیں ۔ زراعت کا دارومدار ابھی تک انسانی محنت پر ہے ۔ ابھی تک وہی دقیانوسی آلاتِ کشاورزی استعمال کئے جاتے ہیں ۔ کبھی کبھی یہ تو ہوتا ہے ۔ لوگ زراعت میں ایک بیل یا ایک گھوڑے سے مدد لیں ۔ لیکن یہ بہت کم ہوتا ہے ۔ کہ گھوڑوں اور بیلوں کی جوڑی سے زراعت کا کام کیا جائے ۔ رسل و رسائل کا کام بھی آدمی ہی کرتے ہیں ۔ آدمی ہی بوجھ اٹھاتے ہیں ۔ اور وہی قدیم وضع کی گاڑیوں کو جن پر بھاری بوجھ لدا ہوتا ہے خراب سڑکوں اور کمان کی طرح خمیدہ پلوں پر سے کھینچے لے جاتے ہیں[1] ۔

کسان خواہ کتنی ہی محنت سے زراعت کیوں نہ کریں ۔ چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی سے وہ معمولی سے معمولی سامانِ معاش بھی حاصل نہیں کر سکتے ۔ یہی وجہ ہے ۔ کہ جاپانی کسانوں کو بسر اوقات کے لئے زراعت کے علاوہ کوئی اور کام بھی ساتھ ساتھ کرنا پڑتا ہے ۔ اگر جاپان کا کسان[2] ریشم کے کیڑوں کی پرورش نہ کرتا ۔ تو اس کیلئے زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا ۔ وہاں پیداوار کا تقریباً سولہ یا سترہ فیصدی تو محصولوں میں صرف ہو جاتا ہے ۔ حالانکہ پنجاب میں محصولوں پر جو کچھ صرف ہوتا ہے ۔ وہ پیداوار کے پانچ فیصدی سے بھی کم ہوتا ہے ۔ زمین کا لگان زمین کی مجموعی قیمت کا تین فیصدی ہوتا ہے ۔ اور مقامی محصول ایک فیصدی ۔ پنجاب میں مالگذاری زمین کی قیمت کا ایک فی صدی بھی کم نہیں ۔ بلکہ اس کا نصف ہوتی ہے ۔ بیچارے جاپانی کسان کی حالت یہ ہے ۔ کہ اس کے پاس بیل بھی نہیں ۔ جو ہل چلانے میں اس کی اعانت کر سکیں ۔ اس کے کندھوں پر محاصل کا بارِ گراں پڑا ہے ۔ چھوٹی سی زمین ہے ۔ اور افلاس کی فراوانی کا یہ عالم ہے ۔ کہ وہ بیچارہ

---

[1] ملاحظہ ہو کمرشل نمبرا بابت سنہ ۱۹۲۰ء جاپانی مزدوروں کے متعلق رپورٹ ۔

[2] ملاحظہ ہو جاپان کی سیر بک ۔ ماڈرن جاپان (جاپان جدید) جاپان بائی جاپانیز وغیرہ وغیرہ ۔ ریشم کا تاگہ بنانا ۔ اور اس سے کپڑے بننا ۔ جاپان کی بہت بڑی گھریلو دستکاریاں ہیں ۔ ان کے علاوہ موزے بننا، دیا سلائی، بٹن، برش، اور جھاڑ بنانا ۔ سن اور پیال کی چیزیں بنانا، نقلی موتی اور جواہر بنانا جاپان کی بڑی صنعتیں ہیں ۔ بیوی یا تو باہر کھیت میں جاکر کام کرتی ہے ۔ یا گھر میں کام کرتی ہے ۔ اور اسی قسم کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں ۔ اولاد تو اور گلی کوچوں میں کھیلتے وقت بھی وہ پیال سے چیزیں بناتے رہتے ہیں، ملاحظہ ہو ۔ جاپان کے مزدوروں کے متعلق سرکاری رپورٹ ۔

زراعت کیساتھ کوئی دوسرا کام کرنے مثلاً چاول اور پیاز کی چیزیں بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہر کام میں اُس کے بیوی بچے اُس کی مدد کرتے ہیں۔ اِس لئے پنجاب کے کسان کو اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہئے۔ کہ اپنے جاپانی ہم پیشہ بھائیوں سے اُس کی حالت بدرجہا بہتر ہے۔

یہ کہنا غیر ضروری ہوگا۔ کہ جب اراضی چھوٹی سی ہو۔ تو کسب معاش کیلئے یہ ضروری ہے۔ کہ متواتر و پیہم محنت کرکے زمین کی گہری جوتائی کیجائے۔ اور کاشتکاری سے جو آمدنی حاصل ہو اُس میں اضافہ کرنے کے لئے ساتھ ساتھ کوئی دوسرا کام بھی کیا جائے۔ لیکن جاپان کی یہ کیفیت ہے۔ کہ یہ تمام چیزیں جمع ہوکر بھی عمدہ سامانِ معیشت مہیّا نہیں کر سکتیں۔ بلجیم میں تو سائنس اور امداد باہمی کی تحریک نے چھوٹے چھوٹے مشقت پسند مالکانِ اراضی پر یہ واضح کر دیا ہے۔ کہ سرمایہ کو منفعت بخش کاروبار میں لگانے کا طریقہ کیا ہے۔ جس کا ہر شخص کو قائل ہو جانا چاہئے۔ یعنی اگر ایک چھوٹے سے رقبہ میں سائینٹیفک طریق پر زراعت کرنے کے لئے بہت بڑا سرمایہ صرف کرنا ہے تو انسانی خوراک کے بجائے انسان کے لئے دودھ مکھن گوشت بطورِ خوراک مہیّا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جاپان میں مذہبی خیالات کی وجہ سے مچھلی کے سوائے دوسرے حیوانات کا گوشت کھانا ممنوع ہے۔ کچھ مویشی جو دکھائی دیتے ہیں۔ اُن سے باربرداری کا کام لیا جاتا ہے۔ اور لوگ دودھ اور مکھن سے ناآشنا ہیں۔ جاپانی زمین سے پوری پوری طرح فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اِس لئے وہ مفلس[1] ہو رہے ہیں۔ ادھر بلجیم میں صرف ۹ فیصدی رقبہ مزروعہ میں گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔ ورنہ زیادہ تر دوسری قیمتی اجناس مثلاً چقندر، تمباکو اور سن، یا ایسی اجناس کی کاشت کی جاتی ہے۔ جو مویشی کی خوراک بن سکیں وہاں زمین میں جسقدر کھاد ڈالی جاتی ہے۔ اور جسقدر مویشی استعمال کئے جاتے ہیں۔ اُس کا اوسط تمام ممالک سے زیادہ ہے۔ زراعت پر جو انسانی عنصر کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اُس کا اندازہ بلجیم اور روس کے کسانوں کے باہمی موازنہ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ رُوسی کسان زمین میں کچھ نہیں ڈالتے۔ اور اُس سے جتنا زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ محنت و

---

[1] مسٹر رونٹری نے (۱۹۱۰ء) حسب ذیل تناسب فی صدی بیان کیا ہے۔ فرانس ۲۱۔ جرمنی ۵۔ برطانیہ عظمیٰ ۵۔ ڈنمارک ۱۰

مشقت سے زراعت کرنے کو قابلِ نفرت سمجھتے ہیں ۔ اِسطرح انہوں نے زمین کو تباہ کردیا ہے
اُس کی زرخیزی ختم ہوچکی ہے ۔ اور ابھی تک وہ مزید پیداوار حاصل کرنے کے طالب ہیں ۔ روسی
کسان کے پاس عام طور پر جس قدر زمین ہوتی ہے ۔ اگر اس کی کاشت اِسی طرح کی جاتی جسطرح
بلجیم اور جرمنی میں[1] کی جاتی ہے ۔ تو وہ اُسکی ضروریات کیلئے کافی ثابت ہوتی ۔

پنجاب کو بلجیم سے یہ سبق سیکھنا چاہئیے ۔ کہ قطعاتِ اراضی کا چھوٹا ہونا خوشحالی کی راہ میں
رکاوٹ پیدا[2] نہیں کرتا ۔ اگر ترقی کرنے کا حوصلہ موجود ہو ۔ سائینس، امداد باہمی، سرمایہ اور محنت و مشقت
سے کام لیا جائے ۔ تو ایک چھوٹے سے رقبہ پر بھی اچھی طرح زندگی بسر کیجا سکتی ہے ۔ لیکن زمین
پر عقل و دانش اور ہنرمندی صرف کر کے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئیے
قصہ مختصر اگر پنجابی کسان سچ مچ خوشحالی حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ تو اُسے چاہئیے کہ اپنے طریقِ زراعت
میں یکسر تغیّر و انقلاب پیدا کر دے ۔

بلجیم سے بالکل متضاد کیفیت دیکھنا ہو ۔ تو سرویا کی حالت دیکھئے ۔ اس ملک میں قطعاتِ اراضی
چھوٹے چھوٹے ہیں ۔ جو ابھی خدا جانے اور کتنے چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کئے جائیں گے ۔
زمین کی زراعت کے بارہ میں بھی اس کی کیفیت بعینہٖ پنجاب کی سی ہے ۔ زراعتی تعلیم پستی
کی حالت میں ہے ۔ سرمایہ کا فقدان ہے ۔ لوگ زراعت کو صنعت و حرفت اور دیہات کے شہروں
پر ترجیح دیتے ہیں ۔ ریلوے کے سلسلے کو زیادہ ترقی نہیں ہوئی ۔ ملک کا جغرافیائی محلِ وقوع ایسا
ہے کہ سمندر تک پہنچنا مشکل ہے ۔ اس طرح گویا ملک اقتصادی حیثیّت سے طاقتور ہمسایہ سلطنتوں
کا محتاج ہے ۔ جن سے ہمیشہ اسکے تعلقات دوستانہ نہیں رہتے ۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر یہ کیفیت تھی ۔
کہ سرویا سے جو مال برآمد کیا جاتا تھا ۔ اُس میں سے نوّے فیصدی آسٹریا کو جاتا تھا ۔ یا تو اِس مال
کی کھپت وہیں ہوجاتی تھی ۔ یا تو دور دراز منڈیوں کو بھیج دیا جاتا تھا ۔ سرویا کے کسان ابھی تک

[1] ملاحظہ ہو "ایکس آف رشیا" (روس کا زوال) صفحہ مصنفہ ای ۔ جی ڈین ۔

[2] فرانس میں پچیس لاکھ سے زیادہ اراضی ایسی ہیں ۔ جن کا رقبہ ۲½ ایکڑ سے بھی کم ہے ۔ جرمنی میں بھی تقریباً
یہی کیفیت ہے ۔

زراعت کے نہایت دقیانوسی طریقوں پر کاربند ہیں - وہ زمین کو زرخیز بنانے کے لئے اُس میں کھاد نہیں ڈالتے - اِس سے پیداوار بہت کم ہوتی ہے - مصنوعی کھاد کا تو کوئی نام بھی نہیں جانتا - صرف ۳۲ فی صدی رقبہ میں زراعت ہوتی ہے - جوار ملک کی اہم ترین جنس ہے - اور بیچارے کسان اسی سے پیٹ پالتے ہیں - البتہ اس ملک میں مویشی پالے جاتے ہیں - مویشی اور دودھ، مکھن، پنیر وغیرہ دوسرے ملکوں میں بھیجا جاتا ہے - سُوئر کو پالتو جانوروں میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے -

اِس کے بعد سینگ والے جانوروں کا درجہ آتا ہے - تمام کسان سؤر پالتے ہیں - اور اُن سے بہت نفع حاصل کرتے ہیں - اِس کے علاوہ ثمردار پودوں کی کاشت بھی کی جاتی ہے - آلوچہ بہت پیدا ہوتا ہے - جسے سُکھا کر باہر بھیجا جاتا ہے - ہر ضلع کے لئے ضروری ہے - کہ اس میں ثمردار درختوں کا ایک باغ ہو، جو کم از کم بارہ ایکڑ زمین پر پھیلا ہُوا ہو - سرویا ایک مفلس اور درماندہ ملک ہے - لیکن اس کے لیڈر دیہاتی مسائل کو سلجھانے کی کوشش میں مصروف ہیں - انہوں نے اس حقیقت کو جان لیا ہے - کہ چھوٹے چھوٹے مالکانِ اراضی محض اجناس خوردنی کی کاشت کرکے زندگی بسر نہیں کرسکتے[۱] -

اِس سلسلہ میں ڈنمارک کا ذکر نامناسب نہیں ہوگا - کیونکہ وہاں پنجاب کی انسبت اراضی بہت بڑی ہے - لیکن یہ کہنا غیر متعلق نہیں ہوگا - کہ اگرچہ ڈنمارک کے لوگ جنہیں اعلیٰ درجہ کی تنظیم پائی جاتی ہے - گیہوں کی کاشت بہت کم کرتے ہیں - اور زمین کو مویشی کیلئے چارہ مہیا کرنے کے کام میں لاتے ہیں - تاہم اکثر سامان خورد و نوش مثلاً اناج آٹا - وغیرہ دوسرے ملکوں سے لایا جاتا ہے - اور یہاں سے مویشی، مکھن، پنیر، سؤر کا گوشت، انڈے وغیرہ باہر بھیجے جاتے ہیں[۲] -

---

[۱] سرویا بائی سرو بینز، الواب ۱۵-۱۶ + [۲] مسٹر آبرٹس لکھتے ہیں - کہ ڈنمارک اور بلجیم کو یہ بہت فائدہ ہے - کہ انکی اجناس انگلستان جیسے صنعتی ملک میں فروخت ہوتی ہیں - لیکن پنجاب میں اگر موجودہ زمانہ کی نسبت زیادہ گھی پیدا ہو - یا باہر سے لایا جائے - تو یہاں وہ صرف ہو جائیگا - اس لئے فروخت کیلئے منڈی تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی - مسٹر ابرٹس یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر پنجاب کے کسان عموماً کاشت شروع کردیں - تو انہیں زیادہ پانی کی ضرورت ہوگی - اور موجودہ نہریں اس کے لئے ناکافی ہیں +

دوسرے ملکوں پر یہ مختصر تبصرہ کرنے کے بعد جب ہم پنجاب کی جانب توجہ کرتے ہیں تو ہمیں کئی باتیں قابلِ غور نظر آتی ہیں۔ اس سرزمین کے کسانوں کو اس امر پر اصرار ہے کہ وسیع زمین میں تھوڑی جوتائی کیجائے۔ اور اس پر زیادہ محنت بھی صرف نہ کی جائے۔ دقیانوسی آلاتِ زراعت استعمال کئے جائیں۔ وہ اس کھاد کو بھی جو مویشی سے حاصل ہوتی ہے۔ زمین میں شاذونادر ہی ڈالتے ہیں۔ اور مصنوعی کھاد بالکل استعمال میں ہی نہیں لائی جاتی ہے۔ وہ زمین کا ایک بڑا حصہ یعنی تقریباً ½ گیہوں کی کاشت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اور مویشی کی خوراک مہیا کرنے کا کام زمین سے بہت کم لیتے ہیں۔ وہ پھلوں کی کاشت نہیں کرتے۔ اور مویشی یا مویشی کے دودھ مکھن کی تجارت نہیں کرتے۔ ہاں البتہ کچا چمڑہ باہر ضرور بھیجا جاتا ہے۔ اُن کے مذہبی جذبات کچھ ایسے واقع ہوئے ہیں۔ کہ وہ سینگوں والے مویشی کی پرورش کر کے اُن سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ دوسرے ملک ان چیزوں سے بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک تو آلو، اور دوسرے سؤر۔ پنجاب میں آلو کی تو یہ کیفیت ہے۔ کہ اسے ابھی تک عام غذا کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ اور سؤر کو ممنوع جانور سمجھا جاتا ہے۔ کسان کاشتکاری کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کرتے۔ جن سے اُنکی آمدنی میں ترقی ہو اگر کوئی کام کرتے ہیں۔ تو صرف اس قدر کہ اپنی بہلیوں کو کرایہ پر چلاتے ہیں۔ دستکاری بعض بعض خاص ذاتوں اور قبیلوں کے لئے مخصوص ہے۔ ریشم کے کیڑوں کی پرورش کو مقبولِ عام بنانے کی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی۔ شہد کی مکھیاں شاذ ہی پالی جاتی ہیں۔ ہنس، بطخ، فیل مُرغ، کبوتر، اور مرغی[1] کو فروخت کے لئے پالنا ابھی تک قابلِ التفات ہی نہیں سمجھا گیا۔ سبزی کی کاشت کو کسان اپنے لئے ذلت تصور کرتے ہیں یہی وجہ ہے۔ کہ مالی اپنا معاشرتی درجہ بلند کرنے کے لئے باغبانی چھوڑ کر گیہوں کی کاشت کر رہے ہیں۔ قصہ مختصر پنجاب کے چھوٹے مالکانِ اراضی اس کوشش میں مصروف ہیں۔ کہ نہ تو وہ مویشی پالیں۔ نہ خانگی صنعتوں کو ترقی دیں۔ بلکہ چند ایکڑ زمین میں گیہوں

---

[1] انگلستان میں آج سے چھ سو سال پہلے بھی تقریباً ہر جگہ مرغیوں کی پرورش کی جاتی تھی چنانچہ فنز ہربرٹ نے ۱۵۲۳ء میں لکھا تھا۔ کہ کسان کی بیوی بازار جاتی ہے۔ اور مکھن، پنیر، دودھ، انڈے، چوزے، مرغیاں اور بطخیں، فروخت کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو کرٹلر صفحات ۱۴۱ و ۵۸ اور تھورولڈ راجرس جلد چہارم باب دوم +

کی کاشت کرکے اس پر بسر اوقات کریں۔ اور یہ ایک ایسا کام ہے۔ جس سے دنیا کے کسی ملک
میں فائدہ حاصل نہیں کیا گیا۔ اگر پنجاب کے کسان اِس کام کو جس سے فائدہ کی قطعاً کوئی امید نہیں
ہو سکتی۔ اب تک کئے جاتا ہے۔ تو اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے۔ کہ اس کی ضروریاتِ زندگی محدود ہیں
اور کچھ یہ وجہ ہے۔ کہ حکومت پیداوار بڑھانے میں اس کی مدد کر رہی ہے[1] چنانچہ اِنہیں چیزوں کی وجہ
سے اس کے حالات جاپان کے کسان سے بہتر ہے۔ اور اگر ضروریات کے تناسب کا خیال
رکھا جائے۔ تو پرتگال۔ ہسپانیہ۔ رومانیہ۔ بلغاریہ۔ یونان۔ اور سرویا کے کسان سے اسکی حالت
بدتر نہیں۔ اگر اس صوبہ کی زراعت کو اچھی خاصی ترقی دینا مقصود ہے۔ تو زراعتی مسائل کا حل
کرنے کے لئے نہایت غور وخوض سے اس کی تحقیق کی جائے۔ کہ پنجاب سے کن اجناس کی
کاشت سے فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ یا یوں کہئے۔ کہ پنجاب کی زمین کو کیونکر منفعت بخش طریق
پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی خیال رہے۔ کہ زمین کا استعمال ایسا نہ ہو جس سے
لوگوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔ کیونکہ یہ امر ملحوظ رہے۔ کہ اگر مولیشی کو محض دودھ حاصل کرنے
کے لئے پالا جائے۔ تو اس سے اتنا ہی نفع حاصل ہو گا جتنا مرغیوں کو محض انڈوں کے لئے
پلنے یا اُن کے لئے بھیڑوں کی پرورش کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ میں
بھیڑیں بہت پالی جاتی ہیں۔ لیکن اگر ان بھیڑوں کے گوشت اور کھالوں کی فروخت کے لئے
کوئی منڈی نہ مل سکے۔ تو آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ والوں کو محض اُن سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ کیونکہ

---

[1] جاپانی سفیر متعینہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے امریکہ والوں کے ایک مجمع میں کہا تھا۔ ہمارے اہلِ ملک کو کسی چیز
کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کی ضروریات کا دائرہ صرف انہیں چیزوں تک محدود ہے۔ جن کے بغیر زندگی بسر ہی نہیں ہو سکتی
ملک کا بہت تھوڑا رقبہ ایسا ہے۔ جس میں اشیائے خوردنی کی پیداوار ہوتی ہے۔ اسی سے ہمیں خوراک حاصل کرنا ہے۔ اِس لئے
ہم مجبور ہیں۔ کہ اس کے ہر حصہ میں عمیق کاشت کریں۔ ہم نے اپنی ساکھ اسطرح قائم کی ہے۔ کہ ہم معاشرت کے بارہ میں بہت
کفایت شعاری مدِ نظر رکھتے ہیں سا افراد سلطنت کیلئے ایثار و قربانی کرتے ہیں تاکہ سلطنت، ملت اور افراد زندہ رہیں۔
فٹز ہربرٹ نے زمین کی نگہداشت اور غور و پرداخت کے مسئلہ پر ۱۵۲۳ء میں قلم اٹھایا تھا وہ لکھتا ہے کہ ذخیرہ رکھنا کسان کیلئے ویسا ہی ضروری ہے جیسا فصل
کاٹنا۔ اگر اُسنے یہ نہ کیا۔ تو یا اسے خریدنا پڑیگا یا مستعار لینا پڑیگا یا بھیک مانگنی پڑیگی۔ (ضوروولڈ را جرس جلد چہارم باب دوم)

ہم کرنے کی محنت میں گوشت اور کھالیں ثانوی پیداوار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس تحقیقات سے جن اجناس کی کاشت منفعت بخش نظر آئیگی۔ اُن کی فہرست میں یقیناً
دکھائی نہ دیگا۔ گیہوں ایک ایسی جنس ہے۔ جس کی کاشت نہایت وسیع رقبہ میں کی جا سکتی ہے
صورت میں کاشت ہو سکتی ہے۔ کہ زمین ارزاں ہو۔ دوسری اجناس کی نسبت گیہوں کی اچھی
پیداوار حاصل کرنے کے لئے بہت کم محنت صرف ہوتی ہے۔ لیکن دوسری اجناس کی طرح
یہ کیفیت نہیں۔ کہ انسان جتنی زیادہ محنت کرے۔ پیداوار میں بھی اُسی نسبت سے اضافہ ہوتا
یہ ایسی جنس نہیں جس کی کاشت پر زیادہ محنت مشقت صرف کر کے زیادہ نفع حاصل کیا جائے
قیمت کے مقابلہ میں اس کا وزن اس قدر زیادہ ہوتا ہے۔ کہ ان منڈیوں میں جو یہاں سے
ہزار میل کے فاصلے پر ہیں۔ اس کا پہنچایا جانا مشکل ہے۔ جوں جوں زراعت ترقی کا قدم
ہے گیہوں کو تنزل حاصل ہوتا ہے۔ انگلستان میں گیہوں کی کاشت بہت کم کیجاتی ہے
ہی اس لئے کہ زراعت کی ترقی کے لئے زمین میں باری باری مختلف اجناس کی کاشت کرنا
ہے۔ اور گیہوں اِس مقصد کیلئے موزوں ہے۔ جنگ کے زمانے میں اشیائے خورد و نوش کی
بڑھانے کی بہت کوشش کی گئی۔ اس لئے گیہوں کی کاشت بھی زیادہ ہوئی۔ لیکن زیادہ
گیہوں کی کاشت جاری نہ رہ سکی۔ ادھر جنگ ختم ہوئی۔ ادھر گیہوں کی کاشت بھی کم ہو گئی
ستہائے متحدہ امریکہ میں یہی کیفیت ہے۔ کہ جس رقبہ میں گیہوں کی کاشت کی جاتی تھی
ں چند سال سے کمی واقع ہو رہی ہے۔ اور اس کی جگہ دوسرے اجناس لے رہے
۔ شمالی یورپ کے متعلق ہم بیان کر ہی چکے ہیں۔ کہ وہاں کے چھوٹے چھوٹے قطعات
میں گیہوں کو بار نہیں ملتا۔ دنیا میں جہاں کہیں زراعت کے سائینٹیفک طریقوں نے رواج

ی کسی حد تک دودھ اور مکھن پیدا کرنے کی محنت میں ثانوی پیداوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ امر کہ محض دودھ کے لئے مویشی
ائدہ مند نہیں۔ اِس واقعہ سے پوری طرح ثابت ہوتا ہے۔ کہ کسی ہندو سرمایہ دار نے مویشی پالنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر
بجائے بھینس لے رہے ہیں۔ تو اس کی وجہ غالباً یہ ہے۔ کہ بھینسوں کے متعلق کوئی مذہبی جذبہ نہیں پایا جاتا۔ یورپ کی
نس سے زیادہ دیتی ہے +

حاصل کیا۔ گیہوں کی مقبولیت[1] اور ہر دلعزیزی خاک میں مل گئی۔ جوں جوں زیادہ سرمایہ لگایا جا رہا ہے کاشت زیادہ عمیق کی جا رہی ہے۔ اور کھیتوں کا رقبہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ گیہوں کی کاشت زوال پذیر ہو رہی ہے۔

جہاں جہاں لوگوں کے پاس روپیہ نہیں۔ اور دوسری اجناس جن کی کاشت میں زیادہ محنت کرنی پڑتی ہیں۔ نہیں بوئی جا سکتیں۔ وہاں گیہوں نے قدم جما رکھے[2] ہیں۔ اور اگر گیہوں سے جو کچھ آمدنی ہوتی ہے۔ وہ بڑھتے بڑھتے یورپ والوں کے معیارِ آمدنی کے قریب پہنچ جائے۔ تو یقیناً گیہوں کو پنجاب میں قبولِ عام حاصل رہیگا۔ پنجاب کے مزروعہ رقبہ کے ایک ثلث میں گیہوں کی کاشت کرنے کے علاوہ ایک اعتراض یہ ہے۔ کہ خریف میں ربیع کی نسبت نباتی نشو و نما زیادہ سرعت سے ہوتی ہے۔ اور پودے جلد جلد بڑھتے ہیں۔ اِس لئے جس رقبہ میں گیہوں بوئی جائیگی۔ اُس کی قوتِ نشو و نما کو اسقدر ترقی نہیں ہوگی۔ جیسی اُس صورت میں ہو سکتی ہے کہ اسی رقبہ میں فصلِ خریف کی کاشت[3] کی جائے۔

---

[1] آسٹریلیا میں یہ کہا جاتا ہے۔ کہ وکٹوریہ میں چھ سو ایکڑ زمین پر گیہوں کی کاشت کر کے حاصل فراہم ہو سکتی ہے۔ یہ علاقہ بالکل خشک ہے۔

[2] ملاحظہ ہو ایشلے کی کتاب "ایلاٹ منٹ آف سمال ہولڈنگز اِن آکسفورڈ شائر" صـ ۶۴ ایک چھوٹے سے قطعہ میں بونے کے لئے گیہوں سب سے زیادہ مفید جنس ہے۔ ملاحظہ ہو کارور کی کتاب "پرنسپلز آف رورل اکنامکس" صـ ۱۱۲ صـ ۱۴۷ گلٹر کی رورل سوشیالوجی۔ مصنفہ جلیٹ صـ ۳۹ رورل ولتھ اینڈ ریلیف۔ ووٹ کی انٹروڈکشن ٹو رورل سوشیالوجی صـ رونٹری کی لینڈ اینڈ لیبر (بلجیم سے سبق) صـ ۱۷۳ تا صـ ۱۷۷۔

[3] مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ یہ دلیل مسٹر ڈبلیو رابرٹس سابق پرنسپل اگریکلچر کالج لائل پور نے پیش کی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اگر پنجاب کے زراعت پیشہ لوگ بھی انگلستان کی طرح زمین میں چار سال کے بعد مبادل جنس کی کاشت کریں۔ تو وہ رقبہ جس میں گیہوں کی زراعت ہوتی ہے۔ بہت کم ہو جائیگا۔ کاشت کیلئے جنس کا انتخاب اِس امر پر منحصر ہے۔ کہ پانی کتنی مقدار میں فراہم ہو سکتا ہے۔ سر جیمز ولسن کا اندازہ ہے۔ کہ فی ایکڑ پیداوار کا اوسط برطانیہ عظمیٰ میں ۳۲ بشل ہے۔ کناڈا میں ۲۲۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۱۶۔ اور پنجاب میں ۱۲۔ (ایک بشل ۳۲ سیر کا ہوتا ہے)

اب اُن دلائل کا بیان بھی ضروری ہے۔ جو گیہوں کی حمایت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اسے یہ خطرہ نہیں۔ کہ حمل ونقل کی وجہ سے اس کی قدر وقیمت میں کوئی کمی واقعہ ہو جائے گی۔ یا کس قدر نقصان ہو جائیگا۔ اُسے فروخت کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ اور چونکہ اس مانگ ہمیشہ رہتی ہے۔ اِس لئے گیہوں کی کاشت کرنیوالے کو ہمیشہ یہ اعتماد رہتا ہے۔ کہ اُسے پوری پوری قیمت مل جائے گی۔ خریدبراں یہ ان جاہل کسانوں کیلئے بہترین جنس ہے جنکے پاس نہ تو سرمایہ ہے اور نہ اتنی عقل کہ گیہوں سی بہتر جنس پیدا کر سکیں۔

اگر گیہوں کے بجائے کپاس کی کاشت کی جائے۔ تو اس کی حمایت میں بہت دلیلیں دی جا سکتی ہیں۔ کپاس کی عمیق کاشت سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ سائنٹیفک طریقوں سے اس کی پیداوار کو بہت ترقی دیجا سکتی ہے۔ اور پھر یہ گرمیوں کے موسم میں بہت نشو پذیر ہوتی ہے۔ اسکی مانگ بھی غیر محدود ہے۔ اور ہمیشہ رہتی ہے۔ اس کے ریشوں کو اگر دبا دیا جائے۔ تو اس کی قیمت جسامت کی کمی کے باعث بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ آسانی سے فروخت ہو سکتی ہے۔ اور دور دراز مقامات پر بھیجی جا سکتی ہے۔ پنجاب میں اسے گیہوں پر ایک اور فوقیت حاصل ہے۔ کہ کپاس کی کاشت کے موسم میں نہروں کے اندر پانی بہت ہوتا ہے۔ لیکن جن دنوں کھیتوں میں گیہوں کی فصل کھڑی ہوتی ہے۔ پانی میں قلت رُونما ہو جاتی ہے۔

اگر یہ صوبہ بھی اُن تغیرات سے روشناس ہونا چاہتا ہے۔ جو دوسرے ممالک میں چھوٹی چھوٹی اراضی کی ترقی کے ساتھ ساتھ رُونما ہوئے ہیں۔ تو یہ اغلب ہے۔ کہ جوں جوں عمیق کاشت کی عادت ہوتی جائے گی۔ گیہوں یا کپاس کے بجائے دوسری اجناس قبولِ عام حاصل کرتی جائیں گی۔ اب بھی بڑے بڑے شہروں کے نواح میں عمیق کاشت کی جاتی ہے۔ لیکن جب وسائل رسل ورسائل کو ترقی ہوگی۔ حمل ونقل کے مصارف کم ہو جائیں گے۔ اور اجناس ایک جگہ سے دوسری جگہ جلد پہنچائی جا سکیں گی۔ تو عمیق کاشت کے طریقے بھی زیادہ پھیل جائیں گے۔ کاشت کے موجودہ طریقوں میں اِس لئے کوئی فوری تغیر رونما نہیں ہوتا۔ کہ ایسی منڈیاں موجود نہیں، جن میں تمام پیداوار کی کھپت ہو سکے۔ وسیع کاشت کے اسباب

یہ ہیں[1] ۔ کہ کھاد نہیں ڈالی جاتی ۔ اراضی غیر مزروعہ پڑی ہیں ۔ وہی طریقے استعمال کئے جاتے ہیں، جو ہمیشہ سے مستعمل ہیں ۔ عقل ودانش کا فقدان ہے ۔ موسمی فصلوں کی وجہ سے کاشت کی حدبندی ہوگئی ہے ۔ جن مزارعین کے حقوق معیّن اور محفوظ ہیں ۔ انہیں چھدری جتائی کا طریقہ بہت پسند آتا ہے ۔ اور عملی طور پر اِس طریقہ کی وجہ سے بہت سی زمین اور محنت کا نقصان ہوتا ہے ۔ وسیع کاشت میں اِس طرح تبدیلی کیجا سکتی ہے ۔ کہ محنت سے جو بہت سہل الحصول اور فراوان ہے ۔ پُورا پورا فائدہ اٹھایا جائے ۔ کھاد پر مزید سرمایہ صرف کیا جائے ۔ زمین کی اصلاح اور آلاتِ کشاورزی پر بھی زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے ۔ اور زراعت کے سائنٹیفک طریقوں سے فائدہ اُٹھایا جائے ۔ امریکن مصنفین کا دعویٰ ہے ۔ کہ ایک بڑے رقبہ پر چھدری جتائی سے فی کسان یا فی مزدور نفع کا اوسط گہری جتائی کی نسبت زیادہ ہوتا ہے ۔ جو ایک چھوٹے سے رقبہ میں کی جائے ۔ اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ زراعت کے مختلف طریقوں کا معاوضہ کرتے وقت یہ ضروری ہے ۔ کہ فی کس پیداوار اور فی ایکڑ پیداوار کا فرق ملحوظ رکھا جائے ۔ مثلاً جرمنی میں خوراک کی فی ایکڑ پیداوار انگلستان سے زیادہ ہے ۔ لیکن انگلستان میں خوراک کی فی کس پیداوار جرمنی کی نسبت بقدر بیس فی صدی کے زیادہ ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے ۔ کہ انگلستان میں پچاس ایکڑ سے کم رقبہ کی اراضی سولہ فیصدی[2] سے بھی کم ہیں ۔ اور جرمنی کی نصف زمین پچاس سے کم رقبہ کی اراضی پر مشتمل ہے ۔ پنجاب میں فی کس رقبہ بڑا نہیں ۔ اور کوئی

---

[1] فروخت کیلئے منڈی فراہم کرنے کے سلسلے میں وسائل رسل ورسائل کو بہت اہمیت حاصل ہے ۔ اور رسل ورسائل کے مسئلہ کو بہت نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ مسٹر ہاورڈ اور مسز ہاورڈ نے اِس سلسلہ میں بہت بے بہا خدمات انجام دی ہیں ۔ اور یہ واضح کیا ہے ۔ کہ رسل ورسائل کے اکثر عقدوں کی گرہ کشائی کیونکر ہوسکتی ہے ۔ کوئٹہ کے پھلوں کا پیکنگ اگر اچھا ہو ۔ تو انہیں دُور دراز مقامات پر فروخت کیا جا سکتا ہے ۔ اور سوکھے پھل تو ہر جگہ بھیجے جا سکتے ہیں ۔ ہمیں طباعی اور ہمت واقدام کی بدولت حیرت انگیز کارنامے کئے جا سکتے ہیں ۔ مسٹر ایمرسن اِس سلسلے میں یہ کہتے ہیں ۔ کہ فوری تغیر اِس لئے رُونما نہیں ہوتا ۔ کہ کھاد فراہم نہیں ہوسکتا ۔ لیکن انہوں نے شہروں کے کوڑے کرکٹ کو نظر انداز کر دیا ہے ۔

[2] یہ سولہ فیصدی زمین بھی دراصل ۶۶ ۱/۲ فی صدی کھیتوں پر مشتمل ہے ۔

شخص اِس امر کی حمایت نہیں کریگا - کہ یہاں وسیع کاشت کیجائے - حالانکہ یہاں اِسی طریقے پر عمل ہوتا ہے - اراضی چھوٹی ہونگی - تو فی کس پیداوار بھی تھوڑی ہوگی - اوسط درجہ کے انسان میں پیداوار سے آمدنی حاصل کرنے کی قابلیت بہت محدود ہوتی ہے - صرف محنت کی بدولت جو فی کس آمدنی ہوتی ہے - وہ بہت تھوڑی ہوا کرتی ہے - پنجاب کے کسان کو محنت کے علاوہ دوسری چیزوں کے استعمال کی تعلیم بھی حاصل کرنا چاہیئے - اُسے ساری عقل و دانش جو اس میں موجود ہے یا پیدا کیجا سکتی ہے - استعمال کرنی چاہیئے - اُسے مزید سرمایہ لگانے کا طریقہ بھی سیکھنا چاہیئے - اگر صوبہ کی حیثیت مجموعی کو پیش نظر رکھا جائے - تو اس میں کوئی جائے کلام نہیں - کہ عمیق کاشت کے طریقوں کا استعمال بہت مستحسن ہے - چونکہ زمین موجودہ اور آئندہ دولت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے - اس لئے اِس سے جتنی زیادہ دولت حاصل کر لی جائے - صوبہ کی عام خوشحالی کے لئے اُسی قدر بہتر ہے - دیہات میں یہ بڑی دشواری پیش آرہی ہے - کہ وہاں محنت کی فراوانی ہے - اوسطاً ہر کسان کو بہت سا فرصت اور فراغت کا وقت مل جاتا ہے - اِس لئے اس کی آمدنی بہت کم ہے - یہ کیفیت نہیں کہ کثیر التعداد لوگ ہمیشہ بیکار رہتے ہیں - بلکہ لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت ایسی ہے جو سال بھر میں بہت سی گھنٹے بیکاری میں بسر کرتے ہیں - اگر کسان کی آمدنی سے اُس کی اراضی کی قیمت فروخت کا سود اور اسکی محنت کا معاوضہ وضع کر لیا جائے تو اکثر کسانوں کو کوئی نفع باقی نہیں

لہ وسیع کاشت اور عمیق کاشت کی تفصیلی بحث کیلئے سنگ ہیں صفحات ۵۵-۴۸-۲۱۵-۲۲۱-۲۳۴-جانڈ صفحہ ۱۷۷ تا ۱۷۹-کارور صفحہ ۱۶۶ تا ۱۶۹-صفحہ ۲۲۳ تا ۲۴۷- دیکھئے - کارور صفحہ ۱۶۵ پر لکھتا ہے "کبھی کبھی یہ کہا جاتا ہے - کہ فی ایکڑ کثیر پیداوار بجائے خود ایک مستحسن چیز ہے یہ صحیح نہیں - دراصل فی کس کثیر پیداوار مفید چیز ہے - جن مقامات پر فی کس پیداوار زیادہ ہوتی ہے - وہیں اوسط درجہ کا آدمی بلند معیار کی زندگی بسر کرتا ہے - اور خوشحال و فارغ البال رہتا ہے - جہاں زمین بہت ہو - وہاں وسیع کاشت کیوجہ سے فی کس کثیر پیداوار بآسانی حاصل ہوسکتی ہے - فی ایکڑ کثیر پیداوار کو اگر مستحسن سمجھا جاتا ہے - تو اِس لئے - کہ وہ فی کس کثیر پیداوار حاصل کرنے کا ذریعہ ہے کسی دوسری حیثیت سے وہ مستحسن نہیں - اگر فی ایکڑ پیداوار زیادہ ہو - اور فی کس پیداوار قلیل تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا - کہ لوگ نہایت عسرت و مصیبت کی زندگی بسر کرینگے - جن ملکوں میں فی ایکڑ پیداوار زیادہ ہے - اُن کی یہی کیفیت ہے"۔

بچیگا۔ پھر بھی یہ کہا جاتا ہے۔ کہ کھیتی باڑی سے زیادہ کوئی مفید منفعت[1] نہیں۔ اس بدیہی مغالطہ کی وجہ یہ ہے۔ کہ پنجاب میں ملکیت زمین موروثی ہے۔ اور جو لوگ اپنی آبائی زمین کی کاشت میں مصروف ہیں۔ اُن میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے۔ جو کبھی کبھی دوسرے کام پر اس قدر محنت صرف کر کے اسبابِ معاش پیدا نہیں کر سکتے۔ اگر پنجاب میں زراعت کی تنظیم صحیح اقتصادی اساس پر ہوتی۔ اور زمین سے نہایت منفعت بخش کام لیا جاتا۔ اگر مزدور سال بھر متواتر بہم باقاعدگی سے زمین پر محنت کرتے رہتے۔ اور آج جو زمین بیکار پڑی نظر آتی ہے۔ اسمیں زراعت کیجاتی۔ تو کسان اپنی ہمت اور دانشمندی کی بدولت ضرور نفع حاصل کر لیتے۔

یہاں شاید یہ کہا جائے۔ کہ اراضی کو اقتصادی حیثیت حاصل نہیں۔ اِس لئے کسان خوشحالی اور فراغت حاصل نہیں کر سکتا۔ مسٹر کیٹنگز[3] کے الفاظ میں اقتصادی اراضی ایک ایسے رقبہ کا نام ہے۔ جس سے ایک شخص اِس قدر پیداوار حاصل کر سکے۔ کہ مصارف پیداوار ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے۔ وہ اُس کی اور اس کے اہل و عیال کی باسائش بسر اوقات کیلئے کافی ہو۔ لیکن اِس امر کی صحیح تعیین ناممکن ہے۔ کہ ایسی اراضی کا رقبہ کس قدر ہو۔ کیونکہ آسائش اور آرام کی زندگی کا کوئی خاص معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ پھر زمین کی زرخیزی، پیداوار کی فراغت کے لئے منڈی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور یہ امر بھی ملحوظ رکھنا پڑیگا۔ کہ کسان زمین میں کس جنس کی کاشت کریگا۔

یہ صحیح ہے۔ کہ پنجاب کی اکثر اراضی کو آج یہ حیثیت حاصل نہیں۔ کیونکہ آج نہایت وسیع رقبہ

---

[1] ملاحظہ ہو کارور کی کتاب "پرنسپلز آف رورل اکنامکس" صفحہ ۳۱۵۔ وہ لکھتا ہے "کھیتی باڑی کا منافع اُس رقم کو کہا جائے۔ جو کسان کی محنت کا معاوضہ، زمین کا لگان، اور سرمایہ کا سود وضع کرنے کے بعد باقی بچ جائے۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ آیا پنجاب یا کسی دوسرے ملک کے نصف کسان بھی کوئی نفع حاصل کرتے ہیں یا نہیں۔ البتہ یہ امر یقینی ہے۔ کہ انمیں سے جو بہت مفلس ہیں۔ انہیں کوئی نفع نہیں ہوتا۔"

[2] "پلیس آف ایگریکلچر ان انڈسٹری" مصنفہ آروِن۔

[3] رورل اکانومی اِن بمبئی۔ دکن۔

میں کاشت کر کے تھوڑی پیداوار حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن اگر طریقِ زراعت میں تبدیلی کر دیجائے
ذرائع رسل و رسائل کو وسعت دیکر منڈیوں کے ساتھ تعلق پیدا کیا جائے۔ امدادِ باہمی کے نفاذ سے
مصارف میں تخفیف کیجائے۔ اور آمدنی بڑھا دی جائے۔ تو پنجاب کی اراضی اقتصادی حیثیت
حاصل کر سکتی ہے۔ ایک قطعہ اراضی کو اقتصادی حیثیت دینے اور منفعت بخش بنانے کیلئے اُس کا وسیع ہونا
ضروری نہیں۔ بلکہ اس امر کا دارو مدار اسکی خالص پیداوار پر ہے۔
یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اگر ایک قطعہ زمین کسی بہت بڑی منڈی کے قریب واقع ہو۔ اُس میں
بہت کھاد ڈالی جائے۔ اور نہایت گہری جوتائی کیجائے۔ تو وہ اقتصادی حیثیت اختیار کر لے
لیکن اگر وہی قطعہ اراضی کیمبل پور کے ملک کے علاقہ میں یا دوابہ سندھ ساگر کے وسط میں واقع
ہو۔ تو اُسے کوئی اقتصادی حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ زمین سے منڈی سے قریب ہونے کو وہی
اہمیت حاصل ہے۔ جو زرخیزی کو۔ بلکہ اگر منڈی تک پیداوار کو پہنچانے کی تمام سہولتیں میسر ہوں
تو منڈی کا قرب زرخیزی سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ آج کل دانشمندی، محنت اور سرمایہ
کے صحیح استعمال کی بدولت زمین کو زرخیز بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی قطعہ زمین کو
ایک کنوئیں سے جس پر کسان کو پورا تصرف اور قبضہ حاصل ہو سیراب کیا جاتا ہے۔ تو کسان
اس چاہی زمین سے اتنا پیدا کر لیگا۔ جس سے اپنی گذر اوقات کر سکے۔ اور یہ ممکن ہے کہ اُس
زمین کو نہر سے سیراب کرنا نقصان کا موجب ہو۔ کیونکہ نہری زمینوں کی یہ کیفیت ہے۔ کہ کسان
جب چاہے۔ انہیں سیراب نہیں کر سکتا۔ بلکہ اُسے اس غرض کیلئے اپنی باری کا منتظر رہنا پڑتا
ہے۔ اور یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ زمین میں کس جنس کی کاشت کی جائے صرف یہی نہیں دیکھا
جاتا کہ اُسے کتنی مقدار میں پانی دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہ فصل کو مناسب اور
موزوں موقع پر پانی مل سکتا ہے یا نہیں۔
ایک اور بات یہ ہے کہ اگر ایک ہنرمند اور باہمت کسان کے قبضہ میں پانچ ایکڑ چاہی زمین
ہو۔ جو جالندھر جیسے ضلع میں ایک ہی جگہ واقع ہو۔ تو وہ اُس کے مایحتاج کے لئے کافی ثابت ہو سکتی
ہے۔ لیکن اگر یہی زمین دس، بارہ حصوں میں بٹی ہوئی مختلف مقامات پر واقع ہو۔ اور اُسے کئی
کنوئیں سیراب کرتے ہوں۔ جن کی ملکیت پر بیچارہ کسان جزوی طور پر شریک ہو۔ تو اُس سے

کوئی اقتصادی نفع حاصل نہیں ہو سکتا۔ پنجاب کے اکثر اضلاع علی الخصوص درمیانی اضلاع میں اراضی بیشمار چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ جو گاؤں کے مختلف حصوں میں واقع ہوتے ہیں۔ ہم ایسی بیشمار مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ کہ بعض گاؤں ایسے ہیں۔ جو ہزار یا ہزار سے زیادہ کھیتوں پر مشتمل ہیں۔ لیکن ان کھیتوں کے رقبہ کا اوسط ۱/۴ ایکڑ یعنی دو کنال سے زیادہ نہیں۔ کئی گاؤں ایسے ہیں۔ جن میں کھیتوں کا اوسط ۱/۸ ایکڑ یعنی ایک کنال ہے۔ اِن کھیتوں میں بعض اتنے چھوٹے ہیں۔ کہ کاشت کے قابل ہی نہیں۔ بعض اتنے تنگ ہیں۔ کہ انہیں آڑا ترچھا ہل نہیں چلایا جا سکتا۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ اگر ان علاقوں میں اراضی کی تقسیم از سر نو اس طرح کی جائے۔ کہ ہر مالکِ اراضی کے پاس جو زمین ہو۔ وہ سب کی سب ایک ہی جگہ واقع ہو۔ تو یہ اراضی جنہیں اس وقت کوئی اقتصادی حیثیت حاصل نہیں۔ بہت زیادہ قیمتی بن سکتی ہیں اس کام میں بہت سی دشواریاں تو ہیں۔ لیکن تحریک اشتمالِ اراضیات اِس کام میں کسی قدر کامیابی حاصل کر رہی ہے۔ ہم جو کچھ اُوپر لکھ چکے ہیں۔ اُس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ غیر اقتصادی اراضی کے معنی محض وہ رقبہ ہیں۔ جو ایک کسان کے قبضہ میں ہے۔ اور زمین پر جو دباؤ پڑ رہا ہے۔ اس کے نجات حاصل کرنے کا صرف یہی ذریعہ نہیں کہ انتقالِ مکان کر لیا جائے۔ بلکہ بعض دوسرے ذرائع بھی ہیں۔

یورپ کے اکثر نظام ہائے زراعت کے مطابق ایک کنبہ کی پرورش کے لئے ۲۵ ایکڑ[1] زمین ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ یورپ میں معیارِ زندگی پنجاب کی نسبت بلند ہے۔ لیکن اتنا بلند بھی نہیں۔ جتنا عوام خیال کرتے ہیں۔ دوسری جانب پنجاب کی نسبت زراعت پر بدرجہا زیادہ محنت کی جاتی ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کے اکثر زمینداروں کے قبضے میں چھوٹی چھوٹی اراضی ہیں۔ (ان کی اراضی پچاس ایکڑ سے کم ہوتی ہے) زراعت کے شاہی کمیشن کے سامنے ۱۹۱۹ء میں جو شہادتیں دی گئیں۔ اُن سے ظاہر ہوا تھا۔ کہ چھوٹے چھوٹے مالکانِ اراضی کُتے کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ مسلسل محنت میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ گھنٹوں کام

---

[1] باغبان اس کی نسبت بہت کم رقبہ کی بدولت ترقی اور فراغت حاصل کر سکتا ہے۔

کرتے رہتے ہیں۔ اور اُن کے کنبے کے لوگ یعنی بیویاں، لڑکے، اور لڑکیاں اُن کی مدد کرتی ہیں
ویلز میں سالہا سال تک یہ کیفیت رہی۔ کہ کسان جو سرمایہ زمین پر لگاتا تھا۔ اُس کا مناسب
سُود وضع کر لیا جائے۔ تو جو آمدنی بچ رہتی تھی۔ وہ تنخواہ دار مزدوروں کے حقِ خدمت سے بھی
کم ہوتی تھی۔ کسی طبقے کے لوگوں کو اتنی محنت نہیں کرنا پڑتی۔ جتنی اس کسان کو کرنا پڑتی ہے۔
جس کی اراضی پچاس ایکڑ سے زیادہ نہ ہو۔ وہ بیچارہ خود اپنے بیٹوں کی مدد سے زراعت کرتا ہے
اور اسطرح اُسے مزدوروں کو حقِ خدمت دیکر کام نہیں کرانا پڑتا۔ اگر اس کا کوئی لڑکا نہیں۔
تو وہ کسی دوسرے شخص سے سارے دن کے لئے یا چند گھنٹوں کے لئے مدد لیتا ہے۔ اسطرح
وہی شخص اپنی حالت سدھار سکتا ہے۔ جو کئی کئی گھنٹوں تک نہایت محنت سے کام کرتا ہے
ہر ممکن طریق پر اپنی ذات سے اپنے کام کو فائدہ پہنچائے۔ اور جزرسی سے جسقدر روپیہ بچا سکے
بچائے۔ ایسا دیکھا گیا ہے۔ کہ ایسے تنخواہ دار مزدور اپنے آقا کی زندگی اختیار کرنا نہیں چاہتے جب
اُنہیں کہا گیا۔ کہ وہ مزدوری کرنا چھوڑ دیں۔ اور ایک چھوٹی سی اراضی کے مالک بن
جائیں۔ تو اُنہوں نے اِسے منظور نہ کیا۔ اور مزدوری کرنیکو ترجیح دی۔

ماحصل یہ کہ اس بحث سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ کہ آیا پنجاب کی اراضی اقتصادی حیثیت
رکھتی ہے یا نہیں۔ اِس اصطلاح کا استعمال یہ دیکھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ کہ اِس علاقہ میں
زراعت، محنت، اور جزرسی کا معیار کیا ہے۔ اِس صوبہ میں یہ امر قابل غور ہے۔ کہ جس شخص
کے پاس پچاس ایکڑ یا اس سے زیادہ زمین ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا زمیندار سمجھتا
ہے۔ اپنے ہاتھ سے کاشت کرنیکو ننگ و عار خیال کرتا ہے۔ زمین اجارہ پر دے دیتا ہے۔ اور خود
لگان پر بسر اوقات کرتا ہے۔

مختلف ملکوں میں چھوٹے چھوٹے مالکانِ اراضی کی جو حالت ہے۔ اُس پر بحث کرتے
وقت یہ بتا دینا ضروری ہے۔ کہ پنجاب میں انگلستان جیسی سرسبز چراگاہیں موجود نہیں۔
بعض اہلِ قلم کبھی کبھی اِس امر پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ کہ اِس صوبہ میں اراضی کا جو رقبہ چراگاہوں
کیلئے مخصوص تھا۔ اس میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ کہ اسی
سبب سے گائیوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ اور دودھ، اور گھی کا نرخ بہت بڑھ گیا ہے۔ سچ بات

یہ ہے۔ کہ پنجاب میں اگر زراعت سے غفلت برتی جائے۔ تو زمین چراگاہوں کی صورت اختیار کر لیگی۔ لیکن انگلستان کا عالم ہی اور ہے۔ وہاں چراگاہیں بنانے کے لئے سرمایہ محنت اور ہنر مندی صرف کی جاتی ہے۔ دولت کے قدرتی ذرائع سے غفلت برتنے سے دولت حاصل نہیں ہوا کرتی۔ اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کہ آج سو ایکڑ زمین میں تھوڑی بہت آبپاشی کر کے انسانوں اور مویشی کے لئے جس قدر خوراک حاصل کر لی جاتی ہے۔ نہروں کی تعمیر سے پہلے اتنے رقبہ سے اسقدر خوراک حاصل نہیں ہوا کرتی تھی۔ بلکہ یہ زمین بیکار پڑی رہتی تھی۔ زراعت کی توسیع کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ بیلوں کے لئے، جن کا وجود زمین کی کاشت کیلئے ضروری ہے۔ چارہ مل سکیگا۔ حالانکہ پرانے زمانہ میں جب ہر طرف چراگاہیں ہی چراگاہیں نظر آتی تھیں۔ لوگوں کے بیل بیکار رہتے تھے۔ اس لیے ان کے نزدیک چارہ کا مصرف یہی تھا کہ اس سے گھی اور دودھ حاصل کیا جاتا۔

اس بحث سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ اس صوبہ میں اصل نقص تو یہ ہے۔ کہ یہاں کا نظام زراعت مقامی حالات کے لئے موزوں نہیں۔ پنجاب کے کسان کو انگلستان، امریکہ بلکہ ڈنمارک کے کسان جیسا بھی نہ سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ صحیح معنوں میں کسان ہی نہیں۔ وہ بیچارہ ایک چھوٹا موٹا مالک اراضی ہے۔ بلکہ اکثر کسان تو اراضی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب زراعت کے اُن طریقوں پر عمل کرتے ہیں۔ جو اُسی صورت میں منفعت بخش ہو سکتے ہیں۔ کہ زمین کئی سو ایکڑ رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ بہرحال اس کی حالت

---

[1] اونٹاریو اور انگلستان کے متعلق بھی سر ایے۔ ڈی ہال لکھتے ہیں۔ کہ جس رقبہ میں کاشت کی گئی ہو۔ اس میں گیہوں اور جو کی پیداوار کے علاوہ اِس قدر چارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جتنا اسی قدر رقبہ میں گھاس پیدا ہونے سے ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو "ایگریکلچر آفٹر دی وار" صہ۴۷ و صہ۴۲۔ اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ کہ جس زمین میں ہل چلایا گیا ہو۔ اور کسی جنس کی کاشت کی گئی ہو۔ اس کی فصل کو جب مویشی کے چارہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔ تو اس سے جس قدر دودھ اور گوشت حاصل ہوگا۔ ایسی صورت میں جبکہ اس رقبہ پر گھاس اُگی ہوئی ہو۔ اُس کی نسبت نصف دودھ اور گوشت حاصل ہو سکتا ہے۔

جنوبی یورپ کے کسانوں سے بدتر نہیں۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے بہتر ہے۔ اور یہ ضروری نہیں۔ کہ اُس کی حالت ہمیشہ ناقابلِ اطمینان رہے۔ ہاں اگر وہ پوری طرح یہ محسوس نہ کرے۔ کہ خوشحالی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ تو اس کی حالت ایسی ہی رہیگی۔ وہ بحالتِ موجودہ اِس ناممکن العمل کام میں مصروف ہے۔ کہ ایک چھوٹی سی زمین یا زمین کے ٹکڑے میں اُن طریقوں سے زراعت کرکے زندگی بسر کرے۔ جو وسیع رقبۂ زمین میں زراعت کرنے کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں۔ وہ اِن تمام امور کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ جن سے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ ذخیرہ فراہم کرنا نہیں جانتا۔ زیادہ سے زیادہ چند مویشی یا بکریاں اُس کی ساری کائنات ہیں۔ مویشی پالنے اور ان کی اعانت سے فائدہ اٹھانے پر بھی مذہبی جذبات جہالت اور تعصبات نے پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ اور یہ چیز نہ ہو۔ تو ایک چھوٹی سی اراضی سے اسی وقت فائدہ ہو سکتا ہے۔ کہ اس کی کاشت پر بیحد محنت صرف کیجائے۔ چونکہ فی الحال اراضی کی توسیع کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ اِس لئے اِتنا ضرور ہونا چاہیئے۔ کہ زمین کے استعمال اور مصرف میں تغیر کیا جائے۔ پنجاب میں آج ہمیں جو بڑا اصل طلب مسئلہ پیش ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ پانچ ایکڑ سے پندرہ ایکڑ تک کی زمین سے فائدہ اُٹھانے کے لئے کونسے ایسے طریقے استعمال کئے جائیں۔ جن کی بدولت زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل ہو سکے۔ گیہوں کی کاشت سے یقیناً یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہے۔ کہ اگر زمین کے ایک حصّہ میں گیہوں کی کاشت کی جائے۔ تو اس سے ہمیشہ نفع حاصل ہوتا رہیگا۔ انگلستان کے بورڈ آف ایگریکلچر (مجلس زراعت) نے پچھلے دنوں تحقیق اور تجربہ کے بعد یہ اِطلاع بہم پہنچائی ہے۔ کہ اگر ایک اراضی کی پیداوار سے چند گائیوں کی پرورش کا انتظام کیا جائے۔ تو تجربہ سے معلوم ہوگا۔ کہ جب اِس قطعہ پر گھاس اُگی ہوئی ہو۔ تو اس سے جتنی گائیوں کی پرورش ہو سکتی ہے۔ اُن سے دگنی تگنی گائیوں کے لئے اس وقت خوراک مہیا ہو سکتی ہے۔ جب اُس میں ہل چلایا گیا ہو۔ اِسطرح گویا سترہ سے پچیس ایکڑ تک کی زمین سے اقتصادی نفع حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ زراعتی ترقی کے کمیشن نے یہ تجربہ کرنے کے لئے۔ کہ ایسی زمین پر جو زراعت کے لئے مخصوص ہو۔ مکھن اور دودھ کے فارم قائم کرنا تجارتی زاویۂ نگاہ سے درست ہے۔ چالیس ہزار پونڈ دینا منظور کئے ہیں۔ جن سے دس نمائشیں

کی جائیں گی[1]۔

پنجاب کا مسئلہ لاینحل نہیں۔ لیکن اگر اس کا کوئی حل تلاش کرنا مقصود ہے تو اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ تحقیق اور تجربہ پر روپیہ صرف کیا جائے۔ اور جو شخص تحقیق و تدقیق کرے۔ وہ بہت بڑا صاحبِ استعداد اور باہنر شخص ہو۔ جو اس روپیہ سے صحیح طور پر فائدہ اٹھا سکے۔ دوسرے مقامات پر جو تجربات ہوتے ہیں۔ اُن سے صرف اتنا فائدہ ہوتا ہے۔ کہ ہم جان لیتے ہیں۔ کہ مسئلہ کا حل کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے لیکن اُن کی مدد سے مسئلہ کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک وسیع رقبہ زمین پر گہری جتائی کرنے کی راہ میں پانی کی بہم رسانی کا مسئلہ حائل ہے۔ باقی رہا ثمردار درختوں کی کاشت کا مسئلہ۔ تو اُس کے لئے بھی ضروری ہے۔ کہ جب ضرورت اور موقعہ ہو۔ پانی کافی مقدار میں مہیا ہو سکے۔ کیونکہ صرف پانی کا کافی مقدار میں مہیا ہونا ہی اس مسئلہ کا حل نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ سوال بھی پیش ہے۔ کہ عین وقت پر پانی مہیا کیا جائے۔ نہروں اور مصنوعی ذخائرِ آب سے بہت فائدہ ہو سکتا ہے لیکن اُن کی تعمیر کے لئے روپے کی ضرورت ہے۔ اس امر کی کیا ضمانت ہے۔ کہ اس قدر ساکھ بھی قائم ہو جائیگی۔ کہ سرمایہ مطلوبہ مل سکے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ زراعتی اصلاحات سے عام دلچسپی بھی پیدا ہو۔ زراعتی تعلیم کا کوئی مناسب نظام دریافت کیا جائے۔ کسانوں کی تنظیم کی جائے۔ تاکہ وہ جدید علم سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اور انہیں ان اثرات سے محفوظ رکھا جائے۔ جو اُن کے حوصلے اور عزم کو پست کر دینے کا باعث ہوں۔ کیونکہ عوام میں زراعتی اقتصادیات سے جو عام بےخبری اور جہالت پائی جاتی ہے۔ انہیں اکثر ایسے طریقے اختیار کرنے کی دعوت دی جائیگی۔ جن سے محض ایک گروہ کو خوش کرنا مقصود ہوگا۔ اور جو یقیناً بحیثیتِ مجموعی عوام کی آئندہ خوشحالی کی تمام امیدوں کو مٹا دینگے۔

کوئی قوم کوئی نسل اقتصادی قوانین کو حقارت سے ٹھکرا نہیں سکتی۔ لیکن ایسے گروہ کا وجود ضروری ہے۔ جو محض ذاتی اغراض کے لئے بعض تدابیر اختیار کرنے کی دعوت دیگا۔ مثلاً یہ کہا

---

[1] ترقی زراعت کے کمیشن کی رپورٹ۔

جائیگا۔ کہ گیہوں کی برآمد ممنوع قرار دیجائے۔ اور اس سے مقصود یہ ہوگا۔ کہ شہر کے باشندوں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ یہ امر پوری طرح محسوس نہیں کیا جاتا۔ کہ جو چیز زرعی پیداوار کی قیمت میں جسقدر تخفیف کا باعث ہوتی ہے۔ اُسی قدر زراعت کی جانب سے بے التفاتی پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ گذشتہ صدی کے نصف اوّل میں امریکہ سے جو سستا گیہوں آیا۔ اُس نے یورپ کی زراعت کو تقریباً تباہ کر دیا۔ سیاسی خلفشار پیدا ہوگیا۔ معاشرتی ہنگامے رُونما ہوئے۔ اور آخر کار زراعت کے طریقوں میں انقلاب پیدا ہوگیا۔ اسکا نتیجہ خواہ اچھا ہی ہو لیکن ابتدا میں تو لوگوں کو بہت مصیبت اٹھانی پڑی۔

آپ کو اشیاء کی ارزانی کے حامی بھی ملیں گے۔ جو یہ دلیل پیش کرینگے۔ کہ اجناس کی گرانی سے کسی کو فائدہ نہیں ہو سکتا۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک ہر شخص جو کوئی جنس پیدا کرتا ہے۔ اپنی محنت اور ہمت کے زیادہ سے زیادہ معاوضہ کا طلبگار نہیں ہوتا۔ اِس قسم کے اہلِ قلم پنجاب کے اہم مسئلہ کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ کسان کو بہرحال زمین سے اپنے سامانِ معیشت کی کفالت کا بندوبست کرنا ہے۔ خواہ وہ زمین کا مالک ہو۔ یا اُس کی حیثیت محض مزارع کی ہو۔ اس کی مقبوضہ زمین کا رقبہ محدود ہے۔ اِس لئے وہ ایسے طریقے اختیار کرنا اس کے لئے مفید نہیں۔ جن سے بڑے بڑے مالکانِ اراضی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اُسے کیا طریقِ کار اختیار کرنا چاہئے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جو تمام دوسرے مسائل پر فوقیت رکھتا ہے۔ اُسے ایسی اجناس کی کاشت کرنا پڑیگی۔ جن کی کھپت ہو سکے۔ اور جنہیں وہ بآسانی فروخت کر سکے۔ اِس لئے اب اُسے سب سے زیادہ اِس امر کا خیال رکھنا پڑے گا۔ کہ کونسی جنس ایسی ہے۔ جسے وہ فروخت کر سکتا ہے۔ جب اِس سوال کا فیصلہ کر لیگا۔ تو یہ نہیں دیکھے گا۔ کہ سوسائٹی کے دوسرے خودغرض گروہوں کو کیونکر فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بلکہ اس کے پیشِ نظر تو یہ بات ہو گی۔ کہ

لہ ملاحظہ ہو تھورولڈ راجرس چوتھی جلد چھبیسواں باب۔ زرعی پیداوار میں اضافہ (بشرطیکہ وہ موسم کی خرابی کے باعث نقصانہ ہوا ہو) ہر حالت میں مفید ہے۔ خواہ روپیہ کی قیمت میں تبدیلی کے باعث یہ اضافہ ہوا ہو۔ یا طلب بڑھ جانے کی وجہ سے یا جنس کی فراہمی میں کمی ہو جانے سے +

وہ خود کس طرح زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کر سکتا ہے۔

بعض خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے لوگ ہمیشہ ایک ایسے اشتراکی نظام کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ جس میں ہر فرد دوسروں کے مفاد کی فکر میں رہتا ہے۔ اور اپنی ساری سرگرمیوں کو دوسروں کے مقاصد پورا کرنے کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے۔ کہ سب لوگوں کے مفاد کی حفاظت اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ کہ ہر شخص اِن ضوابط و قوانین کے دائرہ میں رہ کر جو متمدن ممالک میں مفادِ عمومی کی خاطر نافذ کئے گئے ہیں۔ اپنے مفاد کی حفاظت کا خیال رکھے۔ ایک شخص جس کی ساری بساط پانچ ایکڑ زمین کی ملکیت ہے۔ اِس خیال میں مستغرق نہیں رہ سکتا۔ کہ وہ ہمدردیٔ بنی نوع کے لئے بڑے بڑے کارنامے انجام دے۔ اور سوسائٹی کے دوسرے افراد کی خدمت کرتا رہے۔ وہ اگر اسی امر کا فیصلہ کر لے۔ کہ اُسے کسی جنس کی کاشت کرنی چاہئے۔ اور کس جانور کو پالنا چاہئے۔ تو اس کا یہ فیصلہ اس روشن حقیقت کے ماتحت ہوگا۔ کہ اسے ایک زمین سے سامانِ معاش فراہم کرنا ہے۔ جو باعتبارِ وسعت بمشکل اس کے معاش کی کفیل ہو سکتی ہے۔ باینہمہ اِس بات سے کہ کسان زمین سے زیادہ نفع حاصل کرے۔ عاقبت الامر شہر کے لوگوں کو بھی فائدہ حاصل ہوگا۔ کیونکہ زراعتی خوشحالی کسی ایک طبقہ کی خوشحالی نہیں۔ بلکہ اس سے ساری قوم کی خوشحالی وابستہ ہے۔ جب زراعت کو ترقی ہو۔ تو دولت بھی آہستہ آہستہ جمع کی جا سکتی ہے۔ اِس لئے یہ ضروری ہے۔ کہ دوسری صنعتوں اور منفعت بخش کاموں کے لئے جو سرمایہ بہم پہنچایا جائیگا۔ وہ موقعہ اور وقت کی ضروریات سے کم ہوگا۔ دوسری جانب زراعت کا عروج اور ترقی اگر قوم کی اکثریت کو دولت مند نہیں بنا دیتی۔ تو اس سے اکثر افراد ضرور دولت حاصل کر لیتے ہیں۔ آبادی کا جو حصّہ صنعت و حرفت میں مصروف ہے۔ اُسے بھی خوراک چاہئے۔ جب تک مقامی ضروریات سے زیادہ خوراک پیدا نہ کی جائے۔ غلّہ کی اِس قدر توفیر نہیں ہو سکتی۔ کہ اس سے صنعتی مرکزوں کے باشندوں کی خوراک بہم پہنچائی جائے۔ اِس لئے یقیناً اس صُورت میں بڑے بڑے صنعتی مرکز عالمِ وجود میں نہیں آ سکتے۔ زراعت کی ترقی سے غیر ملکی تجارت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ زراعت کو

ترقی ہوگی۔ تو وہ ایسی اشیار کے مبادلہ میں جو یہاں پیدا نہیں ہوتیں۔ غلہ فراہم کریگی۔ جب کسی ملک میں صنعت و حرفت کو زوال ہو۔ تو اُس وقت یہی زراعت آڑے آتی ہے۔ اور لوگوں کی اعانت اور پرورش کرتی ہے[1]۔ قومی نقطۂ خیال سے یہ کہنا چاہیئے۔ کہ اگر ملک کو زندگی کی جدید لطیف چیزوں سے بہرہ اندوز ہونا' اور دنیا میں کوئی حیثیت حاصل کرنا ہے۔ تو اُسکے لئے ضروری ہے۔ کہ زراعت ترقی کا قدم آگے بڑھاتی چلی جائے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے کئی شرائط ہیں۔ اور ان میں بلاشبہ ایک یہ بھی ہے۔ کہ ترقی کے تمام عوامل اور عناصر کی حدود اور اُن کے فوائد و اثرات کی تحقیق کرنا۔ اور انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے' ان حدود میں سے پنجاب کی اراضی کی وسعت و جسامت کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں اراضی کی وسعت کا اوسط یورپ کے اکثر ممالک سے کم نہیں۔ لیکن مقامی حالات و اسباب جن میں مذہبی احساسات بھی شامل ہیں۔ یہاں زمین کو ایسے طریقے پر استعمال کرنے میں مانع ہیں۔ جن سے کسی دوسرے ملک میں خوشحالی حاصل کرنا ممکن ہے۔ اِس لئے پنجاب کو اپنے مسئلہ کا حل خود تلاش کرنا چاہیئے ؂

---

[1] "تھورولڈ راجرس" [illegible] تیسواں باب ؂
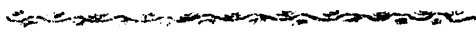
اجارہ داری کی حدود اور اثرات

پنجاب کے بڑے بڑے اقتصادی عوامل و عناصر کی بحث اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اجارہ داری کی حدود اور اس کے اثرات کا ذکر نہ کیا جائے۔ اجارہ داری کو ترقی ہو رہی ہے اور جوں جوں زراعت کے متعلق تجارتی زاویۂ نگاہ وسیع ہوتا جائیگا۔ اقتصادی ترقی بھی اجارہ داری سے بیش از پیش اثر پذیر ہوتی جائیگی۔

چونکہ حکومت نے اجارہ داری کے متعلق جو اعداد و شمار فراہم کیے ہیں۔ انکی فراہمی مختلف اوقات میں بھی ہوئی ہے۔ اور اجارہ داری کے متعلق حکومت کا اصول مختلف اوقات میں

لے "امریکن بینکرز ایسوسی ایشن" نے جو زراعتی کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس کے اجلاس میں یہ الفاظ سپرد قلم کئے گئے تھے۔ اجارہ داری کی روز افزوں دشواری زراعت کے استقلال، خوشحالی اور تحفظ میں خلل انداز ہو رہی ہے۔ اور اس کا دیہات کی قناعت پرور زندگی پر بہت ناخوشگوار اثر پڑ رہا ہے۔ اس کی وجہ سے زمین کی زرخیزی کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ کھیتوں میں جو لوگ آباد ہیں، انکی حالت غیر منظم ہے۔ جہالت عام ہو گئی ہے۔ دیہاتی مدارس کا نظام ناقص ہو گیا ہے۔ لوگ کھیتوں کو چھوڑ کر شہروں میں سکونت اختیار کر رہے ہیں۔ اور زراعت کے غیر منفعت بخش طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ امریکہ میں اوسطاً ایک مزارع چار سال تک ایک کھیت میں کام کرتا ہے۔ انگلستان میں اجارہ داری اوج کمال تک پہنچ گئی ہے۔ کیونکہ وہاں کے مالکان اراضی زراعت کو ترقی دینے کی بہت قابل قدر کوششیں کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو "اگریکلچرل اکنامکس" (زرعی اقتصادیات) مصنفہ بائل صفحات ۶۲ و ۸۱۔

مختلف رہا ہے۔ اس لئے ان تغیرات کی کوئی مسلسل اور مربوط روئداد نہیں پیش کی جا سکتی۔ البتہ یہ بیان کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔ کہ اس قسم کے تغیرات موجود ہیں۔

پہلی چیز تو یہ ہے۔ کہ مزارعین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ذیل کے اعداد و شمار سے یہ واضح ہو جاتا ہے[1]۔

	غیر موروثی مزارع	موروثی مزارع	میزان
۱۸۷۲ء و ۱۸۷۳ء	۶۵۰۰۰۰	۳۷۹۰۰۰	۱۱۰۰۰۰۰
۱۸۸۲ء و ۱۸۸۳ء	۱۰۹۶۰۰۰	۵۱۲۰۰۰	۱۶۰۸۰۰۰
۱۸۹۲ء و ۱۸۹۳ء	۲۸۷۴۰۰۰	۷۵۸۰۰۰	۳۶۳۲۰۰۰
۱۹۰۲ء و ۱۹۰۳ء	۳۰۷۷۰۰۰	۹۴۰۰۰۰	۴۰۱۷۰۰۰

لیکن ان اعداد و شمار سے اجارہ داری کے تغیرات نہیں معلوم ہوتے۔ حالانکہ۔

(الف) جن لوگوں کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ غیر موروثی مزارع ہیں۔ ان میں اکثر ایسے ہیں۔ جو در حقیقت مالکانِ اراضی ہیں۔ اور جنہوں نے ایک چھوٹا سا قطعۂ اراضی اپنے ہمسایہ سے اجارہ پر لے لیا ہے۔

(ب) ہندی علاقے میں آبادی ہونے کی وجہ سے سرکاری مزارعین کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مزارعین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۱۱ء کی رپورٹ مردم شماری میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ اٹھاون ۵۸ فی صدی آبادی کی بسر اوقات کا ذریعہ زراعت کرنا یا زراعت میں مدد دینا ہے۔ حسب ذیل اعداد ملاحظہ ہو:۔

۴ و ۱۳ فیصدی رقم اجارہ ادا کرتے ہیں۔

---

[1] یہ اقتباس مالگذاری کی سالانہ رپورٹ سے لیا گیا ہے ۱۸۷۲ء و ۱۸۷۳ء میں ہر قسم کے مزارعین کی مجموعی تعداد ۱۱ لاکھ تھی، اور کاشتکار مالکانِ اراضی بیس ۲۰ لاکھ تھے۔ لیکن اس رپورٹ میں جو اعداد دیئے گئے ہیں۔ وہ میزان سے مطابقت نہیں رکھتے۔

۱۹ فیصدی مالکانِ اراضی ہیں جو خود زمین کی کاشت کرتے ہیں۔

۲۰ء۲ فیصدی رقم اجارہ وصول کرتے ہیں (خود زمین کی کاشت نہیں کرتے)

۵ فیصدی کا شمار متفرق میں ہے۔

دوسری قابلِ غور تبدیلی یہ ہے۔ کہ جس رقبہ کی کاشت مزارعین کرتے ہیں۔ اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور تیسری یہ کہ مجموعی مزروعہ رقبہ میں سے اُس رقبہ کے تناسب میں اضافہ ہو رہا ہے جس کی کاشت مزارعین کرتے ہیں۔

۱۸۷۵ء و ۱۸۷۶ء میں صوبہ کے مزروعہ رقبہ میں سے ۴۴ فیصدی مزارعین کے رقبہ میں ہے۔ (جن میں تیس فی صدی کو قبضہ کے حقوق حاصل ہیں) ۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء میں یہ تناسب ۵۱ فی صدی تھا۔

جو رقبہ غیر موروثی مزارعین کے قبضہ میں ہے اس نے حسب ذیل ترقی کی ہے۔

۱۸۹۲ء و ۱۸۹۳ء ۲۲۵۰۰۰۰۰ ایکڑ میں سے ۹۰۲۶۰۰۰ یا ۴۰ فی صدی

۱۹۰۲ء و ۱۹۰۳ء ۲۵۷۸۰۰۰۰ " ۱۱۱۳۳۰۰۰ یا ۴۳ فی صدی

۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء ... ۱۲۴۵۰۰۰۰ .

۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء ۲۹۱۴۰۲۱۲ ایکڑ رقبہ میں سے ہر قسم کے مزارعین نے جو رقم اجارہ ادا کرتے ہیں۔ جس قدر رقبہ کی کاشت کی۔ وہ ۱۴۸۳۲۸۸۴ ایکڑ یعنی اکیاون[۱] فیصدی[۱] تھا

---

[۱] سر جیمز ڈوسن اپنی کتاب "ایسنٹ اکنامکس ڈیولپمنٹس ان پنجاب" میں لکھتے ہیں ۱۸۸۵ء میں خود کاشت رقبہ ایک کروڑ ۵۴ لاکھ ایکڑ تھا۔ اور ۱۹۱۰ء میں ایک کروڑ تیس لاکھ رہ گیا۔ جس رقبہ کی کاشت مزارعین کرتے ہیں۔ وہ ۷۵ لاکھ ایکڑ تھا۔ اور ایک کروڑ ۱۵ لاکھ ایکڑ ہو گیا۔ یہ تبدیلی ۱۹۱۰ء کے بعد بھی برابر جاری ہے۔ سر جیمز ڈوسن کہتے ہیں۔ کہ گذشتہ پچاس سال کے عرصہ میں اُسی رقبۂ مزروعہ میں اضافہ ہوا ہے۔ جو نہروں سے سیراب ہو رہا ہے۔ اس لئے فی ایکڑ نفع اور پیداوار کے اوسط میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ گویا اب مالک اراضی ایک چھوٹے سے رقبہ سے بھی اسی قدر پیداوار اور اسیقدر منافع حاصل کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں منفعت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے مزارعین زیادہ لگان دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے مالکان اراضی اپنی مملوکہ اراضی انہیں دیدیتے ہیں +

موروثی مزارعین نے جسقدر رقبہ کی کاشت کی ۔ اور ہر مزارع کے رقبہ مزروعہ کا اوسط دونوں
میں کمی واقع ہو رہی ہے ۔

چوتھی تبدیلی یہ ہے ۔ کہ لگان بصورت جنس کے مقابلے میں نقد رقم لگان کا تناسب
کم ہو رہا ہے ۔

۱۸۷۵ء و ۱۸۷۶ء میں غیر موروثی مزارعین میں ۵۲ فیصدی نقد لگان ادا کرتے تھے ۔
۱۹۰۲ء و ۱۹۰۳ء تک اس تناسب میں معقول کمی واقع ہوگئی ۔ اور چونکہ زرعی پیداوار کی قیمت
زیادہ ہوگئی ہے ۔ اس لئے مالکانِ اراضی کا رجحان اس امر کی جانب ہوگیا ہے ۔ کہ لگان بصورت
جنس[1] وصول کیا جائے ۔ بہرحال اس تبدیلی کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہئے ۔ ابتدائی ایام میں
۱۸۸۲ء و ۱۸۸۳ء تک مزارعین نقد رقم اجارہ مالگذاری اور محصولوں کی صورت
میں ادا کیا کرتے تھے ۔

ایک اہم چیز جس سے اجارہ داری کے اعداد و شمار پر اثر پڑتا ہے ۔ یہ ہے ۔ کہ اراضی مرہونہ
کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ ۱۶۰۰۰ ۳۱ ایکڑ مزروعہ زمین یا تمام مزروعہ رقبہ کی ۹ و ۱۰
فی صدی اِس وقت رہن شدہ ہے ۔ رہن شدہ اراضی کی تعداد ۰۰۰۰۰ ۱۴ ہے ۔ چونکہ
اراضی رہن کرنے والے کسان اکثر اوقات اپنا نام اس طرح درج کراتے ہیں ۔
کہ وہ مزارعین ہیں ۔ جو رہن شدہ اراضی کی کاشت کرتے ہیں ۔ اِس لئے جوں
جوں رہن شدہ اراضی کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ مزارعین کی تعداد بھی

---

[1] لاہور کے بندوبست کی رپورٹ دیکھئے "گذشتہ بندوبست سے لگان بصورت جنس کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہو رہا ہے" ۔ یہی کیفیت گجرات کی ہے "جسقدر رقبہ کا نقد لگان ادا کیا جاتا ہے ۔ وہ قابلِ التفات ہی نہیں ۔ جب فصل اچھی نہ ہو ۔ تو مزارع کیلئے لگان بصورت جنس اچھی ہے ۔ اور بحیثیت مجموعی مالک اراضی کیلئے مفید ہے" امرتسر کے متعلق لکھا ہے "گذشتہ چند سال سے مالکانِ اراضی ان زمینوں پر جنکی آبپاشی کا انتظام اچھا ہے ۔ لگان بصورت جنس لینا چاہتے ہیں ۔ لیکن جن زمینوں کی آبپاشی کا انتظام نہیں ۔ انکا نقد لگان بھی لے لیتے ہیں ۔ کیونکہ انکی پیداوار یقینی نہیں" گورداسپور کے متعلق لکھا ہے "گذشتہ دس سال سے رجحان لگان بصورت جنس کی جانب ہے" ۔

بڑھتی چلی جاتی ہے[1]

ہم سطورِ بالا میں جو کچھ بیان کر چکے ہیں۔ اُس میں سب سے زیادہ یہ چیز نظر آتی ہے۔ کہ صوبہ کا نصف رقبہ مزروعہ ایسے مزارعین کے قبضہ میں ہے۔ جسے زمین کی اصلاح و ترقی کی مشروط آزادی حاصل ہے۔ ابھی نوعِ حقیقت کی کوئی تعیین نہیں کی گئی۔ اور اگر وہ زمین پر سرمایہ صرف کر کے اُس کی قوتِ پیداوار کو ترقی دیں[2]۔ تو اس امر کی کوئی ضمانت نہیں۔ کہ رقمِ اجارہ میں اضافہ نہیں کر دیا جائیگا۔ یا انہیں سرے سے بے دخل ہی نہیں کر دیا جائیگا۔ مزارعین اور مالکانِ اراضی کا تناسب مختلف جماعتوں میں مختلف ہے۔ ۱۸۷۲ء و ۱۸۷۳ء میں اندازہ لگایا گیا تھا۔ کہ سکھوں میں جو اس سے کچھ عرصہ پہلے اس صوبہ پر قابض و متصرف تھے۔ ۱۰۰ مالکانِ اراضی اور ۲۳ مزارعین کی نسبت ہے۔ مسلمانوں میں جو مغربی اضلاع میں وسیع زمینوں کے مالک ہیں۔ مالکانِ اراضی اور مزارعین میں ۱۰۰ اور ۱۶ کا تناسب ہے۔ اور ہندوؤں میں ۱۰۰ اور ۵۳ کا۔ تازہ اعداد و شمار تو فراہم نہیں ہو سکے۔ لیکن اگر ہم مشرقی اضلاع یعنی حصار، رہتک، کرنال، اور انبالہ کا مقابلہ چار مغربی اضلاع یعنی راولپنڈی، اٹک، میانوالی اور مظفر گڈھ سے کریں۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ مزارعین اور مالکانِ اراضی کا تناسب حسب تفصیل ذیل ہے۔ یہ واضح رہے۔ کہ مشرقی اضلاع میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب ۷۴ و ۳ فی صدی ہے۔ اور مسلمانوں کی آبادی صرف ۲۵ و ۳ فیصدی۔ اِسی طرح مغربی اضلاع میں ہندوؤں

---

[1] یہ اعداد و شمار ۱۹۲۰ء کی رپورٹ مالگذاری سے لئے گئے ہیں۔ اوسط طور پر اراضی مرہونہ ½ ۲ ایکڑ ہیں۔ اور انکی مالگذاری تین روپیہ ہے۔ اسطرح یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اراضی مرہونہ اوسط درجہ کی ہیں۔ اور ۳۵ فیصدی سے زیادہ مالکانِ اراضی رہن نہیں کر سکتے۔ رہن شدہ اراضی کے اضافہ کے سلسلہ میں سکھ کے غلط استعمال کی بحث ملاحظہ ہو۔

[2] ٹیننسی ایکٹ (قانون مزارعین) کے رو سے غیر موروثی کاشتکاروں کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ مالکِ اراضی کی رضامندی سے زمین کی اصلاح کریں۔ اگر کوئی مزارع یہ ثابت کر دے کہ اس نے مالکِ اراضی کی رضامندی سے ایسا کیا ہے تو اُسے بیدخل نہیں کیا جا سکتا۔ اور اُسکے لگان میں اُس وقت اضافہ بھی نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ اُسے اپنی محنت کا معاوضہ نہ دیدیا جائے۔ لیکن مقامی حالات ایسے ہیں۔ کہ مزارع کیلئے مالکِ اراضی کی رضامندی کا ثبوت بہم پہنچانا مشکل ہے۔

کی اقلیت ہے یعنی وہ صرف ۱۲،۲ فی صدی ہیں - اور مسلمان ۷،۲، ۸ فیصدی -

	مالکان اراضی	مزارعین جو اراضی پر قابض ہیں	دوسرے مزارعین
مشرقی اضلاع	۵۳ فیصدی	۱۱ فی صدی	۳۶ فیصدی
مغربی اضلاع	۴۸ فیصدی	۱۱ فی صدی	۴۱ فیصدی

اب مرکزی اضلاع کو لیجئے - امرتسر میں وہ رقبہ مزروعہ جس کی کاشت خود مالکان اراضی کرتے ہیں - ۴۸ فیصدی ہے - اور لاہور میں ۴۴ فیصدی - گجرات کے ضلع میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے - یہ تناسب بڑھ گیا ہے - یعنی تحصیل گجرات میں ۵۶ فیصدی تحصیل کھاریاں میں ۱۶ فیصدی اور پھالیہ میں ۶۰ فی صدی - مسلمانوں میں اگر مزارعین کا تناسب زیادہ ہے تو اُسکی وجہ مذہب نہیں - بلکہ اس کا باعث یہ ہے - کہ دریائے سندھ کے کنارے جو اضلاع واقع ہیں انمیں مسلمانوں کی بڑی بڑی جاگیریں ہیں -

بلجیم میں وہ زمین جس کی کاشت مالکان اراضی کرتے ہیں ۵۳ فیصدی ہے جرمنی میں ۸۶ فیصدی - ڈنمارک ۸۸ فیصدی - فرانس میں ½ ۴۷ فیصدی - برطانیہ میں بارہ[۲] فیصدی[۱] اور جاپان میں ۴۸ فی صدی - دوسرے ممالک میں اجارہ داری کو پنجاب سے زیادہ ترقی ہو رہی ہے - انگلستان میں تو وہ پرانی وضع کے خود کاشت زمینداروں کے معدوم ہوتے ہی مزارعین کی تعداد بڑھنے لگی - بلجیم اور امریکہ میں بھی اجارہ داری کو عروج حاصل ہو رہا ہے - اور امریکہ میں اجارہ داری کے معاشرتی اور اقتصادی اثرات و نتائج کو ملک کی زرعی حالت مرکزی حیثیت حاصل ہے - اس کا سبب

---

[۱] ملاحظہ ہو رونٹری کی "لینڈ اینڈ لیبر - بلجیم سے سبق" مطبوعہ ۱۹۱۰ء - یہ اعداد و شمار تازہ نہیں - دوسری جانب فرانس میں ۷۷ فی صدی کسان اور جرمنی میں ۳۸ فی صدی اپنی اراضی کے کلیتاً یا جزواً مالک ہیں - ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۴۷ فیصدی کسان مزارعین ہیں - ملاحظہ ہو جلبٹ کی کنسر کٹو ورلڈ سوشیالوجی صفحہ ۲۲ +

[۲] لیکن جنگ عظیم کے بعد اراضی کی فروخت اس کثرت سے ہونے لگی - کہ خود کاشت زمینداروں کی تعداد بڑھنے لگی - قدیم مزارعین اراضی خریدنے کی بہت کوشش کر رہے ہیں - لیکن ان کی کوششیں دانشمندی پر مبنی نہیں ہوتیں -

بڑا سبب یہ ہے۔ کہ زمین کی قیمت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لئے بیچارے مزارعین اتنا روپیہ پس انداز نہیں کر سکتے۔ کہ خود اراضی خرید لیں۔ انگلستان کے سوا جہاں مزارعین اور زمینداروں کے تعلقات دنیا بھر میں بہترین ہیں۔ مالکانہ حقوق حاصل کرنے کی خواہش ہر ملک کے مزارعین میں پائی جاتی ہے۔ پنجاب پر اجارہ داری کا جو اثر ہوا ہے۔ اس کے متعلق کچھ لکھنا دشوار ہے۔ پچھلے دنوں انجمن ہائے امداد باہمی کے انسپکٹروں کے پاس بعض سوالات بھیجے گئے تھے۔ اور ان سوالات کے ساتھ قیمت زمین کے اتار چڑھاؤ اور اس کے نتائج کی تحقیقات کے متعلق ہدایات کر دی گئی تھیں۔ انسپکٹروں کو یہ حکم دیا گیا تھا۔ کہ خود کاشت اراضی کا مقابلہ ان اراضی سے کریں۔ جن کے مزارعین مالکانِ اراضی سے کوئی قرابت نہیں رکھتے۔ اور اس سلسلہ میں جس قدر تفاصیل حاصل ہو سکیں حاصل کی جائیں۔ چنانچہ پنجاب کی اجارہ داری کے متعلق ہم جو کچھ بیان کرینگے اُنکا سرمایہ یہ سوالات اور انکے جوابات ہیں۔

پہلا سوال یہ تھا۔ کہ اِن دونوں کے طریقِ زراعت ہل چلانے اور کھاد ڈالنے وغیرہ میں کوئی فرق ہے۔ جہاں تک موروثی کاشتکاروں کا تعلق ہے۔ ان کے حقوق عملی طور پر اسی قدر محفوظ ہیں۔ جس قدر مالک اراضی کے حقوق۔ اِس لئے ایسے مزارعین کے متعلق کسی بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں۔

جس قدر جوابات موصول ہوئے ہیں۔ اُن میں یا تو غیر موروثی مزارعین اور متاجرین کا فرق بیان کیا گیا ہے۔ یا بٹائی کی صورت میں قیمت اجارہ دینے والے اور نقد رقم اجارہ ادا کرنے والے مزارعین کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے۔ کہ متاجرین مالکانِ اراضی کی نسبت زمین پر زیادہ وقت اور محنت صرف کرتے ہیں۔ اور انکی نسبت زیادہ غلہ پیدا کر کے فائدہ اُٹھاتے ہیں سب جوابات میں اِس امر کے متعلق بھی اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ کہ بٹائی دینے والے مزارع کی نسبت نقد رقم ادا کرنیوالا مزارع زمین کی زیادہ گہری جوتائی کرتا ہے۔ زیادہ مرتبہ ہل چلاتا ہے۔ اور زیادہ کھاد ڈالتا ہے۔ اگر اس کی کیفیت یہ ہے۔ کہ وہ ایک قطعہ اراضی میں گیہوں جیسی کسی جنس کی کاشت کرتا ہے۔ اور لگان غلہ کی صورت میں دیتا ہے اور دوسرے قطعہ اراضی میں کسی دوسری جنس مثلاً گیہوں کی کاشت کرتا ہے۔ اور اُس کا لگان

اور مالک اراضی سے بھی زیادہ کھاد ڈالیگا۔ گورداسپور میں جو تحقیقات کی گئی۔ اُس سے معلوم ہوا۔ کہ مزارعین گنے کی فصل میں جتنی مرتبہ ہل چلاتے ہیں۔ اُسکا اوسط ۴ء۱۶ ہے۔ اور مالکانِ اراضی کے ہل چلانے کا اوسط ۷ء۱۵ ہے۔

اِن تمام جوابات میں اِس امر کے متعلق اتحاد خیال اور اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ کہ بٹائی دینے والے مزارعین زمین میں اتنی مرتبہ ہل چلاتے۔ جتنی مرتبہ مالکانِ اراضی ہل چلاتے ہیں۔ نہ اس قدر کھاد ڈالتے ہیں۔ اِس لئے زیادہ پیداوار حاصل نہیں کرتے۔ ایسے مزارعین کے پاس آلاتِ کشاورزی بھی کم ہوتے ہیں۔ وہ نئے آلات کم خریدتے ہیں۔ بلکہ فرسودہ آلات کو ہی کام میں لاتے ہیں۔ جن علاقوں میں نئی وضع کے ہلوں اور نئے بیج کو رائج کیا جارہا ہے۔ وہاں دیکھا جاتا ہے۔ کہ ان چیزوں کو رواج دیتے ہیں۔ مزارعین کی نسبت مالکانِ اراضی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ بعض تحقیقات کرنیوالوں کا بیان ہے۔ کہ مزارعین کا حاصل مالکانِ اراضی کے حاصل سے ۲۵ فیصدی کم ہوتا ہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے۔ کہ بایں ہمہ غیر موروثی مزارعین بھی بڑے بڑے مالکانِ اراضی کے تنخواہ دار مزدوروں سے بہتر طریق پر کاشت کرتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عارضی اجارہ داری اور بٹائی کے طریقوں سے زراعت کا معیار پست ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر مزارعین نقد لگان ادا کریں۔ تو یہ چیز زمین کی اعلیٰ غور و پرداخت کیلئے کم مضر ہے[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو "پرنسپلز آف رورل اکنامکس" مصنفہ کارور صفحہ ۲۳۱۔ عام طور پر موسمی تغیرات کے باعث نقد لگان ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بٹائی کے طریقہ کیوجہ سے مزارع زمین کی کاشت جانفشانی سے نہیں کرتا۔ نقد لگان کیوجہ سے کاشت اچھی طرح ہوتی ہے لیکن اراضی کی آئندہ زرخیزی معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔ نقد لگان دینے والے مزارعین اعلیٰ کاشت کے تمام فوائد خود حاصل کرتے ہیں۔ اور بٹائی دینے والے مزارعین کو اِس فائدہ کا محض ایک حصہ ملتا ہے۔ اصول تقلیل حاصل کی رو سے نقد لگان دینے والا مزارع بہت عمیق کاشت کر سکتا ہے۔ بٹائی کے حق میں مسٹر ایمرسن یہ دلائل دیتے ہیں۔ (الف) اسکی وجہ سے لگان اور قیمت کے درمیان خود بخود تناسب قائم ہو جاتا ہے۔ اور کسان اور زمیندار کے مابین بہترین تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ (ب) موسمی حالات اور لگان میں خود بخود ایک نسبت قائم ہو جاتی ہے۔ (ج) کسان اور زمیندار دونوں کو یہ خیال رہتا ہے۔ (باقی بر صفحہ ۱۷۱)

تحقیقات کرنیوالوں سے دوسرا سوال یہ کیا گیا تھا۔ کہ آیا فصل کے معاملے میں بھی زمیندار
اور مزارع کے درمیان کوئی فرق ہے۔ اس کا جواب یوں دیا گیا ہے۔ کہ اگر مزارع خود مالکِ اراضی
ہے۔ تو بہترین اجناس مثلاً گنا۔ روئی وغیرہ کی کاشت تو اپنی مملوکہ اراضی میں کرتا ہے۔ اور گیہوں
وغیرہ اجناس کو جن سے نسبتاً کم نفع ہوتا ہے۔ اُن زمینوں میں بوتا ہے۔ جن کا لگان وہ بٹائی
کی صورت میں ادا کرتا ہے۔ دوسری جانب ایک زمیندار جو زمین کے ایک حصہ میں کاشت کرتا ہے
اور باقی زمین لگان پر دیدیتا ہے۔ اپنے لئے زمین کا وہ حصہ منتخب کرتا ہے۔ جو منفعت بخش اجناس
کی کاشت کیلئے زیادہ موزوں ہو۔ اِس طرح گویا اجناس کی کاشت کے بارے میں بھی اختلاف
رُونما ہو گیا ہے۔ اگر مزارع ایک قطعۂ زمین کو مویشی کیلئے چارہ مہیا کرنے کی غرض سے مخصوص
کر دیتا ہے۔ تو اس قطعۂ زمین کی وسعت کا دار و مدار بہت حد تک اِس امر پر ہے۔ کہ مالک اراضی
کو چارہ میں سے کس قدر حصّہ دیا جائیگا۔ اور اس بارہ میں کیا دستور رائج ہے۔ جن مقامات پر
لگان کی تعیین فصل کے تناسب کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ وہاں بھی زمین کی ساری پیداوار کے
تناسب سے کوئی رقم مقرر نہیں کی جاتی۔ بلکہ لگان کی تعیین اس پیداوار کے تناسب سے
ہوتی ہے۔ جو شاگرد پیشہ لوگوں کی تنخواہ اور دوسرے مصارف ادا کرنے کے بعد بچ رہتی
ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ مزارعین مزدوروں کو پیداوار میں سے بہت بڑا حصّہ دینے کے خواہاں
ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ کہ انکی گرہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ معاوضہ اُنکے حصّہ کی پیداوار
سے نہیں دیا جائیگا۔ مزید برآں پیداوار اٹھاتے وقت بھی مزارع زیادہ احتیاط نہیں برتتا۔
کیونکہ اُسے بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر کھیت میں کچھ غلّہ رہ گیا۔ تو عورتیں اُسے اُٹھا لائینگی۔
جو مزارعین لگان بٹائی کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ جب گیہوں کی کاشت کرتے ہیں۔ تو

(صفحہ ۱۷۰ کا بقیہ) کہ زمین کی کاشت اچھی طرح ہو۔ لیکن زمیندار تو محض لگان وصول کر لیتا ہے۔ جیسا کہ پنجاب میں عموماً
دیکھا گیا ہے۔ یہ بات بآسانی سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ زمیندار کو اضافہ پیداوار سے کیوں فائدہ پہنچے۔ ہاں وہ اضافہ منافع
سے اُس وقت فائدہ حاصل کرے۔ جب اُسکی زمین کو لگان حاصل کرنے کیلئے مزارعین میں مقابلہ ہو۔ اور وہ ایک
دوسرے سے بڑھ کر لگان پیش کریں +

عام طور پر انکی یہی کوشش ہوتی ہے۔ کہ زمیندار کی نسبت زیادہ پیداوار حاصل کریں۔ لیکن اگر کوئی دوسری فصل ہوتی۔ جس پر سرمایہ لگائے بغیر چارہ نہیں۔ تو پیداوار نسبتاً کم ہوتی ہے۔ زیادہ گراں قیمت اجناس مثلاً گنا۔ یا روئی کے لیے تو نقد لگان مفید ہے۔ اور کم قیمت اجناس کے لئے بٹائی کا طریقہ بحیثیت مجموعی مزارع سے مالکِ اراضی زیادہ قیمتی فصل پیدا کرتا ہے۔

تیسرا سوال یہ تھا۔ کہ آیا زیادہ دیر تک رہنے والے پودوں مثلاً اراضی کے درختوں کے بارے میں بھی کوئی اختلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ملا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ مزارعین نہ تو اراضی میں درخت لگاتے ہیں۔ اور نہ اُن درختوں کی غور و پرداخت کرتے ہیں۔ جو پہلے سے اراضی میں موجود ہیں۔ لوآبادیوں میں جن مربعوں کی کاشت مزارعین کرتے ہیں۔ اُن میں خود کاشت مربعوں کی نسبت کم درخت بوئے جاتے ہیں۔ سفید پوشوں کے چکوں میں جہاں جہاں سفید پوش ابتدا میں آباد ہوئے۔ وہاں بہتیرے درخت ہیں۔ لیکن جو اراضی انہوں نے مزارعین کو اجارہ پر دے دی ہے۔ انہیں درختوں کی تعداد کم ہے۔

گورداسپور میں درختوں کا شمار کیا گیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ خود کاشت اراضی میں ان اراضی کی نسبت جنکی کاشت مزارعین کے سپرد ہے۔ دس گنا زیادہ درخت ہیں۔ مزارعین کے نزدیک اراضی میں درخت لگانا فصل کے لئے مضر ہے۔ دوسری جانب مالکانِ اراضی کو بھی مستحسن معلوم ہوتا ہے۔ کہ کھیتوں میں درخت لگائے جائیں۔

ثمردار درخت اور باغ سب کے سب مالکانِ اراضی کے لگائے ہوئے ہیں۔ مزارعین نے عملی طور پر کبھی ایسا نہیں کیا۔

پہاڑوں کے سوا اور کہیں زیادہ دیر تک رہنے والے پودوں کی کاشت فصل کے طور پر نہیں کی جاتی۔ (چائے، قہوہ، چھوٹے چھوٹے پھل وغیرہ) اور درختوں کے بارے میں مزارعین کی سستی اور بے توجہی کا ذکر ہر شخص کرتا ہے۔

چوتھا سوال یہ تھا۔ کہ آیا نقد رقم دینے والے اور بٹائی کے طریق پر عمل کرنیوالے مزارعین مالکانِ اراضی مستاجرین۔ اور غیر موروثی کاشتکاروں کے درمیان زمین کی اصلاح کی کوشش

کے بارہ میں بھی فرق ہے۔

اس کا جواب یہ تھا۔ کہ جو شخص رات بھر کے لئے ایک سرائے میں رہے۔ اُسے کیا پڑی ہے سکہ کوٹھے پر چڑھ کر سوراخ بند کرتا پھرے۔ تاکہ سرائے کی چھت نہ ٹپکے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کریگا۔ کہ بستر کو کسی قدر سرکا لیگا۔ اس بارہ میں بھی اتفاق ہے۔ کہ مزارع زمین کی اصلاح و ترقی کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اِس کی بھی بہت کم پروا کرتا ہے۔ کہ مختلف اجناس کی کاشت باری باری کیجائے۔ تاکہ زمین کی قوتِ پیداوار میں ترقی ہو۔ حالانکہ وہ زمیندار کی نسبت زیادہ محنتی اور جفاکش ہوتا ہے۔ اور زیادہ پیداوار حاصل کر سکتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ زمیندار زمین کو خس و خاشاک سے پاک و صاف کرتے ہیں۔ اُسے ہموار کر دیتے ہیں۔ کھیتوں کے اِردگرد مینڈ بندھوا دیتے ہیں۔ تاکہ بارش کے پانی کو روک لیا جائے۔ وہ کھیت میں کھاد ڈالنے کا خیال رکھتا ہے۔ اور مزارعین عام طور پر گوبر کو بھی بیچ ڈالتے ہیں۔ کنوئیں بھی مالکانِ اراضی ہی کھودتے ہیں۔ مزارعین کو اس کام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ پہاڑوں میں آبپاشی کے لئے دُور دراز سے پانی کی نہریں کاٹ کاٹ کر لاتے ہیں۔ اور ہمیشہ اُن کی مرمت کرتے رہتے ہیں۔ اِن جوابات میں اِس بات پر زور دیا گیا ہے۔ کہ مزارعین زمین کی اِصلاح و ترقی کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ اور مالکانِ اراضی سے جو کچھ ہو سکتا ہے، کرتے ہیں[1]۔

پانچواں سوال یہ کہ آیا مویشی کے بارہ میں اُنکی حالت جداگانہ ہے؟

اِس کے متعلق عام خیال یہ ہے۔ کہ اگرچہ زمیندار اچھے بیل خریدتے ہیں۔ اور غالباً ٹٹو وغیرہ بھی زیادہ تعداد میں رکھتے ہیں۔ تاہم مزارعین کے پاس گائیں اور بھینسیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اور وہ مویشی کی نگہداشت اور پرورش بہتر طریق پر کرتے ہیں۔ مویشی کے بارے میں نظری طور پر جو توقعات قائم کر لی گئیں تھیں۔ اُن سے یہ جواب پوری پوری مطابقت نہیں رکھتا۔ لیکن اگلے زمانہ میں

---

[1] مزارع کو اس اندیشہ نے زمین کی اِصلاح سے باز رکھا ہے۔ کہ کہیں اُسے زیادہ خرچ نہ کرنا پڑے، اسکی وجہ سے زراعت کی نشوو ارتقا کو دوسرے اسباب کی نسبت بہت نقصان پہنچا ہے۔

زمین کی قیمت بیلوں کی قیمت سے کم ہوا کرتی تھی۔ اِس لئے کسان بیلوں کی جانب زمین سے زیادہ توجہ کیا کرتا تھا۔ اب زمین بیلوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ اِس لئے وہ اِس کی اِصلاح و ترقی پر زیادہ توجہ صرف کرتا ہے۔ دوسری جانب بیچارہ کسان یہ سمجھتا ہے۔ کہ مویشی کے سوا اس کی کوئی جائیداد نہیں۔ وہ گائیوں بھینسوں کی غور و پرداخت اِس لئے کرتا ہے۔ کہ دودھ اور گھی فروخت کر کے اپنی آمدنی میں کسی قدر اضافہ کرے۔ بیلوں کی نگہداشت کا باعث یہ ہے کہ اُن سے حمل و نقل کا کام لیکر چند روپے کمانا چاہتا ہے۔ اِس سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس کسان کے پاس جتنی بُری زمین ہوتی ہے۔ وہ اُتنے ہی زیادہ اچھے بیل رکھتا ہے بعض انسپکٹروں نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس بارہ میں مزارعین اور زمینداروں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ ایک دو نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ مالکانِ اراضی مزارعین کی نسبت زیادہ اچھے بیل اور بھینسیں رکھتے ہیں۔ جو تعداد میں زیادہ ہوتی ہیں۔ جن مقامات پر مالکانِ اراضی چارہ میں سے کوئی حصّہ طلب نہیں کرتے۔ وہاں مزارعین چارہ پیدا کرنے پر زیادہ محنت صرف کرتے ہیں۔ اور دودھ دینے والے جانور بھی زیادہ تعداد میں رکھتے ہیں۔

چھٹا سوال مکانوں کے متعلق تھا۔ اس کے متعلق سب نے متفق اللفظ ہو کر لکھا ہے۔ کہ زمینداروں کے مکان زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ انکی تعمیر بھی اچھی طرح کیجاتی ہے۔ مکانوں کی تعمیر میں جو لکڑی استعمال ہوتی ہے۔ وہ بھی باعتبار نوعیت بہتر ہوتی ہے۔ یعنی چیل اور دیودار کی لکڑی سے مکان تعمیر کئے جاتے ہیں۔ مزارعین کے مکان ادنےٰ قسم کی مقامی لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔

نوآبادیوں میں یہ فرق زیادہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ گویا مختصر طور پر یوں کہنا چاہئے۔ کہ مالکانِ اراضی مکان تعمیر کرتے ہیں۔ اور مزارع محض دھوپ اور بارش سے پناہ لینے کے لئے ایک جھونپڑا سا بنا لیتا ہے۔ ایک دو رپورٹوں میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ مزارعین اپنی سکونتی مکانات کی اِصلاح کر رہے ہیں۔ اِس کی وجہ کچھ تو یہ ہے۔ کہ اب انہیں پیداوار کی قیمت زیادہ ملنے لگی ہے اور کچھ یہ سبب ہے۔ کہ زراعت کے سوائے دوسرے ذرائع سے بھی وہ کچھ روپیہ کما لیتے ہیں۔

ساتواں سوال یہ تھا۔ کہ آیا مزارعین اور مالکانِ اراضی کی حالت بچوں کی تعلیم کے بارے میں مختلف ہے۔

اس کا جواب یہ تھا۔ کہ بڑے بڑے زمینداروں میں مزارعین کی نسبت بچوں کی تعلیم دلانے کا جذبہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن مزارعین اور چھوٹے چھوٹے مالکانِ اراضی کے مابین اس بارہ میں چنداں فرق نہیں۔ مزارعین کے لڑکے پرائمری سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کرتے۔ کیونکہ مزارعین تو اپنے لڑکوں سے کھیتی باڑی میں مدد لیتے ہیں۔ اور بڑے بڑے زمیندار مزدوروں سے خدمت لیتے ہیں۔ صرف ایک رپورٹ میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ زمیندار بچوں کو تعلیم دلانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ کہ زمین کی بدولت ہی انکی اولاد اپنی بسر اوقات کر سکتی ہے لیکن کسی رپورٹ میں یہ نہیں بیان کیا گیا۔ کہ مزارعین میں بھی یہ میلان پایا جاتا ہو۔ کہ انکے فرزند تعلیم حاصل کریں۔ تاکہ اراضی پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ اور تعلیم حاصل کرکے کچھ کمائیں۔ اور اپنے کنبے کی پرورش کرسکیں۔ زراعت پیشہ لوگوں کے لئے ابتدائی تعلیم مفت ہے۔ اس لئے خرچ کا تو اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا یہ امر کہ اس صورت میں بھی مزارعین اپنے بچوں کو سکول کیوں نہیں بھیجتے۔ تو اس وجہ کچھ تو اس کی سستی اور جہالت ہے۔ جو محض ان کی تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ اور بڑا سبب یہ ہے۔ کہ وہ اپنی اولاد سے مویشی کی رکھوالی کا کام لینا چاہتے ہیں۔

آٹھویں سوال میں یہ پوچھا گیا۔ کہ مزارعین اور مالکانِ اراضی کے بچوں کے طریقِ حصولِ معاش میں بھی کوئی اختلاف ہے۔ یعنی آیا وہ کاشتکاری کرتے ہیں۔ یا کوئی دوسرا کاروبار اختیار کر رکھا ہے کسی شہر میں نقل مکان کر لیا ہے۔ یا ملازمت کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو جوابات موصول ہوئے ہیں۔ ان سے قطعی طور پر کوئی بات معلوم نہیں ہو سکتی۔ دونوں زراعت کرتے ہیں۔ البتہ بڑے بڑے مالکانِ اراضی کے تعلیم یافتہ فرزند ملازمت تلاش کرتے ہیں۔ اور مزارعین کے لڑکے جنہیں زیادہ آزادی حاصل ہے۔ نوآبادیوں میں جا بستے ہیں۔ زمیندار تو زمین کو کسی طرح چھوڑ نہیں سکتا۔ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ مزارع مجبور ہو کر شہر کو چلا جائے۔ اور وہاں محنت و مشقت کرکے پیٹ پالے۔ اس کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ زیادہ کد و کاوش سے تحقیقات کرکے

اعداد و شمار فراہم کئے جائیں۔ باقی رہا یہ امر کہ مزارعین اور زمینداروں میں سے زیادہ مقروض کون ہے۔ کس کا معیارِ زندگی بلند ہے۔ تو اُس کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ مالکانِ اراضی کو اپنی معاشرتی حیثیت کے مطابق زیادہ مصارف کا متحمل ہونا پڑتا ہے۔ لباس اور خوراک کے اعتبار سے انکا معیار زندگی مزارعین سے بہتر ہے۔ مزارعین دودھ اور گھی[1] کو اپنے استعمال میں نہیں لاتے بلکہ فروخت کر دیتے ہیں۔ اور مالکان اراضی اِن چیزوں کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں بعض ذاتوں میں تو یہ فرق بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن بعض ذاتوں مثلاً ارائیں اور گوجر وغیرہ میں کم ہے۔ چونکہ مزارع کی کوئی ساکھ نہیں ہوتی۔ اِس لئے وہ کفایت شعاری پر مجبور ہو جاتا ہے وہ مقدمہ بازی اور عیش و عشرت میں روپیہ صرف نہیں کرتا۔ زیادہ محنت سے کام کرتا ہے۔ اور مصارف کے بارے میں بہت احتیاط سے کام لیتا ہے۔ ہر جگہ مالکانِ اراضی کے قرض کا اوسط مزارعین کے قرض کے اوسط سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اُنکی ساکھ زیادہ ہے۔ جو مزارعین شہروں کے قریب رہتے ہیں۔ وہ فرصت کے اوقات میں چھوٹے موٹے متفرق کام بھی کر لیتے ہیں۔ اور اُنکی حالت زمینداروں سے بہتر ہے۔ کیونکہ زمینداروں کو اپنے وقار کا بھی خیال رہتا ہے۔ اور انہیں مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ کہ زراعت کے سوائے کوئی دوسرا کام بھی کر لیں۔

اِس سلسلہ کا دسواں اور آخری سوال یہ تھا۔ کہ آیا مزارعین بھی انجمن ہائے امداد باہمی میں مالکان اراضی کی طرح بکثرت شریک ہو رہے ہیں۔ اِس کا جواب ملا۔ بڑے بڑے مالکانِ اراضی تو ان مجالس میں زیادہ شریک نہیں ہوتے۔ متوسط درجہ کے زمیندار البتہ بکثرت شریک ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اُن کے سر پر قرض کا بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ جو بعض اوقات اُنکی شرکت میں سدِ راہ بنجاتا ہے۔ مزارعین کا اس میں بہت کم نقصان ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ انہیں ساہوکاروں سے قرض نہیں ملتا۔ اس لئے وہ قرض کے بغیر بھی گذارہ کر سکتے ہیں۔

[1] مسٹر ایمرسن نے لکھا ہے کہ جوں جوں خوشحالی میں ترقی ہو رہی ہے۔ مزارعین کا میلان گھی بیچنے کی جانب سے کم ہوتا جاتا ہے۔ گھی کی قلت کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے۔

بعض ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں۔ کہ زمینداروں نے مزارعین کو مجالسِ امدادِ باہمی میں مساوی حیثیت سے شریک کرنا گوارا نہیں کیا یا اگر وہ اِن میں شریک بھی ہوئے۔ تو انہیں قرض نہیں دیا۔ بعض حالات سے یہ ثابت ہوا ہے۔ کہ زندگی کے متعلق مزارع کا زاویۂ نگاہ نہایت تنگ ہے۔ اور وہ امدادِ باہمی کے مقاصد اور فوائد کو پوری پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔ وہ گاؤں کی زمین میں حصہ دار نہیں۔ اِس لئے بعض اوقات وہ یہ نہیں سمجھ سکتا۔ کہ سوسائٹی میں وہ زمیندار کی برابری کیونکر کر سکتا ہے۔

نوآبادیوں کی طرح جن جن مقامات پر مزارعین مستقل حیثیت سے دیہات میں آباد نہیں ہوئے وہاں انہوں نے مجالس امداد باہمی میں شرکت نہیں کی۔ اُن اضلاع میں جو قدیم ایام سے آباد چلے آتے ہیں۔ اور جہاں امداد باہمی کی تحریک استقلال حاصل کر چکی ہے۔ مزارعین مجالس مذکور میں بکثرت شریک ہوتے ہیں۔ لیکن شمار میں اُن کا تناسب مالکانِ اراضی سے کم ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں۔ کہ جوں جوں اِس تحریک کے اصولوں کو زیادہ لوگ سمجھتے جاتے ہیں۔ مزارعین زیادہ تعداد میں شریک ہو رہے ہیں۔

حاصل یہ کہ صوبہ کے نصف سے زیادہ رقبہ مزروعہ کی کاشت مزارعین کرتے ہیں۔ اِس رقبہ میں متواتر اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ مزارعین زمین میں فصل اُگنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی جانب زمینداروں کی نسبت کم توجہ کرتے ہیں۔ ان کی نسبت کم ہل چلاتے ہیں کم کھاد ڈالتے ہیں۔ اور کم آلاتِ کشاورزی استعمال کرتے ہیں۔ وہ جو فصل پیدا کرتے ہیں۔ وہ کم قیمت ہوتی ہے۔ ایسی فصل پیدا کرنے کی جانب توجہ نہیں کرتے۔ جس کے لئے زمین پر سرمایہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کھیتوں کی اصلاحوں کی کوشش نہیں کرتے۔ ادنےٰ درجہ کے مویشی رکھتے ہیں، زیادہ دیر تک رہنے والے پودے نہیں اُگاتے۔ درختوں پر کوئی توجہ صرف نہیں کرتے۔ وہ اپنے بچّوں کی تعلیم میں چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی سے بھی زیادہ غفلت برتتے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک محسوس نہیں کیا۔ کہ زراعت کو زیادہ منفعت بخش بنانے کے لئے تنظیم کس قدر ضروری ہے۔ غلّہ کی صورت میں رقمِ اجارہ ادا کرنے کا طریقہ جسے بٹائی کہتے ہیں۔ اُن کے اِس رجحانِ طبع کو زیادہ قوی کرنے کا باعث ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے زمین میں باری باری مختلف

اجناس کی کاشت نہیں کی جاتی - اور یہ طریقہ آہستہ آہستہ نقد لگان ادا کرنے کے دستور کو مٹا رہا ہے۔

اِس نقص میں اِس وجہ سے اور اضافہ ہو رہا ہے - کہ زمین کی قیمت میں رقم اجارہ کی نسبت زیادہ سرعت سے گراں ہوتی چلی جا رہی ہے - اِس طرح مزارعین کے لئے اوّل تو مالکِ زمین بننا ہی ناممکن ہو گیا ہے - اور اگر بفرضِ محال وہ اراضی کے مالک بن بھی جائیں - تو یہ چیز اُن کیلئے منفعت بخش نہیں - مزید برآں اراضی کی رہن و فروخت بکثرت ہو رہی ہے - اور ایسے کھیتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو اجارہ پر دیدی گئی ہیں -

اِس خرابی کی وسعت کو صحیح طور پر ذہن نشین کرا دینا ناممکن ہے - کیونکہ بکثرت مزارعین ایسے ہیں جو بعض قطعاتِ اراضی کے مالک بھی ہیں - جن کا مبادلہ انہوں نے دوسرے زمینداروں سے کر لیا ہے - اور بعض ایسے ہیں - جو اپنی رہن شدہ زمینوں کی کاشت کر رہے ہیں - مزید برآں یہ بھی معلوم نہیں - کہ کس قدر مزارعین ایک قطعۂ اراضی کو چھوڑ کر دوسرے قطعۂ اراضی کی شروع کر دیتے ہیں - یا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں انتقال مکان کرتے ہیں - اور نہ یہ معلوم ہے - کہ کتنے مزارعین ایسے ہیں - جو ایک ہی قطعۂ زمین کی کاشت مستقل طور پر کئے چلے جاتے ہیں[۲] - اجارہ داری بجائے خود بُرائی نہیں - انگلستان میں اکثر کھیت مختصر عرصہ (ایکسال)

---

[۱] بٹائی کا طریقہ وسیع کاشت کے لئے موزوں واقع ہوا ہے - کیونکہ وہ محنت کا زیادہ سے زیادہ خام معاوضہ ہے - یہ طریقہ قانون تقلیل حاصل کی وجہ سے عمیق کاشت کا مؤید نہیں -

[۲] ریاستہائے متحدہ امریکہ کی اجارہ داری کے متعلق ذیل کا بیان "انٹرنیشنل ریویو آف اگریکلچرل اکنامکس" بابت اپریل ۱۹۱۷ء سے لیا گیا ہے - اس کی وجہ سے نہایت دلچسپ موازنہ ہو جائیگا -

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں مزارع ایک کھیت پر تین سال سے زیادہ عرصہ تک نہیں رہتا - لگان بصورت جنس ادا کرنیوالے مزارعین اکثر نقد لگان دینے والوں سے زیادہ دیر تک رہتے ہیں - باقی رہے مالکانِ اراضی تو ایک مالکِ اراضی اپنی زمین میں سولہ سال تک کاشت کرتا رہا تھا -

امریکہ کے کھیتوں کی قیمت نہایت سرعت سے بڑھ رہی ہے - اِس لئے اُن کی فروخت بھی (باقی بر صفحہ ۱۷۹)

کے لئے مزارعین کو اجارہ پر دیدیئے جاتے ہیں - اور مزارعین کی یہ خواہش نہیں ہوتی - کہ وہ زیادہ عرصہ کیلئے انہیں اجارہ پر لیں - سکاٹ لینڈ میں اجارہ کی مدت سات سال سے اُنیس سال تک ہوتی ہے - اکثر زمینیں ۱۹ سال کیلئے اجارہ پر دے دی جاتی ہیں - ویلز میں بھی عام پر سال بھر کیلئے اراضی اجارہ پر دی جاتی ہے - ملکیت زمین طویل عرصہ کے اجارہ اور سال بھر کے اجارہ

(۱۷۰ کا بقایا) ہو رہی ہے - اکثر زمینوں کے مصرف میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے - کیونکہ اُنکے مالک تبدیل ہو جاتے ہیں جب تک کوئی اراضی قابلِ فروخت مالکِ اراضی کے قبضہ میں رہے گی - وہ متاجرین کو تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے زمین دیتا رہے گا - تھوڑے عرصہ کے اجارہ کا باعث یہ ہے - کہ مزارعین بھی مالکان اراضی بن رہے ہیں - جو لوگ ساری عمر زراعت کے پیشہ میں گزار دیتے ہیں - ان میں سے اکثر کسی نہ کسی طرح مالک اراضی بن جاتے ہیں - اس لئے مزارعین کا ایک کھیت میں تھوڑے عرصہ کے لئے کام کرنا درحقیقت بہت حد تک اسی وجہ سے ہے کہ مزارعین برابر ترقی کر کے مالک اراضی بنتے چلے جا رہے ہیں - اجارہ داری کے حالات و اسباب علی الخصوص زراعت کی نوعیت کا قدرتی نتیجہ ہے - مزارع کے پاس مویشی نہیں ہوتے، وہ درخت نہیں لگاتا - وہ زمین کو زرخیز بنانے یا اسکی گہری جتائی کرنے پر روپیہ صرف نہیں کرتا - اُسکی خواہش یہ ہے - کہ سال بھر کے اندر اندر ہی وہ جنس بوئے - کاٹے، اور اُسے فروخت بھی کر لے - اجارہ داری اُن علاقوں میں زیادہ ہے - جہاں کپاس، غلہ اور گیہوں کی کاشت ہوتی ہے - مزارع خود کاشت زمینداروں سے زیادہ غلہ پیدا کرتا ہے لیکن مویشی کے لئے زمینداروں کی نسبت کم چارہ پیدا کرتا ہے - وہ دودھ، مکھن اور پھلوں کی پیداوار کی جانب متوجہ نہیں ہوتا - لیکن تمباکو اور دوسری سبزیوں کی پیداوار کیجانب زیادہ توجہ کرتا ہے - کیونکہ اُنکے لئے زیادہ سامان کی ضرورت نہیں - اور محض چند مہینے صرف ہوتے ہیں - لگان میں اسطرح جلد اضافہ نہیں ہوتا جسطرح زمین کی قیمت فروخت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے - اسلئے زمین خریدنے کی نسبت اُسے لگان پر لے لینا زیادہ ارزاں ہے - مزارع کو جو آمدنی محنت کیوجہ سے ہوتی ہے - وہ خود کاشت زمینداروں کی آمدنی سے زیادہ ہوتی ہے - امریکہ میں زمیندار اور مزارع دونو مستقل زراعت میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے - مالک اراضی کو یہ توقع رہتی ہے - کہ وہ زمین فروخت کر دیگا - اور مزارع یہ سمجھتا ہے - میں کبھی نہ کبھی اسے چھوڑ کر چلا جاؤنگا - مالک اراضی فی ایکڑ جتنا غلہ پیدا کرتا ہے - مزارع بھی اسیقدر غلہ پیدا کر لیتا ہے شاذ ہی ایسا ہوا ہے کہ مزارع نے زمین کی اصلاح و ترقی کی خواہش کی ہو - مزارعین میں تنظیم بہت کم ہے وہ ایک مفلس جماعت کا ن[illegible]

۱؎ زراعت کے شاہی کمیشن کے سامنے سکاٹ لینڈ کے ایک گواہ نے ۱۹۱۹ء میں بیان دیا تھا - آپ ایسے لوگ سے جو

کی موافقت اور مخالفت میں جو دلیلیں دی جاتی ہیں۔ وہ دلچسپ ہیں۔ اِس صوبہ میں جہاں یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اجارہ داری کے نقائص کا سیدھا سادہ علاج اِس قسم کا مسودہ بیع اراضی ہے۔ جس نے آئرلینڈ کے مزارعین کو مالکانِ اراضی بنادیا تھا۔ یہ ضروری ہے۔ کہ اِن دلائل پر غور و خوض کیا جائے یہ واضح رہے۔ کہ آئرلینڈ میں اجارہ داری کے مسئلہ کو غیر ملکی مالکانِ اراضی نے جنہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں تھا پیچیدہ بنا دیا تھا۔ اِس مسئلہ کی پیچیدگیوں میں اُن کسانوں نے اضافہ کر دیا جو عرصہ سے زمین پر قابض تھے۔ اور اِس لئے اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھتے تھے۔ اور اور یہ خیال کرتے تھے۔ کہ انہیں حقوق سے محروم کرنے میں بے انصافی سے کام لیا گیا ہے۔ وہاں لوگوں نے اجارہ داری کا علاج کرنے کے لئے اِس امر کا مطالبہ کیا تھا۔ کہ رقمِ اجارہ مناسب ہو۔ حقیقت کی تعیین کر دی جائے۔ اور حقوقِ اجارہ داری کے بیع و شریٰ کی اجازتِ عام دیدی جائے۔ چنانچہ یہ مطالبہ قبول کر لیا گیا۔ برطانیہ کے کسان حقیقت کی تعیین کے طالب نہیں۔ بلکہ اُن کی خواہش اِس قدر ہے۔ کہ اُن کی حقیقت کو محفوظ کر دیا جائے۔ امریکہ کے کسان ہمیشہ سے یہی سمجھتے رہے ہیں۔ کہ جن زمینوں کی وہ کاشت کرتے ہیں۔ اُنکا انہیں ملکیت میں رہنا بہتر ہے کیونکہ اوّل تو اضافہ قیمت زمین کو ہی کاشتکاری کی منفعت کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ مزید برآں اُنکے سامنے زمین کو اجارہ پر دینے کے متعلق کوئی معقول نظام نہیں پیش کیا گیا۔ پروفیسر کارور لکھتا ہے کہ ہم نے اجارہ داری کے مسئلہ کا حل کرکے کوئی ایسا نظام قائم کرنے کی کوشش نہیں کی جس میں ترقی پسند اور دُور اندیش اپنے لئے ایک کشش محسوس کرتا ہو مختصر عرصہ کے اجاروں کا نتیجہ یہی ہوگا۔ کہ اقدام کا جذبہ اور مسابقت کی خواہش دب جائیگی۔ چونکہ زمیندار کے مفاد کی حفاظت کا پُورا پُورا انتظام نہیں۔ اِس لئے اُس کا اپنی زمین کو طویل اجارہ پر دے دینا خطرناک ہے لیکن لطف یہ ہے۔ کہ دنیا میں بہترین زراعت وہیں ہو رہی ہے۔ جہاں اجارہ داری کا طریقہ رائج ہے۔ (انگلستان میں) اگر زمین کی قیمت کم ہونے لگے۔ تو یہ ظاہر ہے۔ کہ زمین کی

(صفحہ ۱۷۹ کا بقیہ) عقل و دانش اور سرمایہ رکھتے ہوں اُس وقت تک زراعت پر اپنی تمام کوششیں مرکوز کر دینے کی توقع نہیں کر سکتے جب تک کہ انہیں یہ یقین نہ دلائیں۔ کہ اتنے سالوں کے عرصے میں زراعت سے نفع ہوگا۔ سوال ہے ہے کہ اِس پر نسپلز آف رورل اکنامکس صفحہ ۲۲۶۔

ملکیت میں خسارہ ہی خسارہ ہے - انگلستان کے کسان اِس خطرہ کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں - برطانیہ میں آجکل زمین فروخت کی جا رہی ہے - اور کسانوں اِس امر کیجانب مائل کیا جا رہا ہے - کہ وہ اراضی خرید خرید کر کھیتوں کے مالک بن جائیں - وہ زمین کی ملکیت کے خواہشمند تو نہیں - البتہ اپنے حقوق کاشتکاری کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں - اِس لئے محض حقیقت کی حفاظت کے لئے زمین کے مالک بن جاتے ہیں - اس کا نتیجہ یہ ہوا - کہ بہتیرے کسان زراعت کو ترقی دینے کے خیال سے اپنا سارا جمع جتھا زمین پر لگا کر اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہیں - لیکن وہ ذخائر جمع کرنے اور زراعت کی دوسری ضروریات فراہم کرنے پر روپیہ خرچ نہیں کرنا چاہتے - انگلستان کی طرح جس ملک میں رقم اجارہ قیمت زمین کے مقابلہ میں بہت تھوڑی، اور اس کی حیثیت ادنٰے شرح سود جیسی ہو - تو وہاں ایک ذی استعداد کسان کیلئے بہتر ہے - کہ اجارہ ادا کرتا رہے - اور اپنا سرمایہ مویشی اور مشینوں کی خرید پر لگا دے - جن سے اُسے زیادہ[1] فائدہ ہو سکتا ہے - پنجاب میں جہاں زراعت کی اصلاح و ترقی پر بہت کم روپیہ صرف کیا جاتا ہے - یہ محسوس کرنا مشکل ہے - کہ انگلستان میں زمین کی مستقل ضروریات مثلاً عمارت، نالیوں - جنگلے وغیرہ پر تو زمیندار روپیہ صرف کرتا ہے - پھر بھی کسان اپنی جیب سے فی ایکڑ جس قدر رقم صرف کر دیتا ہے - اُس کا اوسط پندرہ پونڈ سے پچیس پونڈ تک سے (۱۵۰ روپیہ سے ۲۵۰ روپیہ) تک ہے -

انگلستان میں جو کسان زمین کے مالک ہیں اُن کے خلاف یہ دلیل پیش کیجاتی ہے - کہ زمین کا مالک ہونے کیوجہ سے اُن کے کھیتوں کی حدود معیّن ہو گئی ہے، اور یہ صحیح بھی ہے کیونکہ ایک مزارع خواہ وہ ایک چھوٹے سے قطعہ اراضی مثلاً ایک سو ایکڑ زمین میں کاشت کرنا شروع کرے جب خوشحالی حاصل کریگا - تو وہ زمین کو ۲۰۰ ایکڑ تک بھی وسیع کر سکتا ہے -

---

[1] ملاحظہ ہو - کارورمنٹ ۲۳ زراعت کے شاہی کمیشن کے سامنے حقوقِ اجارہ کی حفاظت، ماہیت، اور ضرورت کے متعلق جو شہادت دی گئی تھی - اُس کا ایک مختصر خلاصہ اوراق آئندہ میں دے دیا گیا ہے -

اگر اُس نے اپنی قابلیت اور ہمت کی بدولت کچھ روپیہ بچا لیا ہے۔ تو اُسے قدرتاً یہی خواہش ہوگی۔ کہ اپنے کاروبار میں ہی اُسے صرف کرے۔ اِس طرح وہ کچھ اور زمین لے لیگا۔ گویا نظامِ اجارہ داری ایک زینہ ہے۔ جس سے ایک صاحبِ ہمّت اور محنتی کسان ترقی کر کے بڑا کسان بن سکتا ہے۔

باقی رہا یہ امر کہ اجارہ داری طویل عرصہ کے لئے ہو یا قلیل زمانہ کیلئے۔ تو ان دونوں کی حمایت میں جتنی دلیلیں پیش کیجائینگی۔ اُن کا دارو مدار اِس امر پر ہوگا۔ کہ آیا حقیقت کی حفاظت کا سامان مہیا ہو گیا ہے یا اس کے متعلق کسی قسم کا وعدہ کر لیا گیا ہے۔ سکاٹ لینڈ میں زمین کو طویل عرصہ کے لئے اجارہ پر دینے سے جقدر فائدہ ہُوا اتنا انگلستان میں قلیل زمانہ کے اجارہ سے نہیں ہُوا۔ گذشتہ تیس سال سے عام رُجحان اِس امر کی جانب ہے۔ کہ زمین کی زائد ترجیح ہی کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن زمیندار اور مزارع کے جو عمدہ تعلقات قائم ہیں۔ وہ اس رُجحان کے مزاحم ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہاں یہ کیفیت ہے۔ کہ اگر مزارع اچھا ہو۔ تو زمیندار اجارہ کی تجدید پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ انگلستان میں جو طریق اجارہ داری رائج ہے۔ اُس کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ کہ اُس میں بہت لچک اور توڑنے مڑنے کی صلاحیت ہے۔ اس کے رُو سے کسان اس امر پر مجبور نہیں۔ کہ اگر غلہ کا نرخ کم ہو جائے۔ جب بھی وہ بدستور سابق پیش قرار لگان ادا کرتا رہے۔ مزید برآں مزارع ہمیشہ زمیندار سے منصفانہ اور شفقت آمیز سلوک کی توقع کر سکتا ہے۔ انگلستان کے مزارعین کا بیان ہے۔ کہ اجارہ زیادہ دیر کے لئے ہو تو مزارع کو زمین کی اصلاح و ترقی پر روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں۔ کہ وہ جس قدر روپیہ صرف کریں۔ اُس کا معاوضہ بھی انہیں مل جائے۔

ہر دو صورتوں میں پرانی وضع کے زمینداروں کا احساس ذمہ داری کارفرما نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ نئے زمیندار جو اب اراضی خرید رہے ہیں۔ بالکل تجارتی نگاہ رکھتے ہیں۔ اِس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ مزارع کی حفاظت کا بہتر سامان تلاش کیا جائے۔ زرعی اراضی کے متعلق جو قوانین منظور ہوئے ہیں۔ اُن کا مقصد یہ تھا۔ کہ

کہ حقیقت کی حفاظت کی جائے۔ لیکن اُن کے مقصد میں حقیقت کی تعیین بلکہ رقم اجارہ کی تعیین داخل نہیں تھی۔ اِس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ زمیندار کو اپنی زمین پر قبضہ کا اختیار حاصل ہے لیکن مزارع زمین کی اصلاح و ترقی کیلئے جس قدر محنت کرتا ہے۔ اور پھر زمیندار کے تجدید اجارہ سے انکار کر دینے کی صورت میں اُس بیچارے کو جس قدر پریشانی ہوتی ہے۔ قانون اُس کا معاوضہ بالکل نہیں دلاتا۔ کسانوں کے نمائندے تخمیناً ایک سے چار سال تک کی رقم اجارہ کو کسان کی محنت کا معاوضہ قرار دیتے ہیں۔ اجارہ کے متعلق معقولیت پسند کسانوں کا خیال ہے۔ کہ اس کا انحصار نرخ پر ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ نرخ کم ہو جائے۔ تو رقمِ اجارہ میں بھی تخفیف کر دی جائے۔ نرخ زیادہ ہو جائے۔ تو رقمِ اجارہ کو بڑھا دیا جائے۔ ذیل میں ہم اِس مسئلہ پر کاشتکار کے زاویہ نگاہ سے بحث کرتے ہیں۔ اِس بارے میں زمیندار کی رائے چنداں مختلف واقع نہیں ہوئی۔ لیکن یہ امر قابلِ غور ہے۔ کہ ایک مسلم الثبوت مبصر اِس خیال سے اختلاف ظاہر کرتا ہے کہ اگر مزارع کو حقیقت کی حفاظت کا یقین دکھا دیا جائے۔ تو زراعت میں تدریجی اصلاح و ترقی ہونے لگے گی۔ اُس کی رائے میں زمین کے معاملے میں کسانوں کے درمیان مقابلہ نہ ہو۔ اور مسابقت کا خیال اُنھیں حوصلہ افزائی نہ کرے۔ تو رقومِ اجارہ کم ہو جائیں گی۔ اور مزارعین تھوڑے صرف سے کافی آمدنی حاصل کر لیا کرینگے۔ مسابقت کا جذبہ[1] اُن میں اضافہ کرتا ہے کسانوں کی ہمت اور حوصلہ افزائی کو ترقی ہوتی ہے۔ اور عمدہ طریق پر کھیتی باڑی کیجاتی ہے اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اجارہ داری کے اثرات و نتائج سے نجات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ یہ نہیں۔ کہ اجارہ داری کو مٹا دیا جائے۔ اور تو اور اگر سال بھر کے لئے زمین اجارہ پر دیدی جائے۔ جب بھی اُس میں اعلیٰ طریقہ پر کاشت ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ یا تو زمیندار اپنی ذمہ داریاں جنکا تعلق زمین اور کاشتکار سے ہے۔ محسوس کرے۔ یا قانون مزارع کو فرض شناس زمیندار کے خصائص طبیعت سے محفوظ رکھے۔ مزارع اور زمیندار میں اشتراکِ عمل ہونا ضروری ہے۔ اور ایک آمریکن اہلِ قلم نے اسی حقیقت کو ملحوظ رکھ کر لکھا ہے۔ کہ قانون کی

[1] "ایگریکلچر آف دی وارنسٹ" مصنفہ مسٹر ... [illegible]

رُو سے اجارہ داری کا کوئی عمدہ نظام قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے خیال کو اس امر سے تقویت ہوتی ہے۔ کہ قانونِ اراضی میں متواتر ترمیمیں کیجا چکی ہیں۔

مندرجہ بالا بحث میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ اُنہیں اگر پنجاب کے نظامِ اجارہ داری پر منطبق کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ موجودہ حالات و اسباب کا بہترین علاج یہ ہے۔ کہ مزارعین میں مسابقانہ اور حریفانہ سعی و ہمّت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اُن کے قلب میں یہ خیال پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ مزارعین کے لئے ضروری نہیں۔ کہ وہ آٹھ ایکڑ یا بارہ ایکڑ اراضی پر اکتفا کرے۔ بلکہ اُس کے پاس پچاس ایکڑ یا سو ایکڑ زمین ہونی چاہئے۔ اور وسیع رقبہ پر قبضہ کرنے کے لئے اگر دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قیمت بھی دینا پڑے۔ تو اُس میں تامّل نہ کیا جائے۔ اگر رقم اجارہ زیادہ ہے، تو زمین پر زیادہ محنت، ہنرمندی، اور عقل و دانش صرف کی جائے۔ زرعی کالج کے گریجویٹ ملک کی سب سے بڑی خدمت یہ کر سکتے ہیں۔ کہ اس تحریک میں رہنمائی کریں۔ اور اُن لوگوں کو اراضی سے بیدخل کر دیں۔ جو کاشت کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ عذر کہ اگر ایسا کیا گیا۔ تو آبادی کا ایک حصّہ گرفتارِ مصیبت ہو جائے گا۔ چنداں قابلِ غور نہیں۔ اکثر لوگ جو اِس وقت زراعت میں مصروف ہیں۔ زمین سے محض قوتِ لایموت حاصل کر رہے ہیں۔ اُن کے لئے غالباً یہ بہتر ہوگا۔ کہ اُن بیرونی اشخاص کو جو مزدوری کر رہے ہیں، بے دخل کر کے اُن کی جگہ لے لیں۔ یا جدید صنعتی تحریک میں شامل ہو جائیں، کیونکہ اِس تحریک نے یہ فرض کر لیا ہے۔ کہ دیہات میں ایک ایسی جماعت موجود ہے۔ یا پیدا کیجا سکتی ہے۔ جو وسیع رقبوں کی کاشت میں محنت صرف کرنے پر آمادہ ہے۔ فی الحال تو عام رجحان اِس امر کی جانب ہے۔ کہ اگر ایک چھوٹے سے رقبے میں عمیق کاشت کر کے اِس قدر فائدہ حاصل کیا جا سکے۔ جو ایک وسیع رقبے کی کاشت سے ہوتا ہے۔ تو رقبہ مزروعہ میں تخفیف کر دی جائے۔ بلند معیار کی زندگی بسر کرنے کی خواہش اِس رجحان کی مزاحمت

لے "کنسٹرکٹو رورل سوشیالوجی" مصنفہ جلیٹ صفحہ ۲۲۳ +

کرے گی۔ لیکن ابھی زمانہ دُور ہے جب مختلف الاستعداد کسانوں میں مسابقت کا حقیقی جذبہ پیدا ہوگا۔ اور جو لوگ زراعت کی اعلیٰ قابلیت نہیں رکھتے انہیں بھی اپنے طریقوں کی اصلاح کا ولولہ پیدا ہو جائیگا۔

موجودہ نظام میں ایک بڑا نقص یہ ہے۔ کہ کئی کئی گھنٹوں تک مسلسل سخت مشقت کرنے کی بجائے کئی کئی دنوں تک تھوڑے تھوڑے عرصہ تک محنت کر کے کام ختم کیا جاتا ہے۔ اگر صحیح طور پر ترقی حاصل کرنا مقصود ہے۔ تو محض زمین کے استعمال کے بارہ میں ہی تغیر و انقلاب ضروری نہیں۔ بلکہ رائے عامہ میں بھی تبدیلی پیدا کی جائے۔ کہ سال بھر میں کتنے عرصہ تک محنت کی جائے۔ ہندوستانی کسانوں کو اِس بارے میں بے مثال خصوصیت حاصل ہے۔ کہ جس زمانہ میں وہ اپنی زمین پر مصروف کار نہیں ہوتا۔ کوئی دوسرا کام کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کی کوشش نہیں کرتا۔

پنجاب کی اقتصادی تاریخ میں یہ خصوصیت نہایت نمایاں نظر آتی ہے۔ کہ اراضی کی قیمت نہایت تیزی سے گراں ہوتی جا رہی ہے۔ قیمتوں کی اس گرانی نے صوبہ کی نشوو ارتقا پر ایک نمایاں اثر ڈالا ہے۔ اس کی وجہ سے کسان کیطرح قانون دان اور دلال بھی اراضی کی اصلاح و ترقی پر روپیہ صرف کرنے کی بجائے مزید اراضی کی خرید پر روپیہ خرچ کر رہے ہیں۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ پیداوار میں اضافہ ہو جائے تو اسے اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن اراضی کی حیثیت بڑھ جائے تو اسے بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اراضی کی قیمت میں ہونے والے اضافہ کا اندازہ لگا کر جوا کھیلنے کو ترقی ہو رہی ہے۔ اسکی روک تھام کے لئے خاص قوانین کے نفاذ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو اسے بھی ایک سیاسی شکائت بنا لیا گیا۔ اور کہا گیا۔ کہ جو لوگ اسوقت اراضی نہیں خرید سکتے جس وقت اس کی حیثیت ارزاں ہوتی ہے۔ انہیں ان قوانین و احکام سے نقصان پہنچ رہا ہے۔ اراضی کی قیمت میں روز افزوں اضافہ کی بدولت کسانوں کی ساکھ تو آسانی سے قائم ہو گئی۔ لیکن چونکہ ان کی تعلیم ناقص ہے۔ اس لئے وہ نہیں سمجھ سکتے۔ کہ اس سہل الحصول ساکھ میں کیا کیا خطرات ہیں۔ اس کی وجہ مزارعین کی تعداد بڑھ گئی۔ اور مزارع کا ترقی کر کے مالک اراضی بن جانا دشوار ہو گیا۔ لیکن یہ چیز صوبہ کی اقتصادی پستی کا باعث نہیں کیونکہ اس کی وجہ سے اراضی پر کئی کروڑ روپیہ لگایا گیا ہے۔ اور اگر اراضی کی قیمت میں مزید اضافہ کی امید سدّ راہ نہ ہوتی۔ تو اس روپیہ سے کوئی منفعت حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا۔ کہ اراضی پر روپیہ لگانے کا شوقِ عام ہو گیا۔ لیکن اس سے بہ حیثیت مجموعی زراعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

یہ موضوع اس قدر اہم ہے۔ اور اس کے متعلق ایسی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ کہ اس پر

تفصیلی بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پنجاب میں یہ چیز بہت نئی ہے۔ آج اراضی پر لوگوں کو مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔ لیکن انگریزوں کے عمل دخل سے پہلے جو لوگ اس ملک پر حکومت کرتے تھے۔ اُنکے عہدِ حکومت میں حقوق کی دو خاص صورتیں تھیں۔ ایک تو حکومت کیجانب سے مالگذاری جمع کرنیکا حق، دوسرا کسی قطعہ اراضی پر قبضہ رکھنے کا حق جسکے لئے یہ شرط تھی۔ کہ اِس قطعۂ اراضی کی مالگذاری حکومت کو یا کسی زمیندار کو جسے مالگذاری جمع کرنیکا حق ہوگا۔ ادا کیجائیگی۔[1]

جن لوگوں کو پہلی قسم کا حق حاصل تھا۔ انہیں انگریزی سلطنت کے ابتدائی دور میں اعلیٰ درجہ کے مالکانِ اراضی سمجھا گیا۔ (مثلاً اودھ کے تعلقدار) اِسطرح گویا کاشت کار ادنیٰ درجہ کے مالکانِ اراضی تصور کئے گئے۔ اور باقی کو پورے پورے مالکانِ اراضی تسلیم کرلیا گیا مثلاً جیسے بنگال کے بڑے بڑے زمیندار) اسطرح گویا ان لوگوں کو جو زمین میں خود کاشت کرتے تھے، مزارع کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ محولہ بالا اقسام میں سے پہلی قسم کا حق زمین سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ حق دراصل اس مالگذاری پر تھا۔ جو زمین سے حاصل کیجاتی ہے۔ کاردار یا مالگذاری وصول کرنے والے زمیندار جس قدر روپیہ وصول کرتے تھے۔ اُس میں سے زیادہ خود رکھتے تھے۔ اور حکومت کے خزانے میں صرف اُس کا

---

[1] پروفیسر کیل نے اپنی دلچسپ کتاب "انڈین اکنامکس" کے پندرہویں باب میں اِس امر کا اعتراف کیا ہے۔ کہ انگریزی عملداری سے پہلے جو ہنگامہ خیز عہد گذرا ہے۔ فتحمند بادشاہ مالکان اراضی کو ملکیت سے محروم کرکے انہیں مزارع کی حیثیت میں پہنچا دیتے تھے۔ یا اُنکی زمین اپنے منظورِ نظر لوگوں کو عطا کردیتے تھے۔ لیکن پروفیسر مذکور کو اِس بیان کا یہ نتیجہ مستخرج کرنے سے انکار ہے۔ کہ یہ حکمران یقیناً یہ سمجھتے ہونگے۔ کہ انہیں مالکانِ اراضی کو ملکیت سے محروم کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ پروفیسر کیل کا خیال ہے۔ کہ جو لوگ زمین کی کاشت کرتے تھے۔ اُنہیں مالکانہ حقوق حاصل تھے۔۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں جو کاردار زیادہ طاقتور ہوتے تھے۔ ایک فریق سے زمین چھین کر دوسرے کو جو زیادہ مالگذاری ادا کرنے پر آمادہ ہوجاتا تھا۔ دیدیتے تھے۔ وہ کسی کا کوئی حق تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اگر حقوقِ ملکیت تسلیم کرایا جاسکے۔ تو وہ بالکل لغو ہے۔ اگر کوئی حکمران قانون وضع کرنے کسی حق کا دعویٰ کرے۔ اور اُسے منوا سکے۔ تو اس صورت میں کہا جاسکتا ہے۔ کہ وہ بجا طور پر حق رکھتا ہے۔

ایک حصہ داخل کیا[1] جاتا تھا۔

دوسری قسم کا حق کاشتکار کے سوائے کسی کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ حکومت یا مالگذاری وصول کرنیوالا زمیندار مالگذاری وصول کرنے کے بعد اس کی کمائی میں سے اتنا ضرور چھوڑ دیتے تھے۔ کہ اُس کے جینے اور اراضی کی کاشت کرنے کا سہارا رہے۔ حکومت یا زمیندار کا یہ مقصد نہیں تھا۔ کہ بیچارے کاشتکار کے پاس اِس سے زیادہ بچ رہے۔ حکومت کی ضروریات یا زمیندار کی حرص بیچارے کاشتکار کو زراعت کے منافع سے کُلی طور پر محروم کر دیتی ہے۔ اِس صورت میں کاشتکار کو مالگذاری کے علاوہ کوئی رقم اجارہ نہیں ادا کرنا پڑتی تھی۔ اراضی سے جو حاصل ہوتا تھا اُس سے کچھ مالگذاری وصول کرنیوالے کی حرص پوری ہو جاتی تھی۔ اور کچھ کاشتکار کے پیٹ بھر کھانے کا سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ اِتنی گنجائش ہی نہیں تھی کہ کوئی تیسرا شخص لگان پر زندگی بسر کر سکے۔ جو شخص مالگذاری ادا کرتا تھا وہی زمین کی کاشت بھی کیا کرتا تھا۔ چونکہ کاشتکار کے پاس قوتِ لایموت کے سوا اور کچھ نہیں بچتا تھا۔ اِس لئے اس امر کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ کہ اراضی پر اس کے کیا کیا حقوق ہیں۔ اگر کوئی شخص زراعت کا پیشہ اختیار کرنا چاہتا تو اس کے لئے بہت آسانی تھی۔ کیونکہ بہت سی زمین غیر مزروعہ پڑی تھی۔ وہ اِس زمین میں ہل چلانا شروع کر دیتا۔ اِس طرح اُسے کاشتکاری کا غیر اہم حق حاصل کرنے کے لئے کوئی قیمت بھی ادا نہیں کرنا پڑتی تھی۔ پنجاب میں کاشتکاروں پر مالگذاری کا بوجھ الگ الگ نہیں پڑتا تھا بلکہ گاؤں سے ایک رقم معینہ مالگذاری کے طور پر وصول کی جاتی تھی۔ اِس لئے گاؤں کے لوگ باہر سے لوگوں کو بلا کر لاتے تھے۔ اور انہیں اس امر پر آمادہ کرتے تھے۔ کہ وہ غیر مزروعہ زمین میں کھیتی باڑی کریں۔ اِس طرح اُن کے بوجھ میں ایک اور شخص شریک ہو جاتا۔ اور یہ بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا۔ کہ سیاسی انقلاب کیوجہ سے یا اس لئے۔ کہ لوگوں سے زیادہ

---

[1] موجودہ زمانہ میں جاگیرداروں کو اسی مقدار مالگذاری کے لینے کا حق حاصل ہے۔ جو حکومت نے مقرر کر رکھی ہے، وہ اس سے زیادہ نہیں لے سکتے۔ کوئی جاگیردار اس زمین پر مالکانہ حقوق نہیں رکھتا۔ جو اُس کی جاگیر میں ہیں یہ اور بات ہے۔ کہ جاگیر کے علاوہ کچھ زمین اُسکی ملکیت ہو۔

مالگزاری طلب کیجاتی تھی۔ لوگ گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ کبھی کوئی باہمت شخص کچھ روپیہ ادا کر کے حکومت سے اراضی کے ایک رقبہ میں زراعت کرنے کی اجازت لے لیتا تھا۔ وہ شاہی منظوری کے بل بوتے پر دوسرے کاشتکاروں کے حقوق پر اپنے حقوق کی فوقیت کا مدعی ہوتا تھا۔ یا اپنے کاشتکار کو لا بساتا تھا۔ اور پھر ایسا بھی ہوتا تھا۔ کہ کاشتکار اُسے نکال کر خود زمین کے مالک بن جاتے تھے۔ اُس زمانہ میں قبضہ اور ملکیت کو کوئی استقلال نہیں تھا۔ اِس لئے زمین کو کوئی خریدنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ یہاں پر بحث کرنا بیسود ہے۔ کہ پنجاب میں ہندو دھرم شاستر کا کسقدر اثر و نفوذ تھا۔ ہندو دھرم شاستر کی رُو سے کوئی فرد واحد آبائی جائیداد پر قبضہ نہیں رکھ سکتا۔ اور یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ آیا ہندو دھرم شاستر میں زمین کی خرید و فروخت کا بھی ذکر ہے یا نہیں۔ مسلمان حملہ آور کسان نہیں بلکہ گلہ بان تھے۔ وہ بھیڑ بکری کے گلوں پر زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ اور اُنکی دولت کا تمامتر انحصار اسی جائیداد منقولہ پر تھا۔ زراعت کے حقوق کے متعلق اُنہیں جو دستور رائج ہیں سو انہوں نے اُن ہندوؤں سے لئے ہیں جنہیں وہ آ کر آباد ہوگئے تھے یا جنکی وہ اولاد ہیں۔ یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں۔ کہ انگریزوں کے پنجاب میں آنے سے پہلے اراضی کی فروخت بہت کم ہوتی تھی[1]۔ شہروں کے قرب و جوار میں ایسے واقعات کی مثالیں پیش کیجا سکتی ہیں یا کنوؤں کے فروخت کے واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں لیکن انگریزی[2] حکومت سے پہلے کی ہالصد سالہ تاریخ سے معلوم

---

[1] اِس سلسلہ میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اراضی کی قیمتِ فروخت کچھ نہ تھی۔

[2] قدیم زمانہ میں اراضی پر حقوق کی جو حیثیت تھی۔ اُسکے لئے مورلینڈ کی کتاب "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر" صفحات ۹۶-۱۰۰ اور ۱۲۹-۱۳۰ دیکھئے۔ اُس زمانہ میں کسانوں کو عام طور پر ہمیشہ یہ خطرہ رہتا تھا۔ کہ ابھی زمین اُن سے چھین لیجائیگی۔ اِس واقعہ کا ثبوت جہانگیر کے اِس فرمان سے ملتا ہے۔ کہ "سرکاری افسر اور جاگیردار کسانوں کی زمینیں نہ چھینا کریں"۔ ہم نے یہاں جو خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اُنکی مخالفت کے سلسلہ میں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ جس زمانہ میں سر اڈیمنڈ میکلیگن ملتان کے مہتمم بندوبست تھے۔ انہوں نے الحاق پنجاب سے پہلے فروخت اراضی کے کئی واقعات جمع کئے تھے۔ یہ ظاہر نہیں ہوا۔ کہ اُس زمانہ میں کیونکر زمین معقول قیمت پر فروخت کیجا سکتی تھی۔ یا زمین خرید نیوالا تصفیوں اور تنازعوں سے کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا۔ "زمانہ میں پچھلے دنوں تک زمین کی بیع کو رجسٹری کرانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ پھر تو اس سے اور کچھ کسانوں کی جہالت کے باعث زمین کو معقول داموں پر فروخت کر لینا تقریباً ناممکن تھا۔ ہر قطعہ زمین پر بے شمار اشخاص حقوق ظاہر کرتے تھے۔" (روانڈ کا پمفلٹ) یہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کہ بیع شرطی کی رجسٹری کے بغیر قدیم زمانہ میں بھی کیونکر آزادانہ فروخت زمین ممکن تھی +

ہوتا ہے۔ کہ نہ تو یہاں مستقل ملکیت اراضی کا وجود تھا۔ نہ کوئی اہم حقوق حاصل تھے۔ اور نہ اُن حقوق کو فروخت کیا جا سکتا تھا۔ یہ بھی وثوق کیساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ آیا اُس بدامنی کے زمانہ میں لوگ روپیہ پس انداز بھی کرتے تھے یا نہیں۔ اور اگر کرتے تھے۔ تو کیا اراضی خرید کر وہ یہ راز افشا کرنے کی جرأت کر سکتے تھے۔ کہ اُن کے پاس کچھ اندوختہ موجود ہے۔

سکھوں کے دورِ حکومت میں کسان کاشت بھی کرتا تھا۔ تو اس طرح کہ پہلو میں تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ جب تحصیلدار مالگذاری وصول کرنے آتا تھا۔ تو اس کے ساتھ ایک پوری رجمنٹ حفاظت کی غرض سے ہوا کرتی تھی۔ بڑے بڑے شہروں کے قرب وجوار کے سوا اور کہیں زمین فروخت نہیں ہوسکتی تھی۔ غدر سے پہلے لوگ انتقالِ اراضی کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے۔ کہ صوبہ پنجاب کے بعض حصوں میں ۱۸۶۵ء سے پہلے زمین فروخت نہیں ہوئی۔ پنجاب کا الحاق ۱۸۴۹ء میں سلطنت انگریزی سے ہوا تھا۔ اسے ایک ایسی سرزمین سمجھا جاتا تھا۔ جہاں ریتلی اور بنجر زمین بکثرت ہے۔ اور یہ سمجھ لیا گیا۔ کہ سلطنت میں اِس صوبہ کا اضافہ حکومت ہند کے خزانہ پر جو آگے ہی بوجھ تلے دبا ہے ایک مزید بوجھ کا اضافہ ہوگا۔ جب امن وامان قائم ہوگیا مالگذاری کی ایک رقم معین کردی گئی۔ جو نہ کم تھی اور نہ زیادہ۔ اور کسانوں کے حقوق اور ملکیت کی حفاظت کا سامان بھی ہوگیا۔ تو پنجاب خوشحالی کی راہ پر قدم بڑھانے لگا۔ اور اُس وقت سے آجتک کسی روک کے بغیر گامزن ہے۔ چونکہ اب رسل ورسائل کے ذرائع کو ترقی ہوگئی ہے۔ آبپاشی کو وسعت دیدی گئی ہے پیداوار کی قیمت بڑھ رہی ہے۔ اِس لئے ابھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ خوشحالی اور ترقی کہاں تک بڑھتی چلی جائیگی۔

جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں ۱۸۵۰ء سے پہلے اراضی کی فروخت شاذ ہی ہوا کرتی تھی۔ لیکن جلد ہی لوگوں کی توجہ اِس کی جانب ہونے لگی۔ اور ۱۸۷۰ء میں اراضی کی فروخت اِس قدر بڑھ

۱۔ ۱۸۶۰ء میں انگلستان کے اندر زمین کی سالانہ قیمت تقریباً ۲ پنس فی ایکڑ تھی۔ اور اس کے ذخائر سے قطع نظر کیا جائے۔ تو اُس کی قیمت ایک شلنگ بھی نہیں تھی۔ ملاحظہ ہو کرٹلر کی کتاب "شارٹ ہسٹری آف انگلش ایگریکلچر" ص ۱۹۔

بڑھ گئی۔ کہ حکومت بھی پریشان ہوگئی۔ یہ جاننا خاص دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کہ جس ضلع میں بارش زیادہ باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ اُس میں ساہوکار زمین خریدنے سے زیادہ اراضی رہن رکھنے کو اچھا سمجھتے تھے۔ اِس زمانہ میں انہیں زمین کا مالک بن جانا ایک بارِ گراں[1] معلوم ہوتا تھا۔ سنہ ۱۸۷۲ء سے سنہ ۱۸۷۳ء میں ضلع گورداسپور کے اندر ۶۰.۵ فیصدی اراضی ساہوکاروں کے پاس رہن رکھی گئی۔ اور ۶۳ فی صدی اراضی کسانوں کے پاس فروخت کی گئی۔ جن اضلاع میں بارش کی حالت اچھی نہیں تھی۔ ساہوکاروں کو بہت دیر تک اِقتصادی زندگی میں کوئی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ اِن اضلاع میں شاذ ہی اراضی کو رہن کرنے کے واقعات ہوتے ہونگے۔ عام طور پر اراضی کا انتقال فروخت کے ذریعے ہی ہوتا تھا۔ لیکن زیادہ تر اراضی دوسرے مالکانِ اراضی کے پاس فروخت کی جاتی تھی۔

پنجاب میں زیادہ تر چھوٹے چھوٹے مالکانِ اراضی آباد ہیں۔ پنجاب کے کسان کے قبضہ میں عموماً آٹھ ایکڑ زمین ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ وہ کسی دوسرے مالک اراضی کی چار ایکڑ زمین مزارع کی حیثیت سے کاشت کرتا ہے۔ زراعت پیشہ ذاتوں کے لوگ دوسرے باشندوں سے ممیز نظر آتے ہیں۔ اُن کے جسم اپنی ساخت کی وجہ سے بآسانی پہچانے جاتے ہیں۔ اُن میں نہایت بیش بہا فوجی اوصاف پائے جاتے ہیں جنکی وجہ سے انہیں بہت بڑی سیاسی اہمیت حاصل ہے۔ ستر سال سے حکومت اُن کے اطمینان اور فارغ البالی کیلئے کوشش کر رہی ہے۔ اگر اُنکی جگہ غیر زراعت پیشہ سرمایہ دار لے لیں۔ تو حکومت کو اِس سے بہت پریشانی ہوگی۔ انتظامِ اراضی کی سالانہ رپورٹ اِس امر کی گواہ ہے۔ کہ حکومت پنجاب اِس اَمر کو نہایت تشویش اور فکر کی نگاہوں سے دیکھتی رہی ہے۔ کہ اراضی قدیم مالکانِ اراضی کے قبضے سے نکل کر ساہوکاروں اور دوکانداروں کے قبضہ میں جا رہی ہے۔ چنانچہ حکومت کو اس کے متعلق جو تشویش رہی ہے۔ اُس کا نتیجہ

[1] جہاں مالیہ زیادہ ہوتا تھا۔ زمیندار افلاس میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ وہ مویشی ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت کر کے اور زمین کو چھوڑ کر کسی دوسرے ضلع میں چلے جاتے تھے۔ جہاں مالگذاری کم ہوتی تھی۔ بہت زمین کو فروخت نہیں کرتے تھے۔ ہاں اگر زمین میں کنواں ہوتا تھا تو اُسے بیچ ڈالتے تھے۔

یہ ہوا۔ کہ ۱۹۰۱ء میں قانون انتقال اراضی منظور کیا گیا۔ اِس عرصہ کے دوران میں اراضی کی قیمت برابر بڑھتی گئی۔ اور حکومت نے نہایت مبارک اور قابلِ فخر واقعہ سمجھا۔ حکومت کو اس کے متعلق کبھی کوئی شبہ نہیں پیدا ہوا۔ کہ آیا قیمت اراضی کی یہ گرانی اس حد تک تو نہیں جا پہنچی۔ کہ اس کے متعلق پریشانی ظاہر کی جائے۔ یہی ہے وہ سوال۔ جس پر ہمیں اس باب میں بحث کرنا ہے۔

بہر حال اس قدر مسلّم ہے۔ کہ اگر آج اراضی کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ تو اس کا اوّلین سبب انگریزی حکومت کا نظم و نسق ہے۔ جس نے کسانوں کو وہ تمام سامان بہم پہنچا دیئے ہیں جو زراعت میں خوشحالی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ انگریزوں نے مالگذاری کی شرح کم کر دی۔ کسان کے حقوق کا ایک صحیح ریکارڈ مرتب کیا۔ اور ان حقوق کی حفاظت قانون سے کی گئی۔ تاکہ حقِ ملکیت محفوظ ہو جائے۔ اور نزاع کا اندیشہ نہ رہے۔ اسیطرح اراضی کو بآسانی منتقل کرنے کا ایک طریقہ رائج کیا گیا۔ اور ان چیزوں نے[1] اراضی کو قابلِ فروخت بنا دیا۔

جن لوگوں کو متذکرہ بالا حقوق میں سے پہلی قسم کا حق حاصل تھا۔ یعنی جو لوگ مالگذاری وصول کرنے کا حق رکھتے تھے۔ اور حکومت کو ایک معینہ رقم ادا کر دیا کرتے تھے۔ انہیں نئی حکومت نے اعلیٰ درجہ کے مالکانِ اراضی تسلیم کر لیا۔ حکومت کے خزانہ میں جو مالگذاری داخل کیجاتی تھی۔ اُسے محدود کر کے بلکہ اُسے گھٹا کر ان کے حقوق کی قدر و قیمت بڑھا دی۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم دیدیا گیا۔ کہ کسان سے کس حد تک رقم وصول کی جائے۔ لیکن صوبہ میں زیادہ تر ایسے لوگ آباد تھے جنہیں دوسری قسم کا حق حاصل تھا۔ یعنی وہ زمین کی کاشت کا حق رکھتے تھے۔ اور اس کے عوض مالگذاری ادا کر دیا کرتے تھے۔ ابتدا میں جن افسروں نے اراضی کا بندوبست کیا۔ انہوں نے مالگذاری میں تخفیف کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اب زراعت کا سارا منافع حکومت کے خزانہ میں داخل نہیں ہوتا۔ بلکہ کہنے کو تو حکومت نصف منافع لیتی ہے۔ اور در اصل اس کے خزانہ میں جو رقم داخل ہوتی ہے۔ وہ اس کا بہت تھوڑا حصہ[2] ہوتی ہے۔ پہلے تو کسان کو جو نفع بچ رہتا

---

[1] ملاحظہ ہو سر جیمز ڈوکسن کا مقالہ "پنجاب کی جدید ترقیات کے متعلق" (نوشتہ در ۱۹۱۰ء) زمانہ دراز سے ہندوستان کی ساری اراضی میں حاکم وقت کو حصہ دینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جب پنجاب انگریزوں کے زیر نگیں ہوا (باقی بر صفحہ ۱۹۷)

تھا۔ وہ بمشکل اُس کے گذارہ کیلئے کافی ہوتا تھا۔ لیکن انگریزی عہد حکومت میں اسے اس سے بہت زیادہ نفع ہونے لگا۔ یہ نفع جو اسطرح بچ رہتا ہے۔ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اور اسے فروخت کیا جا سکتا ہے۔ ۱۷۹۲ء یا ۱۷۹۳ء میں بنگال کے اندر پرمیننٹ سیٹلمنٹ ریگولیشن کا نفاذ کیا گیا۔ اور اس قانون کی رُو سے زمینداروں کو یہ پورا پورا اور آزادانہ حق حاصل ہو گیا۔ کہ حکومت کی اجازت کے بغیر اراضی کی رہن و بیع کر سکیں۔ یہ خیال شمالی ہندوستان میں پھیلا۔ اور اگرچہ پنجاب میں انتقالِ اراضی کو مستحسن نہیں سمجھا گیا۔ تاہم آہستہ آہستہ لوگوں کو یہ حق حاصل ہو گیا۔ اب گویا دو عنصر بروئے کار آگئے۔ کسان جسقدر مالگذاری ادا کرنے کا عادی تھا۔ حکومت نے اُس سے کم مالگذاری کا مطالبہ کیا۔ اور اسطرح اس کے پاس کچھ زائد منافع بچ رہا۔ اس طرح اب دلاّل کو موقع ہاتھ آگیا بلکہ آگے بڑھ کر مالکانہ حقوق خرید لے۔ کسان بیچارہ پہلے جو کچھ ادا کیا کرتا تھا۔ وہ اس سے وصول کر لے۔ اور جس قدر منافع بمدِ فاضل بچ رہے۔ اُس پر خود قبضہ کر لے۔ یہ منافع زائد رقم اجارہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اِس تغیر کے ساتھ ہی پنجاب میں یہ خیال عام ہو گیا۔ کہ اراضی کو فروخت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ جس چیز نے ساہوکار کی توجہ کو اپنی جانب کھینچا۔ وہ یہی منافع زائد یا رقمِ اجارہ تھی۔ ساہوکار نے یہ چاہا۔ کہ زمین کو رہن رکھ کر رقمِ اجارہ حاصل کرے۔

آگے چل کر جو واقعات پیش آئے۔ وہ تمامتر انہیں دو اسباب کے رہینِ منت ہیں۔ زمین کی فروخت سے پہلے خریدار کا ہونا ضروری ہے۔ اور خریدار کے پاس سرمایہ ہونا چاہئے۔ اور سرمایہ جب تک جمع نہ کیا جائے۔ کہاں سے آئیگا۔ پنجاب کے سلطنت انگریزی کے ساتھ ملحق ہونے سے

(صفحہ ۱۹۲ کا بقیہ) تو یہ مالیہ خام زرعی پیداوار کا کم از کم ⅓ ہُوا کرتا تھا۔ پہلے تو عام طور پر خام پیداوار کا ⅙ مالیہ لیا جاتا رہا۔ جو سکھوں کے زمانہ کے مالیہ سے نصف تھا۔ لیکن گذشتہ سالوں میں قیمت پیداوار میں جو اضافہ ہُوا ہے۔ اسکی وجہ سے مالیہ کا تناسب قائم نہیں رہ سکا۔ ۱۸۶۹ء میں مالیہ کا اوسط ایک روپیہ فی مزروعہ ایکڑ سے کم تھا۔ ایک ایکڑ زمین کا مالیہ ادا کرنے کے لئے چالیس پونڈ گیہوں دینا پڑتا تھا۔ گذشتہ نو سال میں جو اوسط رہا ہے۔ اُس کے اعتبار سے ۲۰ پونڈ گیہوں فی ایکڑ مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اب مالیہ فی ایکڑ خام پیداوار کا ⅟ ہوتا ہے۔

پہلے ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جن کے پاس کسی قدر اندوختہ بھی ہوا کرتا تھا۔ تجارت بہت محدود تھی۔ مختلف صوبوں کے حاکم اور چھوٹے چھوٹے افسر اسی فکر میں رہتے تھے۔ کہ لوگوں سے جتنا حاصل کیا جا سکے حاصل کیا جائے۔ جن لوگوں کے پاس دولت تھی۔ وہ بڑے بڑے شہروں میں حاکمی افسروں اور سرداروں کے زیرِ حفاظت رہا کرتے تھے۔ اُنہیں گاؤں میں جانے اور اراضی کے حقوقِ ملکیت خریدنے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

لیکن انگریزوں کے آتے ہی ایک متمدّن و مہذب نظامِ حکومت کی تمام ضروری باتیں آگئیں۔ چھاؤنیاں تعمیر کی گئیں۔ اُن میں فوجیں رکھی گئیں جنہیں باقاعدہ تنخواہ ملنے لگی۔ رفاہِ عام کے کام ہونے لگے۔ مزدوروں کو نقد اجرت ملنے لگی۔ پیداوار کی فروخت کیلئے منڈیاں قائم ہوئیں اور تاجروں کو یہ موقعہ ہاتھ آگیا۔ کہ جو لوگ سرکاری ملازمت میں ہیں۔ اُنکی ضروریات فراہم کرکے روپیہ کمائیں۔ غرضیکہ نئے عہدِ حکومت میں صرف کسان ہی روپیہ پس انداز نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی روپیہ جمع کرنے کا موقعہ ہاتھ آگیا۔

۱۸۶۹ء و ۱۸۷۰ء میں ایک لاکھ ایکڑ سے زیادہ اراضی دس روپیہ فی ایکڑ کے حساب سے خریدی گئی جو سالانہ مالگذاری سے اٹھارہ گُنا زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ۱۸۷۵ء و ۱۸۷۶ء میں اراضی کا نرخ بیس روپیہ فی ایکڑ تھا۔ جو سالانہ مالگذاری سے اکتیس گُنا زیادہ ہے۔ اراضی کی قیمت میں اِسقدر اضافہ اِس لئے ہوگیا۔ کہ مدراس میں قحط پڑ گیا تھا۔ اِس لئے وہاں یہاں سے غلہ بھیجا گیا۔ آئندہ چند سالوں کے عرصے میں بارش کی قلّت کی وجہ سے اچھی فصل نہیں ہوسکی۔ چنانچہ فروخت شدہ رقبہ میں اضافہ ہوگیا۔ اور اراضی کی قیمت گھٹ کر سترہ روپیہ فی ایکڑ ہوگئی۔ شرح مالگذاری میں کمی کے باعث ۱۸۸۲ء میں اراضی کی قیمت سالانہ مالگذاری سے چھتیس گنا زیادہ ہوگئی۔ اس وقت اس اضافہ کو[1] غیر متوقع سمجھا گیا تھا۔

شرح مالگذاری کی تخفیف کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان کی پیداوار میں حکومت کا کیا حصّہ تھا۔

[1] یا اٹھارہ سال کی قیمت خرید۔ انگلستان میں ۱۸۶۰ء تا ۱۸۸۰ء اِس منزل تک پہنچ گیا تھا۔ دیکھئے کرنل [illegible] مکّا۔ کورٹ آف وارڈس (دائی برصہ)

سنہ ۱۸۱۲ء ۸۱ فیصدی

سنہ ۱۸۲۲ء ۹۲ فیصدی

سنہ ۱۸۳۲ء ۷۰ یا ۸۰ فیصدی

سنہ ۱۸۴۴ء ۷۰ فیصدی اوسطاً جس قدر پیداوار کی توقع کیجاتی تھی اسکا ۷۰ فیصدی مراد ہے۔

سنہ ۱۸۵۵ء ۵۰ فیصدی

سنہ ۱۸۷۵ء ۵۰ فیصدی موجودہ خالص پیداوار کا ۵۰ فیصدی۔

پہلے پہل جو شرح مالگذاری مقرر کی گئی۔ وہ اِس قدر زیادہ ہے۔ کہ یقین نہیں آتا۔ یہ شرح مالگذاری انگریزوں سے پہلے حکمرانوں کی یادگار تھی۔ وہ اِس قدر زائد نفع ہی نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ کہ حق انتقالِ اراضی کو کوئی اہمیت حاصل ہو سکے۔

دوسرے اسباب جنہوں نے اراضی کی قیمت پر بہت اثر ڈالا۔ ریلیں اور نہریں تھیں۔ اِس صوبہ میں پہلے پہل سنہ ۱۸۵۸ء میں ریلوے لائن تعمیر ہوئی۔ اور سنہ ۱۸۶۱ء میں اس پر آمدورفت ہونے لگی۔ صوبہ کے صدر مقام لاہور سے ملتان تک ایک ریلوے لائن تعمیر کی گئی۔ سٹیمر کے ذریعے یہ لائن کراچی سے ملحق ہوجاتی تھی۔ اس کا افتتاح سنہ ۱۸۶۵ء میں کیا گیا۔ بمبئی اور کلکتہ سے پنجاب کو ریل کے ذریعہ سنہ ۱۸۸۳ء سے ملایا گیا۔ اُس وقت ریلوے [1] لائن میں گیارہ سو میل

(۹۲ کا بقایا) کی رپورٹ سنہ ۱۹۱۹ء سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مالگذاری اور محاصل اُن رقم کے پندرہ فیصدی سے کم تھے۔ جو غلہ کی فروخت اور لگان سے حاصل ہوتی تھی بعض حالات میں یہ ۱۰ فیصدی سے بھی کم تھے۔ بعد میں جو شرح فیصدی دی گئی ہے وہ سرکاری رپورٹوں سے لی گئی ہے۔ سر فاگن کا بیان ہے۔ کہ مالگذاری کی جو تعیین کی گئی ہے۔ اس کا تناسب حسب ذیل ہے۔
ہوشیارپور۔ ۲۶ فیصدی۔ فیروزپور ۲۰ فیصدی۔ لاہور ۲۲ فیصدی۔ امرتسر ۲۵ فیصدی۔ گجرات ۲۲ فیصدی جالندھر ۲۱ فیصدی۔ لدھیانہ ۲۰ فیصدی۔ شاہ پور ۲۸ فیصدی۔ انبالہ ۲۰ فیصدی۔ ملتان ۲۰ فیصدی (ملاحظہ ہو مسٹر فاگن کا بیان کونسل میں بتاریخ یکم اگست سنہ ۱۹۲۸ء)۔

[1] ریلوے کی تعمیر سے پیشتر ایسے اوقات بھی ہوتے تھے کہ مقامی منڈیوں میں غلہ کی اسقدر فراوانی ہوگئی۔ کہ اُسے فروخت کرنا ناممکن ہوگیا۔ اِسلئے غلہ کا نقصان ہوا۔ اگر زمین کی پیداوار کا فروخت ہونا ناممکن ہو جائے تو زمین کی قیمت زیادہ نہیں ہوگی۔

سفر ہو سکتا تھا۔ سیلابی نہریں پنجاب کے الحاق سے پہلے موجود تھیں۔ انہیں وسعت دی گئی۔ آبپاشی کی وسیع اسکیم پر غور کیا گیا۔ باری دوآبہ کی نہر کا افتتاح ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ اور نہر سرہند[1] کا آغاز ۱۸۷۰ء میں ہوا۔ نہروں کو بہت سرگرمی سے وسعت دی گئی۔ ریلوں کی تعمیر کی گئی۔ اہلی مزدوروں کی مانگ بڑھ گئی۔ اور ۱۸۶۵ء و ۱۸۸۰ء میں جب جنگِ افغانستان چھڑی یہ مانگ اور بھی زیادہ ہو گئی۔ قیمتیں بہت بڑھ گئیں۔ اور اگرچہ ۱۸۶۶ء و ۱۸۶۹ء میں سخت قحط پڑا۔ اور ۱۸۷۷ء و ۱۸۷۸ء میں بھی خشک سالی رہی۔ زراعت پیشہ لوگ زیادہ خوشحال ہوتے گئے۔ ۱۸۷۴ء میں بنگال قحط میں مبتلا ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں مدراس میں قحط پڑا۔ تو ان دونوں صوبوں کو ریلوں کی وجہ سے پنجاب سے غلہ بآسانی بھیجا گیا۔ اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہی اس صوبہ سے غلہ یورپ کی منڈیوں میں پہنچنے لگا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ غلہ کا نرخ متعین ہو گیا۔ اب زائد از ضرورت جنس کا نکاس بآسانی ہو سکتا تھا۔ روپیہ کمانے کی خواہش نے غلہ کی برآمد کو ترقی دی۔ کسان کو قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ زراعت سے کیا نفع حاصل کر سکتا ہے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اگر اچھی فصل ہوئی۔ تو یہ نہیں ہوگا کہ اس کے پاس زائد از ضرورت غلہ پڑا رہے۔ اور اُسے فروخت نہ کیا جا سکے۔ اس لئے اسمیں زیادہ سرگرمی پیدا ہو گئی۔ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۸ء تک مزروعہ رقبہ میں ۱۰۲ فیصدی کا اضافہ ہو گیا۔ اور یہ روز بروز وسیع ہوتا چلا گیا۔ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۸۵ء تک آبادی میں جو اضافہ ہوا۔ اُس کا اندازہ لگایا گیا۔ کہ ۱۵۰۰۰۰ سے بڑھ کر[2] ۱۷۲۰۰۰ ہو گئی ہے۔ گویا آبادی میں پچاس فیصدی سے زیادہ اضافہ ہوا۔ اب یہ کیفیت نہیں رہی تھی۔ کہ مالگذاری ادا کرنے والے لوگ مزارعین کی تلاش کرتے پھریں۔ جو اُنکا بوجھ بٹائیں۔ بلکہ مزارعین اس فکر میں پھرنے لگے کہ کہیں اراضی ملے۔ تو اُس کی کاشت کریں۔

---

[1] ۱۸۸۶ء میں از سرِ نو اس کی تعمیر ہوئی۔ اور موجودہ بند بنایا گیا۔

[2] یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ جسکی وجہ یہ ہے۔ کہ ۱۸۵۵ء میں آبادی کا تخمینہ اصل آبادی سے بہت کم لگایا گیا تھا۔

اِس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ اراضی کی خرید و فروخت میں ترقی ہونے لگی صرف انکی تعداد میں ہی ترقی نہیں ہوئی۔ بلکہ قیمتوں میں بھی ترقی ہوئی۔ سنہ ۱۸۶۹ء و سنہ ۱۸۷۰ء میں دس لاکھ روپے کی اراضی خریدی گئی۔ پانچ سال کے عرصہ میں اُس کی قیمت پندرہ لاکھ تھی۔ اور سنہ ۱۸۷۹ء و سنہ ۱۸۸۰ء میں تیس لاکھ روپیہ۔ یہ اراضی اِس لئے فروخت نہیں کی گئی۔ کہ کسانوں کی اقتصادی حالت بھی نہیں تھی۔ بلکہ لوگوں نے اِس لئے زمین خریدی۔ کہ اُن کے پاس فالتو روپیہ پڑا تھا۔ جسے وہ منفعت کاروبار میں لگانا چاہتے تھے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ زمین کی خرید و فروخت زیادہ تر اُن اضلاع میں ہوئی۔ جو سب سے زیادہ خوشحال تھے۔ اراضی خریدنے والے ساہوکار اور بنئیے اس زمانہ میں اراضی خرید کر بآسانی اُس پر قبضہ نہیں جما سکتے تھے۔ لیکن جب عدالتِ انصاف کی قوت بڑھی۔ حکومت کا اثر وسیع ہُوا۔ بنیا جو قدیم زراعت پیشہ سے فائدہ حاصل کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرتا رہتا ہے محفوظ ہوگیا۔ اور اُسے اپنی پالیسی سے زیادہ فائدہ حاصل ہونے لگا۔ سنہ ۱۸۷۶ء و سنہ ۱۸۷۷ء میں زراعت پیشہ جماعت میں روپیہ سود پر لینے کا ذوق نمایاں ہُوا۔ جو زمین فروخت کی گئی تھی۔ اُس میں سے نصف زراعت پیشہ لوگوں کے ہاتھ فروخت ہوئی۔ اور اہلِ زراعت نے جس اشتیاق سے اپنے گھروں کے قرب و جوار میں اراضی خریدنا شروع کی۔ اُس نے قیمت اراضی کے اضافہ میں مدد دی۔

سنہ ۱۸۷۷ء و سنہ ۱۸۷۸ء تک پانچ سال کے عرصہ میں فروخت شدہ رقبہ کا اوسط ۹۳۰۰۰ ایکڑ تھا۔ اور سنہ ۱۸۸۲ء و سنہ ۱۸۸۳ء تک کے پنجسالہ عہد میں ۶۱۰۰۰ ایکڑ۔ آئندہ پانچسال میں فروخت شدہ رقبہ ۱۳۱۰۰۰ ایکڑ تک جا پہنچا۔ اور بعد کے پانچ سالوں میں جن کا اختتام سنہ ۱۸۹۲ء و سنہ ۱۸۹۳ء پر ہوتا ہے۔ فروخت شدہ رقبہ ۲۳۳۸۰۰ ایکڑ تھا۔ فروخت شدہ رقبہ میں اِس نمایاں اضافہ کے باوجود (اِس رقبہ میں وہ رہن شدہ رقبہ بھی شامل ہے۔ جسے بعد میں فروخت کر دیا گیا) قیمت میں اضافہ ہوتا رہا۔ ابتدائی ایام میں سرسہ کی اراضی ۲ر فی ایکڑ کے حساب سے فروخت ہوئی تھیں۔ تقریباً سنہ ۱۸۶۹ء کا ذکر ہے۔ کہ اس علاقہ کی اراضی کی قیمت دس روپے فی ایکڑ ہوگئی۔ اِس کے بعد اراضی کی قیمت میں جو ترقی ہوتی رہی۔ اُس کا اندازہ مصرحہ ذیل کی اعداد و شمار سے ہوسکتا ہے۔

١٨٧٥ء و ١٨٧٦ء	فی ایکڑ اوسط قیمت	٢٠ یا ٣١ روپیہ × مالگذاری
١٨٨٠ء و ١٨٨١ء	" "	٨ یا ٣٢ روپیہ × "
١٨٨٥ء و ١٨٨٦ء	" "	١٦ یا ٣٦ روپیہ × "
١٨٩٠ء و ١٨٩١ء	" "	٢٠ یا ٥٠ روپیہ × "

سرکاری طور پر جو اعداد و شمار شائع کئے گئے ہیں۔ اُن میں رقبہ مزروعہ فی ایکڑ کی اوسط قیمت حسب قرار ذیل دی گئی ہے۔

١٨٨٥ء و ١٨٨٦ء	٣٠ روپیہ
١٨٩٠ء و ١٨٩١ء	٦١ روپیہ
١٨٩٥ء و ١٨٩٦ء	٥٩ یا ٥٦ × مالگذاری
١٩٠٠ء و ١٩٠١ء	٧٧ یا ٨٩ × "
١٩٠٥ء و ١٩٠٦ء	٨٨ یا ١٠٥ × "
١٩١٠ء و ١٩١١ء	١٢٤ یا ١٢٧ × "
١٩١٦ء و ١٩١٧ء	٢٢٧ یا ١٥٧ × "

١٩١٩ء کی رپورٹ مالگذاری میں یہ مذکور ہے۔ کہ ١٩١٧ء و ١٩١٨ء میں اراضی مزروعہ کی قیمت کا اوسط ٢٥٢ روپے فی ایکڑ سے کم ہو کر ١٨٤ روپے ہو گیا ہے۔ (یا ١٢٧ روپیہ × مالگذاری) دوسرے سال یہ رقم بڑھ کر ٢٧٥ روپیہ ہو گئی۔ اِس سال کے دوران میں سرکاری زمین کا اچھا خاصا سہاگ پاڑہ اور سدھنائی کی نو آبادیوں کے مزارعین کے ہاتھ برائے نام نرخ پر بیچ ڈالا گیا۔ اِس کا اثر صوبہ کی قیمت فروخت کے اوسط پر بھی پڑا۔ اکثر اضلاع سے یہ رپورٹ بھی موصول ہوئی کہ زرعی پیداوار کی قیمت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے زمین کی قیمت میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

لہ یہ ثلاثہ رنی ١٩١٩ء لاہور میں شہری اراضی قیمت اوسط ٣٠٦ روپے تھا۔ جالندھر میں ٦٦٨۔ ہوشیارپور میں ٥٢٧ اور امرتسر میں ٤٥٢ +

۱۸۹۶ء و ۱۸۹۷ء سے ۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء تک اکیس سال کے عرصہ میں تقریباً ۹۶۷۰۰۰ قطعات اراضی جن کا مجموعی رقبہ تیس لاکھ ایکڑ رقبہ مزروعہ (یعنی تمام رقبہ مزروعہ کا دسواں حصّہ) ہوتا تھا۔ ۳۲ کروڑ روپے میں فروخت کیا گیا۔

ان اعداد و شمار پر نظر ڈالنے کے بعد شاید یہ کہا جائے۔ کہ ۱۸۶۸ء سے ۱۸۹۱ء تک زمین کی قیمت میں چنداں سرعت سے اضافہ نہیں ہوا۔ کیونکہ مالگذاری میں تخفیف۔ ذرائع حمل و نقل کی اصلاح، وسیع منڈیوں کی فراہمی اور ایک منظم حکومت کی دوسری برکات و خصوصیات کی موجودگی میں اس سے زیادہ اضافہ قیمت کی توقع کیجاتی تھی۔ قیمتِ زمین میں جو متواتر و پیہم اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں۔ کہ آبادی گنجان ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ ۱۸۸۱ء میں رقبہ مزروعہ کی مجموعی آبادی ۵۱۴ نفوس فی مربع میل تھی۔ اور ۱۹۱۱ء میں نہری نو آبادیوں کے قائم ہونے کی وجہ سے ۴۹۹ رہ گئی [1]۔

اس کی یہ بھی وجہ نہیں۔ کہ اب پہلے کی نسبت بہتر طریقِ زراعت اختیار کیا جا رہا ہے۔ یا زمین کی اصلاح و ترقی کیجانب توجہ ہو رہی ہے۔ ۱۸۶۸ء میں سو ایکڑ رقبہ مزروعہ میں ۴۶ زراعت پیشہ نفوس آباد تھے۔ اور ۱۹۱۱ء میں ان کی تعداد ۳۴ رہ گئی۔ یہ یقین کیا جاتا ہے۔ کہ بیلوں کی تعداد میں بھی اس قسم کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ یہ تو کہنا ہی عبث ہے۔ کہ گانٹھوں کی پیداوار کی وجہ سے یا کھاد ڈالنے کے باعث زمین کی اصلاح ہوئی ہے۔ اور قیمتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس اضافہ کی کچھ تو یہ وجہ ہے۔ کہ نہروں اور کنوؤں سے آبپاشی میں اضافہ ہوا ہے۔ یعنی ۱۸۶۸ء میں نہروں اور کنوؤں سے ساٹھ لاکھ ایکڑ زمین کو سیراب کیا جاتا تھا۔ اور ۱۹۱۷ء میں یہ رقبہ ایک کروڑ بیس لاکھ ایکڑ سے متجاوز ہو گیا۔ کنوئیں

---

[1] قیمت زمین پر جو سب سے زیادہ بسبب اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ آبادی کی ترقی ہے لیکن اگر کاروباری خوشحالی میں کمی ہو جائے۔ اور پیداوار کا استعمال کرنے والے لوگوں اور مزارعین دونوں کی آمدنی گھٹ جائے۔ تو محض آبادی میں اضافہ کی وجہ سے قیمت میں ایسقدر اضافہ نہیں ہو سکتا۔ ملکیہ تین لپ پلز آف اکنامکس صلا۔

کی قیمت بھی عام طور پر زمین کی قیمت میں محسوب کیجاتی ہے۔ اور چونکہ کنوؤں پر کئی کروڑ (غالباً کم از کم پانچ کروڑ) روپیہ صرف کیا گیا۔ اور نہروں پر ۲۳ کروڑ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ اس لئے زمین کی قیمت بڑھ گئی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کی کیسی قدر کم قیمت[1] لیجاتی ہے۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آبپاشی میں یہ اضافہ کس قدر اہم ہے۔ بہرحال یہ امر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کہ ان اضلاع اور علاقوں میں بھی جہاں جہاں نہریں اور کنوئیں موجود نہیں۔ قیمت زمین میں اضافہ ہو رہا ہے۔

کسی حد تک اضافہ زمین کی وجہ یہ بھی ہے۔ کہ زمینی پیداوار کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ لیکن اس چیز کے اثرات و نتائج کا اندازہ لگانا دشوار[2] ہے ۱۸۶۹ء میں گیہوں ۱۲ سیر فی روپیہ کے حساب سے فروخت ہوتا تھا۔ ۱۸۷۱ء سے اس نرخ میں برابر کمی ہونے لگی یعنی ۱۸۷۱ء میں بیس سیر تھا۔ اور ۱۸۷۷ء میں ۲۷ سیر رہ گیا۔ ۱۸۷۹ء میں پھر فوراً قیمت بڑھ گئی۔ یعنی گیہوں کا نرخ ۱۳½ سیر فی روپیہ ہو گیا۔ گذشتہ سالوں کے اندر اچھی منڈیوں سے ذرائع آمد و رفت قائم ہو جانے کی وجہ سے گیہوں کے نرخ میں جو اضافہ ہوا ہے۔ اُن کے باعث اُن تمام اضلاع میں جہاں سے باہر کو گیہوں جاتا ہے۔ زمین کی قیمت بڑھ گئی ہے لیکن اس کا اثر ان اضلاع پر نہیں پڑا۔ جو اپنی پیداوار کو اپنے ہاں ہی صرف کرتے ہیں۔ مصارفِ زراعت میں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے ۱۸۸۰ء میں بیلوں کی قیمت ۳۵ روپیہ فی راس تھی۔ اب ان کی قیمت کا اوسط ۸۰ روپیہ سے کم نہیں۔ دوسرے لوازم زراعت کی قیمت بھی اسی طرح بڑھ گئی ہے۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ مصارفِ پیداوار میں جو اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے تمام پیداوار متاثر ہوتی ہے۔ اور قیمت پیداوار میں جو اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے صرف پیداوار

[1] آبپاشی کا نرخ فی ایکڑ اوسطاً پانچ روپیہ دس آنے ہے۔ (۱۹۳۰ء) اور فی ایکڑ جنس کی قیمت کا اندازہ ۶۲ روپیہ کیا گیا ہے۔

[2] مثلاً ڈنمارک میں اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ اگرچہ عمیق کاشت کی وجہ سے ۱۸۸۰ء سے آج تک فصل کی قیمت سو فیصدی بڑھ گئی ہے تاہم زمین کی قیمت میں ۸۰ سے ۹۰ اضافہ ہوا ہے قیمت پیداوار نفع پر بہت اثر انداز ہوتی ہے لیکن اس کے سوا نفع کے اور اسباب و عوامل بھی ہیں۔

کا وہی حصہ متاثر ہوتا ہے۔ جو فروخت کردیا جاتا ہے۔

اِس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ صوبہ کا نصف رقبہ مزروعہ مزارعین کے قبضے میں ہے جس کی اکثریت لگان جنس کی صورت میں ادا کرتی ہے۔ مصارفِ زراعت میں جو اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا بار مزارع کے سر پر پڑتا ہے۔ اور زمیندار اپنے حصے کی پیداوار کی قیمت کے اضافہ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ حکومت چونکہ پیداوار کے تناسب کے حساب سے مالگذاری کا مطالبہ نہیں کرتی۔ اِس لئے زمیندار کو زیادہ فائدہ ہو رہا ہے۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرکے زمین خریدتا چلا جاتا ہے۔ اِس سلسلہ میں یہ امر یقیناً بہت اہمیت رکھتا ہے، کہ حکومت مالگذاری کی تعیین[1] میں بہت نرمی کا سلوک کر رہی ہے ۱۸۶۸ء و ۱۸۶۹ء میں حکومت اوسطاً فی ایکڑ ۱ روپیہ ۱ آنہ ۹ پائی مالگذاری وصول کرتی تھی۔ جو اس زمانے کے نرخ کے مطابق ۲۲ سیر سے ۲۸ سیر گیہوں کی قیمت تھی۔ اب مالگذاری ۱ روپیہ ۸ آنہ ۶ پائی فی ایکڑ ہے۔ جو تقریباً ۱۵ سیر گیہوں کی قیمت ہوتی ہے۔ اِس لئے اب روپیہ کے اعتبار سے مالگذاری زیادہ ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جس رقبہ پر مالگذاری لگائی گئی ہے۔ اُس میں بیشتر حصہ وہ ہے جس کی آبپاشی کا انتظام حکومت نے کیا ہے۔ لیکن حکومت کے مطالبہ میں جو اضافہ ہُوا ہے۔ وہ قیمت پیداوار کے اضافہ سے کم ہے۔ اِس طرح گویا حقیقتاً بوجھ ہلکا ہوگیا ہے۔

ایک چیز جو اضافہ قیمت اراضی میں مانع ہے۔ اراضی کی تقسیم ہے۔ ہر اراضی کئی کھیتوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ کھیت آبائی جائیداد کی تقسیم کیوجہ سے سارے گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

---

[1] یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ تعیین مالگذاری کے سلسلے میں جو شفقت اور نرمی برتی گئی ہے۔ آیا اسکا اندازہ کرنے میں مبالغہ تو نہیں کیا گیا۔ گذشتہ سالانہ رپورٹوں سے یہ مطالبہ ایک روپیہ آٹھ آنہ فی ایکڑ معلوم ہوتا ہے۔ قیمت اِس سے ۱۰ گنا زیادہ ہے۔ اور پیداوار کا اوسط پچیس روپیہ۔ اگر لگان پیداوار سے نصف یا بارہ روپیہ آٹھ آنہ ہے تو اس سے ۴۰ حاصل ہُوا۔ اگر مطالبہ بالکل معاف کر دیا جائے تو یہ ۵۰ فیصدی ہو جائیگا۔ اور اگر اسے دگنا کر دیا جائے۔ تو یہ تخفیف کے بعد ۴۰ رہ جائیگا۔ لیکن ایسے معمولی اختلافات موجودہ گراں قیمتوں کا باعث نہیں ہو سکتے۔ قصہ مختصر کہ مالگذاری اِس قدر تھوڑی ہے۔ کہ اگر اس میں مزید تخفیف کر دی جائے تو کوئی اثر نہیں ہوگا۔

اسی طرح گویا کسان کی محنت کے فواید میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ اس کا بہت وقت ضائع ہوتا ہے
اسے بیلوں کو ساتھ لیکر ایک قطعہ اراضی سے دوسرے قطعہ اراضی تک جانا پڑتا ہے۔ مزید براں
زمین کی حد بندی کے لئے بہت سی مینڈیں بنانے میں کسی قدر رقبہ کا بھی نقصان ہوتا ہے۔
ایک اعتراض یہ بھی ہے۔ کہ کھیت اتنے چھوٹے ہوتے ہیں۔ کہ ان میں کنواں کھود کر فائدہ نہیں
اٹھایا جا سکتا۔ جاپان میں جہاں اس مسئلہ پر بہت توجہ صرف کی گئی ہے۔ حکومت نے تحقیق و
تدقیق کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ اگر ان منتشر کھیتوں کو از سر نو منظم و مرتب کیا جائے۔ تو پیداوار
میں ۱۵ فیصدی کا اضافہ ہو جائیگا۔ اور وہ رقبہ جس سے کوئی پیداوار حاصل نہیں ہوتی (مینڈیں وغیرہ)
رقبہ مذکور میں[1] سے ۳ فیصدی ہونگی۔ اگر پنجاب میں اشتمال اراضی کی تحریک کو معقول کامیابی
حاصل ہوئی۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ زمین کی قیمت میں اضافہ ہو جائیگا۔ لیکن بلجیم میں جو تجربہ
ہوا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین کو چھوٹے چھوٹے قطعات میں منقسم کر دینے کی
وجہ سے اُس کی فروخت میں آسانی ہوتی ہے۔ مزید براں اس طرح زمین کی قیمت میں بھی
اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دُور اندیش خریدار چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی کو ہی خریدا
کرتے ہیں۔

تجربہ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر صنعتی اداروں کے مزدوروں کو کم تنخواہ ملے۔ تو اس کی وجہ
سے قیمتِ زمین میں اضافہ ہوتا ہے پنجاب میں نصف زمین کی کاشت مزارعین کرتے ہیں
اس لئے اُن میں کثیر التعداد لوگ ایسے ہونگے۔ جنہیں شہروں میں محنت کا معاوضہ معقول ملے۔
تو وہ یقیناً شہروں میں جا کر محنت و مشقت کرینگے[2]۔

---

[1] جاپان ییر بک صفحات ۱۱۵ و ۲۱۴ ۔ اراضی کے چھوٹا ہونیکی وجہ سے اسکی قیمت تو کم ہو جاتی ہے۔ لیکن جہاں اراضی اسقدر چھوٹی نہیں۔ کہ اقتصادی حیثیت سے اسکی کاشت نہ ہو سکے، تو اسکی قیمت ایسی ہوتی ہے جو اکثر مزیدار ادا کر سکیں۔ اس لئے اسکی خرید کیلئے باہم مقابلہ کرنیوالوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔

[2] جاپان جدید صنعتی رجحان اور دیہاتیوں کا نقل مکان کرکے شہروں میں چلا جانا ایسے واقعات ہیں جن کی وجہ سے مالکان اراضی کو مزارعین ملنا مشکل ہو گیا ہے۔ جاپان ییر بک ص ۵۱۳۔

اگر صنعت و حرفت میں معقول معاوضہ خدمت ملے۔ زندگی اچھی طرح بسر ہو سکے۔ تو ان مزارعین کی تعداد میں جو زمین کی کاشت کرنا چاہتے ہیں تخفیف ہو جائیگی۔ لگان بھی کم ہو جائینگے۔ اور ان کے ساتھ قیمت اراضی میں بھی کمی واقع ہو جائیگی۔ انگلستان کے شہروں میں مزدوروں کو معقول معاوضہ ملتا ہے۔ اس لئے زمین کی قیمت بڑھنے نہیں پاتی۔ بلجیم کے شہروں میں مزدوروں کا معاوضہ کم ہے۔ اس لئے لوگ زراعت کو چھوڑ کر صنعت و حرفت کیجانب توجہ نہیں کرتے۔ مزید برآں لوگوں کو زمین سے جو خاص محبت ہے۔ وہ بھی اس رجحان کی مخالف واقع ہوئی ہے یہ ممکن ہے۔ کہ بعض زراعت پیشہ لوگ معقول معاوضہ حاصل کرنے کے خیال سے شہروں میں جا کر محنت کریں۔ اور اپنی تنخواہوں میں سے جس قدر روپیہ ممکن ہو سکے پس انداز کرتے رہیں۔ تاکہ اس روپیہ سے آگے چلکر اپنے گاؤں میں ایک قطعہ اراضی خرید لیں۔

کہا جاتا ہے۔ کہ دو علل ایسی ہیں۔ جو اس اضافہ قیمت کو روکنے یا اسکی تلافی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان میں ایک تو یہ کہ نہری نوآبادیوں کو وسعت دیجائے۔ اور بہت سی قابل کاشت زمین مہیا ہو جائے۔ اور ذرائع حمل و نقل میں اصلاح کیجائے۔ دوسری یہ۔ کہ فن کشاورزی میں کوئی فوری[1] اور اہم تبدیلی رونما کیجائے۔ اول الذکر کی مثال تو امریکہ کی تاریخ سے مل سکتی ہے۔ جہاں گھاس کے وسیع میدانوں میں گیہوں کی کاشت کی گئی۔ چنانچہ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۸۰ء تک ریاستہائے متحدہ امریکہ میں گیہوں کی پیداوار دگنی ہو گئی تھی۔ ریل کی وجہ سے نہایت سرعت کیساتھ بہت سی زمین میں جو ابھی تک اچھوتی پڑی تھی کاشت ہونے لگی۔ ذرائع رسل و رسائل کے مصارف میں کمی ہو گئی۔ اور یورپ میں امریکہ سے بکثرت غلہ اور گوشت کی درآمد[2] ہوئی۔ مغربی یورپ میں زمین کی قیمت بقدر ۲۰ فیصدی کے کم ہو گئی۔ انگلستان کے بعض حصوں میں قیمت زمین میں ۵۰ فیصدی کمی ہوئی۔ اور جنگ عظیم تک نرخ کم رہے۔ امریکہ پر بھی اس کا اثر پڑا۔ چونکہ کناڈا اور مغربی ریاستوں میں نئی زمین

---

[1] سلگ مین۔ پرنسپلز آف پولیٹکل اکنامکس۔ صفحہ ۵۱۳۔

[2] کرٹلر۔ شارٹ ہسٹری آف انگلش ایگریکلچر۔ صفحہ ۲۹۳۔

کی کاشت ہوئی تھی۔اس سلئے نیویارک کی ریاست میں زرعی جائیداد کی قیمت کم ہوگئی۔اور اوہیو میں[1] بھی زمین کی قیمت میں اسی نوع کی کمی واقع ہوئی۔

پنجاب میں زراعت کو بہت ترقی ہوئی ہے۔کیونکہ وسیع نہریں تعمیر ہو گئی ہیں۔اور جو وسیع علاقے پہلے بالکل ویران پڑے تھے۔اب اُنکی آبپاشی کا سامان مہیا ہو گیا ہے۔لیکن اِس سے اضافہ قیمت زمین میں کمی نہیں ہوئی۔گذشتہ ۲۰ سال کے عرصہ میں رقبہ مزروعہ ۴۰ فیصدی بڑھ گیا ہے۔جس رقبہ میں نہروں[2] سے آبپاشی ہوتی ہے۔وہ پہلے تیس لاکھ ایکڑ تھا۔اب ایک کروڑ ایکڑ ہے۔اس زمانہ میں آبادی میں بھی چنداں ترقی نہیں ہوئی۔یعنی آبادی محض ۵ فیصدی بڑھی ہے۔اِس طرح زمین پر کوئی زیادہ دباؤ نہیں پڑا۔خام پیداوار غالباً دگنی ہو گئی ہے۔اکثر لوگ انتقالِ مکان کر کے نہری نو آبادیوں میں جا بسے ہیں۔لیکن اس کی وجہ سے پرانے اضلاع میں قیمت زمین کم نہیں ہوئی۔اس سے یہ ظاہر ہے۔کہ پنجاب جیسے صوبہ میں جہاں لوگوں کے پاس چھوٹی چھوٹی زمینیں ہیں۔زراعت کو کتنا ہی فروغ کیوں نہ دیا۔اضافہ قیمت زمین کو روکا نہیں جا سکتا۔

اضافہ قیمت زمین کو روکنے کا دوسرا ذریعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ فنِ کشاورزی میں کوئی فوری اور عظیم اصلاح کیجائے۔اِس صوبہ کی زراعت پر جس چیز نے بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔وہ ریلوے اور رسل و رسائل کی دوسری آسانیاں ہیں۔جن کی وجہ سے پنجاب کا تعلق بڑی بڑی نو آبادیوں سے ہو گیا ہے۔جس زمانہ میں زراعت کو یہ وسعت حاصل نہیں ہوئی تھی۔عام طور پر

[1] بلجیم تو قیمتیں پچاس کے اندر یعنی ۱۸۳۰ء سے ۱۸۸۰ء تک دگنی ہو گئی تھیں۔لیکن امریکہ میں غلہ کی بکثرت کاشت ہوئی۔اور یہاں غلہ کی قیمت گر گئی۔تو قابلِ زراعت اراضی کی قیمت میں ۲۳ فیصدی کمی واقع ہو گئی۔یہ تغیر ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۵ء تک رونما ہوا۔چراگاہوں کی قیمت میں جو کمی ہوئی۔وہ ۲۳ فیصدی سے کم تھی۔" لینڈ اینڈ لیبر" مصنفہ رونٹری (بلجیم سے سبق) صفحہ ۱۴۶۔

[2] ملاحظہ ہو کتاب ہذا میں سے "نہروں کی تعمیر سے صوبہ بہت متمول ہو گیا ہے۔اور اضافہ قیمت زمین کا بڑا باعث یہی ہے"۔

زمین سے اِس قدر پیداوار ہوتی تھی جس سے لوگوں کی اپنی ضروریات پوری ہوجایا کرتی تھیں، رقبہ مزروعہ جوں جوں بڑھتا گیا۔ گیہوں کی پیداوار بھی زیادہ ہوتی گئی۔ اور بہت سا زائداز ضرورت گیہوں بچ رہا۔ جسے باہر کے ملکوں میں بھیجا گیا۔ گیہوں کی تجارت برآمد کا باعث یہ ہے۔ کہ یورپ کی منڈیوں میں گیہوں کی بہت مانگ ہے۔ اور تجارت برآمد اِسی صورت میں جاری رہ سکتی ہے۔ کہ ان منڈیوں میں برابر گیہوں کی مانگ رہے۔ یہ اغلب نہیں۔ کہ سائنس کے کسی جدید انکشاف کی وجہ سے یورپ کے وہ ممالک جن میں پنجاب سے گیہوں جاتا ہے۔ اپنی ضروریات کے لئے خود کافی گیہوں پیدا کرسکیں۔ اور اس طرح پنجاب کے گیہوں کی مانگ میں کمی ہوجائے۔ لیکن اِس قسم کا واقعہ ناممکن بھی نہیں۔ مزید برآں یہ بھی ناممکن نہیں۔ کہ کوئی ایسا علمی انکشاف ہو۔ جس کی وجہ سے پنجاب کی پیداوار بدرجہا زیادہ ہوجائے۔ اگر پیداوار میں فوری اضافہ ہوجائے، اور مال کی فراہمی مانگ سے بڑھ جائے[1]۔ اور چند سال تک متواتر ایسا ہی ہوتا رہے۔ تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ آج جس زمین میں گیہوں کی کاشت ہورہی ہے۔ اسکا بیشتر حصہ بیکار ہوجائیگا۔ گیہوں کی قیمت بھی کم ہوجائیگی۔ اور زمین کی قیمت میں بھی کمی رونما ہونے لگے گی یہ بہرحال قیاسات ہیں بعض دوسرے اسباب سے بھی یہی نتائج پیدا ہوسکتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی وجہ سے یورپ کو غلہ نہ جاسکے۔ تو اُس کا بھی وہی اثر ہوگا جو غلہ کی مانگ سے کمی واقع ہونے سے ہوسکتا ہے۔ فرض کرلیجئے۔ کہ سیاسی اسباب و وجوہ سے ریل کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔ گیہوں بندرگاہوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ یا شہروں کے باشندوں کو نفع پہنچانے کیلئے گیہوں کی برآمد میں مداخلت کی جاتی ہے۔ تو اس کی وجہ سے ملک کی داخلی منڈیوں میں نرخ کم ہوجائیگا۔ اور اس طرح گیہوں کی کاشت کے شوق او رولولہ میں بھی کمی واقع ہوجائیگی۔ کسان گیہوں کی کاشت کرتا ہے۔ تو سب سے پہلے اس کے پیشِ نظر یہ مقصد ہوتا ہے۔ کہ وہ اس سے اپنی محنت کا معاوضہ حاصل کرے۔ اور کچھ نفع بھی لے جیسا کہ ہم انسانی عنصر کی بحث میں واضح کرچکے ہیں۔ کسان اپنے

---

[1] یا موجودہ وسائل رسل ورسائل اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ لیجا سکیں۔ نہری زمینوں میں بہتر ہلوں کے استعمال سے پیداوار بہت بڑھ سکتی ہے۔

طریقوں کی اِصلاح کرنے یا اپنی سرگرمیوں کو وسعت دینے کیجانب مائل نہیں ہوتا۔ اِس لئے
ضروری ہے۔ کہ کوئی ولولہ انگیز چیز موجود ہو۔ تو اس کے قلب میں مزید کوشش و محنت کا قوی جذبہ
پیدا کرے۔ اگر نفع بھی نہ رہا۔ جو اُسے محنت کی ترغیب دلاتا ہے۔ تو پیداوار میں کمی ہو جائیگی
اور اس کے ساتھ ہی اراضی کی قیمت بھی گھٹ جائیگی۔ پنجاب جیسے صوبہ میں جہاں نصف زمین
کی زراعت مزارعین کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے۔ کہ قیمت زمین کا انحصار بہت حد تک رقم
اجارہ پر ہو۔ ہم آگے چل کر تفصیلی طور پر بیان کرینگے۔ کہ یہاں نقد لگان میں اِس سرعت سے
اضافہ نہیں ہوا۔ جس سرعت سے قیمتِ زمین میں اضافہ ہوا ہے۔ اُسی طرح زرعی پیداوار
کی قیمت اتنی نہیں بڑھی۔ جتنی زمین کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے۔ کہ قیمت زمین
جس قدر بڑھ گئی ہے۔ لگان خواہ جنس کی صورت میں ہو یا نقد کی صورت میں اتنا نہیں بڑھا۔
حالانکہ لگان اور قیمت زمین آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ جب رقم لگان میں تخفیف ہوگی۔ تو اس
سے یقیناً یہ خطرہ ہوگا۔ کہ قیمتِ زمین فوری طور پر نہ گر جائے۔ اِس دلیل کو ذہن نشین کرنے کیلئے
اِس بات پر غور کرنا چاہئے۔ کہ گذشتہ صدی کے اندر انگلستان میں کیا ہوا۔ جب نپولین
شاہِ فرانس سے انگریزوں کی جنگ ختم ہونے کے قریب تھی۔ تو گیہوں کی قیمت میں اضافہ
ہوگیا۔ اور چونکہ سالہا سال تک نرخوں کی گرانی کا یہی عالم رہا۔ اِس لئے زمیندار اور مزارعین دونو
نے اِس سے یہی نتیجہ نکالا۔ کہ اب مستقل طور پر یہی نرخ رہیگا۔ لگان کی رقم نہایت سرعت سے
بڑھ گئی۔ اکثر لوگ جو زمینداروں اور کسانوں کے طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ آگے بڑھے،
اُن کے پاس جتنا روپیہ تھا۔ یا جس قدر وہ قرض لے سکتے تھے۔ سب زراعت پر لگا دیا۔ پنجاب
میں تو کوئی زمین پر روپیہ صرف کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن وہاں زمین کی اصلاح و ترقی پر بہت
سرمایہ لگایا گیا۔ دور و دراز علاقوں سے کھاد فراہم کی گئی۔ بہت تیزی سے نہایت وسیع ترقی
کی گئی۔ کشاورزی میں بھی اِصلاح ہوئی۔ اور بہتیری زمین جو بیکار پڑی تھی۔ قابلِ زراعت
بن گئی۔ اب گیہوں کا نرخ کم ہونے لگا۔ اجناس کے متعلق جو قوانین نافذ تھے۔ وہ منسوخ کر
دیئے گئے۔ اور افلاس و نکبت کا دور شروع ہوگیا۔ قوانین اجناس کی تنسیخ کے بعد بھی بعض
ہوشمند مبصروں کی یہی رائے تھی۔ کہ زمین کی قیمت میں برابر اضافہ ہوتا رہیگا۔ اِس ضمن میں

یہ دلیل دی گئی تھی۔ کہ چونکہ رقبہ مزروعہ میں توسیع ممکن نہیں۔ اور آبادی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اِس لئے زمین کی قیمت یقیناً زیادہ ہوجائیگی۔ انہوں نے اِس امر کا اندازہ نہیں کیا۔ کہ دنیا کے دوسرے حصوں میں لاکھوں ایکڑ قابلِ زراعت زمین کی دریافت ہوگی۔ اور وسائل آمدورفت میں بہت کچھ اصلاح رُونما ہوجائیگی۔ جب امریکہ کا گیہوں انگلستان کی منڈیوں میں بکثرت آنے لگا۔ تو قیمتیں بالکل گر گئیں۔ لگان میں تخفیف کردی گئی۔ چودہ سال کے عرصہ میں جقدر کمی ہوئی۔ وہ تخمیناً ۲۳ فیصدی تھی۔ زمین پر قبضہ رکھنے والوں کے نفع کے اوسط میں چالیس فیصدی کی کمی ہوگئی۔ اور ۱۸۷۵ء و ۱۸۹۴ء کے درمیان زمین کی قیمت میں ۴۹ فیصدی سے زیادہ کمی واقع ہوگئی[۱]۔

اِس مختلف تذکرہ سے ظاہر ہوجائیگا۔ کہ زمین کے لئے یہ ضروری نہیں۔ کہ اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا رہے۔ زمین کی قیمت میں تخفیف کے دو ممکن اسباب ہوسکتے ہیں۔ جن کا ذکر ہم کرچکے ہیں۔ دو اور سبب بھی ہیں جنہیں یقینی نہیں۔ بلکہ اغلب سمجھنا چاہئے۔ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں۔ زمین کی قیمت کا دار و مدار لگان اور ملکیت کی منفعت پر ہے۔ ان میں دو طریقوں سے تخفیف کیجاسکتی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے۔ کہ گاؤں کے مزدور صنعت و حرفت کی ترقی یا دوسری ترقیات کی وجہ سے کھیت میں کام کرنے کے عوض زیادہ حقِ خدمت طلب کرے۔ اور اس سبب اور اسی قسم کے دوسرے اسباب کی بنا پر مصارف زراعت میں اسقدر اضافہ ہوجائے۔ کہ زمیندار پیداوار کے ایک قلیل حصہ یعنی لگان پر قناعت کرلے۔ اگر مزارع پیداوار کا بیشتر حصہ حقِ خدمت کے طور پر اپنے قبضہ میں کرلے جب بھی یہی نتیجہ ہوگا[۲]۔

۱؎ کرنٹار کی کتاب: نارطہ ہسٹری آف انگلش ایگریکلچر صفحات ۲۴۴ و ۲۱۰ ۔

۲؎ انگلستان میں تو ۱۳۴۸ء میں ہی سیاہ بخار کی وجہ سے محنت کی فراہمی میں بہت کمی واقع ہوگئی تھی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مصارف زراعت بڑھ گئے۔ اور زمینداروں کا منافع بہت کم ہوگیا۔ جس رقبہ میں، الکلانِ ارضی تنخواہ دار مزدوروں کی مدد سے کاشت کیا کرتے تھے۔ اس میں بھی کمی واقع ہوگئی۔ اور زیادہ رقبہ لگان پر دیدیا گیا۔ پروفیسر تھورولڈ راجرس نے اندازہ لگایا ہے۔ کہ پرانے زمانے میں وبائے عظیم سے پہلے پہلے جب فارق اور ناظر زراعت کے منتظم تھے۔ اوسط درجہ یا اس سے زیادہ منافع (باقی بر صفحہ ۱۰۸)

دوسرا قرینِ قیاس سبب اضافہ محاصل ہے۔ ہندوستان عرصہ سے ایک ایسی حکومت کے نظم و نسق سے متمتع ہو رہا ہے۔ جو ایک متمدن ملک کے نظم و نسق کی ارزاں ترین صورت ہے۔ جب اس ملک میں جمہوری ادارے قائم ہونگے۔ تو یہ توقع ہے۔ کہ رفاہِ عام کے مصارف میں اضافہ ہو جائیگا۔ اور یہ اضافہ اِس قسم کی آئینی تبدیلی کے ساتھ ہر جگہ بروئے کار آ رہا ہے۔ مثلاً جبری تعلیم کا عام مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اور یہ مطالبہ پبلک فنڈ سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ جو محصول لگا کر پورا کیا جائیگا۔ رفاہِ عام کی بعض چیزیں مثلاً سڑکوں کی اصلاح، مویشی کی بیماریوں کا علاج ایسی چیزیں ہیں۔ کہ اُن سے تھوڑے عرصہ میں نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر تعلیم پر روپیہ صرف کیا جائے۔ تو بہت عرصے کے بعد تھوڑی سی مالی آمدنی ہو گی۔ اس عرصہ کے دوران میں مالکان اراضی یا مزارعین اور یا دونوں سے یہ مطالبہ کیا جائیگا۔ کہ زمین پر جو محصول لگائے گئے ہیں۔ انہیں ادا کریں۔ اور اسطرح زمیندار کو زمین کی ملکیت سے جو فوائد حاصل ہیں۔ اُن میں کمی واقع ہو جائے گی۔ یہ قرینِ قیاس ہے۔ کہ اِس قسم کا کوئی عنصر اضافہ قیمتِ زمین کی تحریک کو روک دیگا۔

لیکن اِن امور کا تعلق حال سے نہیں۔ بلکہ مستقبل سے ہے۔ اِس ضمن میں جو تازہ ترین اطلاعات موصول ہوئی ہیں)۔ وہ بھی خاص طور پر دلچسپ ہیں۔ لوئر دوابہ باری کی نوآبادی میں جو زمین سرکاری طور پر نیلام کے ذریعہ بیچی گئی۔ اس کی قیمت ۱۹۱۷ء میں ۲۲۹ روپے تھی۔ اور ۱۹۱۸ء میں ۳۳۱ روپے ہو گئی۔ اس زمین کی قیمت میں غالباً محض اِسلئے اضافہ ہوا۔ کیونکہ انہی دنوں یہ بات دریافت ہوئی تھی۔ کہ اِس علاقہ کی زمین امریکن رُوئی کی کاشت کیلئے

(بقایا از صفحہ ۲۰۷) زرخیزی کے سالوں میں ۱۸ فیصدی منافع ہُوا کرتا تھا۔ جب وبا دور ہو گئی۔ تو نفع بہت کم ہو گیا۔ یعنی سرمایہ پر ۴ فیصدی سے بھی کم رہ گیا۔ ۲؎ یہ اُمبادی النظر میں بہت بے قیمت چیز معلوم ہوتی تھی۔ زراعت کی سب سے زیادہ اہم ثانوی پیداوار یعنی اُون کی قیمت بہت گر گئی۔ اور جسمانی محنت سے جسقدر پیداوار ہوتی تھی۔ اسکی قیمت بڑھ گئی۔ ملاحظہ ابواب ۲۸+

؎ جبری تعلیم بھی کسانوں کے بچوں کو کھیتوں پر کام کرنے سے روکے گی۔ اور وہ جو کام اب کرتے ہیں۔ وہ یا تو کوئی نہ کریگا۔ اور اگر کرینگے بھی تو تنخواہ دار مزدور ہی کرینگے۔ اِسطرح مصارف زراعت میں اضافہ ہو جائیگا +

موزوں[1] ہے۔

دوسرے سال اِن گراں قیمتوں میں بھی اضافہ ہوگیا۔ ۸۸۶۰ ایکڑ رقبہ کی قیمت فروخت کا اوسط ۴۹۲ فی ایکڑ تھا۔ سب سے زیادہ قیمت ۲۵ ایکڑ کے ایک قطعہ زمین کی ادا کیگئی۔ جو خانیوال ریلوے اسٹیشن سے ایک میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں واقع ہے یہ قطعۂ زمین بحساب ۱۰۱۸ روپیہ فی ایکڑ فروخت ہوا۔ اِن قیمتوں کی گرانی کا باعث یہ ہے کہ بکثرت روپیہ ایسا موجود ہے۔ جسے سرمایہ دار کسی کاروبار میں لگانا چاہتے ہیں۔ اِس نظریہ کی تائید اِس واقع سے ہوتی ہے۔ کہ شہر منٹگمری میں بعض نئی دوکانوں کے لئے جو زمین خریدی گئی۔ اس کی قیمت ۸۲۲۱۲[2] روپیہ فی ایکڑ تھی +

قیمتوں میں جو مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اُس کی ایک وجہ ہر گاؤں کے مقامی حالات بھی ہیں۔ زمیندار موروثی کاشتکار رہتے ہیں۔ ایک ہی گاؤں میں وہ پیدا ہوتے ہیں سو ہیں پرورش پاتے ہیں۔ انہیں اپنے گاؤں سے اُسی صورت میں انتقالِ مکان کا خیال آسکتا ہے۔ کہ کسی نوآبادی میں انہیں زمین حاصل ہوسکے۔ گاؤں میں زمین کو فروخت کرنے کی کوئی منڈی نہیں۔ اگر ایک نووارد اپنے گھر بار کو چھوڑ کر گاؤں میں سکونت اختیار کرنا اور زمین خریدنا چاہیے۔ تو اس کا اعتماد نہیں ہوسکتا۔ کہ وہ زمین خریدنے کے بھی قابل ہوگا۔ اسطرح گویا گاؤں میں کوئی زمین ایسی نہیں ہے جسے "زمین برائے فروخت" کہا جاسکے۔ وراثت کے اصول ایسے ہیں۔ کہ ہر بیٹے کو اراضی میں سے حصہ ملتا ہے۔ اِسطرح زمین چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ اور اراضی کا مالک

---

[1] بہت زیادہ قیمتی فصل کی کاشت کے باعث قیمتیں گراں ہوجائینگی۔ جسطرح انگلستان میں ہاپ (ایک قسم کا کڑوا پودا) کی کاشت کی وجہ سے بیحد قیمتیں بڑھ گئی تھیں۔ ملاحظہ ہو کیلورٹ صفحہ ۱۴۹۔ اگر جنس کی پیدائش یا زراعت کی اصلاح میں کفایت شعاری سے کام لیا گیا۔ تو لگان زیادہ ہوجائیگا۔ اور اراضی کی قیمت بڑھ جائیگی۔

[2] سرکاری رپورٹ میں لکھا ہے۔ کہ جو کیفیت زرعی زمین کی ہے۔ وہی شہر کی ان سکنی زمینوں کی ہے۔ ان غیر معمولی قیمتوں کی وجہ بہت حد تک یہ ہے۔ کہ دیہات میں ایسے روپیہ کی فراوانی ہے جسے کسی ایسے کاروبار میں نہیں لگایا جا سکتا جس پر عوام کو اعتماد ہو۔ یہ موقع صنعتی نشو و ترقی کے لئے بہت مفید ہے۔ بشرطیکہ صنعتوں کا آغاز کرنیوالے عوام کا اعتماد حاصل کرسکیں +

اپنے ذرائع و وسائل کو کام میں لاکر جسقدر زمین کی کاشت کر سکتا ہے۔ اسکی نسبت بہ قطعۂ زمین
جو اُسے ورثہ میں ملتا ہے۔ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اِن اراضی کی وسعت میں اضافہ کا یہی طریقہ ہے
کہ اگر کوئی قطعہ اراضی قابلِ فروخت ہو۔ تو اُسے اس میں شامل کر لیا جائے۔ اس طرح گویا زمینداروں
کی اکثریت قابلِ فروخت اراضی کی خریدار بن سکے گی۔ چونکہ اراضی چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں۔ اور ہر اراضی
گاؤں میں دس بارہ حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ جو گاؤں میں مختلف مقامات پر واقع ہوتے ہیں
اِس لئے اراضی کی فروخت میں بھی سہولت ہے۔ انگلستان میں ایک اراضی جسکا رقبہ ۱۵۰
ایکڑ ہوتا ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے کرکے نہیں فروخت کیجاتی۔ بلکہ پوری اراضی یکبارگی بیچی جاتی ہے
اراضی کے ساتھ جو مکانات وغیرہ ہوتے ہیں۔ اُن کی وجہ سے اُسے مختلف قطعات اراضی میں
تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اِس طرح انہیں لوگوں سے اراضی کا خریدار بننے کی توقع ہو سکتی ہے۔
جو پوری اراضی کو خریدنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور یہ لوگ یقیناً اُن لوگوں سے تعداد میں
کم ہوتے ہیں۔ جو ایک چھوٹے سے قطعۂ اراضی کو خریدنے کے لئے روپیہ مہیا کر سکتے ہیں۔
یہاں اوّل تو کھیت ہی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور پھر جن کھیتوں کی زراعت ایک ہی
شخص کے سپرد ہے۔ اُنکے لئے ضروری نہیں۔ کہ ایک ہی جگہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے
واقع ہوں۔ اِس لئے فروختِ اراضی آسان ہے۔ ایک سودے میں اوسطاً جو رقبہ فروخت کیا
جاتا ہے۔ وہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اور اس کی قیمت بھی ایسی نہیں ہوتی۔ کہ گاؤں کے اکثر
باشندوں کی حیثیت سے بڑھ کر ہو۔ پھر وہ سب کے سب یہ چاہتے ہیں۔ کہ اُن کی
مملوکہ اراضی میں اضافہ ہو۔ ایک سودے میں اوسطاً جو رقبہ فروخت کیا گیا ہے۔ اسکی تفصیل
ذیل میں ملاحظہ ہو۔

سنہ ۱۹۰۱ء تک پانچسال کے عرصہ میں	۹و۵ ایکڑ مجموعی طور پر		۲و۳ ایکڑ رقبہ مزروعہ	
سنہ ۱۹۰۶ء	؍؍	۷و۵	؍؍	۳٫۴	؍؍
سنہ ۱۹۱۱ء	؍؍	۵	؍؍	۲و۸	؍؍
سنہ ۱۹۱۶ء	؍؍	۴و۵	؍؍	۲و۶۸	؍؍
سنہ ۱۹۱۹ء و سنہ ۱۹۲۰ء میں		۴و۰۶	؍؍	۲و۶	؍؍

گویا جو قطعاتِ اراضی فروخت ہوتے ہیں۔ وہ بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور جوں جوں زمانہ آگے قدم بڑھاتا جاتا ہے۔ وہ چھوٹے ہوتے جاتے ہیں۔ اسکی مثال بلجیم میں مل سکتی ہے۔ کیونکہ اس ملک میں بھی بیشتر اراضی کا رقبہ تھوڑا ہے۔ وہاں جب ایک چھوٹا سا قطعہ اراضی میں قابلِ فروخت ہوتا ہے۔ گاہک یا مزارعین وہ اس کے جائے وقوع پر جا پہنچتے ہیں دوسری جانب انگلستان کی یہ کیفیت ہے۔ کہ اگر ایک بڑے کھیت کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ تو بلجیم کی طرح آس پاس کے لوگوں میں اتنے کافی اشخاص نہیں نکلیں گے جو اُسے اجارہ پر لینے یا خریدنے کے خواہشمند ہوں۔ اِسطرح یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اِس امر کی جانب میلان زیادہ ہو رہا ہے۔ کہ زمین کی زیادہ قیمت حاصل کرنے کیلئے اُسے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ دونوں ملکوں میں بڑی بڑی اراضی کی نسبت چھوٹی اراضی کی مانگ زیادہ ہے۔ ایسے لوگ نسبتاً کم ہیں جنکے پاس بڑی اراضی کو خریدنے یا اجارہ پر لینے کیلئے کافی روپیہ ہو۔ اِس لئے جب وہ فروخت ہونے کے لئے منڈی میں آتی ہیں۔ تو ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ جو اُسے حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بولی دیں۔ لیکن چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی کی یہ کیفیت نہیں[1]۔

پنجاب کی بھی یہی کیفیت ہے۔ چونکہ مالک اراضی بلا اعانت غیرے جتنی زمین کی کاشت کر سکتا ہے۔ اس سے عام طور پر اسکی مملوکہ اراضی چھوٹی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہے۔ کہ اپنی زمین میں اضافہ کرے۔ چونکہ اراضی چھوٹی ہوتی ہے۔ اِس لئے اسکی قیمت بھی آس پاس کے اکثر لوگوں کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے۔ اِس امر کو کوئی نقص نہیں سمجھا جاتا۔ کہ زیرِ خرید اراضی خریدار کی مملوکہ اراضی کے پاس واقع نہیں۔

اِن اثرات کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے۔ جو بیحد اہمیت رکھتی ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے۔ کہ زمینداروں کو اپنی اراضی کی وسعت بڑھانے کا موقعہ ملے۔ صوبہ میں تخمیناً پچیس لاکھ ایسے کنبے ۳۴۲۰۰ دیہات میں آباد ہیں۔ جنکی زندگی کا سہارا زراعت ہے

[1] ملاحظہ ہو رونٹری کی لینڈ اینڈ لیبر" میں بلجیم سے سبق صفحہ ۱۵۱۔

اکیس سال کے عرصہ میں اراضی کے ۹۶۲۰۰۰ سودے ہوئے - یا یوں کہئے - کہ ایک سال کے اندر ۴۶۰۰۰ سودے کئے گئے - اِسطرح گویا اکیس سال کے طویل عرصے میں فی گاؤں انتیس اراضی کی خرید و فروخت ہوئی - ہر زراعت پیشہ کنبے کو ۴۸ سال کے عرصہ میں ایک مرتبہ کہیں زمین خریدنے کا موقعہ ملا - یا اگر ہم فرض کریں - کہ بیچنے والوں اور خریداروں کی تعداد ایک جتنی ہے - پھر بھی کہیں ۷۲ سال میں ایک مرتبہ مزروعہ زمین کے خریدنے کا موقعہ ملا - یہی وجہ ہے - کہ زمین کی قیمت اِس قدر زیادہ ادا کیجاتی ہے - خریداری میں باہمی مسابقت[1] و مقابلہ بہت زیادہ ہے - زمین کی قیمت اُس کی کمیابی کی بنا پر زیادہ ہوتی ہے - اگر کلّو جیسے دور دست علاقہ میں بھی زمین کی بہت زیادہ قیمت ادا کیجاتی ہے - تو اُس کی وجہ محض کمیابی ہے - اس کوہستانی علاقہ میں ۱۸۷۱ء سے ۱۸۹۱ء تک زمین کی قیمت اوسطاً ۲۷ روپیہ فی ایکڑ رہی ہے - اور ۱۸۹۱ء سے ۱۹۱۲ء تک ۸۵ روپیہ فی ایکڑ - گزیٹر میں لکھا ہے - کہ قیمت زمین کا تعلق اُس نفع سے نہیں - جو زمین کی پیداوار سے حاصل کیا جاتا ہے - ہمالیہ کے وسطی علاقہ میں زمین کی قیمت بہت زیادہ ہے - چنانچہ لاہل میں ۱۵۷ روپیہ فی ایکڑ ہے - اور سپتی[2] میں ۱۳۲ روپیہ فی ایکڑ قیمتوں کی گرانی کی وجہ یہ ہے - کہ قابلِ زراعت زمین کمیاب ہے - چونکہ آبادی بھی منتشر ہے - اس لئے زمین کی قیمت اس کے وقوع کے اعتبار سے بھی بہت بڑھ جاتی ہے - لوگ محنت مزدوری اور تجارت سے تھوڑا سا روپیہ کما لیتے ہیں - اور اُسے کاروبار میں لگانے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں - کہ یا تو مویشی پالیں یا زمین پر روپیہ لگائیں - اِن سنسان علاقوں میں اگر ایک گاؤں کے باشندے کو جس کے پاس روپیہ موجود ہو - یہ بھی معلوم ہو جائے - کہ وہ دیہات سے آگے گذر کر کوئی زمین برائے فروخت موجود ہے - تو وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا[3] -

[1] جہاں زمین آزادانہ خریدی جاسکتی ہے - وہاں اسکی قیمت بعض عارضی اسباب و عوامل مثلاً غلہ کی قیمت محنت کا معاوضہ وغیرہ وغیرہ کے تابع ہے - لیکن جہاں طلب رسد سے بڑھ جاتی ہے - ان کا کوئی اثر نہیں رہتا -

[2] یہ اعداد و شمار بہت دلچسپ ہیں - کیونکہ جس رقبے سے انکا تعلق ہے - اُن پر وہ اسباب و عوامل اثر انداز نہیں (باقی بر صفحہ ۲۱۳)

یہ بات واضح ہوتی جاتی ہے۔ کہ جن اثرات و عوامل کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ انکی وجہ سے اِسقدر زمین کی قیمت اقتصادی حدود سے باہر نکل گئی ہے۔ پچھلے دنوں کورٹ آف وارڈس کے متعلق پنجاب میں ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس میں بیان کیا گیا تھا۔ کہ ۲۰۰۰۰۰ ایکڑ زمین کی قیمت کا اندازہ ۹۴ روپے فی ایکڑ لگایا گیا۔ اِس وسیع رقبہ سے جو خام آمدنی ہوتی ہے۔ وہ قیمت زمین کے سات فیصدی سے کم ہے۔ اور مالگذاری ادا کرنے کے بعد صرف پانچ فیصدی رہ جاتی ہے۔ اور جب اس سے انتظام زمین اور شکست و ریخت کے اخراجات وضع کر لئے جائیں۔ تو منافع محض ۴½ فیصدی رہ جائیگا۔ اگر زمین کی قیمت مالگذاری سے ۱۵ گنا زیادہ ہو۔ (۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء میں قیمت زمین اور مالگذاری کا یہی تناسب تھا) تو منافع خالص صرف تین فیصدی رہ جاتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جو رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں بھی اِس نوع کے نتائج بیان کئے گئے ہیں۔ مصارفِ زراعت کا صحیح تخمینہ تو کسی وقت اور کسی جگہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اور پنجاب میں تو ریکارڈ میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ ہم نے جو اعداد پیش کئے ہیں۔ انہیں ایک وسیع رقبہ کا جو سارے صوبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ صحیح حساب سمجھنا چاہئے۔ اِس سے یہ بات ظاہر

(۲۱۲ کا بقایا) ہوئے۔ جو عام طور پر گراں قیمت زمین کا باعث ہوتے ہیں۔ آبادی میں سرعت سے اضافہ نہیں ہوا۔ کوئی نئی منڈی بھی موجود نہیں۔ ریلوے بھی نہیں، صنعتوں کا بھی وجود نہیں۔ شہری آبادی بھی نہیں۔ ایک سڑک کے سوا باقی تمام سڑکوں کی کیفیت ہے جو صدیوں سے چلی آتی ہے۔ تجارت برآمد بھی نہیں جسے اضافہ کا سبب قرار دیا جا سکے۔ ان مقامات میں اضافہ قیمت کے اسباب یہ ہیں۔ برطانی حکومت کیوجہ سے امن و امان ہے۔ مالگذاری تھوڑی ہے۔ تبت اور وسط ایشیا سے تجارت کے باعث جس کے لئے بہت سہولتیں میسر ہیں۔ نفع ہو رہا ہے، اور اسی وجہ سے قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔ زمین اب تک ایک حد سے بڑھی ہوئی سرکاری مالگذاری وصول کرنیکا بہانہ نہیں بلکہ سامانِ معاش کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جس سے امن و امان کی بدولت لطف اُٹھایا جا سکتا ہے۔

[۱] ملاحظہ ہو رونلڈی کی کتاب "لینڈ اینڈ لیبر" (بلجیم سے سبق) محض تجارتی اسباب ہی نہیں۔ بلکہ بعض دوسرے وجوہ بھی ہیں جو بلجیم کے خریداران اراضی پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ہنڈیاں زیادہ قیمتی ہیں چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کو خریدنے کیلئے اسقدر مقابلہ ہوتا ہے کہ عام طور پر زیادہ قیمتیں ادا کیجاتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ زمین کی پیداوار اسقدر نہیں جس سے ادا کردہ قیمت کا مناسب سود حاصل ہو سکے۔ پنجاب میں یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ درحقیقت کسقدر قیمت ادا کیجاتی ہے کیونکہ فنی نفع کے قانون کے اندیشہ سے پہلے ہی حد سے بڑھی ہوئی رقم بتلائی جاتی ہیں۔

ہوتی ہے۔ کہ زمین کی قیمت اُس کی پیداوار کی قیمت کے اعتبار سے جسقدر ہونا چاہئے۔ اس سے بہت زیادہ ہے۔ ہم نے صوبہ کی جس عام خوشحالی کا ذکر کیا ہے۔ کچھ تو اس کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ لوگوں نے فوجی ملازمت کر کے بہت سی آمدنی حاصل کر لی۔ اور اکثر لوگوں نے امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ میں جاکر بہت روپیہ کمایا ہے[1]۔ پنجاب کے لوگوں کے پاس بڑی بڑی رقوم جمع ہو گئی ہیں۔ وہ اس روپیہ کو یا تو زمین پر لگا دیتے ہیں۔ اور یا زیورات بنوا لیتے ہیں۔ کسی زمانہ میں زیور بنوا لینا زاید از ضرورت کو جمع رکھنے کا ایک معقول عام طریقہ تھا۔ لیکن جب زیور کا روپیہ حاصل کرنا چاہیں تو اس میں نقصان ہوتا ہے۔ لیکن زمین خریدنے میں ایک بڑی کشش یہ ہے۔ کہ اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اور یہی اضافہ قیمت دراصل اضافہ قیمت کا سب سے بڑا باعث ہے۔ کیونکہ تجربہ شاہد ہے۔ کہ اگر آج زمین کی خرید پر کچھ روپیہ صرف کیا جائے۔ تو جب زمین کو فروخت کر کے روپیہ وصول کرنا چاہیں تو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہو گا۔ اگر زمین خریدنے کے وقت قیمت خرید کے لائق نہیں ہوتی۔ تو چند سال کے بعد ہو جاتی ہے۔ اسطرح گویا قیمت زمین کے اضافہ کا اندازہ کر کے زمین خریدی جاتی ہے۔ ایک اور سبب یہ ہے۔ کہ اکثر پیشوں کے لوگ جو دولت حاصل کر رہے ہیں۔ وہ اُسے لگانے کے لئے کوئی محفوظ اور مناسب کاروبار تلاش نہیں کر سکتے۔ صنعت و حرفت ابھی غیر اہم چیز ہے۔ اور سرمایہ مشترکہ سے کاروبار شروع کرنے کا طریقہ بھی مٹنے والا ہے۔ جس علاقہ کے اندر ۱۸۶۸ء میں ۷۰ وکیل تھے۔ اب اس میں ۱۳۰۰ وکیل ہیں۔ یہ لوگ اور اسی طرح کے دوسرے پیشوں کے لوگوں میں یہ فطری خواہش موجود ہے۔ کہ وہ ایسی جایداد کے مالک بن جائیں۔ جس کی قیمت میں کمی واقع نہ ہو۔ ان حالات میں تو خالص آمدنی بھی چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔

اُوپر ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اضافہ قیمت زمین کوئی ایسی بات نہیں جس پر خوشی ظاہر کیجائے۔ بلکہ یہ چیز نہایت فکر و تشویش کی محتاج[2] ہے۔ بہت کم ایسا

---

[1] غیر ممالک سے جو منی آرڈر آئے۔ اُن کی وجہ سے پہلے پہل پنجاب کے اندر ۱۸۹۵ء و ۱۸۹۶ء میں روپیہ کی توخیر ہوئی پنجاب سے جو رقمیں باہر بھیجی گئیں اُنکی نسبت جو رقوم یہاں آئیں سنہ ۱۹۰۰ء و ۱۹۰۱ء میں بقدر ۲۵ لاکھ کے زیادہ تھیں۔ سنہ ۱۹۱۰ء و ۱۹۱۱ء میں ۴۲ لاکھ اور سنہ ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء میں ۸۰ لاکھ سے زیادہ + (۲ے بر صفحہ ۲۱۵)

ہوا ہے۔ کہ زمین پر روپیہ لگانے کی وجہ سے زراعت کو کوئی فائدہ پہنچا ہو۔ بلکہ اکثر اوقات جیسا کہ انگلینڈ
اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ ہم
کہہ چکے ہیں۔ کہ اضافہ قیمت زمین کی ایک بہت بڑی وجہ خود اضافہ قیمت زمین ہے۔ اگر زمین
کی قیمت میں کمی واقع ہو جائے۔ تو لوگوں کو اس پر روپیہ لگانے کا شوق بھی نہیں رہے گا۔
اس طرح بہت سا سرمایہ جسے اب زمین پر لگایا جاتا ہے بچ جائیگا۔ جس سے اصلاح و ترقی
کے دوسرے کام کئے جا سکتے ہیں۔ یہ نقص تو واضح ہے۔ کہ صوبہ کا سارا جدید سرمایہ زمین پر لگا
دیا جاتا ہے۔ زمین کی اصلاح پر صرف نہیں کیا جاتا۔ صوبہ میں ریلوے کی کئی کمپنیاں ہیں، تاہم
سرکاری رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء میں تقریباً ۲½ کروڑ روپیہ صرف زمین خریدنے
پر صرف کیا گیا[۲]۔ یہ روپیہ تو رقبہ مزروعہ کی توسیع کے کام آیا۔ اور نہ اس موجودہ رقبہ مزروعہ کی پیداوار
کو ترقی دی گئی۔ یہ امر قابل غور ہے۔ کہ نہ تو قیمت زمین میں اضافہ ہونے نہ اراضی کی خریداری بڑھنے
اور نہ سرمایہ کی فراوانی کیوجہ سے بیکار زمین سے فائدہ اٹھانے اور دلدلوں اور ویرانوں میں نالیاں
لگانے کی کوشش کی گئی۔ بلکہ اس زمین کی حالت سدھارنے کی سعی کی گئی جسے ندی نالوں
نے نقصان پہنچایا ہے۔ صوبہ کی زمین کا ایک بہت بڑا رقبہ فی الحال قابل زراعت نہیں۔ لیکن
اگر روپیہ صرف کیا جائے۔ تو اس زمین کا اچھا خاصہ حصہ زراعت کے قابل بن سکتا ہے۔ اس
سلسلہ میں سعی و اقدام اور ہمت و جرأت کی جو کساد بازاری ہے۔ وہ زیادہ توجہ و التفات کی مستحق ہے۔
ایک اور بڑا نقص یہ ہے۔ کہ زمین کی بڑھی ہوئی قیمت کیوجہ سے چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی

(۲۱۴ کا بقایا) ہاں یہ چیز باعث مسرت ہے۔ کہ اسطرح صوبہ میں دولت کی فراوانی اور مالگذاری کے کم ہونے کا ثبوت فراہم ہو گیا۔

۱؎ ڈنمارک کے ایک وزیر کا ایک قول "بٹر بزنس" کی جلد چہارم نمبر ۲ صفحہ ۱ میں درج کیا گیا ہے۔ اسکا بیان ہے کہ ڈنمارک میں قیمت زمین محض قیاس کی بنا پر روپیہ لگانے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ اسے قوم کی محنت اور خوشحالی کا سرچشمہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہ صورت حال ملت کیلئے بہت مضر اور اسکے سود و بہبود میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

۲؎ یہ اعداد مبالغہ آمیز معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ عام دستور یہ ہے کہ بیع ناموں میں اصل قیمت سے بہت زیادہ لکھی جاتی ہے تاکہ حق شفع کا خطرہ نہ رہے۔ ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں ۳ کروڑ ۹۲ لاکھ روپیہ کی زمین خریدی گئی۔

یا مزارعین ہیں جنکی پونجی تھوڑی سی ہے۔ یہ ہمت کہاں کہ زمین خریدنے کی جرأت کر سکیں۔ اُن مالکان اراضی کی صحیح تعداد معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں جنہیں گذشتہ سالوں میں بیدخل کر دیا گیا ہے لیکن گذشتہ ۱۲ سال کے عرصہ میں زمین کی فروخت کے ۹۶۰۰۰ سودے ہوئے ہیں۔ انمیں کچھ تو وہ مالکانِ اراضی ہونگے۔ جو زمینداری کے مرتبہ سے گر کر محض مزارع رہ گئے۔ اِس کا یہ جواب نہیں کہ اگر انمیں تخفیف ہوئی۔ تو دوسری اراضی میں اضافہ بھی تو ہوا۔ اگر ایک آسودہ حال شخص نے اپنی جائیداد میں جو اتنی بڑی ہے۔ کہ وہ اس کی بدولت بآسائش تمام زندگی بسر کر سکتا ہے۔ چند ایکڑوں کا اضافہ کر لیا۔ تو یہ چیز کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اہمیت تو اس بات کو حاصل ہے۔ کہ وہ مزارعین اور زمیندار جن کی اراضی سے اقتصادی نفع نہیں ہوتا۔ کفایت شعاری[1] کی بدولت اپنی اراضی میں اضافہ کرنے کے قابل ہو جائیں۔ صوبہ کی تقریباً نصف زمین کی کاشت غیر موروثی مزارعین کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں۔ جو اسی گاؤں یا پاس پڑوس کے کسی گاؤں میں خود مالک اراضی بھی ہیں۔ لیکن ایسے مزارعین کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ جو مالکانِ اراضی نہیں، اگر وہ زمین کے مالک بن جائیں۔ تو اس سے صوبہ کی اقتصادی حالت مستحکم ہو جائیگی۔ دوسرے ممالک میں روپیہ قرض لیکر زمین خرید لینا اور پھر اُس روپیہ کو قسطوں میں ادا کر دینا ممکن ہے۔ لیکن پنجاب میں یہ کیفیت ہے۔ کہ اگر کوئی شخص روپیہ قرض لیکر زمین خرید لے۔ تو زمین کی پیداوار اسقدر نہیں ہوگی۔ کہ اس سے سود بھی ادا ہو سکے۔

اضافہ قیمت زمین کے ساتھ ساتھ اُس روپیہ کے اوسط میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جو زمین رہن کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی فائدہ کی بجائے نقصان ہی ہوا ہے۔ پنجاب میں زمیندار نے اپنی ساکھ سے پیداوار بڑھانے کے لئے روپیہ نہیں لیا۔ البتہ جوں جوں اس کی

---

[1] یا زمین پر ایسے حقوق ہوں جنکی وجہ سے معیشت محفوظ ہو سکتی ہے۔ جذبات سے قطع نظر کر لیجئے۔ تو مالک اراضی بننے میں کوئی خاص خوبی نہیں۔ اگر مزارع کے حقوق محفوظ ہو جائیں۔ (یعنی وہ اسقدر محفوظ ہو جائے۔ کہ مالک اراضی جب چاہے اُسے بے دخل نہ کر سکے) تو بہتر یہ ہے کہ کسان اپنا سارا سرمایہ ذخائر آلات کشاورزی اور کھاد وغیرہ پر صرف کر دے اور زمین نہ خریدے اِن چیزوں سے اُسے نسبتاً زیادہ نفع حاصل ہوگا +

سالکہ زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ وہ قرض لیتا جاتا ہے۔ اور اس قرض سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ جو شخص اپنی زمین بیچنا چاہتا ہو۔ اس کے لئے زمین کی موجودہ گراں قیمت بہت اچھی ہے لیکن لیکن اس کسان کیلئے جو ساری عمر اراضی میں صرف کرنا چاہتا ہو۔ یہ چیزیں محض قرض لینے کی محرک ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ جن ملکوں میں زراعت کا نظام اچھا نہیں۔ اور مزدور کافی مہیا نہیں ہوسکتے۔ وہاں زمین کی قیمت گراں نہیں رہ سکتی۔ اور یہ قرین قیاس ہے۔ کہ اگر روپیہ لگانے کے لئے کوئی نئی راہ آئی۔ جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ تو آج پنجاب میں جو غیر اقتصادی نرخ نظر آ رہے ہیں۔ وہ نہیں رہینگے۔ جنگ کا ایک اثر تو یہ ہوا ہے۔ کہ سرکاری ہنڈیوں کا سود بڑھ گیا۔ اور اس میں اور اس آمدنی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ جو ایسی زمین سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کا نقد لگان دیا گیا۔ اس کا ایک اور اثر یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ریلوے کمپنیوں کے برطانی حصہ دار حصّوں کو اس نرخ پر بیچیں جنہیں یہاں کے سرمایہ دار خریدیں۔ اِس قسم کے رجحانات سے صوبہ کو غالباً فائدہ پہنچیگا کیونکہ یہ ظاہر ہے۔ کہ اس صوبہ کی دولت میں سرعت سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اور از بسکہ زمین کے سوا اس دولت کو اور کہیں لگانے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اِس لئے غیر اطمینان بخش[1] صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ پورے وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ آیا صنعت و حرفت کی ترقی کا دور زمین کی قیمت میں کمی کر دیگا۔ یا اس کے اضافہ کو روک دیگا۔ صوبہ کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اور

---

[1] متذکرہ بالا بحث کے سلسلہ میں حسب ذیل اقتباس جو ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۱ء کی مالگذاری کی رپورٹ سے متعلق ہے۔ نہایت دلچسپ ہے۔ جائیداد رہن کر کے قرض لینے میں جو اضافہ ہوا ہے وہ کس حد تک اضافہ قیمت زمین کی وجہ سے ہے۔ اور کس حد تک زراعتی آبادی کے مصارف میں اضافہ اس کا باعث ہے۔ آیا یہ روپیہ ضروریات میں صرف ہوا ہے یا اس باب تعین میں۔ یہ تمام ایسے سوالات ہیں۔ جن کا کوئی قطعی جواب دینا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ اقتصادی اور معاشرتی حالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تمام اسباب ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن یہ تو کسی قدر وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ زرعی زمین کی قیمت میں اضافہ نے مالکِ اراضی اور کسان کی ساکھ بڑھا دی ہے۔ اور وہ ضروریات زندگی اور اسباب تعیش کی بڑھی ہوئی قیمتیں ادا کرنے کے لئے روپیہ فراہم کر سکتا ہے۔

مسلمانوں کا بیشتر حصہ ایسی ہنڈیاں جن سے سود حاصل ہو سکے۔ نہیں خریدیگا۔ بلکہ اگر اُسے نفع بھی ہو۔ جب بھی وہ اُسے خریدنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ مسلمان ریلوے یا دوسرے صنعتی کارخانوں کے حصے خریدنے میں بھی پس و پیش کرتے ہیں۔ اُن میں اکثر ایسے ہیں جو تجارت سے ہی محترز ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک وہ منافع جو زمین سے حاصل ہوتا ہے۔ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ انہیں تو صرف اِس امر سے سروکار ہے۔ کہ انہیں مذہباً اراضی خریدنے کی اجازت ہے۔ اور اس پر وہ جو روپیہ لگائیں گے۔ وہ محفوظ رہیگا۔ اِس طرح گویا مسلمانوں کو ایک قوت اراضی کی خرید پر آمادہ کر رہی ہے۔ اگرچہ وہ وسیع رقبہ کے مالک ہیں۔ لیکن یہ چیز انہیں مزید رقبہ پر قبضہ کرنے کی خواہش سے باز نہیں رکھ سکتی۔ زراعت ایک ایسی صنعت ہے۔ جو مسلمانوں کو پسند ہے۔ کیونکہ اس پر کوئی مذہبی پابندی عاید نہیں۔ اِس امر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کہ اُن کے اِس جذبہ نے قیمت زمین پر کس قدر اثر ڈالا ہے۔

نواں باب

اضافہ قیمت زمین کے اثرات

جب حالات و اسباب ایسے ہوں۔ کہ اقتصادی قوتیں پورا پورا اثر ڈال سکیں تو یہ معلوم کرنا بہت آسان ہے۔ کہ اِن قوتوں کا میلان کس طرف ہے۔ لیکن جب رجحانات رسم و رواج تعصبات یا جہالت سے متاثر ہوں۔ تو یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ کہ حقیقی زندگی میں اقتصادی قوتوں سے کیا نتائج رونما ہونگے۔ ابھی تک پنجاب کی تنظیم اقتصادی اصولوں پر نہیں کی گئی لیکن آہستہ آہستہ یہ صوبہ اِس منزل کیجانب بڑھ رہا ہے۔ اضافہ قیمت زمین سے جو اقتصادی نتائج رونما ہوئے ہیں۔ اُن پر روشنی ڈالنے کے انجمن ہائے اِمداد باہمی کے انسپکٹروں کے پاس گیارہ سوالوں کی ایک فہرست بھیجی گئی تھی۔ یہ سب کے سب گریجویٹ تھے۔ (اور تقریباً سب اقتصادیات کے گریجویٹ تھے۔) انہیں ہدایت کی گئی تھی۔ کہ وہ محض حقائق معلوم کریں۔ اور انہیں اپنی رائے سے بالکل الگ الگ رکھیں۔ دونوں کو آپس میں گڈمڈ نہ ہونے دیں۔ ہاں! جب وہ حقائق بیان کر چکیں۔ تو ہر سوال کے متعلق اپنی رائے بھی ظاہر کریں۔ ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی گئی تھی۔ کہ جب وہ انجمن امداد باہمی کا معائنہ کرنے کیلئے دورہ کی غرض سے نکلیں۔ تو ساتھ ساتھ اِن سوالات کے متعلق بھی تحقیقات کرتے جائیں۔ چنانچہ یہ باب اِنہیں سوالات اور اُنکے جوابات کے خلاصہ پر مشتمل ہے۔

پہلے سوال کا مفہوم یہ تھا کہ اضافہ قیمت زمین کے متعلق جسقدر اطلاعات فراہم ہو سکیں۔ فراہم کیجائیں۔ چونکہ یہ معلوم کرنا آسان نہیں تھا۔ کہ آیا ایک ہی قطعۂ زمین چند سالوں کے بعد دوبارہ فروخت نہیں کر دیا گیا۔ اِس لئے صرف اِسقدر کہنے پر اکتفا کیا گیا۔ کہ صوبہ بھر کی زمین کی قیمت

میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بہر حال یہ اضافہ قیمت صوبہ کے مختلف حصوں میں یکساں نہیں بڑے
بڑے شہروں کے قرب و جوار میں جو زمینیں واقع ہیں۔ انکی قیمت میں زیادہ اضافہ ہوا ہے
جن زمینوں کی فصل سال میں دو مرتبہ ہوتی ہے۔ یا جن کی آبپاشی کا معقول انتظام ہے۔ انکی
قیمت بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن انسپکٹر اس اضافہ قیمت کی وجوہ یہ بتاتے ہیں۔ کہ پیداوار
کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ کسان خوشحال ہو گئے ہیں۔ اور اُن کے پاس بہت سا روپیہ ہے۔
اور زمین کے سوا کوئی دوسری صنعت نہیں جس پر وہ روپیہ لگا سکیں چنانچہ لائل پور کی نوآبادی
میں مربع (جو تقریباً ۲۷ ایکڑ ہوتے ہیں) ۱۹۱۴ء میں بحساب ۴۰۰۰ روپیہ فی مربع فروخت
ہوئے ۱۹۱۵ء میں اُن کی قیمت ۶۰۰۰ روپیہ تھی۔ ۱۹۱۷ء میں ۸۰۰۰ روپیہ ۱۹۱۸ء
میں ۱۰۰۰۰ روپیہ ۱۹۱۹ء ۱۶۰۰۰ روپیہ اور ۱۹۲۰ء میں ۲۲۰۰۰ روپیہ۔ یہ قیمتوں کا اوسط نہیں
بلکہ صحیح مثالیں ہیں۔ اِن مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ لوگوں کے پاس کس قدر روپیہ ہے۔
اور جو لوگ صاحبِ زر ہیں۔ وہ اراضی کو زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کر کے خریدنے پر آمادہ
ہیں۔ گورداسپور میں بعض قطعاتِ اراضی دوبارہ فروخت کئے گئے۔ انکی قیمت فروخت کے
متعلق حسب ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں۔

رقبہ	پہلی مرتبہ قیمت فروخت	دوسری مرتبہ قیمت فروخت	دونوں سودوں کا درمیانی وقفہ
۲½ ایکڑ	۱۰۰۰	۱۴۰۰۰	۱۲ سال
۳ "	۲۴۰	۳۵۰	۵ سال
۷ "	۹۰۰	۱۳۴۰	۵ سال
۳½ "	۱۰۰۰	۱۵۷۵	۵ سال
۲ "	۱۰۰	۲۵۰	۶ سال

ایک انسپکٹر لکھتا ہے۔ کہ سکھوں کے زمانہ حکومت میں زمین کو ایک بارِ گراں سمجھا جاتا
تھا۔ میرے (انسپکٹر کے) اپنے گاؤں میں یہ روایت مشہور ہے۔ کہ سکھوں کے زمانہ میں ایک
شخص گلی کوچوں میں اِس قدر بلند آواز سے گاتا پھرتا تھا کہ اُس کی آواز پردہ نشیں عورتوں کے کانوں
تک پہنچتی تھی۔ پنچایت نے فیصلہ کیا۔ کہ سزا کے طور پر اُسے پچاس ایکڑ زمین دے دی جائے

تاکہ وہ اُس کی کاشت کرئے اور مالگذاری بھی ادا کرے۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ کسی انسپکٹر نے یہ نہیں لکھا۔ کہ قیمت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ یا پیداوار اِس قدر کم ہوتی ہے۔ کہ جو روپیہ لگایا جاتا ہے۔ اُس سے اچھی خاصی آمدنی نہیں ہوتی۔

دوسرے سوال کا مطلب یہ تھا۔ کہ لوگ اضافہ قیمت زمین کی کیا وجہ بتاتے ہیں۔ جو جوابات موصول ہوئے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عوام اضافہ قیمت زمین کو حسب ذیل اسباب میں کسی نہ کسی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

(۱) پیداوار کی قیمت میں اضافہ۔

(۲) دولت میں اضافہ۔

(۳) ذرائع ریل و رسائل میں ترقی۔

(۴) نہروں سے آبپاشی کے انتظام میں ترقی۔ اور مزید ترقی کی توقع۔

(۵) آبادی میں اضافہ۔

(۶) قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے کسان اپنے کام میں زیادہ محنت و مشقت کرتے ہیں۔ اور اسطرح زیادہ پیداوار حاصل کرتے ہیں۔

(۷) لوگ بہ نسبت سابق روپیہ صرف کرنے پر زیادہ آمادہ ہیں۔ اور وہ روپیہ جمع کرنے یا زیور بنوانے کی بجائے روپیہ کو زراعت میں لگانا پسند کرتے ہیں۔

(۸) قانون انتقال اراضی کی وجہ سے ساہوکاروں کو زمین پر قبضہ کرنے میں آسانیاں نہیں رہیں۔ لیکن وہ جس زمین پر قبضہ کر سکتے ہیں اُسکی قیمتِ خرید زیادہ ادا کرتے ہیں۔

(۹) آسٹریلیا۔ امریکہ اور دوسرے اجنبی ممالک میں جو پنجابی ہیں۔ وہ برابر وہاں سے روپیہ بھیج رہے ہیں۔ اور یہ روپیہ قیمت زمین کا خیال کئے بغیر زمین پر لگایا جا رہا ہے۔

(۱۰) زمین میں اصلاح ترقی پر ہوئی ہے۔ اور اُسے زیادہ زرخیز بنا دیا گیا ہے۔

(۱۱) وراثت کا جو دستور رائج ہے۔ اُس کی وجہ سے زمین خاندان کے افراد میں تقسیم ہوتی جاتی ہے۔ اسکی مانگ زیادہ ہو گئی ہے اور مانگ نے قیمت بھی بڑھا دی ہے۔

(۱۲) روپیہ علی الخصوص کاغذی نوٹوں کی قدر کم ہو گئی ہے۔

علم خیال کے مطابق پر اضافہ قیمت زمین کے اسباب یہ ہیں۔ پیداوار کی قیمت میں اضافہ دولت میں اضافہ۔ اور یہ امر کہ کسانوں کو روپیہ لگانے کے لئے زراعت سے زیادہ کوئی موزوں صنعت نظر نہیں آتی۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ جوابات معقول ہیں۔ اگرچہ جواب ۶ اور ۱۰ بہت حیرت انگیز ہیں۔

اِس سلسلہ میں اِس امر کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ کہ مسلمانوں کو سود لینے پر اعتراض ہے۔ زمین کی قیمت پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ جتنے روپے میں زمین خریدی گئی ہے اگر اُس کا سود لیا جائے تو زمین کی آمدنی سے زیادہ ہو گی۔ لیکن جہاں سُود لینا ہی خارج از بحث ہو۔ تو زمین سے جقدر آمدنی حاصل ہو گی۔ اُسے غنیمت سمجھا جائیگا۔

تیسرا سوال یہ تھا۔ کہ آیا اضافہ قیمت زمین سے زمین کی اِصلاح و ترقی پر کوئی اثر پڑا ہے۔ (خوشگوار یا ناخوشگوار)

جن رقبوں کی آبپاشی نہروں یا کنوؤں سے ہوتی ہے۔ وہاں تو اضافہ قیمت زمین کی وجہ سے اصلاح و ترقی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ کیونکہ عام خیال یہ ہے۔ کہ زمین کی ترقی کا انحصار بہت حد تک پانی کی بہم رسانی پر ہے۔ بہر حال اس امر کیجانب عام رجحان ضرور ہے۔ کہ زیادہ کھاد استعمال کیجائے۔ اضافہ قیمت زمین سے زیادہ اضافہ قیمت پیداوار کسان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کر رکھا ہے کہ وہ زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جن علاقوں کا دارومدار بارش پر ہے۔ یعنی جہاں زمینیں بارانی ہیں۔ وہاں زمین کی اچھی خاصی اِصلاح و ترقی کیلئے کوشش کیجا رہی ہے کھیتوں کو ہموار کیا جاتا ہے۔ کھاد کا استعمال زیادہ عام ہو رہا ہے۔ ویران زمینوں میں ہل چلایا جا رہا ہے۔ اور نئے کنوئیں کھودے جا رہے ہیں۔ گورداسپور کے ۱۱ دیہات میں تحقیقات کیگئی تو معلوم ہوا کہ پانچ سال کے عرصہ میں کنوؤں کی تعداد ۳۳ سے ۴۰ ہو گئی ہے۔ باوجودیکہ اِس عرصہ میں کنوئیں کی تعمیر کے مصارف بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔

اِس سے یہ واضح نظر آتا ہے۔ کہ کسان زمین کی اِصلاح و ترقی میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور جہاں کہیں کسی شخص نے زمین کی زیادہ قیمت ادا کی ہے۔ اُسکی کوشش یہی ہوتی ہے۔ کہ اُس نے

زمین کی خرید پر جو روپیہ صرف کیا ہے۔ اُس سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کر سکے۔ وہ اپنی صنعت کو بہ نسبت سابق زیادہ تجارتی زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی بڑی وجہ اضافہ قیمت پیداوار ہے۔ اضافہ قیمت زمین سے زمین کی اِصلاح و ترقی پر نسبتاً کم اثر پڑا ہے انجمن ہائے امدادِ باہمی کی کوششوں کی وجہ سے بھی اچھے بیج اور عمدہ آلات کشاورزی کی مانگ زیادہ ہو رہی ہے۔ اتفاقاً یہ تحقیقات زیادہ تر انہی لوگوں میں کی گئی تھی۔ جو انجمن ہائے امدادِ باہمی میں شریک ہو چکے ہیں۔ اور ان کے متعلق کسی قدر اعتماد و وثوق کیساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اصلاحِ زمین اور زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے مسائل پر زیادہ توجہ صرف کیجا رہی ہے۔ لیکن اِس امر سے لوگوں کی بیخبری کہ کس چیز کی کاشت منفعت بخش ہو سکتی ہے۔ ترقی میں سدِ راہ ہو رہی ہے جیسا کہ مسٹر ایمرسن نے لکھا ہے۔ نظری طور پر تو یہ توقع کرنا چاہیئے۔ کہ ساکھ کے بڑھ جانے سے اُن مالکانِ اراضی کے اصلاح و ترقی کیجانب توجہ کرنا آسان ہو جائیگا جن میں کافی ہمّت اور حوصلہ موجود ہے لیکن عملی طور پر اس کی شہادت نہیں ملی۔

چوتھا سوال یہ تھا۔ کہ آیا اضافہ قیمت زمین کا کوئی اثر لگان پر بھی پڑا ہے۔ جہاں بٹائی کے طریقہ سے لگان ادا کی جاتی ہے۔ لگان کے تناسب میں چنداں فرق واقع نہیں ہوا لیکن جن مقامات پر لگان نقد ادا کیا جاتا ہے سو ہاں اس میں گذشتہ پانچ سال کے اندر نہایت سُرعت سے ترقی ہو گئی ہے۔

گورداسپور کے علاقہ میں بارانی زمینوں کا نقد لگان ۲ دو روپیہ فی ایکڑ سے آٹھ روپیہ فی ایکڑ ہو گیا ہے۔ لیکن بارانی اور چاہی زمینوں کا لگان آٹھ روپیہ فی ایکڑ سے بڑھ کر ۱۶ سولہ روپیہ فی ایکڑ ہو گیا ہے۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاقہ میں ایک مربع کا لگان ۱۹۱۴ء میں ۲۰۰ روپیہ تھا لیکن ۱۹۲۰ء میں ۸۰۰ روپیہ ہو گیا۔ بیان کیا گیا ہے۔ کہ لاہور میں گذشتہ چند ۱۰ سال کے اندر نقد لگان چوگنا، پانچ گنا ہو گیا ہے۔ جالندھر میں نقد لگان ۱۰ دس سال کے عرصہ میں دُگنا ہو گیا ہے۔

نقد لگان میں اس نمایاں اضافہ کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ قیمت پیداوار کا بلاواسطہ اثر پڑا ہے،

اور کچھ یہ کہ جو مزارعین زیادہ زمین کی کاشت کرتے ہیں۔ اُن میں مسابقت کا حریفانہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور لگان بالواسطہ متاثر ہوا ہے۔ جن مقامات پر مزارعین کی قلت ہے۔ وہاں نقد لگان میں اضافہ نہیں ہوا۔ اس قسم کی بھی کوئی شہادت نہیں تھی۔ کہ اضافہ قیمت پیداوار سے قطع نظر کر کے محض اضافہ قیمت زمین کے باعث لگان بڑھ گیا ہے۔

یہ امر واضح اور نمایاں نظر آتا ہے کہ لگان میں اُسی سرعت کیساتھ اضافہ ہوا ہے جس سرعت سے زمین کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ دوسری جانب بندوبست کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لگان میں نسبتاً کم اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً امرتسر کے اندر جو تغیرات گذشتہ دو بندوبستوں کی درمیانی مدت یعنی بیس سال کے عرصے میں رُونما ہوئے ہیں۔ اُن کے متعلق ذیل میں اطلاعات فراہم کی گئی ہیں۔

تحصیل	اضافہ قیمت زمین	اضافہ نقد لگان
ترنتارن	۱۱۴ فی صدی	۶۶ فی صدی
امرتسر	۳۷ فی صدی	۳۹ فی صدی
اجنالہ	۷ فی صدی	۲۵ فی صدی

اِس عرصے میں پہلے تو آبادی میں متواتر و پیہم اضافہ ہوتا رہا۔ پھر پلیگ کی وجہ زوال رُونما ہوا۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۱ء تک اِس میں گیارہ فیصدی اضافہ ہوا۔ ۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۱ء تک مزید ۳ فیصدی اضافہ ہوا۔ اور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۱ء تک آبادی میں ۱۴ فی صدی کمی واقع ہو گئی۔ رقبہ مزروعہ بھی کسی قدر کم ہو گیا۔ کیونکہ ترن تارن میں دو فی صدی اور امرتسر میں ایک فی صدی زمین پر کلر کی تہ جم گئی تھی۔ لاہور کے بندوبست کی رپورٹوں سے حسب ذیل تفصیلات معلوم ہوئی ہیں۔

لہ یہ اطلاعات اس تحقیقات سے حاصل نہیں کی گئیں۔ لیکن جن امور کو ہر جگہ کلیتہً کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اُن سے بالکل مطابق ہیں +

تحصیل	اضافہ قیمت زمین	اضافہ نقد لگان
لاہور	تقریباً دس گنا ہو گیا۔	۱۳۱ فی صدی
چونیاں	تقریباً تگنا۔	۳۵ فی صدی
قصور	تگنے سے زیادہ	۳۴ فی صدی

گورنمنٹ نے جالندھر کے بندوبست کی رپورٹ پر جو تبصرہ کیا ہے۔ اُس میں مذکور ہے کہ دو بندوبستوں کی درمیانی مدت میں قیمت پیداوار پچاس فی صدی بڑھ گئی۔ اور زمین کی قیمت فروخت میں ۴۰۰ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ اور لگان ۲۰ فیصدی بڑھ گیا۔

تحصیل گوجرانوالہ میں بندوبست کے جو مختلف حلقے مقرر کئے گئے ہیں۔ اُن سے اُن تغیرات کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ جو ۱۸۹۲ء سے ۱۹۱۱ء تک رونما ہوئے ہیں۔

حلقہ	قیمت زمین	نقد لگان میں اضافہ	چکوتہ لگان میں اضافہ
چرکاری	۱۷ روپے ۵۸ روپے	چاہی زمین میں ۳۵ فیصدی بارانی زمین میں ۴۷ فیصدی	چاہی زمین میں ۲۲ فیصدی بارانی زمین میں ۶۶ فیصدی
بنگہ	۱۳ روپے سے ۲۹ روپے	چاہی زمین میں ۳۱ فیصدی بارانی زمین میں ۴۷ فیصدی	چاہی زمین میں ۲۲ فیصدی بارانی زمین میں ۲۴۱ فیصدی
بار	۱۱ روپے سے ۲۸ روپے	چاہی میں ۶ فیصدی بارانی میں ۱۷ فیصدی	چاہی میں ۱۰۰ فیصدی بارانی میں ۶۰ فیصدی

متذکرہ بالا اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ لگان میں بہت ہی کمی واقع ہوئی ہے گویا زمین پر سرمایہ لگانیوالے کو جو آمدنی ہوتی ہے۔ اُس میں تخفیف ہو گئی ہے۔

اِس سلسلہ میں اور بھی مثالیں پیش کیجا سکتی ہیں۔ لیکن یہ ثابت کرنے کیلئے مزروعہ اراضی کی کی قیمت میں جسقدر اضافہ ہوا ہے۔ اُس کے مقابلے میں نقد لگان میں اضافہ نہیں ہوا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ زمیندار اِس امر پر زور دے رہے ہیں۔ کہ لگان بصورتِ جنس (بٹائی) کو زیادہ رواج دیا جائے۔ دوسری جانب مزارعین نقد لگان کو ترجیح دینے کے حق میں ہیں۔ اور مزارعین کی کمزوری کی وجہ سے

نقد لگان ادا کرنے کا دستور کم ہو رہا ہے۔

پانچواں سوال یہ تھا۔ کہ آیا اضافہ قیمت زمین نے لگان کے سوا اجارہ داری پر دوسری حیثیات سے بھی اثر ڈالا ہے۔ کیا اس کی وجہ سے اجارہ داری کو ترقی ہوئی ہے۔ ایک کے سوا تمام جوابات اِس امر پر متفق ہیں۔ کہ مزارعین کی تعداد زیادہ ہو رہی ہے۔ سب سے بڑا تغیر یہ ہے۔ کہ گاؤں میں جو لوگ کمین (شاگرد پیشہ) کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب مزارع بن کر زمین کی کاشت کر رہے ہیں اِس کی وجہ اضافہ قیمت پیداوار ہے۔ جو زراعت کو زیادہ منفعت بخش صنعت بنا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ اراضی کی خرید کے بارہ میں مقابلہ اور مسابقت تک نوبت پہنچی ہے۔ اور اسکی وجہ سے زمیندار مزارعین سے (مزدوری اور ملازمت کے بارہ میں) زیادہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ لائل پور کی نوآبادی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے۔ کہ وہاں کے زمیندار زیادہ منفعت حاصل کرنے کے خیال سے یہ خواہش کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ کہ جو زمین انہوں نے مزارعین کو دے رکھی تھی۔ وہ ان سے لے لیں۔ اور اس میں خود کاشت کرنا شروع کر دیں۔ قیمت زمین کی گرانی کا صرف یہ نتیجہ ہوا ہے۔ کہ مزارعین زمیندار نہیں بن سکتے۔ (اجارہ داری کی بحث میں یہ معلوم ہوگا۔ کہ زمین کو فروخت کرنے یا رہن رکھنے کے باعث اجارہ داری میں تو اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن قیمت زمین کی گرانی کے سبب اس رجحان کا اِس طرح ردعمل نہیں ہونے پاتا۔ کہ مزارعین اراضی خرید لیں) زراعت کی منفعت میں جو عظیم اضافہ ہوا ہے اسکی وجہ سے مزارعین زیادہ زمین کی کاشت کرنے کے خواہشمند نظر آتے ہیں۔ اور زمیندار لگان پر زمین دینے پر آمادہ ہیں۔

چھٹا سوال یہ تھا۔ کہ کیا اضافہ قیمت زمین سے فصل پر بھی کوئی اثر پڑا ہے۔ اِس بارہ میں تمام جوابات متفق ہیں۔ کہ اب منفعت بخش فصل کے انتخاب پر زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ زراعت کے طریقوں کی اصلاح ہو رہی ہے۔ لیکن اضافہ قیمت زمین سے زیادہ اضافہ قیمت پیداوار اس کا باعث ہو گیا ہے۔ یہ امر واضح و نمایاں نظر آتا ہے۔ کہ قیمت زمین کی وجہ یہ اثر نہیں ہوا۔ کہ لوگ فصل کی کاشت کرنے کے بجائے درخت علی الخصوص ثمردار درخت لگائیں۔ اور ان سے روپیہ حاصل کرنیکی کوشش کریں۔

ساتواں سوال یہ تھا۔ کہ آیا اضافہ قیمت زمین سے ایسی اجناس کی کاشت کیجانب توجہ کم ہو گئی ہے جو مویشی کے چارہ کے کام آتی ہیں۔ یہ تو صحیح ہے۔ کہ ایسی اجناس کا رقبہ محدود ہو گیا ہے۔ اور صرف ناقص قدر کاشت

کیجاتی ہے۔ جو مویشی کی ضروریات کیلئے کافی ہو۔ لیکن اِس امر کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ کہ چارہ مویشی کیلئے کافی ہو۔ یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اضافہ قیمت زمین کیوجہ سے اسکا رقبہ محدود ہو گیا ہے۔

مزارعین زمینداروں کی نسبت چارہ کی کاشت کیجانب زیادہ مائل ہیں علی الخصوص جہاں جہاں بٹائی کے قاعدہ کے مطابق زمیندار چارہ کی فصل میں بہت تھوڑا حصہ لیتے ہیں۔

آٹھواں سوال یہ تھا۔ کہ آیا گذشتہ دس سال کے اندر جسقدر زمین فروخت ہوئی ہے۔ وہ گاؤں کے پرانے باشندوں کے ہاتھ بیچی گئی ہے۔ یا بیرونی آدمیوں کے ہاتھ۔ زیادہ تعداد تو ایسے واقعات کی ہے جنمیں زمین قدیم باشندگان دیہہ کے ہاتھ فروخت کیگئی ہے۔ خاص طور پر چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کی ہر جگہ یہی کیفیت ہے اگر ایک بڑا قطعہ اراضی قابلِ فروخت ہو۔ تو باہر کے لوگ بھی خرید لیتے ہیں۔

باقی تین سوال یہ تھے۔

(۱) کیا تم اضافہ قیمت زمین اور اضافہ مصارف پیداوار کا مقابلہ کر سکتے ہو۔

(۲) کیا اضافہ قیمت زمین کا مقابلہ قیمت پیداوار سے کر سکتے ہو۔

(۳) کیا اضافہ قیمت زمین کا مقابلہ دیہاتی مزدوروں کے حقِ خدمت سے کیا جا سکتا ہے۔

اِس تحقیقات سے یہ ثابت ہوا۔ کہ اضافہ قیمت اضافہ مصارف زراعت اضافہ قیمت پیداوار اور مزدوروں کے حقِ خدمت سے زیادہ ہے۔ لیکن جزئیات میں اچھا خاصہ اختلاف ہے جالندھر میں قیمت زمین تگنی ہو گئی ہے۔ بیلوں اور بھینسوں اور چھکڑوں کی قیمت تگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ قیمت پیداوار تقریباً دُگنی ہو گئی۔ اور معاوضہ محنت ڈیڑھ گنا ہو گیا ہے۔

لدھیانہ میں بیلوں، چرسوں، کھاد، ہل اور چھکڑوں کی قیمت ۲۰ سال کے اندر تگنی ہو گئی ہے قیمت پیداوار ڈھائی گُنی ہو گئی ہے۔ اور مزدوری چوگنی ہو گئی۔ لیکن قیمت زمین کا اضافہ سب سے زیادہ ہوا ہے یعنی وہ چھ گُنی سے آٹھ گُنی ہو گئی ہے حصار سے جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ اُن میں بھی اِسی قسم کے اعداد شمار دیئے گئے ہیں۔

گورداسپور سے ایک رپورٹ موصول ہوئی ہے۔ جو نہایت احتیاط سے لکھی گئی ہے۔ اسمیں امور مندرجہ بالا سے اتفاق کیا گیا ہے۔ لیکن اضافہ قیمت زمین بہت کم ظاہر کیا گیا ہے۔ اِس عرصہ میں وہاں زمین کی قیمت دُگنی بھی نہیں ہوئی۔

راولپنڈی سے بھی اسی نوع کا ایک جواب موصول ہوا ہے۔ وہاں قیمت زمین دگنی ہو گئی ہے
مصارفِ زراعت دگنے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں قیمت پیداوار چوگنی ہو گئی ہے۔ (خاص طور پر آلو کی
قیمت) اگر تمام رپورٹوں کو بحیثیتِ مجموعی لیا جائے۔ تو اضافہ کی ترتیب حسب تفصیل ذیل ہو گی۔

۱۔ قیمت زمین۔

۲۔ معاوضہ محنت۔

۳۔ قیمت پیداوار۔

۴۔ مصارف زراعت۔

اگر یہ صحیح ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہیں۔ کہ چھوٹے چھوٹے خود کاشت زمیندار اور مزارعین پہلے سے زیادہ
آمدنی حاصل کر رہے ہیں۔ اور مزدور کی بھی یہی کیفیت ہے۔ بڑے بڑے زمیندار جنہوں نے زمین مزارعین کو دے
رکھی ہے اور جو لوگ بصورتِ جنس لیتے ہیں۔ وہ بھی خوشحال ہیں۔ گویا بحیثیت مجموعی معاوضہ محنت اور دوسرے
مصارفِ زراعت میں اضافہ کے باوجود زراعت بہ نسبت سابق زیادہ منفعت بخش صنعت ہے۔

لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قیمت زمین کی گرانی اہم ترین چیز نہیں۔ بلکہ وہ چیز جس کا اثر سب سے زیادہ
ہے یہ ہے۔ کہ اب پیداوار کی قیمت بہت ملتی ہے۔ اس چیز کی وجہ سے زیادہ محنت کا ولولہ پیدا ہو رہا ہے۔ اور
کسان زراعت میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اضافہ قیمت زمین سے زراعت کو کوئی فائدہ نہیں ہوا اور دوسری
جانب حق خدمت اور مصارف زراعت کے اضافہ نے قیمت زمین کو بڑھنے سے نہیں روکا۔ دو لو آخر الذکر
نتائج بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ امر قابلِ غور ہے۔ کہ قیمت زمین کی گرانی کوتاہ اندیش زمینداروں میں یہ خواہش پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے
کہ وہ اپنی اراضی فروخت کریں۔ دوسری جانب زیادہ محتاط اور دور اندیش لوگوں میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایک
چھوٹا سا قطعہ زمین فروخت کر کے اراضی کے بڑے حصّہ کی اصلاح کریں۔ اس صوبہ میں دونوں طرف رجحان
پایا جاتا ہے۔ لیکن ہماری تحقیقات کا مقصد یہ تھا۔ کہ اضافہ قیمت کی وجہ سے اگر طریق زراعت پر کوئی اثر پڑا
ہے۔ تو اسے معلوم کریں۔

دسواں باب

دیہاتی ساکھ کا بیجا استعمال اور قانونِ انتقالِ اراضی

(۱) دیہاتی ساکھ کا بیجا استعمال

اگر ۱۹۱۸ء سے پہلی تین چار صدیوں کی تاریخ پنجاب کا مطالعہ کیا جائے۔ تو ہمیں بیرونی حملوں لڑائیوں بغاوتوں اور قحط کے واقعات کا ایک مسلسل و پیہم سلسلہ نظر آئیگا۔ کبھی کبھی بیرونی حملہ ایک ایسی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرتا تھا جسے مستقل حکومت تو نہیں۔ لیکن اس کے لگ بھگ سمجھا جا سکتا ہے کبھی وہ محض غارتگروں کے ایک لشکر کا ایک سردار ہوتا تھا۔ اُس کی نیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ کہ صدیوں تک ملک عدم استقلال اور برہمی کی حالت میں رہتا تھا۔ اور اس زمانہ میں اقتصادی ترقی ناممکن ہو جاتی تھی۔ ایسے حالات میں صنعت و حرفت کو ترقی نہیں ہو سکتی۔ سرمایہ کسی ایسی چیز میں نہیں لگایا جا سکتا۔ جو حملہ آور کی حرص کو اپنی جانب متوجہ کرے۔ اور کوئی شخص یہ ظاہر نہیں کرتا تھا۔ کہ وہ کسی قدر منقولہ جائیداد کا بھی مالک ہے بادشاہ کے درباری خواہ اپنی دولت کے کیسے ہی دلفریب مظاہرے کیوں نہ کریں۔ جو ایک سیاح کی توجہ کو اپنی جانب منعطف کر لیں۔ لیکن عوام کی یہ کیفیت تھی۔ کہ وہ جس قدر روپیہ جمع کرتے تھے۔ اُسے حریص نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ حاکم مطلق العنان اور متلون المزاج ہوا کرتے تھے۔ حکومت کے مقابلے میں عوام کے حقوق تسلیم نہیں کئے جاتے تھے۔ زمین جس طرح اب لوگوں کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔ اُس وقت نہیں سمجھی جاتی تھی

اور تو اور سکھوں کے زمانہ میں بھی جب کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک قسم کا مستقل نظم حکومت قائم کیا۔ کارداروں کو یہ اختیار حاصل تھا۔ کہ جو شخص تھوڑی مالگذاری ادا کرے۔ اُسے زمین سے بیدخل کر کے اس شخص کو زمین کا قبضہ دیدیں۔ جو زیادہ مالگذاری ادا کر سکتا ہو۔ جب کوئی شخص حاکم کے دربار میں قرب حاصل کرتا تھا۔ تو اُس کو زمین عطا کی جاتی تھی۔ لیکن زمین عطا کرتے وقت اِس امر کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ کہ آیا اس پر کوئی شخص قابض ہے۔ یا نہیں۔ اگر دوسرے لوگ اِس زمین کی کاشت کرتے ہوں۔ تو حاکم کے منظورِ نظر کو یہ اختیار حاصل تھا۔ کہ اُن سے لگان لینے پر اِکتفا کرے۔ اور انہیں مزارع کی حیثیت سے زمین میں کاشت کرنے دے۔ یا انہیں بے دخل کر کے اُن کی بجائے اپنے آدمی مقرر کر دے۔ اِس بحث میں یہ چیز چنداں اہمیّت نہیں رکھتی۔ کہ آیا اس وقت حقوق مالکانہ کو جنہیں حکومت کے اختیارات کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا۔ موجود تھے۔ یا نہیں۔ پروفیسر کیلی لکھتا ہے۔ "کہ اراضی دراصل اُن لوگوں کی ملکیّت ہے۔ جنہوں نے یا جن کے آباؤ اجداد نے انہیں پاک اور صاف کر کے قابلِ زراعت بنایا۔ لیکن گردشِ تقدیر سے بیرونی حملوں اور ملکی جنگو نکے موقعہ پر ان مالکوں کو حقوق مالکانہ سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اور اُن کی حیثیت محض مزارع کی رہ جاتی تھی۔ پھر جب حملہ آوروں یا نقل مکان کرنیوالوں کا کوئی سیلاب آتا۔ تو اِن فتحمندوں کو بھی اپنے حقوق مالکانہ سے دستبردار ہو جانا پڑتا تھا۔ اور اُن کی حیثیت محض اعلیٰ درجہ کے مزارعین کی رہ جاتی تھی۔ پرانے راجاؤں اور سرداروں کو جو نئے فتحمند کی اطاعت قبول کرتے تھے۔ محض حکمت عملی کے خیال سے انہیں زمینوں کا مالک رہنے دیا جاتا تھا۔ لیکن وہ اِس شرط پر کہ ان کے مزارعین پر جو محصول لگایا جائیگا۔ وہ اُسے جمع کر کے سرکاری خزانہ میں داخل کر دینگے۔ اور ایک حصّہ خود رکھ لینگے۔ جن زمینداروں کو محصول فراہم کرنے کی اجازت ہوتی تھی۔ یا جو سرکاری ملازمین فراہمی محاصل کے کام پر مامور ہوتے تھے۔

وہ اکثر اُس تمام زمین کو جس کی مالگذاری وہ فراہم کرتے تھے۔ اپنی پرائیویٹ جائیداد بنا لیتے تھے۔ سرکش قبائل کے سردار اس شورش اور فساد کے زمانہ سے فائدہ اُٹھا کر خود زمین کے مالک بن جاتے تھے۔

اِس نتیجہ اور اسی قسم کے دوسرے نتائج سے جن پر دوسرے اہل قلم پہنچے ہیں۔ یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں کسی کو کوئی ایسا حق حاصل نہیں تھا۔ جس میں کوئی دوسرا شخص مین میکھ نہ نکال سکے۔ اور یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی (خاص علاقوں سے قطع نظر کرکے) زمین پر ساکھ کی بنیاد استوار نہیں کی جاسکتی۔ اِس قسم کی مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ کہ زمین کی ملکیت کوئی قابلِ فخر چیز نہیں۔ بلکہ وبالِ جان سمجھی جاتی تھی۔ مالگذاری اسقدر طلب کی جاتی تھی۔ کہ کسان کھیتوں کو چھوڑ کر صوبہ کے دوسرے حصّوں میں چلے جاتے تھے۔ وہ دوکانداروں یا دوسرے سرمایہ داروں کے پاس زمین فروخت نہیں کرتے تھے بلکہ ایسے یونہی چھوڑ کر چلے جایا کرتے تھے۔ جو لوگ مالگذاری ادا کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو کسی قیمتی اور قابلِ انتقال جنس کا مالک نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اُن کا خیال تھا۔ کہ اُنہیں اس شرط پر زمین کی کاشت کا فی طور حاصل ہے۔ کہ وہ حکومت کا مطالبہ پُورا کرتے ہیں۔

مغرب کی جانب سے پنجاب پر جو پے در پے حملے ہوئے۔ اُن سے پہلے اِس سرزمین کے حالات کچھ ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ اِس میں کوئی شک نہیں۔ کہ صدیوں تک پنجاب کی اراضی کی یہ حیثیت نہیں تھی۔ کہ اِس کی وجہ سے ساکھ قائم ہو سکے۔

اِس سرزمین کی یہی غیر مستقل حالت دولت جمع کرنے کی راہ میں مانع ثابت ہوئی۔ کیونکہ کفایت شعار بننے اور روپیہ پس انداز کرنے کے لئے امن وامان اور حفاظت جان ومال کی ضرورت ہے۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے۔ کہ جس لطف ومسرت کے حصول کی خاطر وہ اپنی خواہشوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اُن کا حصول غیر یقینی ہے۔ تو خواہشوں کی قربانی

۱ؔ "انڈین اکنامکس" تیسرا ایڈیشن صفحہ ۲۵۶۔ اِس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں زمین پر مالکانہ حقوق کا دعوےٰ آنا دشوار ہی نہیں۔ بلکہ خطرناک تھا۔ اور زمین حکومت کے سوا کسی کی ملکیت نہیں ہوا کرتی تھی

اور ایثار کے جذبہ کو عمومیت اور ہردلعزیزی حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہر زمانہ میں یہی کیفیت رہی ہے۔ کہ اگر زراعت ترقی نہ کرے۔ تو سرمایہ جمع کرنے کی کوئی اُمید نہیں ہوسکتی۔ اتنا ماحصل زائد تو ہوتا ہی نہیں تھا۔ جس سے کچھ پس انداز کیا جاسکے اور اگر قرض مل بھی سکے۔ تو اس کے ادا کرنے کا کوئی موقعہ نہیں مل سکتا۔

اس طرح گویا اگلے زمانہ کے سُود خواروں کے پاس اول تو سرمایہ ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر اُن کے پاس روپیہ ہوتا۔ تو وہ کسی کو کچھ روپیہ بطور قرض دے بھی دیتے۔ جب بھی اُسے وصول کرنے کا کوئی موقعہ نہیں تھا۔ آج زمینداروں کی جو ساکھ ہے۔ اُس کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اسوقت بھی لین دین ہوا کرتا تھا۔ ساکھ کا وجود بھی تھا سود بھی لیا جاتا تھا۔ کیونکہ ان چیزوں کے متعلق ہندوؤں کے دھرم شاستر میں جو قوانین موجود ہیں۔ اُن سے یہ باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ لیکن آج قرض جسقدر سہل الحصول ہے۔ اُس وقت نہیں تھا۔ اُس زمانہ میں لوگ زیادہ قرض نہیں دے سکتے تھے۔ کیونکہ

(ا) اتنا روپیہ جمع نہیں تھا۔ کہ اُسے قرض کے طور پر دیا جاسکے۔

(ب) اتنا ماحصل زائد نہیں تھا۔ جس سے قرض ادا کیا جاسکے۔

(ج) عملی طور پر قرض کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔

(د) نادہند مقروض سے روپیہ وصول کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔

انگریزوں کی آمد کے ساتھ قانون کا نفاذ ہوا ضبط ونظم قائم کیا گیا۔ محاصل کا ایک منصفانہ نظام کیا گیا۔ جو سہل اور عام فہم اصُولوں پر مبنی تھا۔ جائیداد کے متعلق لوگوں کے پرائیویٹ حقوق تسلیم کرلئے گئے۔ اور وہ حقوق ایسے تھے۔ جنہیں حکومت نے بھی تسلیم

لہ انگریزوں کی عملداری سے پہلے پنجاب سے صرف چند لاکھ روپیہ کی اشیاء برآمد ہوئی تھی ۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء میں برآمد شدہ اشیاء کی قیمت ۲۵ کروڑ تھی۔ یہ ایک ایسی رقم ہے جو دیہات کے مجموعی قرض سے کم نہیں یہ ظاہر ہے کہ پہلے یہ صوبہ اپنی ضروریات سے زیادہ اجناس پیدا ہی نہیں کرتا تھا۔ اور کرتا بھی تھا۔ تو بہت کم۔ لیکن اب اس کی زائد از فرورت پیداوار بہت بڑھ گئی ؂

کر لیا۔ یہ حقوق باقاعدہ ضبط تحریر میں لائے گئے۔ مزید برآں مقامی اور نسلی دستور کے
مطابق حقوق کے انتقال کی آسانیاں بہم پہنچائی گئیں۔ اور سب سے زیادہ اہم یہ چیز
تھی کہ اس امر کی متواتر کوشش کی جاتی رہی۔ کہ لوگوں کی اقتصادی حالت بہتر کرنے کے
لئے جسقدر مساعی کی جاتی ہیں۔ اُن کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اِس طرح گویا ساکھ کے تمام
لوازم جو ایک حکومت مہیا کر سکتی ہے۔ مہیا کر دیئے گئے۔ لیکن بدقسمتی سے حکومت کے
نظم و نسق میں تو تبدیلیاں ہو گئیں۔ لیکن اس کے ساتھ عوام میں اقتصادی احساس بیدار
نہیں ہوا۔ جلد مٹ جانے والی سلطنتوں اور ریاستوں کے قیام کی وجہ سے ایسے عادات
و فضائل اور رسموں نے جڑ پکڑ لی تھی۔ جو مادی ترقی کے بالکل برعکس تھیں۔ چنانچہ گذشتہ
ستر سال کا تجربہ بھی کلی تغیر پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سرکردگی
میں سکھوں کی حکومت کی ترقی ایک فوجی واقعہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اقتصادی حالات
سُدھارنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس عہد کے مُلکی نظم و نسق کا ذکر سر لیپل گرفن نے اِن
الفاظ میں کیا ہے۔ کہ بیچارے کسان سے جسقدر روپیہ وصول کیا جا سکتا تھا۔ وصول
کر لیا جاتا تھا۔ اِس پر تشدد کرتے وقت صرف اِس بات کا خیال رکھا جاتا تھا۔ کہ اسقدر
تشدد نہ کیا جائے۔ کہ وہ سرکشی پر آمادہ ہو جائے۔ یا مایوس اور دل شکستہ ہو کر
اراضی کو چھوڑ کر چلا جائے۔ سکھ محصل جو مالگذاری وصول کیا کرتے تھے۔ جو سونے کے انڈے
دینے والی مُرغی کو ہلاک تو نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ اُس کے پر اکھیڑ لیتے تھے۔
حکومت بہت سی مالگذاری کے علاوہ خام پیداوار کا نصف بھی وصول کر لیا کرتی تھی۔ اور
اگر بیچارے کسان کے ذمہ کچھ روپیہ رہ جاتا تھا۔ تو اُسے وصول کرنے کے لئے فوج کی ایک
رجمنٹ بھیج دی جاتی تھی۔ زمین تو بہت سی بڑی تھی۔ لیکن اتنے کاشتکار نہیں ملتے تھے۔
جو یہ بوجھ اُٹھانے میں شریک ہو جائیں۔ حکومت یا شاہی محصلین جسقدر لے سکتے تھے لے
لیتے تھے۔ اور بیچارے کسان کے پاس کچھ باقی نہ بچتا تھا۔ اِس طرح ریاست اور کاشتکار
کا معاملہ براہِ راست تھا۔ یہ نہیں تھا۔ کہ اُن میں ایک سُست اور کاہل الوجود زمیندار واسطہ
کا کام دے۔ اگر ایسا کوئی زمیندار حاصل بھی۔ تو حکومت کاشتکار سے جس قدر وصول

کر لینی تھی۔ اُس کے بعد وہ اُس سے کچھ نہیں لے سکتا تھا۔ اِن حالات و اسباب کے ماتحت زمین کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ انتقال اراضی سے عملی طور پر وہ بے خبر تھے۔ اگر کوئی شخص روپیہ کے عوض زمین رہن بھی رکھ لیتا۔ تو اُس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ زمین کی ذمہ داریاں اُس کی منفعتوں سے زیادہ تھیں۔ اور پھر اس امر کا یقین نہیں تھا۔ کہ زمین کی وجہ سے ساکھ محفوظ رہے گی۔

۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی موت واقع ہوئی۔ اور اس سے دس سال کے بعد پنجاب کا الحاق برٹش انڈیا سے ہو گا۔ اِن دس سالوں کے اندرونی منافشات کی وجہ سے ملکی نظم و نسق برباد ہو گیا۔ اور بغاوت برپا ہوئی۔ جو سکھوں کی دوسری جنگ پر ختم ہوئی۔ اِسلئے پھر جو دور آیا۔ وہ انتظامی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ لیکن اس ترقی میں غدر ۱۸۵۷ء و ۱۸۵۸ء سے روڑا اٹکایا۔ اور آئندہ دس سال کے عرصہ میں صوبہ کو خراب موسم کے ایک دور میں سے گذرنا پڑا۔ جس کا آغاز ۱۸۶۹ء کے قحط سے ہوا تھا۔ اس صوبہ کے افسر زیادہ تر آگرہ اور اودھ سے لائے جاتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ مطالبہ مالگذاری کے متعلق جو خیالات لاتے تھے۔ وہ ایک ایسے علاقہ کے لئے جہاں بارش کی حالت اُن کے وطن مالوف کی نسبت بہت خراب تھی۔ کس طرح موزوں نہیں ہو سکتے تھے۔ ابتدا میں جو بندوبست مختصر سے پیمانہ پر کیا گیا۔ اِس کی رو سے سکھوں کے زمانہ کے مطالبہ مالگذاری میں تخفیف کر دی گئی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس امر نے کہ مالگذاری کی وصولی میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور پھر مالگذاری نقد ادا کی جاتی ہے۔ کسان کو بہت فائدہ پہنچا۔ پہلے تو زمیندار مالگذاری کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ اگر وہ دوسروں کو اپنی ذمہ داری میں شریک ہونے پر آمادہ کر لیتے تھے۔ تو بوجھ بٹ جاتا تھا۔ مزارعین مالگذاری کی ادائیگی میں اُن کی اعانت کرتے تھے۔ اور اس کے سوائے کوئی مزید محصول زمیندار کو ادا نہیں کرتے تھے۔ الحاق کے فوری نتائج یہ ہوئے۔ کہ امن و سکون قانون ہو گیا۔ مزارع کے حقوق محفوظ ہو گئے۔ ایک معتدل رقم بطور مالگذاری طلب کی گئی۔ تجارت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ صوبہ نہایت تیزی سے خوشحالی اور آسودگی حاصل کرتا چلا گیا۔ اور زراعت پیشہ طبقہ نے اپنے آپ کو ایک ایسی قیمتی جائیداد کا مالک پایا۔ جس سے وہ اِس سے پیشتر بے خبر تھا۔

زمین سے جو نفع ہونے لگا۔ وہ کاشتکار کی فوری ضروریات سے زیادہ ہوتا تھا۔ اور زاید پیداوار کی بناء پر اُس کی ساکھ قائم ہو گئی۔ ایسے مزارعین کا ملنا آسان ہو گا۔ جو سرکاری مالگذاری سے زیادہ لگان کر سکیں۔ لگان اور مالگذاری میں تفاوت در فرق نمایاں نظر آنے لگا۔ اور زمیندار کو منافع حاصل ہونے لگا۔ زراعت کی توسیع کے بارہ میں حوصلہ افزائی کی گئی۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء و ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۲ء و ۱۸۷۳ء کے درمیان یعنی پانچ سال کے اندر رقبہ مزروعہ دو کروڑ دو لاکھ ایکڑ سے بڑھ کر دو کروڑ چھبیس لاکھ ایکڑ ہو گیا۔ چونکہ مالگذاری کی رقم چند کے لئے مقرر کی جاتی تھی۔ اس لئے مالگذاری کے اوسط میں کمی واقع ہو گئی۔ اور وہ ۳ آنہ پائی - ۱ روپیہ سے ۱۱ پائی - ۵ آنہ - ۱ روپیہ ہو گیا چونکہ ساتھ ہی کسان کو کچھ نفع بچ رہتا تھا۔ جس سے وہ اپنا قرض ادا کر سکتا تھا۔ اس لئے نئی قائم شدہ عدالتوں نے اپنا روپیہ وصول کرنے کے بارہ میں دائن کی مدد ہی نہیں۔ بلکہ یہ نیا اصول قرار دیا گیا کہ خواہ مدیون کی زمین ضمانت کے طور پر رہن ہو۔ یا نہیں۔ دائن ڈگری جاری کرا کر اس پر قبضہ کر سکتا تھا۔ یہ اختیار دیوانی عدالتوں کو مجلس قانون ساز کی منظوری بغیر حاصل ہو گیا۔ اکثر صوبوں مثلاً چھوٹا ناگپور اور صوبجات متوسط برار کورگ اور اجمیر میں آبادی جائیداد کے انتقال پر پابندیاں عاید ہیں ۱۸۵۳ء میں پنجاب کی مجلس انتظامیہ نے ایک سرکلر جاری کیا۔ جس میں اُن زمینداروں کو جو اپنا حصہ فروخت

ملہ ملاحظہ ہوا ہے کی کتاب "دی پرمیننٹ سٹلمنٹ آف بنگال" (بنگال کا بندوبست دوامی) لگان میں حکومت اور زمیندار کے حصہ کا تناسب دوامی بندوبست کے زمانہ میں ۱ و ۹ تھا۔ چونکہ ۱۷۹۳ء میں سرکاری مالگذاری ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ تھی یہ گویا کل لگان کا ۹/۱۰ تھی۔ اور کل لگان چار کروڑ تھا موجودہ لگان ۱۵ کروڑ یعنی بندوبست دوامی کے زمانہ کے لگان سے چوگنا ہے۔ چونکہ حکومت کی مالگذاری تقریباً چار کروڑ مقرر ہو چکی ہے۔ اس لئے کسان۔ حقوق رکھنے والے مزارعین اور زمینداروں میں بارہ کروڑ روپیہ تقسیم ہو جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ جن لوگوں کا سارا لگان ۱۷۹۳ء میں ۴۰ لاکھ تھا۔ وہ اتنا روپیہ قرض نہیں لے سکتے تھے۔ جتنا انکے جانشین لے سکتے ہیں جن کا لگان بارہ کروڑ روپیہ ہے۔ قرض کا مدار افلاس پر نہیں۔ بلکہ خوشحالی پر ہے۔ جب کہ مسٹر ڈارلنگ نے اکنامک جرنل آف انڈیا میں لکھا ہے "لے لینڈ اینڈ کنسٹرکٹیو ٹیول پیرا ۶۔۷"

کرنا چاہتے تھے۔ حکم دیا گیا۔ کہ یا تو وہ اپنا حصہ ساری زراعت پیشہ جماعت کے پاس بیچیں یا کسی ایسے فرد کے پاس فروخت کریں۔ جو اُن کا ساجھی ہو۔ اور باہمی رضامندی سے معقول قیمت مقرر کریں۔ اگر وہ مقرر نہ کر سکیں۔ تو ایک افسر مالگذاری اور تین اسیسر ملکر قیمت زمین کی تعیین کریں گے۔ اس کے بعد یعنی ۱۸۵۶ء میں ڈگری کے سلسلہ میں زرعی زمین کی فروخت کے لئے کمشنر سے اجازت کرنی پڑتی تھی۔ ۱۸۵۹ء میں آبائی جائیداد کے سلسلہ میں یہ ضروری قرار دیا گیا۔ کہ جوڈیشل کمشنر سے اجازت حاصل کی جائے۔ بعد میں فروخت اراضی کی درخواستیں فنانشل کمشنر کے پاس پیش ہونے لگیں۔ ۱۸۶۶ء کے بعد یہ قرار پایا۔ کہ کوئی شخص منظوری حاصل کئے بغیر اپنا کوئی حق جو اُسے زمین پر حاصل ہے۔ قرض کے عوض نہیں دے سکتا۔ ۱۸۵۹ء میں پہلی دفعہ جو ضابطہ دیوانی مرتب کیا گیا تھا۔ اس کی رو سے دیوانی عدالتوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا۔ کہ وہ ڈگری کے اجراء کے سلسلہ میں زرعی جائیداد قرق کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ ضابطہ ۱۸۶۶ء سے پہلے پنجاب میں نافذ نہیں ہوا۔ مزید برآں قدرتی اور زرعی جائیداد کی فروخت کے متعلق جو دفعات تھیں۔ اُن میں بعض صوبوں میں ترمیم بھی کی جا سکتی تھی۔ اور ان صوبوں میں پنجاب بھی شامل تھا۔

الحاق پنجاب سے پیشتر مشترکہ ملکیت زمین کا طریقہ ایک قوی عامل تھا۔ جس کی وجہ سے باہر کے لوگ زمین پر قبضہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور آبائی جائیداد کا انتقال لوگوں کے جذبات کے اسقدر مخالف واقع ہوا تھا۔ کہ بآسانی کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگرچہ اس نوع کے انتقال اراضی کے واقعات شاذ و نادر ہوتے رہے لیکن یہ چیز عام زندگی کے دائرہ سے باہر سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اس قسم کے انتقال کی مثالیں دینا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ جب سرایڈورڈ مینکلگن ملتان کے مہتمم بندوبست تھے۔ تو انہوں نے اس قسم کی مثالیں جمع کی تھیں۔ لیکن اُن سے یہ واضح طور پر معلوم نہیں ہوتا۔ کہ کس چیز کا انتقال عمل میں لایا گیا۔ کیونکہ اس امر سے سب باخبر ہیں۔ کہ سکھ کارداروں کو اس امر میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ کہ اگر کوئی کاشتکار زیادہ لگان ادا کرنے پر آمادہ

ہو جائے۔ تو کسی کاشتکار کو بیدخل کر کے اُس کی بجائے اُسے مزروعہ بنا دیا جائیگا۔ اِس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ کہ حکومت وقت کے مقابلہ میں بھی حقوق انتقال حاصل تھے۔

ہندوستانی فرمانرواؤں کے عہد حکومت میں موروثی اراضی کو ادائے قرض کیلئے جبرًا فروخت کرنیکا رواج نہیں تھا۔ ہندوؤں کے دھرم شاستر کی حقیقی اسپرٹ اس امر کے بالکل مخالف ہے کہ ایک فرد واحد آبائی جائیداد کا مالک قرار پائے۔ اور پنجاب کے مسلمان بھی اس بارہ میں رواج کی پابندی کرتے ہیں۔ جو درحقیقت اُنہوں نے اپنے ہندو آباؤ اجداد سے لیا ہے۔ ڈگری کی ادائیگی کیلئے زمین کے فروخت کی نام سے ۱۸۷۲ء و ۱۸۷۴ء تک لوگ بیخبر تھے۔ اور چونکہ اس پر قانون اور رواج کیوجہ سے بہت سی پابندیاں عائد ہیں۔ اسلیئے اس کے تناسب میں اضافہ نہیں ہوا۔

پنجاب میں انگریزوں کی عملداری ہوئی۔ تو کئی نئی باتیں معرض وجود میں آئیں۔ پہلے زمین کو ایک بوجھ سمجھا جاتا تھا۔ جسکا مقصد حکومت کے تباہ کن مطالبہ مالگذاری کو پورا کرتا تھا۔ لیکن اب زمین ایک قیمتی جائیداد بنگئی۔ ذرائع رسل و رسائل میں اصلاح و ترقی ہوئی تو زائد پیداوار کی فروخت کیلئے منڈیاں فراہم ہوگئیں۔ فصل کی کثرت اور فراوانی کو تقریبًا ایک مصیبت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ زائد پیداوار فروخت نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اب یہی چیز اضافہ دولت کا ذریعہ بنگئی۔ قوانین کے نفاذ اور امن و امان قائم ہونے کیلئے تمام حفاظت جان و مال کے متعلق اطمینان حاصل ہونے کی وجہ سے زمین حصول قرض کی ضمانت بنگئی۔ ساتھ ساتھ ہی جوں جوں تجارت بڑھنی تھی۔ روپیہ پس انداز کیا جانے لگا۔ اور دولت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اگلے زمانہ میں ساہوکار کئی وجوہ کے باعث بڑی بڑی رقمیں قرض نہیں دیا کرتے تھے۔ اول تو اُن کے پاس قرض دینے کے لئے روپیہ نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہ اُسے جبرًا وصول نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے۔ کہ کسان کے پاس اتنا حاصل زائد نہیں۔ جس سے وہ روپیہ ادا کر سکے۔ غلہ اُسوقت کسی کام کا نہ تھا جب تک اسکی فروخت کے متعلق پورا پورا یقین نہ ہو جاوے۔ اور جبتک ہمیشہ سڑکوں اور پھر ریلوے کے کیوجہ سے دور دراز کی منڈیوں کیساتھ تعلق قائم نہیں ہوا۔ کبھی کسی کو غلہ کی فروخت کا یقین نہیں ہوتا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں امرتسر کے سوداگران غلہ تقریبًا تباہ ہوگئے چونکہ ملک میں عام شورش برپا تھی

اسلئے مالگزاری وصول کرنے میں تاخیر ہوئی۔ اور کسانوں کے ذمہ دو دو قسطیں ہو گئیں۔ بہتوں نے
روپیہ پیشگی دیدیا۔ اور پیداوار پر قبضہ کر لیا۔ لیکن فصل نہایت کثرت اور فراوانی سے ہوئی۔ گیہوں
کی مانگ نہیں ہوئی۔ وہ فروخت نہیں ہو سکا۔ اور گوداموں میں پڑا سڑتا رہا۔ ایک اور چیز جس نے
ساکھ کو نقصان پہنچایا۔ یہ تھا۔ کہ قیمتیں مختلف اور   تھیں۔ کیونکہ لوگوں کا دارومدار مقامی پیداوار
پر تھا۔ اور باہر کی کسی منڈی سے تعلق قائم نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے توازن قائم رہ سکے۔ فصل سے
چند ماہ پیشتر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کہ آیا گیہوں کی قیمت تیس سیر فی روپیہ ہوگی۔ یا بارہ سیر فی روپیہ۔ مسٹر
الفنسٹن اور دوسرے ماہرین فن کی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انگریزوں کے ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے سے
پیشتر لوگ بہت مقروض تھے۔ لیکن اگر روپوں کا حساب لگایا جائے۔ تو لوگ اس زمانہ میں ہرگز اتنے مقروض نہیں ہو سکتے تھے جتنے بعد
میں ہو گئے۔

۱۸۶۶ء و ۱۸۷۵ء میں باقاعدہ دیوانی عدالتیں قائم کیگئیں۔ انہوں نے ضلع کے افسروں اور انکے اسٹاف سے چارج لیکر
ان دقتوں کا چکوتہ کرانا چاہا۔ جو زراعت پیشہ لوگوں کے ذمہ چلے آئے تھے۔ ان عدالتوں کے افسر عام طور پر مختلف ہوتے تھے۔
جو شہروں سے بھرتی کئے جاتے تھے۔ انہیں دیہاتی معاملات اور رسم و رواج سے واقفیت نہیں ہوتی تھی۔ ہندوستان
کے اکثر حصوں سے یہ شکایت سننے میں آئی ہے۔ کہ قرض میں جو اضافہ ہوا۔ اسکی ذمہ داری ایک حد تک عدالہائے دیوانی اور قانون دیوانی
کے غیر موزوں ہونے پر عائد ہوتی ہے۔ اس قسم کی شکایت دوسرے زرعی ممالک مثلاً فرانس میں سنی گئی ہے۔ مسٹر تھاربرن کا قول ہے کہ پنجابیوں
دیوانی عدالتوں کو اس نظر سے دیکھا۔ کہ وہ ساہوکاروں کی ایجنٹ ہیں۔ جو انکی جانب سے روپیہ جمع کرنے آئی ہیں۔ ساہوکاروں کی سازش
زمین کیلئے نہیں۔ بلکہ پیداوار کیلئے تھی۔ انہوں نے دانشمندی سے سمجھ لیا۔ کہ تجارتی حیثیت سے زمین کی قدر و قیمت کا انحصار اسکی پیداوار پر ہے
جب امن و امان کے قیام کیوجہ اچھی اچھی منڈیوں کے ساتھ تعلق قائم ہو گیا۔ تو انہوں نے یہ سعی شروع کر دی۔ کہ کم سے کم قیمت پر غلہ حاصل کریں
اسکا سیدھا سادہ طریقہ یہ تھا۔ کہ کسان پر قابو حاصل کیا جاوے۔ قدرتی تھوڑے عرصہ کے بعد دیہاتی سود خواروں کی ایک نئی جماعت پیدا ہو گئی جس کے
افراد نے اپنی اعلیٰ عقل و دانش کیوجہ سے ان تمام نئے قوانین اور نئی عدالتوں کے فوائد سے پوری طرح متمتع اندوز ہونا شروع کیا جنکی وجہ سے پنجاب کے کسانوں
کو ان کے پھندے میں پھنسا دیا۔ انکے قبضہ قدرت میں تھا لوہے کا ایسا سخت تھا کہ نئے منظور شدہ قانون شہادت کی وجہ سے اس سے کوئی نکل نہیں سکتا تھا۔ بیچارہ کسان کو اسکی کوتاہ اندیشیوں
پر ملامت کا دستور ہو گیا ہے۔ لیکن نہیں بتایا جاتا کہ زراعت پیشہ لوگوں میں یہ خصوصیت ۱۸۴۹ء کے بعد کیونکر پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے کیوں نہیں تھی
اور یہ محض مالکانِ اراضی اور ان مالکانِ اراضی تک محدود ہے۔ جن کے قبضہ میں بہترین زمینیں ہیں۔

ملک کے زمینی قرض کے متعلق رپورٹ مرتبہ ۱۸۹۵ء [illegible] جو زراعت پیشہ لوگوں کے جذبات قانون [illegible] اس قدر پھیلے ہوئے تھے۔ کہ تھوڑے [illegible] خیالات ظاہر کرنے پر مجبور [illegible]
[illegible] جو ہیں [illegible] سب سے بڑھ کر قانون [illegible] نہیں ہو سکتے [illegible] جلد پنجم [illegible]

دکن کی رعیت کمیشن کی رپورٹ میں یہ الزام تو بالکل غیر اہم قرار پایا گیا ہے کہ کسان شادی بیاہ پر بہت روپیہ صرف کر دیتے ہیں۔ مسٹر کیٹینگز۔ مسٹر مختار ریلن اور مسٹر ورت نے اس کمیشن کے بیانات کی تصدیق کی ہے پچھلے زمانہ میں زمینداروں کو صرف اس لئے بہت کم قرض نہیں ملا کرتا تھا۔ کہ وہ جو ضمانت پیش کر سکتا تھا۔ وہ چنداں قابل قدر نہیں تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی۔ کہ حکمران کی مرضی کے سوا کوئی قانون نہیں تھا۔ جس کی مدد سے روپیہ وصول کیا جا سکے۔ الحاق پنجاب سے پیشتر یہ ناممکن تھا۔ کہ کوئی زمیندار جبرا روپیہ چاہے قرض لے سکے۔ الحاق کے بعد بھی یہ ساہوکار پر امن طریق پر قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔ جب کوئی ساہوکار زرعی جائداد پر قبضہ کرنا چاہتا تھا لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو کر اظہار ناراضی کے ایسے وسائل اختیار کرتا تھا۔ جن کا مطلب سمجھنے میں غلطی نہیں ہو سکتی

سالہا سال کے بعد تحریری اقرارنامہ یا ڈگری کی وجہ سے کہیں یہ اطمینان ہوا۔ کہ حق منتقلہ کا احترام ملحوظ رکھا جائیگا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ساہوکار کو زمین کی نہیں۔ بلکہ فصل کی ضرورت تھی۔ اس کے نزدیک کاشتکار کے بغیر زمین کسی کام کی نہیں تھی۔ اور جب تک زمین عام تھی۔ اور مزارعین کی قلت ہوا کرتی ہے۔ زمین کے حقوق ملکیت کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے تھے۔ اس کی توضیح دو امور سے ہوتی ہے۔ ابتدائی سالوں میں جس قدر زمین فروخت کیگئی۔ وہ تمام مزروعہ زمین تھی۔ یہ کوشش نہیں کی گئی۔ کہ ویران زمین کو خرید کر آئندہ اس کی اصلاح و ترقی کی جانب توجہ کیجائے۔ مزید براں ساہوکاروں نے کبھی اس امر پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ کہ وہ مالکان اراضی بن جائیں۔ یا موروثی اراضی کو خریدیں۔ کیونکہ مالکانہ حقوق سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دیہاتی ساکھ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے آخر الذکر امر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ موروثی کاشتکار اپنے حقوق منتقل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود صرف اسکی ساکھ ہی قائم نہیں۔ بلکہ عام مشاہدے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ وہ چھوٹے چھوٹے زمینداروں سے جنکے درمیان وہ زندگی بسر کرتا ہے اور جنکے حق انتقال اراضی پر اسقدر پابندیاں عائد نہیں۔ اکثر زیادہ آسودہ حال ہوتا ہے۔ اور اس قدر بندشوں میں بھی مبتلا نہیں ہوتا۔

جو لوگ قانون انتقال اراضی کو ایک خاص طبقہ کے حقوق کا محافظ سمجھکر اس اظہار ناراضی کرتے ہیں وہ تقابا شفاء یہ پڑھیں

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ کسانوں کے مقروض ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے۔ کہ گاؤں کے سود خوار پیداوار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۸۴۹ء سے پہلے اتنی زائد پیداوار نہیں ہوتی تھی۔ کہ وہ اس پر قبضہ کر سکیں۔ لیکن برطانی حکام نے مالگذاری کو جو پوری پیداوار زائد پر مشتمل ہوتی تھی۔ نظری طور پر نصف اور عملی حیثیت سے چوتھا ہی کر دیا۔ اس طرح کسان کے پاس کچھ ماحصل زائد باقی بچ گیا۔ جسے وہ فروخت کر سکتا تھا۔ اسی ماحصل نایدکی وجہ سے زمین قابل فروخت ہو گئی۔ بہت سی دیسی ریاستوں میں مالگذاری پیداوار زائد کا بیشتر حصہ ہوتی ہے۔ اور اکثر حالات میں تو انتقال اراضی بھی مفقود ہے۔ وہاں زمیندار کا حق فروخت اراضی کوئی معنی نہیں رکھتا ۱۸۴۹ء سے پہلے رہن زمین کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ کیونکہ اس کے لئے حقوق کی تعیین ضروری ہے۔ برطانی عملداری کے قائم ہوتے ہی بنگال کے طریقہ پر زمین رہن کی جاتی تھی ۱۸۷۴ء تک ۱۳ لاکھ ایکڑ زمین قرض کے بوجھ تلے دبی تھی جس میں دس لاکھ ایکڑ تو چھ سال کے اندر رہن ہوئی تھی۔ اس طرح گویا الحاق کے بعد جس قدر جائداد پر قرض لیا گیا۔ وہ بہت تھوڑی تھی (یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ علاقہ ماورائے ستلج کے الحاق سے پہلے وہ علاقہ جو ستلج سے مغرب کی سمت واقع تھا۔ برطانی عملداری میں آچکا تھا۔ پار کا علاقہ ستلج ۱۸۴۹ء میں انگریزی عملداری میں آیا۔ اور غدر ۵۷ء کے بعد دہلی کے علاقہ کو صوبجات متحدہ سے الگ کر کے پنجاب میں شامل کر دیا گیا)[1] ۱۸۷۴ء میں[2] جو تحقیقات کی گئی۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ گورداسپور ہ ۶۶ و ۵ اراضی ساہوکار ل

(بقایا صفحہ گذشتہ) وہ اِس سلسلہ حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ پرانے زمانہ میں ساہوکار کسان کی زمین پر قبضہ نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اُس کے مویشی کو دائرہ تصریف میں لے آیا کرتے تھے۔

[1] اگرچہ اس امر کی شہادت ملتی ہے۔ کہ انگریزوں کی عملداری سے پہلے بھی زمین کے حقوق مالکانہ بوجھ تلے دبے رہتے تھے۔ تاہم یہ امر پوری طرح ثابت ہو چکا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں رہن کے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے تھے۔

[2] اس کے متعلق زمانہ ماقبل کی شہادتیں فراہم کرنا آسان نہیں۔ جب تک کوئی عجیب صورت حال توجہ منعطف نہ کرے۔ اس پر تبصرہ و تنقید نہیں کی جائے گی لیکن ۱۸۰۰ء تک کسان کی زندگی کے تغیرات میں ساہوکار بھی حصہ لیتا تھا۔ اور اُن سے محض جلب منفعت ہی نہیں کرتا تھا۔

کے پاس رہن کی گئی۔ لیکن جو اراضی اُن کے ہاتھ فروخت کی گئی۔ اس کا تناسب ۳۰ فیصدی تھا۔ چونکہ جس قدر رقبہ فروخت کیا جاتا تھا۔ وہ رہن شدہ رقبہ سے نصف ہوتا تھا۔ اس لئے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ساہوکار ملکیت کی ذمہ واریاں اُٹھائے بغیر محض زمین کی پیداوار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ۲۰۸۱ میں بیان کیا گیا ہے۔ زمین کو خریدنے سے ساہوکار کو صرف یہ فائدہ ہوتا تھا۔ کہ وہ زمیندار پر قبضہ کر لیتا تھا۔ لیکن زمین کو بطور رہن لیکر وہ زمین کے ساتھ محنتی اور فرماں پذیر مالک زمین پر بھی قبضہ کر لیتا تھا۔ جو مزارع کی حیثیت سے اُس کے لئے کام کرتا تھا۔ مزید براں اس پر بار بار اظہار رائے کیا گیا۔ کہ جن علاقوں میں زمین کی رہن کے واقعات ہوتے تھے۔ وہ نہایت آسودہ حال اور دولت مند اضلاع دے۔ اور رہن شدہ جائداد بہت زرخیز ہوتی تھی۔ دوسری جانب وہ زمینیں جو فروخت کی جاتی تھیں وہ ایسے اضلاع میں ہوتی تھی جن کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اور ان زمینوں کو اکثر اوقات کسان ہی خریدا کرتے تھے۔ جن لوگوں نے ابتدا میں بندوبست کی رپورٹیں مرتب کیں۔ وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتے ہیں۔ کہ کسان وہی اراضی فروخت کرتے ہیں۔ جو نسبتاً کم قیمت ہیں۔ اور اچھی زمینوں پر اُنہیں حق دعویٰ ہے۔ لیکن سرکاری طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے۔ کہ جب زمین پر مرتہن کا ایک مرتبہ قبضہ ہو جاتا ہے۔ تو وہ اُس پر قرض اور سود کا برابر اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ تا آنکہ راہن یا اس کا جانشین قرض کے بوجھ تلے اس طرح دب جاتا ہے۔ کہ اُس سے نکلنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا اور ساہوکار اگر رسمی طور پر نہ سہی تو درحقیقت زمین کا مالک بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ پنجاب کا کسان ایک نئی قسم کے قرض سے دوچار ہو رہا ہے۔ اور دوسرے ملکوں کے کسانوں کی طرح وہ بھی تباہی کے خطرہ میں مبتلا ہے۔ سرکاری تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جو روپیہ قرض لیا جاتا ہے۔ اُس میں سے ۹۴ فیصدی ایسا ہوتا ہے۔ جس کے قرض لینے سے پیداوار کو ترقی دینا مقصود نہیں ہوتا۔ ۱۸۷۱ء کی رپورٹ میں لکھا ہے۔ کہ لوگ ابھی تک قرض پر لئے ہوئے روپیہ سے پیداوار بڑھانے کا کام لینا نہیں جانتے۔ وہ اکثر محض فوری ضروریات پورا کرنے یا ہنگامی مطالبات کی ادائیگی کے لئے روپیہ قرض لیتے ہیں"۔ اور ۱۸۸۸ء کی رپورٹ میں مذکور ہے۔ کہ "اب زمین کو رہن کر کے روپیہ قرض لینے میں زیادہ آسانیاں ہو رہی ہیں

اُس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا۔ کہ انتقال اراضی کو روکنے کے لئے قانون وضع کرنا اقتصادی اصولوں کے خلاف ہوگا۔ لیکن اس دعوے کی کوئی سند پیش نہیں کی گئی۔ لیکن ماہرین اقتصادیات خود کاشت زمینداروں کی بے دخلی اور ایسے سرمایہ داروں کے قبضہ کو جو مزارعین سے زمین کی کاشت کراتے ہیں۔ چنداں اہم چیز نہیں سمجھتے۔ قرض دو دھاری تلوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور پروفیسر جانڈ کا یہ قول پنجاب کے حالات پر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے[1] یہ اکثر کہا گیا ہے۔ کہ قرض زمیندار کو اسی طرح اپنے قابو میں رکھتی ہے جس طرح اُس شخص کو جسے پھانسی دی گئی ہو۔ رسی کا پھندا اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ مقروض یا رہن صرف سود خواروں کے لئے منفعت بخش چیز ہے۔ دریائے ڈینیوب کے ممالک اور الجیریا اور روس میں جہاں جاہل اور کوتاہ اندیش کو اسکا شکار بنایا جاتا ہے۔ اس سے جس قدر نقصان ہوتا ہے۔ اُس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور ہم اس امر میں پروفیسر جانڈ سے متفق ہیں۔ کہ اس چیز سے جس قدر زمینداروں کو نقصان ہوا ہے۔ اُس کا مقابلہ اُن زمینداروں سے کیا جائے۔ جو اس کی بدولت دولتمند ہو گئے ہیں۔ تو اس کی تنسیخ ضروری ہوگی۔ آگے چل کر پروفیسر مذکور لکھتا ہے[2] جتنی آسانی سے رہن کی بدولت قرض حاصل کیا جائے۔ اتنا ہی خطرناک ثابت ہوگی۔ اور چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی سود خواروں کے پنجے میں زیادہ گرفتار ہو جائیں گے۔ بدقسمتی سے اس وقت پنجاب کے کسانوں کو مسٹر ڈبوش کے اس انتباہ کا پورا احساس نہیں ہوا تھا۔ کہ ایسے شخص سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیئے۔ جو بآسانی تمام قرض فراہم کرنے پر آمادہ ہو جائے مسٹر کیٹنگز نے بھی[3] دکن کے کسانوں کے متعلق ایسی قسم کی داستان سنائی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ کسان کو اپنی زمین کی ضمانت پر روپیہ قرض لیتے ہیں۔ ظاہر جس قدر آسانی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اُسے مبتلائے فریب کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ نہیں سمجھ سکتا۔ کہ آخر ایک دن اُسے حساب چکانا بھی پڑیگا۔ مسٹر دت نے اضافہ قیمت کے متعلق جو رپورٹ لکھی ہے۔ اس میں وہ بھی لکھتا ہے۔ کہ ملک میں دولت

---

[1] پولٹیکل اکانومی۔ صفحہ ۳۹۴

[2] صفحہ ۳۹۶

[3] رورل اکانومی آف دی بمبئی دکن صفحہ ۔ ۔ صفحہ ۱۶۱ ـــ

کے زیادہ ہوجانے کی وجہ سے آج ایسے لوگ بہ نسبت سابق زیادہ ہیں۔ جو روپیہ قرض دے سکتے ہیں۔ اُن میں
کسان کو کم سے کم شرح سود پر قرض دینے میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ زمین کی
قیمت میں معتدبہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اور وہ اب اُسکی ضمانت پر نسبتاً زیادہ قرض حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن
کسان اپنی بڑھی ہوئی ساکھ سے کوئی فائدہ اٹھانے کی بجائے قرض لیتا ہے اور اُسے احمقانہ اور عاقبت
نااندیشانہ مقاصد پر صرف کردیتا ہے۔ قرض میں اس قدر جذب و کشش ہے۔ کہ وہ ادھار لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور
نہ اُسے اِس چیز کے خطرات کا احساس ہے۔ علی الخصوص وہ کسان اس بارہ میں خاص طور پر پیش نظر آتے ہیں۔
جنکے قبضہ میں چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی ہیں۔" دکن کی رعیت کمیٹی نے ۱۸۷۵ء میں جو رپورٹ لکھی تھی
اُس میں کسان کی کوتاہ اندیشی کے متعلق جسکا اس قدر چرچا ہے۔ یہ الفاظ استعمال کئے تھے" کہ کسان اپنی
جہالت کے باعث کوتاہ بین اور غیر محتاط ہوتے ہیں۔ کہ موجودہ ضروریات پوری کرنیکے لئے آیندہ آمدنی
کو کم کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اور پھر اپنی حماقت سے وہ قرض لے لیتے ہیں۔ اُس سے کوئی فائدہ نہیں
اٹھاتے۔ بلکہ اُسے بیجا طریق پر صرف کردیتے ہیں۔ ہماری عدالتہائے دیوانی کی وجہ سے قرض وصول
کرنے میں جو سہولتیں ہوگئی ہیں۔ اُنکی وجہ سے ادنیٰ درجہ کے ساہوکاروں کا ایک گروہ پیدا ہوگیا ہے۔
جو ادنےٰ درجہ کے مفلس زراعت پیشہ لوگوں سے بہت سا سود وصول کرتا ہے۔ قرض کے اضافہ کا
ایک باعث یہ بھی ہے۔ کہ ساہوکار قانون کی اعانت و حمایت کے طفیل بآسانی قرض وصول کرسکتے
ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کسانوں کی ساکھ زیادہ ہوگئی ہے۔ کہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار اُنہیں قرض دینے کے
بارہ میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں ۱۸۸۰ء میں قحط کے اسباب کی
تحقیقات کے متعلق جو کمیشن مقرر کیا گیا تھا۔ اُس میں لکھا ہے۔ کہ جو طبقے قرض کی بہترین ضمانت
دے سکتے ہیں۔ وہی ساہوکاروں کے پھندے میں بآسانی پھنستے ہیں۔ اس رپورٹ میں آگے چلکر یہ الفاظ آتے
ہیں" قانون کا سخت اور مکمل نظام بھی مفلسی اور کسانوں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہے"۔ ۱۹۰۱ء میں
قحط کے متعلق جو رپورٹ شائع ہوئی تھی اُس میں بمبئی کے متعلق لکھا۔ "کہ کسان کو چونکہ اپنی اراضی کے
انتقال کا حق حاصل ہے۔ اس لئے یہ چیز اُسکے مقروض ہونیکا بہت بڑا سبب ثابت ہوئی ہے۔ ہمیشہ
یہ دیکھا گیا ہے۔ کہ جب کوتاہ اندیش کسانوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے۔ کہ وہ غیر مشروط طریق پر اُن تمام قیمتی
حقوق کو جو اُسے زمین پر ہیں۔ فروخت کرسکیں۔ تو وہ قرض میں بہت زیادہ مبتلا ہوجاتے ہیں۔

اور اُن کی جائداد اُنکے قبضہ سے نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس طرح گویا کسانوں کے مبتلائے قرض ہونیکا اصلی سبب یہ تھا۔ کہ پنجاب کے الحاق کے بعد انگریزی حکومت نے کسانوں کو حقوق عطا کئے۔ مالگذاری میں اسقدر تخفیف کردی۔ کہ اُنہیں اچھا خاصا منافع بچنے لگا۔ اور جیسا کہ مسٹر ٹھاربرن[1] نے لکھا ہے کہ کسانوں نے اپنی روز افزوں لیاقت سے قدرتاً فائدہ اُٹھانا چاہا جس زمین میں زرعی پیداوار ہو سکتی تھی۔ اسکی قیمت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس چیز نے تمام ساہوکاروں کو اپنی جانب منعطف کر لیا۔ انہیں اس کاروبار میں جس قدر منافع ہوا۔ اس کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے دوکانداروں میں بھی شوق پیدا ہوا۔ اور اُنہوں نے بڑے بڑے ساہوکاروں سے روپیہ قرض لیکر کسانوں کو قرضہ دینا شروع کیا۔ اسطرح لوگوں کی ضروریات خواہ کچھ بھی ہوں۔ ایسے قرض دینے والے موجود تھے۔ جو اُنہیں فوراً پورا کر دیتے تھے۔ صوبہ کی بڑھتی ہوئی دولت نے سرمایہ میں اضافہ پیدا کر دیا۔ اور چونکہ صنعت و حرفت کا کوئی کام ایسا نہیں تھا جس پر روپیہ لگایا جا سکے اسلئے زمین کو سرمایہ لگانے کا واحد محفوظ ذریعہ سمجھ لیا گیا۔ ہم نے سرمایہ لگانے" کا لفظ عمداً استعمال کیا ہے۔ یہ اچھی طرح واضح ہے۔ کہ صرف روپیہ قرض ملنا ہی قرضہ کے اس اضافہ کا باعث نہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ روپیہ قرض دینے والے اپنا روپیہ واپس نہیں لینا چاہتے تھے۔ کیونکہ اُن کی خواہش تھی۔ کہ پیداوار پر انہیں مستقل حق حاصل رہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ وہ اصل رقم واپس لینا نہیں چاہتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا۔ کہ روپیہ کے عوض جنس دی جائے۔ سود خوار اس لئے روپیہ لگاتے تھے۔ کہ اُنہیں ایک سالانہ آمدنی حاصل ہوتی رہے۔ چنانچہ وہ کبھی اس فک الرہن پر زور نہیں دیتے تھے۔ سطور مندرجہ بالا سے یہ واضح ہے۔ کہ انگریزوں کی عملداری نے گاؤں کے سودخواروں کے لئے نفع حاصل کرنیکا میدان فراہم کر دیا۔ اس واقعہ سے پہلے سود خوار کے لئے اپنا کاروبار جاری رکھنے کا چنداں موقعہ نہیں تھا۔ اس کے پاس اتنا زر نقد کہاں تھا۔ کہ وہ اُسے قرض دے سکے۔ یا زمین پر لگا سکے۔ اُسے اس امر کے متعلق کوئی اطمینان نہیں تھا۔ کہ اس کی رقم اُسے واپس مل جائے گی۔ گویا ایک حد تک کہنا چاہیئے۔ کہ سود خوار برطانی حکومت کی مخلوق[2] ہے۔ آئرلینڈ میں جب زمیندار جو اپنی زمین سے

---

[1] کسانوں کے قرض کے متعلق رپورٹ بابت ۱۸۹۶ء صفحہ ۷۳

[2] ملاحظہ ہو امپیریل گزیٹیر آف انڈیا کی جلد سوم صفحہ ۹ کا یہ اقتباس (بقیہ صفحہ آئندہ)

غیر حاضر رہتے تھے۔ اپنی جائداد کو لگان حاصل کرنیکا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور مزارعین افلاس میں مبتلا تھے۔ کیونکہ اُنکے حقوق معین نہیں تھے۔ آلو کی فصل بار بار تباہ ہو جاتی تھی۔ امریکہ کے سستے گیہوں سے مقابلہ درپیش تھا۔ اُس زمانہ میں سُود خوار کی سرگرمیوں کا میدان تنگ تھا لیکن جب مزارعین نے اپنے حقوق پہلے پہل معین کرلئے مناسب لگان تجویز کیا گیا۔ انتقال کا حق بھی حاصل ہوگیا۔ اور بعد میں جب بیع اراضی کے قوانین کے ماتحت وہ اراضی کا مالک قرار پایا تو اُسے ایسے حقوق حاصل ہوگئے جنہیں وہ قرض لینے کے لئے ضمانت کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ اس وقت اس کے حقوق سے فائدہ اُٹھانا ممکن تھا۔ چنانچہ اس ملک میں بکثرت مہاجن پہنچے۔ ۱۸۸۱ء میں یعنی قانون اراضی کے نفاذ سے پیشتر (جبکہ آئرلینڈ کے مزارعین کو وہی حقوق عطا کرد‌ئے گئے۔ جو پنجاب کے مزارعین کو حاصل ہیں یعنی تقریباً وہی حقوق جو موروثی مزارع کے ہیں) آئرلینڈ میں یہودیوں کی مجموعی تعداد ۲،۷۴ تھی ۱۸۹۱ء تک یعنی قانون بیع اراضی کے نفاذ کے بعد انکی تعداد ۸۴۱۵ ہوگئی۔ اور مہاجنوں کی تعداد بارہ سال کے عرصہ میں تگنی ہوگئی

اب پنجاب کی طرف توجہ کیجئے۔ یہاں آپکو ناقابل تردید شہادتوں سے معلوم ہوگا۔ کہ زراعت پیشہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ۔ جسمیں ملک کی حالت عمومی بیان کردی گئی ہے " عام طور پر ہندوستان کی زراعت ادنیٰ حیثیت کے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ زمین کی کاشت کیلئے جسقدر روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُسے چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار چھوٹی چھوٹی رقوم میں فراہم کرتے ہیں۔ اور یہ روپیہ قرض لینے والے اگر بھی تجارتی معاملات میں پوری پوری بصیرت نہیں رکھتے۔ ہندوستان کے کسان بھی دنیا کے اکثر ممالک کے کسانوں کیطرح قرض سے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ باقی رہا یہ امر کہ آیا ہندوستانی کسان دوسرے ملک کے کسانوں سے زیادہ مقروض ہے۔ بحث کا محتاج ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں کسان بہت زیادہ مقروض ہے۔ زراعت کی یہ خصوصیت گذشتہ نصف صدی میں پیدا ہوئی ہے۔ ایک جانب تو زمین جو کسان کی تنہا ضمانت ہے۔ برطانی عہد حکومت میں بہت بیش قیمت ہوگئی ہے۔ اِسکے اُسکے قلب میں یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ کہ وہ اس پر غیر ضروری قرض کا بوجھ ڈال دے۔ دوسری جانب اس اضافہ قیمت سے قرض کے سُود پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ساہوکار جاہل کسان کی تجارتی بے بسی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور چونکہ کسانوں میں قرض حاصل کرنے کیلئے حریفانہ مسابقت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لئے شرح سود اسقدر ہے کہ زراعت کاروباری حیثیت سے ناممکن ہوگئی ہے۔ ایک جانب یہ صورت ہے۔ دوسری جانب روپیہ جسکی قدر بڑھ گئی ہے اسطرح بہت تھوڑی مقدار میں حاصل ہوتا ہے

طبقہ کی خوشحالی نے تجارت پیشہ لوگوں کی تعداد کثیر کو روپیہ قرض دینے کی جانب مائل کر دیا۔ مہاجنوں اور ساہوکاروں کی تعداد (اُنکے متعلقین سمیت) ۱۸۶۸ء کی مردم شماری کے مطابق ۵۲۲۶۳ تھی۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہ تعداد ۱۹۳۰۹۰ ہوگئی۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دو سال کے عرصے میں زراعت پیشہ لوگوں کی ایک جماعت بھی عالم وجود میں آگئی ہے۔ جو اپنے ہمسائیوں[1] کو قرض دیکر اپنی آمدنی کا اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن انکا شمار ساہوکاروں کے طبقہ میں نہیں ہوتا۔ محکمہ انکم ٹیکس کی آمدنی کے اعداد و شمار کسی قدر اس امر کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ گذشتہ سالوں کے اندر روپیہ قرض دینے کے طریقہ میں کس سُرعت سے اضافہ ہوا ہے۔ سالانہ رپورٹ میں مذکور ہے۔ کہ کسقدر لوگوں سے انکم ٹیکس لیا گیا۔ اور انکم ٹیکس کی رقم کتنی تھی۔ حساب لگانے سے بآسانی معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ یہ ٹیکس کتنی آمدنی کا ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنا زیادہ مشکل ہے۔ کہ یہ آمدنی کسقدر سرمایہ سے حاصل ہوئی ہے۔ شرح سُود مختلف ہے یعنی ۶ سے ۲۴ فیصدی ہے۔ لیکن چونکہ مہاجن کو صرف سود ہی حاصل نہیں ہوتا اسلئے یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جس قدر سود لگایا جاتا ہے ہمیشہ ادا نہیں کیا جاتا۔ بلکہ کچھ روپیہ مقدمہ بازی پر صرف ہوتا ہے۔ اور کسقدر روپیہ کا نقصان ہوجاتا ہے اسلئے یہ سمجھنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ منافع خالص (وہ آمدنی جسپر ٹیکس لیا گیا ہے) اُس اصل سے تقریباً ۱۲½ فیصدی ہوتا ہے۔ جو بطور قرض دیا جاتا ہے۔

ذیل کے نقشہ میں ایک ہزار روپے سے کم آمدنی محسوب نہیں کیگئی

سال	کتنے لوگوں پر ٹیکس لگایا گیا	ٹیکس	کتنی آمدنی کا ٹیکس	سرمایہ جس سے آمدنی ہوئی
۱۸۹۸ء و ۱۸۹۹ء	۔۔ ۰۰ ۔۔	۲ لاکھ ۰۰ ہزار روپیہ	ایک کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ	۱۲ کروڑ
۱۹۰۲ء و ۱۹۰۳ء	۔ ۴۰۰۰ ۔	۴ لاکھ	ایک کروڑ ۶۵ لاکھ	۱۳ کروڑ
۱۹۰۷ء و ۱۹۰۸ء	۱۰۳۰۰	۴ لاکھ ۲۰ ہزار	ایک کروڑ ۸۰ لاکھ	۱۵ کروڑ
۱۹۱۲ء و ۱۹۱۳ء	۱۲۵۰۰	۵ لاکھ ۱۳ ہزار	۲ کروڑ ۱۳ لاکھ	۱۷ کروڑ
۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء	۱۵۰۳۵	۷ لاکھ ۲۲ ہزار	۳ کروڑ ۵۰ لاکھ	۲۸ کروڑ

[1] اعداد و شمار رہن کے جا سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر ساہوکاروں کے پاس آمدنی کے دوسرے وسائل بھی ہیں۔ لیکن اکثر لوگ جو محض تاجر سمجھے جاتے ہیں۔ روپیہ بھی قرض دیتے ہیں ؎

چند سال ہوئے۔ کہ پانسو روپیہ اور ہزار روپیہ سالانہ آمدنی پر بھی ٹیکس لگایا جانے لگا۔ اسلئے ان مہاجنوں کی تعداد معلوم کرنا آسان ہے۔ جن کی آمدنی پانسو روپیہ اور ایک ہزار روپیہ سالانہ[1] کے درمیان ہے۔ ان پر ایسے مہاجنوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جن کی آمدنی پانسو روپیہ سالانہ سے بھی کم ہے۔ اِس طرح گویا صوبہ بھر کے ساہوکاروں کی تعداد چالیس ہزار ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ ہر کنبہ کے ارکان کا اوسط ۷ء۴ افراد ہے۔ اِس لئے مہاجنوں اور ان کے متعلقین کی مجموعی تعداد ۱۹۳۸۹۰ ہوئی۔ یہی تعداد گذشتہ مردم شماری کی رپورٹ میں مذکور ہے۔ مندرجہ بالا اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ساہوکاروں کی تعداد اور اس سرمایہ میں جو قرض دیا جاتا ہے۔ کس قدر سرعت سے اضافہ ہوا۔ ساہوکاری کے پیشہ کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے انکم ٹیکس کی آمدنی کے اعداد سے پھر رجوع کرنا چاہئے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء میں ۴۰۶۹۰ سے ٹیکس لیا گیا۔ ان میں سے کم از کم ۱۵۰۰۰ مہاجن اور ساہوکار تھے۔ اور باقی ۲۵۰۰۰ دوسرے پیشوں کے لوگ۔ انکم ٹیکس کی مجموعی مالیت تیس لاکھ ستر ہزار تھی۔ اس میں سات لاکھ چالیس ہزار روپیہ ساہوکاروں سے لیا گیا۔ جس آمدنی پر ٹیکس لگایا گیا۔ اس کی مجموعی مالیت سات کروڑ پچاس لاکھ تھی۔ اس میں سے تین کروڑ پچاس لاکھ محض ساہوکاروں کی آمدنی تھی۔ چونکہ جتنے لوگ روپیہ قرض دینے پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ (یعنی ساہوکار اور انکے متعلق) انکی تعداد مجموعی آبادی کا ایک فیصدی ہے۔ حالانکہ دوسری تجارتوں پر زندگی بسر کرنے والے ۵ء۴ فی صدی ہیں۔ سرکاری ملازمین ۷ء۲ فی صدی مختلف پیشہ ۴ء۹ فیصدی اور کارخانوں وغیرہ کے ملازمین ۲۰۰۳ء۲۰ فی صدی اس لئے یہ ظاہر ہے۔ کہ ساہوکار کی آمدنی کا اوسط تمام پیشوں کی آمدنی کے اوسط سے زیادہ ہے۔

---

[1] ۱۸۹۶ء و ۱۸۹۸ء میں جن لوگوں پر ٹیکس لگایا گیا۔ ان کی مجموعی تعداد ۴۴۹۴۴ تھی۔ لیکن اُن میں سے ۲۰۰۰۰ ایسے تھے۔ جن کی آمدنی ۱۰۰۰ سے کم تھی۔ اور ۱۶۰۰۰ کی آمدنی ایک ہزار سے زیادہ۔

صحیح خالص آمدنی کے متعلق تو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جو اطلاعات فراہم کی گئی ہیں۔ ان سے ایک سرسری سا تخمینہ کیا جا سکتا ہے۔ جس زمانہ میں ابھی ۵۰۰ سے ہزار روپیہ تک کی سالانہ آمدنی پر انکم ٹیکس لگایا گیا تھا۔ پانسو سے ہزار روپیہ تک آمدنی رکھنے والے ساہوکاروں کی مجموعی آمدنی ایک ہزار سے زیادہ آمدنی رکھنے والے ساہوکاروں کی آمدنی کا تناسب ۱۵ اور ۳۸ تھا۔

اس طرح گویا پانسو روپیہ سے زیادہ آمدنی رکھنے والے ساہوکاروں کی مجموعی آمدنی پانچ کروڑ روپے کے قریب ہے۔ اور اگر اس آمدنی کو بھی محسوب کر لیا جائے۔ جس پر انکم ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ تو مجموعی آمدنی پانچ کروڑ سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے کی آمدنی بابت ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء ساٹ کروڑ چونسٹھ لاکھ روپیہ تھی۔ اور آبپاشی کی خالص آمدنی بابت سال مذکور دو کروڑ ۷۶ لاکھ ہے۔ ان اعداد سے مقابلہ کیجئے۔ تو آپ پر واضح ہو جائیگا۔ کہ اس صوبہ میں ساہوکاری کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ ساہوکاروں میں تمام تاجروں سے زیادہ ٹیکس ادا کرنے والے پائے جاتے ہیں۔ کمپنیوں کے علاوہ تمام صناعوں میں سے (جو نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں) صرف ۵۷۵ ایسے ہیں۔ جو ٹیکس ادا کرتے ہیں اور ان کے انکم ٹیکس کی مجموعی مالیت ۴۳۰۰۰ روپیہ ہوتی ہے۔ بیرسٹروں اور پلیڈروں وغیرہ میں سے ۱۰۷۳ ٹیکس دیتے ہیں۔ اور ان کے ٹیکس کی مالیت ۸۶۲۵۱ روپے سے زیادہ نہیں یہ ٹیکس ۲۸ لاکھ آمدنی پر لیا جاتا ہے۔ دوسرے پیشہ کے لوگوں میں ۱۹۵ ٹیکس دیتے ہیں۔ انکا ٹیکس مجموعی حیثیت سے ۲۲۴۰۰ ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا اعداد شمار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صوبہ پر کس حد تک ساہوکار کا تسلط ہے۔ ساہوکار متموّل ترین طبقہ ہے۔ اسکا منافع غالباً تمام کسانوں کے مجموعی منافع سے زیادہ ہوتا ہے۔ پیشہ ور لوگ قابلِ التفات نہیں۔ اہلِ صنعت و حرفت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ بلکہ تجارت کو بھی قانونی حیثیت حاصل ہے۔ پنجاب میں ساہوکاروں کا جو تسلط ہے۔ اس کی مثال کسی صوبہ میں نہیں ملتی۔ پنجاب سمیت سارے ہندوستان میں ساہوکاروں کا تناسب ۳۶۷ : ۱ ہے۔ اور پنجاب میں ۱:۱۵ اگرچہ پنجاب کی آبادی ہندوستان کی مجموعی آبادی کا گیارہویں حصہ ہے۔ لیکن برٹش انڈیا میں جتنے ساہوکار

آباد ہیں۔ اُن میں سے ایک چوتھائی پنجاب میں موجود ہیں۔ اور یہیں کام کرتے ہیں۔
دوسرے مسائل کیجانب توجہ کرنے سے پیشتر یہ واضح کر دینا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک انگریز اس صوبہ میں نہیں آئے تھے "شاہ" یا ساہوکار واحد ذریعہ تھے۔ جن سے زراعت پیشہ لوگ مصیبت کے زمانہ میں مدد حاصل کرسکتے تھے۔ اگر کوئی شخص جبراً اپنے مطالبات منوانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ تو یہ وہی شخص ہو سکتا تھا۔ جو لوگوں کو روپیہ قرض دیتا تھا۔ لوگ اُس کے بارِ احسان تلے اسقدر دبے ہوئے تھے۔ کہ زرِ تقاوی کے متعلق یہ سمجھایا جاتا تھا۔ کہ وہ ایک مشترکہ مقصد پورا کر رہا ہے۔ لیکن جب قحط وغیرہ کے قسم کی کوئی مصیبت آپڑتی تھی۔ تو وہ لوگوں کو اُن کے اثرات سے بچا نہیں سکتا تھا۔ قحط کی وجہ سے لوگ فاقے کرتے تھے اور فاقے کرتے کرتے مر جاتے تھے۔ گھر چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ گاؤں ویران اور تباہ ہو جاتے تھے۔ لیکن وہ مقروض نہیں ہوتے تھے۔ وہ اپنے مویشی اور گھر کا سارا سامان ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا کرتے تھے۔ اِس طرح اُن کی ساری ساکھ کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ کیونکہ زمین اُس زمانہ میں ناقابل فروخت تھی۔ بعض اوقات قیمتیں اِس طرح گھٹتی بڑھتی تھیں۔ کہ آجکل اُن کی مثال نہیں ملتی۔ ایسے زمانہ میں ساہوکار کو نقصان کا بہت خطرہ ہوتا تھا۔ اس وقت دور دراز ممالک کی منڈیوں سے تعلقات قائم نہیں تھے۔ تجارت برآمد ناقابل عمل تھی۔ اِسلئے ساہوکار کو خطرہ رہتا تھا۔ کہ اگر مقامی منڈی میں غلّہ کی بھرمار ہوگئی۔ تو وہ جتنا غلّہ خریدے گا۔ سب کا سب ناکارہ ثابت ہوگا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ ۱۸۵۷ء میں غلّہ کی حیثیت کے یکبارگی گر جانے کی وجہ سے دوکاندار تباہ ہوگئے۔ انہوں نے کسانوں کی بجائے مالگذاری سرکاری خزانہ میں داخل کر کے اُن سے رقمِ مالگذاری کے عوض غلّہ لے لیا تھا۔ اور چونکہ ذرائع رسل و رسائل

لہ ۱۹۱۱ء میں صحیح اعداد یہ تھے۔ ساہوکار اور مہاجن تمام برطانی ہند میں ۸۰۳۵۶۰ تھے۔ تمام پنجاب میں اُنکی تعداد ۱۹۳۸۹۰ تھی۔ اِس طرح پنجاب کے سوا ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں اُن کی تعداد ۶۰۹۶۷۰ ہوئی۔ ان اعداد میں محققین بھی شامل ہیں۔ اِس لئے محض مہاجنوں تعداد معلوم کرنے کے لئے اِن اعداد کو پانچ پر تقسیم کر دینا چاہئے۔

اور وسائلِ حمل و نقل نہایت ابتدائی حالت میں تھے۔ اس لئے کئی دوسرے خطرات بھی تھے۔ ایسے حالات میں صرف بہت زیادہ شرح سُود ہی نقصان پورا کر سکتی تھی۔ اور اِن حالات میں اِس نوع کی شرح سُود بھی غیر معقول بھی نہیں تھی۔

کسان کو جو اسباب روپیہ قرض لینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اُن میں ایک یہ بھی ہے۔ کہ مالگذاری ایک معین تاریخ کو طلب کیجاتی ہے۔ دوسری وجہ غالباً بیماریوں کی وجہ سے مویشی کی ہلاکت ہے۔ مسٹر تھارن برن نے تحقیقات سے معلوم کیا ہے۔ کہ ۱۲ فی صدی قرض مالگذاری ادا کرنے کے لئے لیا گیا تھا۔ اور ۱۱ فیصدی مویشی خریدنے کے لئے انجمن ہائے امداد باہمی پنجاب کی گذشتہ رپورٹ میں یہ دکھایا گیا ہے۔ کہ جو روپیہ کسانوں کو دیا جاتا ہے۔ اسمیں ½۱۲ فیصدی مالگذاری کے لئے ہوتا ہے۔ اور ½۱۷ فیصدی مویشی خریدنے کے لئے یہ امر حیرت انگیز ہے۔ کہ ان دو مختلف تحقیقاتوں کے زمانہ میں اکیس سال کا فرق ہے۔ لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔

پنجاب کی تاریخ مال میں اِن ہر دو اسباب کا ذکر کر کے ان پر بحث کی گئی ہے حکومت کو ہمیشہ یہ دعویٰ رہا ہے۔ کہ وہ نہایت آسانی سے مالگذاری جمع کر لیتی ہے ۱۸۷۰ء و ۱۸۷۱ء کی رپورٹ میں فنانشل کمشنر نے اس خیال کی مخالفت کی ہے۔ کہ اِنتقال اراضی کا باعث مالگذاری کا مطالبہ ہے۔ ان کا بیان ہے۔ کہ ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں تو زمین سرکاری مالگذاری کے لئے فروخت کر دی جاتی ہے۔ لیکن پنجاب میں ہم نے اِس قسم کی سخت کارروائی نہیں کی۔ ۱۸۷۱ء و ۱۸۷۲ء میں لفٹننٹ گورنر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ کہ "پنجاب کے بعض اضلاع میں حکومت کے مطالبہ دربارہ مالگذاری کی سختی شاید لوگوں کو مبتلائے قرض کر دے"۔ لیکن ۱۸۷۵ء و ۱۸۷۶ء میں یُوں اظہار رائے کیا گیا تھا۔ کہ مالگذاری کے نظام میں اس قدر لچک موجود ہے۔ اور اُسے اِس حد تک مناسب حال بنا لیا جا سکتا ہے۔ کہ جب ضرورت پڑے عوام کی اعانت کی جائے۔ ۱۸۸۲ء کے بعد یہ کوشش کی گئی۔ کہ اس نظام کو ایسا بنایا جائے۔ کہ اسے زیادہ لچکدار اور فصل کی مختلف حالتوں کے مناسب بنایا جائے حکومت پنجاب نے کبھی اِس مسئلہ کی دشواریوں سے پہلو تہی کرنے کی کوشش نہیں کی یہ صاف

صاف بیان کیا گیا ہے کہ یہ چیز مالگذاری میں شامل نہیں۔ کہ موسمی مصائب کا خیال کئے بغیر نہایت سختی سے مالگذاری کا مطالبہ کیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مطالبہ مالگذاری کے بارہ میں سختی اودھ اور آگرے سے مستعار لی گئی تھی۔ کیونکہ پنجاب کے اکثر سرکاری عہدہ دار آگرہ اور اودھ سے آئے تھے۔ انہوں نے مطالبۂ مالگذاری میں اس کا جو مفہوم سمجھ رکھا تھا۔ اس لئے صوبہ کے لئے موزوں نہیں تھا۔ سالہا سال کے بعد کہیں کلکٹروں کو یہ اختیار دیا گیا۔ کہ وہ اپنے حکم سے مالگذاری ادا کرنے کے لئے بہت سا روپیہ قرض لیا جاتا ہے۔ قرض کی یہ وجہ نہیں۔ کہ مالگذاری کا مطالبہ زیادہ ہوتا ہے۔ ۱۸۶۸ء و ۱۸۶۹ء میں مالگذاری ۱۵ آنے ۷ پائی ہو گئی۔ ۱۸۹۸ء و ۱۸۹۹ء میں مالگذاری ایک روپیہ دو آنے تھی۔ اور اب ایک روپیہ آٹھ آنہ ۲ پائی ہے۔ اِن پچاس سالوں کے عرصہ میں وہ رقبہ جس کی آبپاشی کا انتظام کیا گیا۔ ۱۴۴ فیصدی ہو گیا ہے۔ اور اس رقبہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ جسکی آبپاشی نہیں کی گئی ۱۸۶۸ء و ۱۸۶۹ء میں مالگذاری بحساب ایک روپیہ چودہ آنہ ایک پائی فی کس تھی۔ اور اب دو روپیہ چار آنہ فی کس ہے۔

مقروض ہونے کی دوسری وجہ مویشی کی ہلاکت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات مویشی کا بہت نقصان ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۸۷۷ء و ۱۸۷۸ء میں مویشی کی ہلاکت نے ہولناک صورت اختیار کر لی تھی۔ بعض اضلاع میں سے نصف مویشی ہلاک ہو گئے۔ بعض میں ۱/۳۔ چنانچہ رپورٹ میں لکھا ہے "اس دفعہ مویشی کا اتلاف نہایت تباہی خیز تھا۔ اس سے لوگوں کے زر و مال اور آرام و آسائش پر بہت اثر پڑا"۔ صرف ایک ضلع میں تقریباً ایک کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا۔ جو گویا ضلع کے رقبہ مزروعہ کی قیمت فروخت کا ۱/۲ ہوتا ہے۔ یہ واضح ہے۔ کہ ایسی مصیبت کی وجہ سے بہت قرض لیا گیا ہوگا۔ اور جب کسان ایک مرتبہ کسی سود خوار کے شکنجے میں آجاتا ہے۔ تو پھر نہیں نکلتا۔ سرکاری طور پر اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے۔ کہ "مویشی کی موت سے ہر سال زرعی سرمایہ کا کثیر نقصان ہوتا ہے۔ اُسے بآسانی قرض لینے کے بڑے بڑے اسباب میں سے شمار کیا جا سکتا ہے۔

اِس طرح گویا پنجاب کے کسانوں کے مقروض ہونے کے حسب ذیل اسباب ہیں۔

(۱) انگریزی عملداری کیوجہ سے ملک کی جو حالت ہو گئی ہے۔ اُس نے کسان کی ساکھ بڑھا دی ہے۔

(۲) چالاک سود خوار کسان سے ساکھ کا بھی استعمال کراتے ہیں۔ اُسے قرض لینے کی ترغیب دیتے ہیں۔ تاکہ وہ پیداوار پر قبضہ کر لے۔

(۳) ۱۸۶۸ء و ۱۸۶۹ء کے قحط وغیرہ کی وجہ سے مویشی ہلاک ہو گئے۔ کسانوں کو قرضہ لینا پڑا اور اِسطرح وہ ساہوکاروں کے شکنجے میں پھنس گئے۔

(۴) مالگذاری کی تحصیل کے بارہ میں حکومت کی سختی بھی کسان کے مقروض ہونے کی ذمہ دار ہے۔ مالگذاری کی سختی اِس لئے زیادہ ہو گئی ہے۔ کہ سود خوار نہایت چالاکی سے ساری پیداوار پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اور کسان مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ مالگذاری ادا کرنے کے لئے مزید روپیہ قرض لے۔

(۵) قانونِ دیوانی کا نظام ایسا ہے۔ کہ وہ جاہل کسان کے مقابلہ میں چالاک[۱] ساہوکار کے حق میں ہوتا ہے۔

اِن اسباب میں سے جو چیز کسان کے نقطۂ نگاہ سے سب سے زیادہ اہم ہے، وہ مویشی کی ہلاکت ہے۔ اور اس کی ذمہ داری لوگوں کے مذہبی عقائد پر عائد ہوتی ہے۔ مویشی کی بعض بیماریاں ایسی ہیں۔ جن کا علاج ازروئے عقائد مذہبی نہیں کیا جا سکتا جب ۱۸۵۷ء میں انگلستان کے مویشیوں کے اندر پلیگ پھیل گئی۔ تو کونسل نے حکم دیا کہ جتنے مویشی مبتلائے مرض ہو گئے ہیں۔ انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ اور پھر چار فٹ[۲]

---

[۱] قحط کے کمیشن کی رپورٹ بابت ۱۸۸۰ء۔ سخت قانونی نظام جس میں مڑنے تڑنے کی صلاحیت نہ ہو، زیادہ دولتمند اور ہوشیار مقدمہ بازوں کے ہاتھ میں ایک حربہ دے دیتا ہے۔ جس سے انہیں فاقہ زدہ کسانوں پر دباؤ ڈال کر برباد تباہ کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ ایک نقاد کی نظر میں قرض کی ایک اور وجہ یہ ہے۔ کہ بارش کے غیر معین ہونے کے باعث فصل کا کوئی اعتبار نہیں۔ اِسے بھی تیسرے سبب کا ایک پہلو سمجھنا چاہیئے۔

گہری قبر کھود کر انہیں دفن کر دیا جائے۔ قانون امراضِ مویشی بہت حدتک اسی وجہ سے نافذ کیا گیا تھا۔ مجلس زراعت ابھی تک اِس امر پر مصر ہے۔ کہ ایسے مواقع پر مویشی کو ہلاک کر دیا جائے لیکن اب مویشی کے مالکوں کو معاوضہ بھی ملتا ہے۔ اِس قسم کی کارروائیوں سے انگلستان اپنے مویشی کو جس حدتک محفوظ رکھتا ہے۔ اس حدتک ہندوؤں اور سکھوں سے انکی حفاظت ناممکن ہے۔ اور جب وہ لوگ حفاظتِ مویشی کے اِن طریقوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کی بجائے کوئی دوسرا موزوں طریقہ دریافت نہیں کر سکتے۔ اِس نقصان سے بچنا مشکل ہے۔

عام طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے۔ کہ قرض لینے کی وجہ افلاس ہے۔ لیکن اِس مفروضہ پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ قرض کی وجہ ساکھ ہے۔ اور ساکھ خوشحالی کا نتیجہ ہے۔ افلاس سے پیدا نہیں ہوتی۔ اگر کوئی قرض دینے والا نہ ہو۔ تو قرض لینے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ اور جب قرض لینے کی کوئی جگہ نہ ہو۔ تو کوئی قرض نہیں لیگا۔ اگر یہ کہا جائے۔ کہ کسان فضول خرچ اور کوتاہ اندیش ہوتے ہیں۔ تو اُس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے۔ کہ جب قرض لینے کے لئے بہت سہولتیں مہیا ہو جائیں۔ تو فضول خرچی کو ترقی ہوگی۔ باقی رہی قرض لینے کے بارہ میں کسان کی بے احتیاطی اور کوتاہ اندیشی تو یہ بھی قرض دینے والوں کی بے احتیاطی کا ایک[1] رُخ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ چھوٹے چھوٹے خود کاشت زمیندار اکثر اوقات قرض لیتے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اتنا روپیہ پس انداز نہیں کر سکتے۔ کہ غیر متوقع مصائب کے موقعہ پر صرف کر سکیں۔ لیکن تحریک امدادِ باہمی پنجاب کی تاریخ سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ لوگوں کو اپنا قرض بڑھانے اور ساہوکار سے روپیہ لینے کی ضرورت نہیں۔ قرض کے ایک مناسب نظام کے ماتحت وہ اپنی تمام معمولی ضروریات پورا کرنے کے کافی روپیہ پس انداز کر لیا کریں گے۔ تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسانوں کو اپنا کاروبار چلانے کے لئے سرمایہ کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ بلکہ انکی ضرورت کے متعلق جسقدر اندازہ کیا گیا ہے وہ اِس سے بھی کم ہے۔ تجربہ سے بھی اس

---

[1] قرونِ وسطیٰ میں لوگ لُوقا باب ۶ کی آیت ۳۵ کو سود لینے کے خلاف سمجھتے تھے۔ تھورولڈ راجرس کا بیان دلچسپ ہے۔ کہ قرونِ وسطیٰ میں سود خواری سے بیزاری کی وجہ سے کسانوں میں کفایت شعاری اور دور اندیشی بڑھ گئی تھی۔ اِس لئے ان جلدیں میں ہی یہ ذکر نہیں پایا جاتا کہ دیہاتی قرض کا تناسب زمینداروں میں معقول رہا ہے۔ یہ اقتباس راجرس کی کتاب کی جلد چہارم باب دوم سے لیا گیا ہے +

دعویٰ کی تائید میں شہادت ملی ہے۔ کہ خود کاشت زمینداروں کی ضروریات کا جو اندازہ کیا گیا ہے انہیں اُن سے بدرجہا کم قرض کی ضرورت پڑتی ہے[1]۔ اور جو روپیہ وہ زمین کی ضمانت پر قرض لیتے ہیں۔ جو زمین کی پیداوار بڑھانے پر شاذونادر ہی صرف کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ مسرفانہ معیار[2] پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ افلاس اور کوتاہ اندیشی ایسی چیزیں ہیں۔ جو کسان کو قرض میں مبتلا کر دیں۔ پنجاب میں جو تحقیقات کی گئی ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام مزارعین موروثی کاشتکاروں کی نسبت کم مبتلائے قرض ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے زمینداروں پر موروثی کاشتکاروں کی نسبت زیادہ قرض ہوتا ہے۔ اور بڑے بڑے زمینداران سے بھی زیادہ قرض کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں قصہ مختصر جب لوگ اتنے نادان ہوں کہ قرض پر روپیہ لیکر اسے مناسب طور پر صرف نہ کر سکیں تو ساکھ کا نتیجہ قرض ہوتا ہے۔ اور جوں جوں ساکھ بڑھتی جاتی ہے۔ قرض بھی بڑھتا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسوقت تک جاری رہیگا جب تک بے احتیاطی سے قرض دینے والوں اور بے احتیاطی سے قرض لینے والوں کو روکا نہ جائے۔ اور جو لوگ برابر قرض لئے جاتے ہیں۔ انہیں اپنی صنعت کے کاروباری پہلو سے بھی واقف نہ کیا جائے۔ ممکن ہے اِس خیال کو عام طور پر قبول نہ کیا جائے۔ اِسلئے ہم دوسرے ماہرین فن کی رائے پیش کر دیتے ہیں۔ جو اِس مسئلہ پر تبصرہ کرنے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں مسٹر راؤنٹری نے بلجیم میں جو تحقیقات کی ہے۔ اُسے پیش نظر رکھ کر انھوں نے اِس پرانے نظریہ کی پُر زور تردید کی ہے کہ جس زمین پر کثیر التعداد چھوٹے چھوٹے زمینداروں کا قبضہ ہو۔ وہ یقیناً رہن کے بوجھ تلے دبی ہوگی۔ لیکن یہاں یہ بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ جن چھوٹے چھوٹے مالکانِ زمین کی اراضی رہن ہے اُن کا تناسب اُس وقت تک بڑھتا چلا جاتا ہے تاآنکہ ۷۔۳ ایکڑ سے ۶۲ ایکڑ زمین رکھنے والے زمینداروں تک پہنچ جاتا ہے جن میں سے ۴۰ فیصدی کی زمین رہن ہے۔ اور پھر ۷۔۴ سے ۷۔۳ ایکڑ تک زمین رکھنے والے زمینداروں کی رہن شدہ زمینوں کا تناسب[3] بہت کم ہو جاتا ہے۔

---

[1] بارانی علاقوں میں قرض کا اوسط ۶۰ روپیہ ہے چاہی زمینوں کے علاقہ میں ۸۰ سے ۹۰ روپیہ تک اور نہری علاقوں میں ۱۲۰ سے ۲۵۰ روپیہ تک صحیح رقم میں بیلوں کی قیمت کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

[2] مدراس کے مالیات اور نظم و نسق کی رپورٹ بابت ۱۹۲۸ء۔

[3] لینڈ اینڈ لیبر (بلجیم سے سبق) صفحہ ۵ و صفحہ ۵۱۔

اب ہندوستان کی طرف توجہ کیجئے۔ میں ۱۸۷۹ء میں خوشحالی کا دور دورہ ہوا اس کے ساتھ ہی ساکھ بڑھی۔ اور یہی دو چیزیں کسانوں کے مقروض ہونے کا خاص سبب قرار دی جاتی ہیں۔ مسٹر تھاربرن کا بیان ہے۔ کہ زمیندار قرض نہیں لیا کرتا تھا۔ اور اگر قرض بھی لیتا تھا۔ تو اسی قدر جتنا آئندہ فصل میں اس کا حصہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کی یہ کفایت شعاری کسی خاص خوبی کی وجہ سے نہیں تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اس وقت اس کی ساکھ قائم نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ اپنی ساری جائداد کی مالیت[1] جتنا قرض لینے سے دریغ نہیں کرتا۔ مزید تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ انہیں دیہات میں اراضی کا انتقال زیادہ ہوتا ہے۔ جن میں قرض لینے کے متعلق خاص سہولتیں مہیا ہیں۔ مثلاً شہروں کے قریب وجوار میں جو گاؤں ہیں۔ یا جن دیہات کے پاس ساہوکاروں کے مرکز ہیں۔ وہاں زیادہ قرض لیا جاتا ہے۔ اور جہاں قرض قرض کی جانب راغب کرنے والی چیزیں کم ہیں۔ وہاں اس قدر قرض نہیں لیا جاتا۔ مزید براں ضمانت خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ ساہوکار[2] کے لئے روپیہ قرض دینے کے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ اسے کہیں نہ کہیں اپنا سرمایہ ضرور استعمال کرنا ہے۔ وہ دیہات جہاں اچھی فصل کے متعلق لوگوں کو پوری طرح یقین و وثوق ہے وہ بھی اُن دیہات سے کم مصیبت زدہ نہیں جن کی پیداوار کم اور غیر متعین ہو۔ کیونکہ ساہوکار تو ایسے لوگوں کو ہی قرض دینا پسند کرتا ہے۔ جس کی حالت اچھی ہو۔ اور کم پیداوار والی زمین یا ایسی زمین پر جس کی پیداوار کی مقدار کے متعلق اُسے پورا پورا یقین ہو۔ نہایت ضروری حالات کے ماتحت ہی روپیہ لگاتا ہے وہ تو یہی چاہتے ہیں۔ کہ زمین پر جسقدر روپیہ صرف کریں۔ اُسے انہیں باقاعدہ

---

[1] ایس سی اے نے ایگری کلچر انڈ لینڈ لاس (زراعت پر زمین) پر ٹی ہوپ کا قول نقل کیا ہے

[2] کسانوں کے قرض کے متعلق رپورٹ بابت ۱۸۹۶ء صفحہ ۱

[3] ایضاً صفحہ ۴۲

اچھی خاصی آمدنی ہوتی رہے۔[1] سنہ ۱۹۰۱ء میں قحط کی تحقیقات کے لئے جو کمیشن مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے یہ لکھا تھا۔ کہ ازبس کہ کسان کو اپنی اراضی کے انتقال کے بارہ میں آزادی حاصل ہے۔ اس لئے وہ قرض کے دام میں زیادہ گرفتار ہو گیا ہے اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ جاہل اور کوتاہ اندیش کسانوں کو اراضی پر جو بیش قیمت حقوق حاصل ہیں۔ جب وہ انہیں کسی روک کے بغیر فروخت کر سکتے ہیں۔ تو قرض کے بارگراں تلے دبے چلے جاتے ہیں۔ اور اُن کی جائداد رفتہ رفتہ اُن کے قبضہ سے نکلتی جاتی ہے۔[2] اسی طرح مسٹر ڈوت نے اضافہ قیمت زمین کے متعلق جو یادگار رپورٹ تحریر کی ہے۔ اس میں وہ رقمطراز ہیں "ملک میں روپیہ کی افراط کے باعث اب ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ جو روپیہ قرض دے سکتے ہیں۔ اور وہ کسان کو کم سے کم شرح سُود پر روپیہ قرض دینے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ نرخ اس اضافہ ہونے کے باعث سارے ہندوستان میں زمین کی قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔ اور آج پچیس سال پہلے زمین کی پر کسان کو جسقدر قرض مل سکتا تھا۔ اب زمین کی بدولت اُسے اُس سے بدرجہا زیادہ قرض مل سکتا ہے۔ لیکن کسان کا رجحان طبیعت اس امر کی جانب ہے۔ کہ وہ اپنی بڑھی ہوئی ساکھ کو احمقانہ اور کوتاہ اندیشانہ مقاصد میں صرف کر دے۔ وہ قرض کے خطرات سے بے خبر ہے۔ اور قرض لینے میں اُسے جو کشش نظر آتی ہے۔ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا یہ کلیہ خاص طور سے اُن کسانوں پر منطبق ہوتا ہے۔ جن کے قبضہ میں چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی ہیں۔

اگر ضرورت پڑے۔ تو ہم مغربی ممالک کی مثالیں پیش کر کے یہ ثابت کر سکتے ہیں۔ کہ جب ساکھ بڑھتی ہے۔ تو قرض لینے کے رجحان میں بھی ترقی ہو

---

[1] ایضاً صفحات ۱۴۲-۱۴۴ [2] ملاحظہ ہو اے کی کتاب اگریکلچرل انڈیٹڈنس صفحات ۲۱۳-۲۱۴ صفحات ۱۴۰-۱۶۲-۱۶۳-

جاتی ہے۔ لیکن اب اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صوبہ کی زمین اور پیداوار کی قیمت میں جو عظیم اضافہ ہوا ہے۔ اس پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ ساہوکاروں کی تعداد اور اُن کے سرمایہ میں جسقدر تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اُس کا بھی ہم پوری طرح ذکر چکے ہیں۔ اگر یہ نکتہ ملحوظ نظر رہے کہ روپیہ قرض لینے سے پہلے نہیں۔ بلکہ بعد میں صرف کیا جاتا ہے۔ تو یہ سمجھ لینا آسان ہوگا۔ کہ کسانوں کی کوتاہ اندیشی کا باعث بہت حد تک یہ چیز ہے۔ کہ انہیں قرض لینے میں بہت آسانیاں حاصل ہوگئی ہیں۔ یہ حقیقت کہ کسانوں کے پاس قیمتی زمین ہے۔ جسے فروخت کیا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے بہت جاذب توجہ ثابت ہوئی۔ جن کے قبضہ میں روپیہ تھا۔ جس سے وہ اراضی خرید سکتے تھے۔ اور اس طرح اراضی کی فروخت میں بھی اضافہ ہوگیا۔

اس نقص کی وسعت کے متعلق صحیح اعداد و شمار پیش کرنا مشکل ہے ۱۸۶۶ء سے ۱۸۷۴ء تک زمین کی فروخت کا اوسط ۸۰۰۰۰ ایکڑ سالانہ تھا۔ اس کے بعد پانچ سال تک فروخت شدہ رقبہ کا اوسط ۹۳۰۰۰ - ۱۶۰۰۰۰ - ۱۳۱۰۰۰ اور ۲۳۸۰۰۰ ایکڑ سالانہ رہا۔ پہلے رہن شدہ زمینوں کا رقبہ ۳۴۰۰۰ ایکڑ سالانہ تھا۔ لیکن بعد کے پانچ سالوں میں ۲۱۲۰۰۰ - ۲۹۶۰۰۰ - ۵۹۰۰۰ اور ۵۵۴۰۰۰ ایکڑ سالانہ رہا۔ جہاں تک مجموعی رقبہ کا تعلق ہے۔ یہ اعداد بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مزروعہ رقبہ تخمیناً اس رقبہ کا نصف ہے۔ لیکن دوسری جانب اُن سے اس نقص میں کمی بھی ہوتی ہے کیونکہ اس سلسلہ میں حسب ذیل امور کو نظرانداز کر دیا گیا ہے ۱۸۶۶ء میں قیمت فروخت تقریباً دس روپیہ فی مزروعہ ایکڑ تھی ۱۸۹۳ء میں یہ بڑھ کر ۵۹ روپیہ ہو گئی۔ اسی طرح رہن کی رقم بھی اس عرصہ میں ۱۰ روپیہ سے ۴۶ روپیہ ہو گئی گویا ۱۸۷۴ء و ۱۸۹۳ء کے درمیانی عرصہ میں قیمت فروخت ۹ لاکھ ایک کروڑ ہو گئی۔ اسی طرح رقم رہن ۱۱ لاکھ سے ایک کروڑ ۶۶ لاکھ ہو گئی۔ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۱ء ۴۳۴۶۰۰۰ ایکڑ جن میں ۲۳۵۰۰۰ مزروعہ تھے ایک کروڑ ۸۲ لاکھ روپیہ کے عوض فروخت کئے گئے۔ ان اعداد سے بخوبی معلوم ہوتا ہے

کہ قابل زراعت زمینوں کا انتقال نہایت سرعت سے ہو رہا تھا۔ اور اس امر کی بھی کافی شہادت موجود ہے۔ کہ ان میں اکثر اراضی ساہوکاروں کے طبقہ کے قبضہ میں چلی گئی اس سلسلہ میں یہ دلیل کبھی نہیں پیش کی گئی۔ کہ نئے مالکان اراضی نے بذات خود کاشتکاری کرنا شروع کر دیا۔ اس قسم کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ اس لئے بحیثیت مجموعی یہ کہنا چاہیئے کہ بالآخر انہیں بھی کاشتکاری حاصل کرنے کے لئے زراعت پیشہ طبقہ کی جانب ہی رجوع کرنا پڑا۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں۔ اس طرح گویا کسان کو بیدخل کرنیکی کوشش نہیں کی گئی زمین سے انکا تعلق توڑا لیکن پہلے تو مالک اراضی تھی اب صرف مزارعہ رہ گئے

قانون انتقال اراضی

جب یہ حالت ہو گئی۔ تو مناسب معلوم ہوا کہ اس کا کوئی علاج تجویز کیا جائے۔ یہ تسلیم کر لیا گیا۔ کہ انگریزوں نے نہایت نیک نیتی سے جو نظام رائج کیا تھا۔ وہی بہت حد تک اس نقص کا سرچشمہ تھا۔ زمین کی منفعت میں حکومت کا جو مالکانہ حصہ تھا۔ اس میں انگریزوں نے اسلئے تخفیف کر دی۔ کہ زمین سے تعلق رکھنے والی جماعتوں کو فائدہ پہنچے۔ لیکن ہوا یہ کہ حکومت کے ایثار کے ثمرات سے ساہوکاروں نے فائدہ اٹھایا۔ حکومت خود بہت حد تک اس خرابی کی ذمہ دار تھی۔ اور اب اسی کا فرض تھا۔ کہ اس کا کوئی علاج تلاش کرلے۔ اس زمانہ کے وائسرائے نے صحیح کہا تھا۔ کہ بے عملی علاج کا صحیح بدل نہیں۔ اگر بے عملی اختیار کی گئی۔ تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر محض اس خرابی کو کم کرنے یا اس کا علاج کرنے کی تدبیر اختیار کی جائیں۔ تو وہ حالات کی اہمیت کے مقابلہ میں ناکافی ہونگی۔ یہ ضروری ہے۔ کہ اس نقص کو روک دیا جائے۔

یہ فرض نہیں کر لینا چاہیئے۔ کہ انتقال زمین کے حق پر پابندیاں عائد کرنیکا فیصلہ تمام متعلقہ مسائل پر غور کئے بغیر کر لیا گیا۔ بلکہ جیسا کہ مالگذاری کی سالانہ روئداد سے بخوبی معلوم ہوتا ہے پچیس سال تک اس مسئلہ پر مسلسل و متواتر غور کیا جاتا رہا۔ لیکن یہ محسوس کیا گیا تھا۔ کہ ایک ایسے حق پر پابندیاں عائد کرنا آسان کام نہیں۔ جو حکومت نے خود اپنی

مرضی سے باضابطہ طور پر کسانوں کو عطا کیا ہے۔ پرانے زمانے کے کسان کو پورا پورا مالک اراضی تسلیم کر لیا گیا۔ جسے ایک زمیندار کے تمام حقوق و مراعات حاصل تھیں اور اسے اپنے حقوق مالکانہ ضائع کرنے سے روکنے کی خواہش سے یہ مدعا نہیں تھا۔ کہ کوئی ایسی حرکت کی جائے۔ جسے لوگ کسان کی حیثیت مالکانہ کے لئے مضرت رساں تصور کریں۔ چنانچہ اس نقص کی اصلاح کے لئے جو تجاویز ذہن میں آئیں۔ وہ کم و بیش حسب ذیل ہیں۔

(۱) مالگذاری کے مطالعہ اور اس کی وصولی کے متعلق اسقدر آسانیاں بہم پہنچائی جاسکتی ہیں۔ کہ مالگذاری کرنے کے لئے کسانوں کو روپیہ قرض لینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ چنانچہ اسے اس وقت کے بعد عملی جامہ پہنایا گیا۔

(۲) زمیندار کو قرض لینے کیلئے جو ضمانت دینا پڑتی ہے۔ اسے محدود کر دیا جائے یا رقم قرض کی وصولی میں جو آسانیاں ہیں۔ انہیں نہ رہنے دیا جائے۔ تاکہ قرض لینے میں کمی ہو جائے۔

(۳) زراعتی قرضوں کے طریق کو وسعت دی جاسکتی ہے بہرحال یہ ظاہر ہے۔ کہ زراعتی قرضے کبھی ساہوکار کی جگہ نہیں لے سکتے۔

(۴) غیر منصفانہ معاہدوں کے پورا کرنے سے انکار کیا جاسکتا ہے۔

(۵) یہ شرط عائد کی جاسکتی ہے کہ قرض کی جن رقوم پر مدیون نے قبضہ نہ کیا ہو۔ اُن کی ذمہ واری اس کی پیداوار اور زمین پر عائد نہیں ہوتی۔

(۶) رہن وبیع کے اختیارات کو محدود کیا جاسکتا ہے عنوانات اور بالا میں ۴-۵-اور ۶ تو نمبر ۲ کی شقیں ہیں۔ ۲ و ۳ میں جو علاج تحریر کئے گئے ہیں۔ وہ ناکافی ہیں۔ اِس لئے یہ ضروری ہوا۔ کہ نمبر ۴ - ۵ - ۶ میں جو تجویزیں کی گئی ہیں انہی پر توجہ مرکوز کر دی جائے۔

غیر منصفانہ معاہدوں کی تعمیل سے انکار کا سوال تو ایک حد تک اس طرح حل ہو گیا۔ کہ ضابطہ دیوانی میں ترمیم کر دی گئی۔ اور کسی قدر قانون قرضہ جات ساہوکارہ

نے جس کا نفاذ ابھی پچھلے دنوں میں ہوا ہے۔ اسے حل کر دیا۔ قانون انتقال اراضی میں تو صرف اس قدر اعلان کر دیا گیا۔ کہ ایسا رہن جسے مشروط طور پہ بیع میں تبدیل کیا جا سکتا ہو نا جائز ہے۔ +

اسی طرح زمین اور اس کی پیداوار سے غیر حاصل شدہ روپے کی ذمہ واری اس طرح کم دی گئی دیوانی ڈگریوں کے سلسلہ میں جنکا ذکر ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۶۰ میں ہے۔ ایسی زمینوں کو قرقی سے مُستثنےٰ قرار دیا گیا ہے۔ اب صرف وہ تجاویز رہ گئیں جنکا تعلق زمین کی رہن و بیع پہ پابندیاں عائد کرنیکا تھا۔ اور یہ قانون انتقال اراضی میں آگئی ہیں۔ یہاں یہ امر غیر ضروری ہے کہ اس موقعہ پہ جو اعتراضات وارد کئے گئے تھے۔ اور جنہیں اب تجربہ نے بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ عرض بحث لائے جانے اس وقت یہ محسوس کیا گیا تھا۔ کہ خواہ انتقال زمین کو ممنوع قرار دیا جائے۔ اُسے کُلی طور پہ روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ اُمید ظاہر کی گئی تھی۔ کہ اُن کی تعداد میں بہت کمی واقعہ ہو جائے گی۔ اور وقت نے اس اُمید کو صحیح ثابت کر دیا ہے۔

۸ جون ۱۹۰۱ء کو قانون انتقال اراضی پنجاب کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ یہ سالہا سال کی تدقیق و تحقیق کا نتیجہ تھا۔ اور جب اس مسودہ کو قانون میں تبدیل کیا گیا۔ تو اس وقت اس کے خطرناک ہونے کے متعلق اکثر پیشینگوییاں کی گئی تھیں لفٹنٹ گورنر پنجاب سر میکورتھ ینگ نے زمانہ گذشتہ کے اکثر افسران مال کی آرا اپنی رائے کی تائید میں پیش کیں۔ انہوں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شکایت کی کہ یہ قانون حکومت پنجاب کے اقدام کا نتیجہ نہیں۔ حکومت نے جو انتہائی سفارشات کی تھیں۔ یہ قانون اُن سے آگے بڑھ گیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا تھا۔ کہ میں نے محض اس لئے اس قانون کی مخالفت نہیں۔ کیونکہ میرے افسروں کے بہترین تجربات اس قانون کی تائید و حمایت کرتے ہیں۔ اسوقت تک یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس قانون کے نفاذ سے ہر قسم کی خرابیاں معرض وجود میں

آجائیں گی۔ زمین کی قیمت بہت گھٹ جائے گی۔ قانون کی دفعات کی پرواہ نہیں کی جائے گی۔ ساہوکاروں کا کام کاج ناممکن العمل ہوجائیگا۔ اور قرض لینے والے تکلیف محسوس کریں گے۔ لیکن درحقیقت یہ تمام مایوسانہ پیشینگوئیاں بے بنیاد ثابت ہوئیں۔ قانون کے نفاذ پر لوگ بالکل خاموش رہے۔ جوش وخروش کے بجائے ایک افسردگی اور درد محسوس ہوتا تھا۔ کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ اور یہ نیا قانون صوبہ کی روزمرہ کی زندگی میں داخل ہوگیا۔ اس کی بڑی بڑی دفعات سیدھی سادی ہیں۔ ڈگری کے اجرائے کیلئے زرعی زمین کو فروخت کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح زرعی قبائل کے افراد غیر زراعت پیشہ لوگوں کے ہاتھ زمین فروخت نہیں کرسکتے۔ ہاں خاص خاص حالات میں اس قسم کی منظوری حاصل کی جاسکتی ہے۔ بنگال کی طرح کا رہن جس میں بیع مشروط ہوتی ہے۔ ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ زراعت پیشہ لوگوں غیر زراعت پیشہ لوگوں کے ہاتھ زمین رہن نہیں رکھ سکتے۔ ہاں اس قسم کا رہن جائز ہے جس میں شرط ہو کہ زمین خودبخود کسان کے قبضہ میں آجائے۔ اس غرض کیلئے تاکہ قانون سے بچنے کی کوئی راہ باقی نہ رہے یہ قرار دیا گیا۔ کہ زمین کو پانچ سال سے زیادہ عرصہ کے لئے اجارہ پر نہ دیا جائے۔

اس قانون سے ساکھ میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی۔ قانون کے منظور ہونے سے پہلے پانچ سال تک مزروعہ زمین کی قیمت اوسطاً ۷۵ روپیہ فی ایکڑ تھی آئندہ پانچ سال میں یہ کم ہوکر ۷۵ روپیہ ایکڑ رہ گئی۔ لیکن ۱۹۰۶ء و ۱۹۰۷ء میں ۹۸ روپیہ فی ایکڑ ہوگئی۔ اس کے بعد اس میں متواترا ضافہ ہوتا رہا۔ اور اب دوسو روپیہ[1] فی ایکڑ سے زیادہ ہے ہم صرف مزروعہ رقبہ زمین کو لیں۔ تو قانون کے منظور ہونے سے پہلے پانچ سال کے عرصہ میں جو رقبہ فروخت ہوا۔ وہ ۱۶۲۰۰۰ ایکڑ تھا۔ آئندہ پانچ سال یعنی ۱۹۰۱ء و ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۵ء و ۱۹۰۶ء تک یہ ۱۳۵۰۰۰ رہ گیا۔ اس کے بعد کے پانچ سال یعنی ۱۹۰۶ء و ۱۹۰۷ء

---

[1] ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں ۲۷۵ روپے تھی۔

سے ۱۹۱۰ء و ۱۹۱۱ء میں اس میں مزید کمی ہوئی۔ یعنی ۱۲۱۰۰۰ ایکڑ زمین فروخت ہوگئی۔ لیکن اس کے بعد اس میں متواتر وبہیم اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء و ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء و ۱۹۱۶ء تک فروخت شدہ رقبہ کا اوسط ۱۴۰۰۰۰ ایکڑ تھا۔ اس اضافہ کی وجہ یہ ہے۔ کہ حکومت نہری نوآبادیوں میں بہت زمین فروخت کرتی رہی ہے۔ اس سے یہ معنی نہیں۔ کہ کسانوں میں زمین فروخت کرنے کا جذبہ زیادہ پیدا ہوگیا ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زراعت پیشہ قبائل اب از سرِ نو زمین پر قبضہ کر رہے ہیں۔

فروخت شدہ رقبہ اوسط

	وہ رقبہ جو زراعت پیشہ لوگوں نے بیچا۔	جو زراعت پیشہ لوگوں نے خریدا۔	نفع یا نقصان
۱۹۰۲ء و ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۵ء و ۱۹۰۶ء	۱۵۰۰۰۰	۱۴۹۰۰۰	+۱۰۰۰
۱۹۰۶ء و ۱۹۰۷ء تا ۱۹۱۰ء و ۱۹۱۱ء	۱۷۰۰۰۰	۱۷۸۰۰۰	+۸۰۰۰
۱۹۱۱ء و ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۵ء و ۱۹۱۶ء	۱۸۸۰۰۰	۲۱۷۰۰۰	+۳۹۰۰۰
۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء	۱۸۳۰۰۰	۲۰۳۰۰۰	+۲۰۰۰۰
۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء	۱۶۶۰۰۰	۱۹۱۰۰۰	+۲۵۰۰۰

(یہ اعداد و شمار صوبہ کے موجودہ رقبہ کے متعلق ہیں۔ قانون کے منظور ہونے سے پہلے کے متعلق جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔ ان میں وہ رقبہ بھی ہے۔ جو اب پنجاب میں شامل ہے)

رہن کے متعلق جو اعداد و شمار فراہم ہوئے ہیں۔ وہ بھی حیرت انگیز ہیں۔ قانون کے منظور ہونے سے پہلے کے

پانچ سال میں پنجاب کے رقبہ میں سے جس قدر رقبہ مزروعہ ہر سال رہن کیا جاتا تھا۔ اس کا اوسط
۳۳۹۰۰۰ ایکڑ تھا۔ آیندہ پانچ سالوں کے عرصہ میں سالانہ اوسط ۱۸۰۰۰۰ اور ۱۱۲۰۰۰ اور ۲۲۶۰۰۰
رہا لیکن یہ اعداد و شمار گمراہ کن ہیں۔ قانون کے نتائج ذیل کے نقشہ میں زیادہ صحت اور وضاحت
سے بیان کئے گئے ہیں (ان اعداد میں غیر مزروعہ رقبہ دونوں شامل ہیں)

	وہ رقبہ جو زراعت پیشہ قبائل نے رہن رکھا	زراعت پیشہ قبائل نے پھر حاصل کر لیا	جو زراعت پیشہ قبائل کے پاس رہن رکھا گیا
۱۹۰۲ء و ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۵ء و ۱۹۰۶ء	۱۹۰۰۰	۱۷۸۰۰۰	۱۶۲۰۰۰
۱۹۰۵ء و ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۰ء و ۱۹۱۱ء	۲۴۰۰۰	۲۹۶۰۰۰	۲۱۹۰۰۰
۱۹۱۱ء و ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۵ء و ۱۹۱۶ء	۲۶۴۰۰۰	۲۷۰۰۰۰	۲۳۸۰۰۰
۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء	۲۴۶۰۰۰	۱۹۹۰۰۰	۲۲۰۰۰۰
۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء	۲۴۴۵۰۰	۲۴۸۰۰۰	۲۶۷۵۰۰

ان اعداد و شمار سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ زراعت پیشہ قبائل جسقدر زمینیں رہن کر رہے
ہیں۔ اُن سے کہیں زیادہ زمینوں پر وہ خود قبضہ کر رہے ہیں۔ یا اُن کے پاس زمینیں رکھی جا رہی ہیں۔ رقم
رہن کا اوسط ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۱ء میں ۶۷ روپیہ فی مزروعہ ایکڑ تھا۔ ۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء میں ۱۰۶ روپیہ فی
ایکڑ ہو گیا۔ اور ۱۹۰۹ء ۱۹۲۰ء میں ۱۶۲ روپیہ فی ایکڑ۔ وہ رہن شدہ رقبہ جس کی پیداوار سے دوسرے
لوگ نفع حاصل کر رہے ہیں۔ اُس میں کمی ہو رہی ہے۔ ۱۹۰۱ء و ۱۹۰۲ء میں یہ رقبہ ۳۲۸۷۰۰۰ ایکڑ
تھا۔ ۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء میں ۳۲۵۰۰۰۰ رہ گیا۔ اور ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں ۳۱۱۷۰۰۰ ایکڑ
جو رقبہ زراعت پیشہ قبائل کے قبضہ زراعت پیشہ قبائل کے قبضہ میں ہے۔ اور رہن کر دیا گیا
ہے۔ اس میں یقیناً زیادہ کمی ہوئی ہوگی۔ رہن شدہ مزروعہ رقبہ اور مجموعی مزروعہ رقبہ میں
جو تناسب ہے۔ اس میں کمی واقعہ ہوئی۔ چنانچہ رہن شدہ مزروعہ رقبہ مجموعی مزروعہ رقبہ کا
۱۲.۳ فیصدی تھا۔ اس عرصہ میں ۱۰.۸ فیصدی رہ گیا۔ مختلف اضلاع کے اعداد و شمار
سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو علاقے دوسروں کے محتاج تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ترقی کا قدم
بڑھایا جائے۔ لیکن جو اضلاع پہلے زیادہ آزاد تھے۔ وہ تنزل کر رہے ہیں۔

مجموعی رقبہ مزروعہ اور رہن شدہ رقبہ کا تناسب فیصدی

ضلع	سنہ ۱۹۰۰ء	سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء	سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء
گورداسپور	۵ - ۱۵	۹ و ۲۰	۲ و ۲۱
سیالکوٹ	۱ و ۲۵	۵ و ۱۳	۶ و ۱۳
ملتان	۰ و ۱۷	۱ و ۱۰	۷ و ۹
امرتسر	۰ و ۱۷	۳ و ۱۶	۵ و ۱۶
گجرات	و ۱۶	۴ و ۱۲	۵ و ۱۱
کانگڑہ	۲ و ۱۶	۹ و ۱۲	۵ و ۱۱
رہتک	۰ و ۱۰	۳ و ۱۲	۵ و ۱۱
گوجرانوالہ	۰ و ۱۰	۱ و ۷	سلہ ۳ و ۹
جہلم	۰ و ۹	۶ و ۷	۶ و ۶
کرنال	۰ و ۷	۴ و ۸	۴ و ۸
حصار	۶ و ۵	۰ و ۸	۸ و ۵
جھنگ	۲ و ۳	۴ و ۱۰	۱ و ۱۰

مختلف اضلاع میں اس عجیب وغریب اختلاف کی یہ توجیہہ ہو سکتی ہے۔ کہ برطانی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ساہوکار سب سے زیادہ خوشحال علاقوں میں زیادہ سرگرمی سے اپنا کاروبار پھیلاتے تھے۔ کہ ان کی خوشحالی ساہوکاروں کیلئے کشش کا باعث تھی۔ جب قانون انتقال اراضی منظور ہوا۔ تو اس خوشحالی کی بدولت زراعت پیشہ لوگوں نے پہلی حیثیت پھر حاصل کر لی۔ جو علاقہ زیادہ افلاس زدہ تھے۔ وہاں زمین کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ فصل کم ہوتی تھی۔ اس لئے ساہوکاروں نے بھی اس وقت تک مستعدی ظاہر نہیں کی۔ جب تک

سلہ سنہ ۱۹۱۶ء و سنہ ۱۹۱۷ء کے تناسب میں جو اضافہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ شیخوپورہ کا ضلع علیحدہ کر دیا گیا۔ وہاں پہلے تناسب ۱ و ۵ تھا۔

ہر جگہ قیمتوں میں اضافہ نہیں ہو گیا۔ اور اُنہیں اطمینان نہیں ہو گیا۔ کہ ہمارا روپیہ محفوظ رہے گا۔ رہتک حصار۔ کرنال پرانی قسمت دہلی سے تعلق رکھتے تھے جہاں بیع ۔ کی شرط کے ساتھ زمین رہن کر دینا عام بات تھی۔ ان علاقوں میں جو اضافہ ہوا۔ اسکی وجہ شاید یہ ہے۔ کہ جب قانون منظور ہوا۔ تو اس قسم کی تمام رہن سند مہینوں سے بیع کی شرط اُڑ گئی۔ اب صرف اُسکی پیداوار سے نفع کیا جا سکتا تھا کسی دوسرے کو اس پر حقوق مالکانہ حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

اب ہمیں دو اعتراضات پر بحث کرنا ہے۔ جو عام طور پر اس قانون پر وارد کئے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ قانون خاص طور پر ہندوؤں کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ ہے۔ کہ یہ قانون اپنا حقیقی منشاء پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ کیونکہ اس نے مفلس زراعت پیشہ ساہوکاروں کے رحم اور کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ جو نہایت سرعت سے اُن کی زمینیں خرید رہے ہیں۔ اور اُنہیں مالک اراضی کے بجائے محض مزارع بنا رہے ہیں۔ پہلے اعتراض کا جواب تو آسان ہے۔ اس قانون کی رُو سے بعض زراعت پیشہ لوگوں کے نفاذ کی حفاظت ہوتی ہے۔ اُن میں ایک تہائی ہندو ہیں۔ اور ان ہندوؤں کی تعداد صوبہ کے غیر زراعت پیشہ ہندوؤں کی مجموعی تعداد سے بدرجہا زیادہ ہے۔ اس اعتراض کی بنیاد درحقیقت اس امر پر ہے۔ کہ ساہوکاروں اور دوکانداروں کا گروہ جو بہت زیادہ کفایت شعار ہوتے ہیں۔ اسی صوبہ کے اکثر حصوں میں ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ اس طرح گویا اس قانون کی رُو سے صرف اُنہی کو زمین پر قبضہ کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ لیکن اس قانون کا مقصد درحقیقت یہ ہے۔ کہ بعض طبقوں کو اپنی آبائی جائداد فروخت کرنے سے روکا جائے۔ اس طرح گویا یہ قانون قدیم ہندو قوانین پر مشتمل ہے۔ اور یہ کہنا معقولیت پر مبنی نہیں۔ کہ محض مذہبی اختلاف کی بنا پر اس قانون کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ مزید برآں اس قسم کے قوانین دوسرے ممالک میں بھی موجود ہیں۔ جن سے اس قسم کے قوانین کا حل مقصود ہے۔ حالانکہ ان ممالک میں ہندو آباد نہیں۔ امریکہ کے قانون شکنی میں بھی عام طور پر پچاس ایکڑ کے ایک خاص رقبہ[1] کا انتقال ممنوع قرار دیا گیا ہے

[1] بلجیم میں ایسی اراضی کے بیشتر حصہ کا رہن کرنا ممنوع ہے۔ جواز روئے رسم ورواج وراثت پر ملی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ مصر میں ''فائیو فیڈن لا'' اسی بنا پر نافذ کیا گیا کہ پنجاب میں قانون انتقال کو کامیابی ہوئی تھی۔

جسے کنبہ کے ضرورت فراہم کرنے کے لئے ابدی سمجھا جاتا ہے۔ انگلستان میں آج سے چار یا پانچ سو سال پیشتر تقریباً اس قسم کی تبدیلیاں معرض وجود میں آئی تھیں۔ جو آج پنجاب میں نظر آرہی ہیں۔ زرعی کفائت شعاری کی وہ پرانی رسم میں سے کسان کی ذاتی ضروریات پوری ہوجاتی تھیں۔ ملتی جاتی تھیں۔ سرمایہ دار گروہ میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ کامیاب تاجر اور قانون دان زمین پر قبضہ کرکے دیہات کے شرفا کو شمار ہے تھے۔ جوع الارض کا مرض بہت بڑھ گیا تھا۔ جائداد کی وراثت ٹھہرانے کے متعلق جو کوششیں کی گئیں۔ اُن کی مزاحمت ہوئی۔ لیکن حالات واسباب نے خیالات میں تبدیلی کردی کردی۔ زمین کو کنبہ تک محدود رکھنے کا ایک طریقہ ایجاد کیا گیا۔ اس طرح اب انگلستان کی زیادہ تر جائدادیں[1] اصل مالکوں کے قبضہ میں ہیں۔ اور موروثی جائدادوں پر جو پابندیاں عائد کردی گئی ہیں۔ وہ قانون انتقال اراضی کی پابندیوں سے زیادہ ہیں۔ اسی طرح دوسرے ممالک میں بھی ایسے قوانین موجود ہیں۔ جو سکونت کے اصولوں پر مشتمل ہیں۔

اب پھر ہندوستان کی طرف لوٹئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جب انگریزوں نے اس ملک کی عنان انتظام ہاتھ میں لی۔ تو اُنہوں نے دیکھا۔ کہ کسان حکومت کو جو مالگذاری کرتے ہیں۔ وہ عملی طور پر پورے لگان جتنی ہوتی ہے۔ اس طرح انہیں زمین پر قبضہ کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر وہ مالگذاری ادا نہیں کرتے تو حکومت بلا تامل اُنہیں بے دخل کرکے کسی دوسرے کو زمین کا مالک بنا دیتی ہے۔ اس طرح گویا کسان کو زمین پر کوئی حق حاصل نہیں۔ جسے وہ منتقل کرسکے۔ اُس وقت تو یہ سوال ہی خارج از بحث تھا۔ کہ کیا ایک تاجر زمین خرید سکتا ہے۔ یا نہیں۔ اُس وقت زمین قابل بیع و اشترا نہیں تھی۔ اگر انگریزی حکومت بھی مالگذاری کا پرانا تناسب قائم رکھتی۔ تو زمین کی بیع اس حد تک کبھی نہ پہنچتی۔ کہ اس کی جانب توجہ کرنیکی ضرورت محسوس ہوتی۔ اس طرح یہ حقیقت کہ اس صوبہ میں جو لوگ زمین خریدنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ہندو ہیں۔ اور مالکان اراضی ہندو بھی ہیں مسلمان بھی اور سکھ بھی محض تاریخ کا ایک اتفاقی واقعہ ہے مصر میں بھی "فائیو فیڈن لا" نافذ ہے جس کی رو سے اس قبہ کو قطعی طور پر خرید فروخت سے مستثنےٰ قرار دیا گیا ہے لیکن مصر میں جو لوگ زمین خرید سکتے ہیں۔ وہ ہندو نہیں۔ بلکہ

[1] ملاحظہ ہو کرٹلر کی کتاب "شارٹ ہسٹری آف انگلش ایگریکلچر" صفحات ۱۲۲ - ۱۲۳

مسلمان اور عیسائی ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے۔ کہ یہ قانون اپنا حقیقی منشاء پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوا کیونکہ اب ہندو سود خواروں کی جگہ زراعت پیشہ ساہوکاروں نے لے لی ہے۔ جسے اپنے قبیلہ کے افراد یا دوسرے زراعت پیشہ قبائل سے جس قدر زمین وہ چاہے خریدنے میں آزادی حاصل ہے۔ بہت حدتک یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس قانون کا ہرگز ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔ کہ انتقال اراضی کو کلیتہً روک دیا جائے۔ انتقال اراضی کے اختیارات اس حدتک بڑھے ہوئے تھے۔ کہ اگرچہ رسم ورواج نے انتقال اراضی کو محدود کر رکھا تھا۔ پھر بھی یہ اختیارات خطرناک سمجھے گئے۔ اور یہ مناسب سمجھا گیا۔ کہ اختیارات پر اس حدتک پابندیاں عائد کی جائیں۔ کہ خطرات سے نقصان کا احتمال نہ رہے۔ یہ کبھی خیال نہیں کیا گیا۔ کہ ہر قسم کا انتقال قابل اعتراض ہے۔ جب ایک زراعت پیشہ شخص جس کے پاس اپنی ضروریات سے زیادہ زمین موجود ہے۔ اُس کے ایک حصہ کو کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ جس کے پاس کم زمین موجود ہے۔ یا ایک زمیندار زمین کی اصلاح وترقی کی خاطر روپیہ حاصل کرنے کے لئے اپنی زمین کا ایک حصہ فروخت کر دیتا ہے۔ تو اکثر حالات میں یہ سودا منفعت بخش ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی خوشحال زراعت پیشہ شخص پر جو اپنے اندوختہ کو ایسے کاروبار میں لگاتا ہے۔ جو اس کے طریق زندگی کے عین مطابق واقع ہوا ہے۔ یا کسی غیر اقتصادی قطعہ اراضی کے مالک پر جو آسٹریلیا یا کناڈا جاکر روپیہ پس انداز کرتا ہے۔ اور چند کھیت خرید لیتا ہے۔ تاکہ اس کی زمین ضروریات زندگی کے لئے کافی ثابت ہو۔ کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ پنجاب میں زمین پر گاؤں کے لوگوں کا قبضہ ہے۔ اور گاؤں کے رسم ورواج نے کبھی اس بات کی کہ بعض افراد اپنی آبائی جائداد کو آزادانہ فروخت کردیں۔ موجودہ قانون حق شفع درحقیقت نام ہے اس کوشش کا جو اس رسم کو قانونی صورت دینے کے لئے کیگئی ہے۔ اگر ایک شخص زمین بیچنا چاہے۔ تو سب سے پہلے اس کی جماعت کے دوسرے

افراد کو خرید نے کا حق ہے۔ دوکانداروں اور تاجروں کو اس قسم کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ حق فوقیت اس قدر پرانا ہے۔ کہ اس میں جائے کلام نہیں ہوسکتی لیکن یہ کہنا بالکل بنا خیال ہے۔ کہ یہ حق صرف اسی جگہ ہوسکتا ہے۔ جہاں قیمت حزید ساہوکاری سے متاثر نہیں ہوئی۔ بہرحال دوسرے اعتراض میں اس حد تک صداقت موجود ہے۔ کہ اگر یہ معلوم ہو جائے۔ کہ زراعت پیشہ ساہوکاروں کا ایک گروہ پیدا ہو رہا ہے۔ جو چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی کی مقبوضہ اراضی کو وسیع پیمانہ پر خرید کر انہیں محض مالک اراضی کی بجائے مزارع بنا رہا ہے۔ تو پھر یہ مناسب ہوگا۔ کہ مزید قانونی تدابیر پر غور کر کے اس کی روک تھام کی جائے لیکن ابھی تک یہ ظاہر نہیں ہوا۔ کہ یہ چیز نمایاں طور پر معرض وجود میں آ رہی ہے۔ ابھی تک اس امر کے متعلق صحیح اطلاعات فراہم نہیں ہوئیں۔ کہ مالکان اراضی کی زمینوں کو کس حد تک خرید رہے ہیں۔ اگر فرض کر لیا جائے۔ کہ عملی طور پر ایسا ہو رہا ہے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں۔ کہ اس سے نقصان پہنچے گا۔ اس وقت ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ جن کی زندگی کا دارومدار زراعت پر ہے۔ اور موجودہ طریق زراعت سب کے لئے ایک دن کا کام بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ اکثر زمینیں اتنی چھوٹی ہیں۔ کہ وہ ایک کنبہ کی آسائش کا سامان بھی فراہم نہیں کر سکتیں۔ اور اگر یہ زائد از ضرورت کسان دوسری صنعتوں کی طرف توجہ کریں۔ تو اس سے فائدہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں بھی اسی نوع کے مصائب بر روئے کار آسکتے ہیں۔ جیسے انگلستان کے اندر حلقہ بندی کے زمانہ میں برسرکار آئے تھے۔ لیکن آخرکار حلقہ بندی سے زراعت اور ملک کو بہت فائدہ ہوا۔ بہرحال یہ تو محض خیال آرائی ہے۔ بحث سے صرف یہ امر تعلق رکھتا ہے۔ کہ جس ملک میں ذرائع معاش موروثی ہیں۔ زمین کا غیر زراعت پیشہ لوگوں کے ہاتھ میں یہ چلا جانا بہ نسبت اس کے زیادہ قابل اعتراض ہے۔ کہ زراعت پیشہ لوگ بہت سی زمین پر متصرف ہو جائیں

پنجاب میں جو تجربہ ہؤا۔ اُس سے یہ بات بخوبی عیاں ہے۔ کہ باستثنائے چند نئے مالکان اراضی کے جو تجارت پیشہ یا ضائع جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ خود زمین کی کاشت نہیں کرتے۔ وہ زمین کی اصلاح و ترقی پر روپیہ صرف نہیں کرتے۔ زراعت کی ترقی میں اپنی عقل و دانش سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ صرف اس امر پر قناعت کر لیتے ہیں۔ کہ انہیں زیادہ لگان حاصل ہو جائے۔

آئرلینڈ کے حالات پنجاب سے مشابہ و متماثل واقع ہوئے ہیں۔ نپولین سے جو لڑائیاں ہوئیں۔ اُن کے بعد زرعی پیداوار کی قیمت بہت بڑھ گئی۔ آئرلینڈ کے کسانوں نے اُن سے پورا نفع حاصل کیا۔ آبادی تیزی سے بڑھتی گئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ زمین پر بھی دباؤ پڑتا چلا گیا۔ لوگ زیادہ تر آلوؤں پر زندگی بسر کرتے تھے۔ اور گیہوں فروخت کر دیا کرتے تھے۔ تقریباً ۱۸۴۶ء میں آلو کی فصل پر آفت آئی۔ اور اسکے بعد ہی شدید قحط رونما ہو گیا۔ زمینداروں اور مزارعین کو نقصان اُٹھانا پڑا۔ اور وہ قلاش ہو گئے۔ چونکہ زمین خریدنے کا موقعہ تھا۔ اسلئے ڈبلن کے بہت سے کاروباری اشخاص کی توجہ اس طرف منعطف ہو گئی۔ حالانکہ اُنہیں زراعت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس طرح مالکان اراضی کی ایک نئی جماعت معرض وجود میں آگئی۔ جنہیں محض اُس لگان سے دلچسپی تھی۔ جو وہ زمین سے حاصل کر سکتے تھے۔ پرانی زراعت پیشہ جماعت نے اپنی آبائی زمین پر نہایت مضبوطی سے جس کا احساس اس صوبہ میں اچھی طرح کیا جا سکتا۔ قابض رہے۔ نئے مالکان اراضی نے جسقدر روپیہ لگایا تھا۔ وہ اس کا فی منافع چاہتے تھے۔ مزارعین نے وعدہ تو کر لیا لیکن یہ رقم ادا کر سکے۔ اسکے بعد چالیس سال تک زمین کے متعلق جو شورا بیاں پیش آئیں۔ اُنکا سرچشمہ یہی واقعہ تھا۔

لہ مسٹر ایرسن لکھتے ہیں۔ کہ ملتان میں غیر زراعت پیشہ مالکان اراضی نے زراعت پیشہ مالکان اراضی کی نسبت زمین پر زیادہ سرمایہ لگایا ہے۔ عام طور پر جب مہاجن کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ فلاں چیز پر روپیہ لگانے سے فائدہ ہوگا تو وہ روپیہ لگانے میں دریغ نہیں کرتا۔ وہ زمیندار کی نسبت زمین کی اصلاح پر زیادہ روپیہ لگاتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس قسم کا روپیہ بہت کم ہے۔

سرٹی ہوپ نے ۱۹۰۸ء میں کونسل کے اندر دکن کے کسانوں کی حالت واضح طور پر بیان کر دی تھی انہوں نے فرمایا تھا کہ یہ دلیل تو پیش کی جا سکتی ہے۔ کہ زمین کو انہی لوگوں کے قبضہ میں ہونا چاہئیے جو اپنی عقلمندی محنت اور سرمایہ کی وجہ سے اس سے بہترین منفعت اٹھا سکتے ہیں۔ اگر زمین پر ایک ایسی جماعت کا قبضہ ہو۔ جو جہالت۔ ناعاقبت اندیش اور ہمت کی کمی کے باعث اپنے جانشینوں پر قرض کا ایسا بار گراں چھوڑ جائیں جسے کبھی ادا نہ کیا جا سکے اور اسطرح اپنی محنت پر آمادہ کرنیوالی چیز اور اسکے نتائج میں دلچسپی لینے سے محروم کر دیں۔ تو اس کا صرف یہی علاج ہے۔ کہ ان لوگوں کو بے دخل کر کے اور دیوالیہ بنا کر سوسائٹی کی حالت کو تدریجی طور پر بہتر بنایا جائے۔ ایسے اصول یورپ میں بالکل صحیح ہیں لیکن انہیں مشرقی زندگی پر منطبق کرنے کیلئے بیحد احتیاط کی ضرورت ہے جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمین جا رہی ہے وہ محض اسلئے اسپر قبضہ کرنے کے خواہشمند نہیں۔ کہ اپنی دانشمندی ہمت اور سرمایہ سے اسے ترقی دیں۔ اُن میں سے اکثر تو اپنے سرمایہ کو زرعی تجربات میں نہیں لگانا چاہتے۔ جو مقابلتاً غیر منفعت بخش ہیں۔ وہ اس چیز کو ترجیح دیتے ہیں۔ کہ کسان تو زمین کی کاشت میں برابر لگا رہے اور وہ اس سے جسقدر نفع حاصل کریں حاصل کریں۔ اسطرح کسان قرض کے دباؤ سے غیر موروثی کاشتکار بن جاتا ہے۔ جس سے مارواڑی قرضخواہ زیادہ سے زیادہ لگان وصول کرتا ہے۔ اور اُس کا خون چوس لیتا ہے۔

اقتصادیات کی بحث میں سیاسی شکایات کا ذکر مناسب نہیں لیکن یہ ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ قانون انتقال اراضی کو ایک چھوٹا سا گروہ جو بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسی نظر سے دیکھتا ہے۔ تاریخ اس گروہ کے خیالات کی مؤید نہیں۔ اس کا اپنا قدیم دھرم شاستر بھی اس کی تائید نہیں کرتا جس مقام پر ہندو دھرم شاستر کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ وہاں آبائی جائداد کو ایک فرد واحد کے فروخت کر دینے سے محفوظ رکھنے کیلئے کوئی قانون نافذ کرنے کی ضرورت نہیں جب پنجاب میں زمین سستی تھی۔

لے ملاحظہ ہو لیے کی کتاب۔ "اگری کلچرل انڈیٹڈنس" دکن کے زراعت پیشہ لوگوں کے لئے جو ریلیف ایکٹ نافذ کیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پیشہ ور مہاجن روپیہ قرض دینے کے بارے میں زیادہ محتاط ہو گئے۔ اور کسانوں کی یہ کیفیت تھی۔ کہ جب اُن سے زمین کی ضمانت طلب کی جاتی تھی تو وہ روپیہ قرض لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان اسباب کی وجہ سے غیر ضروری قرضوں میں بہت کمی ہو گئی۔

تو غیر زراعت پیشہ ہندو نے اُسے نہیں خریدا۔ ۱۹۲۱ء سے پہلے اُس کے پاس حقوق و اختیارات کے حصول کے لئے کافی موقع تھا۔ لیکن وہ اس امر کو ترجیح دیتا تھا۔ کہ اسے جو حقوق حاصل ہوں۔ وہ مرتہن کے حقوق ہوں۔ مالکانہ حقوق نہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ خرید زمین کا جذبہ بالکل نیا ہے یہ جذبہ اسوقت قوی ہو رہا تھا جب قانونِ انتقالِ اراضی نے انتقال پر پابندیاں عاید کر دیں۔ اس موضوع پر بحث کی جائے۔ تو یہ خیال کیا جائیگا کہ اس قسم کی پابندیاں دوسرے مقامات میں موجود نہیں تھیں۔ اُن کی حیثیت استثنے[ل] کی نہیں۔ بلکہ کُلیتہ کی تھی۔ یہ پابندیاں ہندو دہرم شاستر اور پنجاب کے رواج میں موجود تھیں۔ باقی رہا یہ امر کہ آیا اقتصادی ترقی کی غرض سے اِس قسم کے قانون کا قیام ضروری ہے۔ تو اس بات کا انحصار بہت حد تک اِس امر پر ہے۔ کہ آیا جن لوگوں کو خرید زمین سے محروم رکھا گیا ہے۔ وہ اُن لوگوں کی نسبت جو بحالتِ موجودہ زمین کے مالک ہیں۔ زراعت کی اصلاح کیلئے زیادہ سرگرمی اور ترقی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ابھی تو اِس قسم کا کوئی رُجحان نظر نہیں آتا۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اُن کے قبضے میں اچھا خاصہ رقبہ زمین موجود ہے۔ خاتمہ پر یہ بھی کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قانون کی تنسیخ کے متعلق کوئی معقول دلیل نہیں دی گئی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ کہ اُونچی ذات کے ہندو اس قانون کے قیام کو ناپسند کرتے ہیں، اور یہ جذبہ پنجاب تک ہی محدود نہیں۔ بندیل کھنڈ کے قانون انتقال اراضی (مجوزہ ۱۹۰۳ء) اور بمبئی کے قانون مجوزہ ۱۹۰۱ء کی بھی اسی طرح مخالفت کی گئی۔ اودھ میں اِس مسئلہ کا حل کرنے کیلئے ۱۹۰۰ء میں "سٹلڈ اسٹیٹس ایکٹ" نافذ کیا گیا۔

[ل] مثال کے طور پر جرمنی کی حالت ملاحظہ ہو۔ جہاں زمین کی ملکیت پر حقوق نے پابندیاں کر رکھی ہیں۔ اولاد کو والدین کی جائیداد کے بعض حصوں کی وراثت کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ ایک اکلوتا فرزند اپنے آبائی جائیداد کا نصف حاصل کر سکتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ اولاد ہو تو برابر کا حصہ ملتا ہے۔ اسطرح بعض وارثوں کے لئے زمین کا جو حصہ مقرر ہوتا ہے۔ اُسے رہن نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے اندر انتقال اراضی میں جو دشواریاں ہیں، انکی وجہ سے انتقالِ اراضی اکثر و بیشتر نہیں ہو سکتا۔ رومانیہ میں تو ایسی دشواریاں جنکی وجہ سے انتقال اراضی کلی انسداد ہو گیا ہے

(۱۱) گیارہواں باب

گیہوں کی قیمت

گیہوں کی قیمت کا مسئلہ پنجاب میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اِس جنس کی کھپت گذشتہ سالوں میں اِسقدر بڑھ گئی ہے کہ اب گیہوں عوام کی سب سے بڑی خوراک بن گیا ہے۔ شہروں میں تقریباً ہر شخص پورے سال تک گیہوں کھاتا ہے۔اس سے زیادہ سستے اناج مثلاً باجرہ اور چری وغیرہ رُوبہ زوال نظر آتے ہیں چونکہ گوشت اور دوسری غذاؤں کے استعمال کے خلاف مذہبی جذبات موجود ہیں۔اس لئے لوگ اسی ایک چیز کے محتاج ہوگئے ہیں۔اور چونکہ پنجاب بندرگاہوں سے دُور واقع ہوا ہے۔اس لئے لوگوں کو صرف اِس قدر اناج سے اپنی احتیاج پوری کرنا پڑتی ہے جو اس صوبہ اودھ اور آگرہ کے ہمسایہ صوبہ میں پیدا ہو جس ملک میں لوگوں کی غذائیں مختلف ہوں۔ وہاں یہ ممکن ہے کہ اگر ایک جنس کی قیمت میں اضافہ ہو تو اُس کا استعمال کم کر دیا جائے۔اور کوئی دوسری جنس زیادہ استعمال میں لائی جائے۔لیکن جہاں غذا کا دائرہ صرف چند اغذا تک محدود ہو۔ وہاں اُن کی قیمت میں اختلاف ہر گھر کے لئے اپنے اندر دلچسپی پنہاں رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے۔کہ گیہوں کی قیمت کا ذکر ہر شخص کی زبان پر ہے۔ ہر شخص اس کا تذکرہ کرتا ہے۔اخبارات میں اس کا ذکر شائع ہوتا ہے۔اور سیاسی لوگ گیہوں کی قیمت کا بہانہ بنا کر حکومت پر حملے کیتے ہیں ہر شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کہ گیہوں اِس قدر گراں ہے۔اس کی قیمت کم کرنے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔اور کب اس کی قیمت میں کمی کی توقع کی جا سکتی ہے۔یہ موضوع آسان نہیں۔اِس میں کئی عناصر قابلِ غور ہیں جن لوگوں نے اِس مسئلہ کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بغیر جو علاج تجویز کئے ہیں۔ وہ بعض بیسود ہی

نہیں۔ بلکہ انکا استعمال خطرناک بھی ہے۔ اس قسم کی جاہلانہ نکتہ چینی کی ایک مثال یہ خیال کیجاتی
ہے۔ کہ گیہوں کی گرانی کا سبب شرح مالگذاری ہے۔ اس وقت اس صوبہ میں مالگذاری کا اوسط
فی ایکڑ ایک روپیہ نو آنہ چھ پائی ہے۔ اور ایک ایکڑ میں اوسطاً دس من سے کم گیہوں نہیں پیدا ہوتا۔ گویا
مالگذاری ۲½ آنہ فی من ہے چونکہ کسی شخص کو ۲½ آنہ فی من جیسی قلیل رقم کا خیال نہیں آسکتا۔ اسلئے
صاف ظاہر ہے۔ کہ مالگذاری گیہوں کی گرانی کے اسباب میں سے نہیں۔ اگر کوئی شخص اس پر
شبہ کرے۔ تو اسے اس امر پر غور کرنے کی دعوت دینا چاہئیے۔ کہ صوبہ کی نصف مین مزارعین کے
قبضہ میں ہے۔ جو مالگذاری ادا نہیں کرتے۔ بلکہ مالکانِ اراضی کو لگان دیتے ہیں جو مالگذاری سے
بدرجہا زیادہ ہے۔ گیہوں اور چاول لاکھوں کروڑوں انسانوں کی خوراک کے سب سے بڑے ذرائع
ہیں۔ وہ ایک خصوصیت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چاول کی کھپت تمام تر اُسی ملک میں ہوتی
ہے، جہاں یہ پیدا ہوتا ہے۔ بہت کم چاول دنیا کے دوسرے ممالک میں بھیجا جاتا ہے لیکن گیہوں سب سے
بڑی خوراک ہے۔ جو باہر بھیجی جاتی ہے۔ دوسری جنسوں کی نسبت زیادہ گیہوں بین الاقوامی تجارت
کیلئے بھیجا جاتا ہے اگرچہ دنیا کی پیداوار میں سے نصف سے زیادہ گیہوں یورپ میں پیدا ہوتا ہے تاہم
فرانس، جرمنی، اطالیہ اور سلطنت متحدہ میں بہت گیہوں کی درآمد ہوتی ہے۔ اور اسی مانگ کی بنا پر
گیہوں کی قیمت مقرر کیجاتی ہے جو گیہوں کاشت کرنے والے کو ملتی ہے جنگ سے پہلے روس،
ریاستہائے متحدہ بہت مقدار میں گیہوں پیدا کرتے تھے آسٹریا ہنگری اور ہندوستان اس بارہ
میں ان سے بہت پیچھے تھے۔ گیہوں کی برآمد کرنیوالے ملکوں میں ہندوستان کا درجہ پانچواں تھا۔
اور سلطنت متحدہ میں سب سے زیادہ گیہوں کی درآمد ہوتی تھی۔ گویا ہندوستان میں گیہوں کے نرخ
کا انحصار انگلستان کی مانگ پر ہے۔ اس جنس کی بڑی منڈی لورپول ہے یعنی لورپول کا نرخ
دنیا بھر کے لئے گیہوں کا نرخ مقرر کرتا ہے۔ دوسرے مقامات میں گیہوں کا نرخ ہوگا۔ جو لورپول میں
ہوگا۔ صرف اس میں سے وہاں تک گیہوں پہنچانے کے مصارف منہا کر لئے جائینگے۔ عام موسموں میں
جب تجارت پر پابندیاں نہیں ہوتیں۔ پنجاب میں گیہوں کے نرخ کا دارومدار لورپول کی قیمت پر ہوتا
ہے۔ اگر یہاں سے گیہوں خرید کر جہازوں پر سوار کرکے لورپول بھیجا جائے۔ اور اس سے نفع حاصل
کیا جا سکے۔ تو گیہوں لورپول بھیج دیا جاتا ہے۔ لیکن جب گیہوں بھیجنے میں نفع حاصل

نہ ہو سکے تو یہاں سے انگلستان بھیجا نہیں جاتا۔ اِس امر پر زور دینا ضروری ہے کہ گیہوں ایک ایسی جنس ہے جسے بین الاقوامی تجارت میں اہمیت حاصل ہے کیونکہ بعض لوگ ایسے نتائج کو بھی جو پنجاب سے باہر کے حالات کے ثمرات ہیں مقامی اسباب کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جب تجارت پر پابندیاں عاید کر دی جاتی ہیں تو گیہوں کی قیمت کا انحصار مقامی اسباب پر ہوتا ہے۔ اسی طرح جب یہاں قیمت بہت گراں ہو یا لورپول میں قیمت اسقدر ارزاں ہو جائے کہ یہاں سے گیہوں باہر بھیجکر فائدہ حاصل نہ کیا جا سکے۔ جب بھی قیمت کا دارومدار مقامی اسباب پر ہوتا ہے لیکن اِن مواقع کے سوا گیہوں کے نرخ کا اِنحصار دنیا کے نرخ پر ہے۔ اور اس کا دارومدار تمام دنیا کی پیداوار اور تمام دنیا کی مانگ پر ہے۔ اِس طرح گویا گیہوں کی قیمت کے مسئلہ پر گفتگو کرتے وقت یہ ضروری ہے۔ کہ دنیا کے اقتصادی حالات پر ایک وسیع نظر ڈالی جائے۔

یہ امر کہ گیہوں بین الاقوامی تجارت کی ایک اہم جنس ہے۔ صرف اِس حقیقت کا شرمندۂ احسان نہیں۔ کہ گیہوں کو خوراک کی حیثیت سے قبولِ عام حاصل ہے کئی دوسری اجناس ایسی ہیں جنہیں گیہوں سے بھی زیادہ خوراک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے مثلاً دودھ ایک بہت ہر دلعزیز خوراک ہے لیکن بین الاقوامی تجارت کی چیز نہیں۔ گیہوں میں بعض ایسی خصوصیات موجود ہیں کہ اُس کا خریدنا اور فروخت کرنا آسان ہو گیا ہے۔ یہ جلد خراب نہیں ہوتا۔ اور جب اُسے رکھے ہوئے کئی مہینے گذر جاتے ہیں۔ تو کھایا جاتا ہے۔ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی لیجایا

لے لائلپور میں گیہوں کا نرخ ساڑھے پانچ روپے فی من ہو تو یہ گویا کراچی میں ۶ روپیہ ۲ آنے ۸ پائی کے برابر ہو۔ کراچی سے انگلستان تک کا کرایہ جنگِ عظیم سے پہلے تقریباً ۷ رفی من تھا۔ جنگ کے زمانہ میں کرایہ بڑھتا ہو گیا لیکن اب اس میں کمی ہو رہی ہے۔ اگر کرایہ کی شرح مستقلاً زمانہ ماقبل جنگ کے کرایہ سے دگنی ہو جائے۔ تو لائلپور سے گیہوں ساڑھے پانچ روپیہ فی من کے حساب سے خرید کر بھیجا جائیگا۔ اور انگلستان میں چھ روپیہ دس آنہ فی من کے حساب سے پہنچے گا۔ (جب کہ روپیہ کی قیمت ایک شلنگ اور چار پنس ہو) کرایہ کم ہو۔ تو ساری دنیا میں گیہوں کی قیمت ایک جیسی ہو جائیگی۔ آجکل کرایہ زیادہ ہے۔ اِس لئے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمانہ ماقبل جنگ کی نسبت گیہوں کی برآمد بھی طرح محدود ہوتی جائیگی جس طرح محصول برآمد محدود ہوتا جائیگا۔

جاسکتا ہے۔ اور اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچتا۔ اس کا ذخیرہ بآسانی رکھا جا سکتا ہے۔ اور اس میں
کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اور سب سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے۔ کہ اسے قسموں اور درجوں میں
تقسیم کیا جا سکتا۔ اور اسے فروخت کرنے کے لئے صرف اس کی قسم بتا دینا کافی ہے۔ مثلاً کراچی میں
جسقدر گیہوں موجود ہے۔ وہ لورپول میں فروخت کیا جا سکتا ہے۔ نہ اسے کراچی سے لورپول میں
منتقل کرنے کی ضرورت پیش آئیگی نہ خریدار کو اسکا نمونہ بھیجنے کی ضرورت ہی یہی باعث ہے۔ کہ گیہوں کا نرخ دنیا کے ہر ملک میں
تقریباً وہی ہوتا ہے جسقدر لورپول میں۔ اسکی یہی خوبی قمار بازی یا سٹہ کے لئے آسانیاں بہم پہنچا دیتی ہے
اگر کسی تاجر کا گودام گیہوں سے بھرا ہوا ہے۔ تو وہ اسے ہندوستان میں تقریباً ہر جگہ بیچ سکتا ہے۔ اور
خریدار اسے کسی دوسرے شخص کے پاس اسی حالت میں فروخت کر سکتا ہے۔ اور اسے اور نہ دوسرے خریدار
کو اس کے خریدار کو اسکے دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اب ہم اصل مضمون کے قریب پہنچ گئے ہیں اسلئے
یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ گیہوں کی قیمت کا سوال کوئی نیا نہیں۔ انگلستان میں آٹھ سو سال سے گیہوں
کی تجارت میں پہلے تو بادشاہ اور پھر پارلیمنٹ دخل دیتی رہی ہے۔ اس عرصہ میں اس کے نرخ کو
قابو میں رکھنے کے لئے کئی طریقے اختیار کئے گئے۔ اور اس طرح بہت سا تجربہ حاصل ہوا۔ جسکا نتیجہ
یہ ہے۔ کہ موجودہ حکومت اس مسئلہ کو چھیڑنا پسند نہیں کرتی۔ گیہوں تنہا ایسی فصل نہیں جسے کسان
پیدا کر سکتا ہے۔ اور کسان اسوقت تک اس جنس کی کاشت نہیں کریگا۔ جب تک وہ اس سے
نفع حاصل نہ کر سکے شاہ ولیم فاتح کے انگلستان میں آنے سے چارسو سال کے بعد انگلستان کی
حکومت نے گیہوں کی تجارت کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ تاکہ عوام کو جو گیہوں سے پیٹ پالتے
ہیں۔ فائدہ پہنچایا جائے۔ اس وقت اسے معلوم ہوا۔ کہ اس سوال کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ یعنی
گیہوں کا ارزاں ہونا ہی ضروری نہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے۔ کہ گیہوں کثیر تعداد میں
ہو۔ یہ ایسا سبق ہے۔ کہ اخبارات کے اکثر مضمون نگاروں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ گیہوں کی ارزانی
سے اس صورت میں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ وہ بہت تھوڑی مقدار میں موجود ہو۔ گیہوں
پر بسر اوقات کرنیوالوں کو خوش کرنے کی کوشش انگریزی حکومت چارسو سال تک کرتی رہی۔ لیکن
اس کے بعد اس نے کسانوں کی حوصلہ افزائی کیجانب توجہ کی یعنی انہیں گیہوں کی مزید کاشت پر آمادہ
کرتی رہی۔ اس نے محسوس کر لیا۔ کہ گیہوں کی کاشت کرنیوالوں کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ گذشتہ

تین یا چار سو سال کے عرصے میں حکومت گیہوں کا نرخ اِس حد تک گراں رکھنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ جس سے کسانوں کو اپنی محنت کا معاوضہ مل جائے۔ اور وہ ایسے بیش از پیش پیدا کریں۔

جب گیہوں کی برآمد میں مداخلت کی گئی۔ اور اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ کسان کو پہلے گیہوں کی جس قدر قیمت مل جاتی تھی۔ اُس میں کمی واقع ہو گئی۔ تو اس نے گیہوں کی کاشت ترک کر کے دوسری چیزوں کی پیداوار کی جانب توجہ کی۔ جن سے زیادہ قیمت وصول ہو سکتی ہے اور پھر اُن لوگوں کی مداخلت کا بھی اندیشہ نہیں رہا۔ جو محض اِس گروہ کا خیال رکھتے ہیں جس میں گیہوں صرف ہوتا ہے۔ انگلستان کے کسان نے تو بہت حد تک گیہوں کی کاشت ترک کر دی۔ اور اپنی زمین کو بھیڑوں کے چرنے کے لئے چراگاہ کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ اتفاق یہ ہوا۔ کہ بھیڑوں سے گیہوں کی نسبت زیادہ فائدہ ہوا۔ اور جب مویشی کی غور و پرداخت کے متعلق نئے انکشافات ہوئے۔ تو چراگاہوں کو دودھ، مکھن، اور مویشی کی پرورش کی دوسری اشیاء کے لئے وقف کر دیا گیا۔ جنگِ عظیم کے زمانہ میں جب ہر شخص فراہمی خوراک کے لئے متفکر تھا۔ انگلستان میں پانچ فی صدی سے دس فی صدی رقبہ گیہوں کی کاشت ہوتی تھی۔ اِس لئے کسان کو قیمتی اور منفعت بخش چراگاہوں میں لوگوں کی خوراک کے لئے گیہوں کی کاشت پر آمادہ کرنے کے لئے خاص تدابیر اختیار کی گئیں۔

اِن حقائق کا ذکر اِس لئے کیا گیا ہے۔ کہ موجودہ زمانہ میں جب کہ گیہوں کے نرخ کا مسئلہ سب کے لئے یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ لوگوں کو ایسے طریقے اختیار کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ جو صدیوں کے تجربے سے بے سود بلکہ خطرناک ثابت ہوئے ہیں۔ جو لوگ مقامی اخبارات میں مضامین لکھتے ہیں۔ اُن شواہد کو جمع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ جو گذشتہ زمانہ کی تاریخ نے جمع کر دیئے ہیں۔ اُنہیں اِن شواہد میں اپنی مجوزہ حکمتِ عملی کی تائید اور تردید کا سامان ملے گا۔ یورپ میں

علی الخصوص انگلستان میں اُن سودوں کے پرانے ریکارڈ محفوظ ہیں۔ جو آج سے صدیوں پیشتر کئے جا چکے ہیں۔ اِس طرح یہ امر بہت آسان ہے۔ کہ تاریخی دستاویزوں کی مدد سے لیڈروں کے بیان کے کذب و صداقت کا امتحان کیا جائے۔

یہاں تک تو ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ کہ گیہوں کی بحث کے سلسلے میں دنیا کے حالات کا وسیع مطالعہ ضروری ہے۔ گیہوں بین الاقوامی تجارت کا ایسا اہم غلّہ ہے۔ کہ اس کی قیمت کا انحصار دنیا کی تجارت کے اسباب و عوامل پر ہے اور چونکہ اس میں اِس قسم کی خوبیاں موجود ہیں۔ کہ اس کی قسم بتا کر اُسے فروخت کیا جا سکتا ہے۔ خواہ کسی شخص کے پاس کتنا ہی گیہوں کیوں موجود نہ ہو۔ وہ اُن پرتی پنچائتوں کے مطالعہ سے جو ولایت سے آتے ہیں۔ اور جن میں لورپول کی منڈی کے نرخ دیئے جاتے ہیں۔ گیہوں کی قیمت معلوم کر سکتا ہے۔ یہ بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ کہ حکومت اِبتدا سے گیہوں کی تجارت اور اس کے نرخوں کو منظم کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ پہلے وہ عوام کے مطالعہ کے خیال سے ایسا کرتی رہی۔ پھر اُس نے کسان کی قیمت بڑھانا شروع کی۔ تاکہ وہ اُس اہم جنس کی کاشت کرتا رہے۔ ہر شخص جانتا ہے۔ کہ گذشتہ صدی کے وسط میں اِنگلستان نے اناج کے قوانین منسوخ کر دیئے گئے۔ لیکن فرانس میں ۱۸۸۵ء میں بھی گیہوں پر محصولِ درآمد لگایا گیا۔ جس میں اُس کے بعد بارہا اضافہ ہُوا۔ جنگ سے پہلے آخری مرتبہ ۱۸۹۷ء میں یہ محصول بڑھایا گیا تھا۔ وہاں یہ مقصد پیشِ نظر تھا۔ کہ کسان کو معقول قیمتِ گندم اور معقول منافع کے حصول کا یقین دلا دیا جائے۔ تاکہ گیہوں کی کاشت ہوتی رہے۔

پنجاب میں ابھی تک گیہوں کا نرخ قائم رکھنے کے لئے کسی کارروائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہاں کے زمیندار اپنی زمین کے ایک بہت بڑے حصے میں گیہوں کی کاشت کرنے پر خود ہی ضرورت سے زیادہ آمادہ

تھے ۔ موجودہ حالات کو سمجھنے کے لئے ان ابتدائی سالوں پر نظر ڈالنا مفید ہوگا ۔ جب پنجاب کے گیہوں پر دنیا کی منڈیوں کے نرخ کا اثر نہیں پڑتا تھا ۔ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ جہاں تجارت پر پابندیاں عائد نہ ہوں ۔ وہاں نرخوں کا انحصار مقامی اسباب و حالات پر ہوتا ہے ۔ اسطرح جہاں اناج کو منڈی تک پہنچانے میں آسانی نہ ہو ۔ وہاں بھی نرخ مقامی ہوگا ۔ اور مختلف مقامات کا نرخ ایک دوسرے سے مختلف ہوگا ۔ جب تک پنجاب ریلوے کی تعمیر نہیں ہوئی تھی ۔ یہاں کے نرخوں کا دارومدار مقامی فصل پر ہوا کرتا تھا مثلاً ڈیرہ اسمٰعیل خاں پر ریلوے کی تعمیر کا اثر بہت دیر کے بعد پڑا ۔ وہاں گیہوں ۱۸۴۲ء میں روپیہ کا بائیس سیر تھا ۔ ۱۸۵۰ء میں اچھی فصل ہوئی ۔ نرخ زیادہ ارزاں ہوگیا ۔ اور گیہوں پچاس سیر فی روپیہ ملنے لگا ۔ ۱۸۶۹ء میں فصل اچھی نہیں ہوئی ۔ اس لئے گیہوں کی قیمت ۱۲ سیر فی روپیہ ہوگئی ۔ جس سال اچھی فصل ہو یہ ضروری ہے ۔ کہ غلہ کی فراوانی ہو جائے ۔ اور غلہ فروخت نہ ہو سکے ۔ تقریباً ۱۸۵۸ء میں امرتسر کے اندر یہی ہوا ۔ بنیوں نے زمینداروں سے گیہوں مروجہ نرخ پر خریدا لیکن گیہوں کی فراہمی مانگ سے زیادہ تھی ۔ اسلئے قیمتیں بہت کم ہوگئیں ۔ اور بنئے تباہ ہوگئے انہیں کوئی خریدار نہیں ملتا تھا ۔ گیہوں گوداموں میں پڑا سڑتا رہتا تھا ۔ جس زمانہ میں ذرائع رسل و رسائل ناقص تھے فصل کی فراوانی ہمیشہ کسان کیلئے رحمت اور برکت کا باعث نہیں تھی ۔ تقریباً ۱۸۷۵ء کا ذکر ہے ۔ کہ کسان کو اچھے سالوں میں فی روپیہ چالیس سیر یا پچاس سیر گیہوں فروخت کرنا پڑتا تھا ۔ بحیثیت مجموعی یہ کہنا چاہئے ۔ کہ شہروں میں اسوقت گیہوں کے نرخ کا اوسط ۱۵ سیر سے ۱۷ سیر فی روپیہ تھا ۔ اب بھی بعض لوگ ایسے موجود ہیں جن کی خواہش ہے ۔ کہ گیہوں کا یہی نرخ ہو جائے ۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت کو اس مقصد کیلئے کوئی کارروائی کرنا چاہئے ۔ وہ ان تغیرات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ۱۸۷۰ء سے آج تک رونما ہوتے ہیں ۔ وہ اس امر کو بھول جاتے ہیں ۔ کہ بٹائی لگانے والوں کے سوا خوراک کی قیمت میں تبدیلیاں کسی شخص کے لئے مفید نہیں ۔ ریلوے تعمیر سے یہ معلوم کرنا یقیناً بہت دشوار ہوگا ۔ کہ گیہوں کب خریدنا چاہئے ۔ اور کتنی دیر تک اس کا ذخیرہ رکھنا چاہئے ۔ قیمتوں میں موسم کے اعتبار سے بہت اختلاف رہتا ہے یہ ہو سکتا ہے ۔ کہ جون میں گیہوں کا نرخ سولہ سیر فی روپیہ ہو ۔ اور جنوری میں ۹ سیر ۔ سن ۱۸۷۰ء میں دہلی کے اندر یہی قیمتیں تھیں ۔ اسی سال کا ذکر ہے ۔ کہ سرسہ میں ماہ جون ۱۱ سیر نرخ تھا ۔ اور جنوری میں ۶ سیر ۔

نرخ کے ان اختلافات کی یہ وجہ تھی۔ کہ محل و نقل کیلئے مناسب آسانیاں میسر نہیں تھیں۔ ہر علاقہ میں جو گیہوں صرف ہوتا تھا۔ وہ وہیں کی پیداوار ہوا کرتا تھا۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ اناج لے جانے کی ضرورت اُسی وقت پیش آئی تھی۔ جب نرخ میں بہت بڑا فرق ہو۔ ہر ضلع کا نرخ مختلف تھا۔ ہر مہینہ نرخ میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک سال زمیندار کے پاس اتنا غلہ نہ ہو۔ کہ اسکے بیچنے کی ضرورت پیش آئے۔ اور دوسرے سال اچھی فصل ہونے کے باعث منڈی میں اناج ہی اناج نظر آئے۔ اور وہ غلہ بیچ نہ سکے۔ ایسے زمانہ میں مقامی منڈی کی ضرورت سے زیادہ گیہوں پیدا کرنے کیلئے کوئی چیز محرک نہیں تھی۔ کسان اسی چیز کی کاشت کرتا ہے۔ جسے وہ فروخت کر سکے۔ اگر وہ فروخت نہ کر سکے تو وہ کاشت بھی نہیں کریگا۔ یعنی اگر اُسے یقین نہ ہو جائے۔ کہ اُسے زائد از ضرورت پیداوار کی فروخت کیلئے کوئی منڈی مل جائیگی۔ تو اُسے کیا پڑی ہے۔ کہ زراعت کو وسعت دے۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ اسکے معنی یہ ہیں۔ کہ تجارت برآمد مفقود ہو تو ہر سال زائد از ضرورت غلہ پیدا نہیں کیا جائیگا۔ تقریباً ۱۸۷۰ء میں پنجاب کے جس قدر حصہ میں گیہوں کی کاشت ہوتی تھی۔ وہ ۵۴۴۰۰۰۰ ایکڑ یا تمام مزروعہ رقبہ کا ۳۱ فیصدی تھا۔ لیکن صرف چند لاکھ روپیہ کا گیہوں باہر بھیجا گیا۔ اُس وقت ریلوے نہیں تھی۔ نہریں کم تھیں۔ صرف دوآبہ باری اور مغربی جمنا کی نہریں چلتی تھیں۔ نہر سرہند کا ۱۸۷۰ء۔ ۱۸۷۹ء میں شروع ہوئی اور اس کی وجہ سے اس رقبہ میں اضافہ ہو گیا جس میں گیہوں کی کاشت ہوتی تھی۔ ۱۸۹۵ء و ۱۸۹۶ء تک وہ رقبہ جس پر گیہوں کی کاشت ہوتی تھی۔ ۶۲۶۰۰۰۰ ایکڑ ہو گیا۔ اس میں سے نصف سے زیادہ یا ۳۲ لاکھ ایکڑ کی آبپاشی ہوتی تھی۔ اور تیس لاکھ ایکڑ رقبہ کی آبپاشی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یہ رقبہ تمام رقبہ کا ۳۲ فیصدی تھا۔ آبپاشی کی توسیع کی وجہ سے مجموعی پیداوار بڑھ کر ۲۳ فیصدی ہو گئی۔ گویا اندازاً چار کروڑ تیس لاکھ من کی بجائے پانچ کروڑ تیس لاکھ من پیداوار ہونے لگی۔ اس میں سے تقریباً ۸۴ لاکھ من یا ۱/۶ سے کم باہر بھیجا گیا۔

۱۸۹۶ء سے صوبہ میں عجیب و غریب تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ یہ سال پنجاب کی تاریخ میں کلی تغیر کا سال سمجھا جائیگا۔ کیونکہ اسی سال میں پستی اور افلاس کی جگہ ترقی اور خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔ اس سال

کا بڑا واقعہ نہر چناب کا افتتاح۔ اور لائل پور کا آباد ہونا تھا۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تجارت میں بہت ترقی ہوگئی۔ اور اسکے ساتھ ہی دولت بھی بڑھ گئی۔ اور عام معیار زندگی بھی نمایاں طور پر بلند ہوگیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صوبہ کے اندر گیہوں کا صرف زیادہ ہونے لگا۔ اور اس سے کم درجہ کے غلوں کا بازار سرد پڑگیا۔ یہ تبدیلی شہروں میں خاص طور پر ہوئی۔

نہر چناب کے بعد دوسری بڑی نہروں کی تعمیر کی۔ اور جس رقبہ میں گیہوں کی کاشت ہوتی تھی۔ وہ بڑھ گیا۔ نو سال تک یعنی سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک گیہوں کا رقبہ ۹۰ لاکھ ایکڑ سے زیادہ تھا۔ ان سالوں میں پنجاب کا رقبہ وہی تھا۔ جو آج ہے۔ دہلی اور صوبہ سرحد اس سے الگ ہو چکے تھے۔ اس لئے اگر اس رقبہ کو لیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ سنہ ۱۸۷۰ء کی نسبت گیہوں کی فصل دگنی ہوگئی ہے۔ مجموعی پیداوار اندازاً ۸ کروڑ دس لاکھ من تھی۔ حالانکہ سنہ ۱۸۷۰ء میں ۴ کروڑ تیس لاکھ من پیداوار تھی۔ اور سنہ ۱۸۹۶ء میں پانچ کروڑ تیس لاکھ من۔ یہ اضافہ آبادی کے اضافہ سے بہت زیادہ ہے۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں آبادی تقریباً ایک کروڑ ۶۲ لاکھ پچاس ہزار تھی۔ اور اب دو کروڑ ہے۔ یہ اعداد و شمار توجہ کے محتاج ہیں۔ کیونکہ صوبہ میں گیہوں کی اس قدر پیداوار ہوتی ہے۔ جو لوگوں کی ضروریات سے زیادہ ہے۔ اگر سنہ ۱۸۷۰ء کی نسبت فی کس صرف گندم بھی بڑھ گیا ہو جب بھی نکتہ بین جسقدر اضافہ پیداوار کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں حقیقی اضافہ اس سے بہت زیادہ ہے یہی زائد از ضرورت پیداوار ہے جس پر تجارت برآمد کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اور اسی میں تجارت درآمد اور تجارت پیشہ جماعتوں کی دولت میں اضافہ کا راز پنہاں ہے۔ جسے پنجاب کی گذشتہ تاریخ کی نمایاں خصوصیت سمجھنا چاہیئے۔

سنہ ۱۸۸۶ء سے سنہ ۱۸۹۵ء تک یعنی نہر چناب کے افتتاح سے پیشتر گیہوں کی برآمد کا اوسط ۲۸۰۰۰ ٹن سالانہ تھا۔ جنگ سے پہلے تین سال کے عرصہ میں ۱۲۷۰۰۰ یا تقریباً پانچ گنا اوسط تھا آئندہ چھ سالوں کا اوسط ۱۰۵۰۰۰ ٹن تھا۔ برآمد شدہ گیہوں کی قیمت اس عرصہ میں ایک کروڑ ۱۸ لاکھ سے ۶ کروڑ ۸۰ لاکھ ہوگئی۔ اس صوبہ میں تجارت جسقدر اہمیت رکھتی ہے۔ اسے واضح کرنیکے لئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ گذشتہ نو سال کے عرصہ میں پنجاب برآمد شدہ گیہوں کے عوض میں غیر ملکی خریداروں سے اسی کروڑ روپیہ سے زیادہ وصول کر چکا ہے۔ اس کثیر رقم کا کچھ عرصہ تو مصنوعات کی صورت میں وصول

ہوا۔ کچھ سونے اور چاندی کی صورت میں اور کچھ دوسری اجناس کی صورت میں۔ تجارت برآمد اور تجارت درآمد دونوں سے تجارت پیشہ پیشہ گروہوں نے منافع حاصل کیا۔ جو بصورت دیگر انہیں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان حقائق کا ان لوگوں کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے۔ جو گیہوں کی تجارت پر پابندیاں عاید کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ گیہوں کی گرانی کی کفایت اکثر شہر کے باشندے کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی لوگ ہیں۔ جو زیادہ قیمت کی وجہ سے نفع حاصل کر رہے ہیں۔ اگر گیہوں کی برآمد کو مستقلاً ممنوع قرار دیا جائے۔ تو اکثر تجارتی ادارے تباہ ہو جائینگے اور شہروں کی خوشحالی کو نقصان پہنچیگا یہ نکتہ اس قابل ہے۔ کہ اس پر زیادہ زور دیا جائے۔ کیونکہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ گیہوں کے نرخ کی گرانی سے صرف زمیندار فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ کسانوں کو جو زیادہ قیمتیں ملتی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مصارف وغیرہ کے سلسلہ میں بیلوں۔ آلات کشاورزی اور دوسری ضروری اشیا کی بھی گراں قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں۔ ایک کمیشن ایجنٹ یا آڑہتی اسلئے کام کرتا ہے۔ کہ اسے فیصدی متناسب کمیشن ملتا ہے۔ اور جوں جوں قیمتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اس کا کمیشن بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ہر شخص اس امر سے باخبر ہے کہ گذشتہ سالوں میں تجارت پیشہ لوگ خوشحال ہو گئے ہیں لیکن جو لوگ گیہوں کی قیمت گھٹانے کے خواہشمند ہیں وہ شاذ ہی اس کا ذکر کرتے ہیں۔

دوسرا جواب طلب سوال یہ ہے۔ کہ جسقدر گیہوں برآمد کیا جاتا ہے۔ اسے نکال کر باقی جتنا گیہوں صوبہ میں رہ جاتا ہے بحیثیت مجموعی اسکی کاشت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یا کمی۔ کیا صوبہ میں جسقدر گیہوں صرف ہوتا ہے۔ اسکی مجموعی مقدار میں تجارت برآمد کی وجہ سے کوئی کمی واقع ہو رہی ہے۔ اسکے سوال کے جواب میں صحیح اعداد و شمار تو نہیں پیش کئے جا سکتے۔ کیونکہ تجارت برآمد کے اعداد و شمار میں دیسی ریاستوں کا گیہوں بھی شامل ہے۔ حالانکہ پیداوار کے اعداد صرف پنجاب سے متعلق ہیں۔ مزید برآں صوبہ سرحد کے اعداد کو ریلوے اعداد سے الگ کرنا بھی مشکل ہے۔ لیکن کوئی شہادت ایسی نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ صوبہ کے اندر جسقدر گیہوں صرف ہوتا ہے۔ اس کی مقدار میں کمی ہو رہی ہے۔ بلکہ ہر شخص جسے آج سے بیس[1] سال پہلے کے حالات یاد ہیں۔ یہ گواہی دے گا

---

[1] سر جیمز ولسن نے اپنے مقالہ بعنوان "دنیا کے گیہوں" میں لکھتا ہے۔ کہ ہندوستان میں گیہوں کا صرف زمانہ جنگ کے اندر ۵ فیصدی بڑھ گیا ہے

گیہوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت تک ہم نے یہی ظاہر کرنیکی کوشش کی ہے۔ کہ صوبہ کی موجودہ خوشحالی کی وجہ بہت حد تک یہ ہے۔ کہ گندم کی زراعت زیادہ وسیع ہوگئی ہے۔ یہ جنس برآمد بھی کی جاتی ہے۔ اور یہ چیز خود ریلوے اور ہزاروں کی تعمیر کی مرہون منت ہے۔ ریلوے کی تعمیر کا یہ اثر پڑا ہے۔ کہ نرخ مستقل ہو گئے ہیں۔ مختلف مقامات کی قیمتوں میں چنداں اختلاف نہیں اور سال کے مختلف حصوں میں نرخ تبدیل نہیں ہوتے رہتے۔ ہر سال کے نرخوں میں بھی نسبتاً کم اضافہ یا کمی ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی گیہوں کے نرخوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جب تک صوبہ کے طول و عرض میں ریلوے کا سلسلہ اچھی طرح قائم نہیں ہوا تھا۔ نرخوں کا دارومدار مقامی حالات پر تھا۔ کسان اُسی قدر قیمت حاصل کرسکتا ہے۔ جتنی اسے قریب ترین منڈی میں مل جاتی تھی۔ اور جب قریب ترین منڈی میں اس کی تمام پیداوار بک نہیں سکتی تھی۔ تو زاید از ضرورت جنس پڑی سڑا کرتی تھی ان حالات میں کسان کو کوئی چیز اس امر پہ آمادہ کرنے والی نہیں تھی۔ کہ وہ زیادہ وسیع رقبہ میں کاشت کرے۔ کسان اسی قدر جنس کی کاشت کرتا ہے۔ جس قدر وہ فروخت کرسکے۔ ریلوے کی تعمیر کا یہ اثر ہوا کہ دنیا بھر کی منڈیوں کے دروازے پنجاب پر کھل گئے۔ اُسے اپنی پیداوار کی پوری یا اور نہیں تو نسبتاً بہتر قیمت ملنے لگی۔ اس طرح کسان کی ہمت بڑھ گئی۔ اور وہ زیادہ رقبہ میں زراعت کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مزروعہ رقبہ میں آبادی کی نسبت زیادہ سرعت سے اضافہ ہوا پہلے کی نسبت فی کس پیداوار کا اوسط بڑھ گیا۔ اور اعلےٰ معیار کی زندگی بسر کرنا ممکن ہو گیا۔

اس سلسلہ میں ایک غلط اندیشہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جو اشیائے خورد و نوش کی تجارت پر بحث کرتے وقت بعض اوقات پیدا ہو جایا کرتا ہے معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں کا خیال یہ ہے۔ کہ جو گیہوں باہر بھیجا جاتا ہے۔ اس سے لوگوں کو محروم کیا جاتا ہے۔ اگر یہ گیہوں باہر نہ بھیجا جاتا۔ تو لوگوں کے صرف میں آتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ تجارت برآمد سے اس قدر گیہوں باہر چلا جاتا ہے۔ کہ لوگوں کے کھانے کیلئے کم باقی رہ جاتا ہے۔ یہاں تک بھی کہا گیا ہے۔ کہ کسان گیہوں کو بیرونی خریداروں کے ہاتھ فروخت کرکے پنجاب کے شہروں کی آبادی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ حالانکہ ہر شخص اس حقیقت سے باخبر ہے۔ کہ کسان اپنی پیداوار بنئے یا گاؤں کے تاجر غلہ کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اُسے اس کی قیمت مل جاتی ہے۔ اور اسکے بعد اسے بھی اس امر سے اسکا

کوئی تعلق نہیں رہتا۔ کہ اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔ وہ اسے بیرونی خریدار کے پاس ہرگز نہیں فروخت کرتا۔ گاؤں کا بنیا اسے قریب ترین منڈی کے بڑے بڑے تاجروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ اس کے بعد اسے بھی اس سے سروکار نہیں رہتا۔ کہ یہ غلہ کہاں جاتا ہے۔ منڈی کا تاجر ایک کاروباری شخص ہے۔ وہ اُسے اُن لوگوں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ جو اُسے زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرتے ہیں۔ اُسے بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ کہ آخر اس گیہوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ گیہوں فروخت کیلئے ہے۔ اور فروخت کر دیا جاتا ہے۔ جو شخص چاہے خریدے! اس میں اس بات کا کوئی امتیاز نہیں۔ کہ گیہوں اس صوبہ میں صرف ہو۔ یا قریب کے صوبوں میں۔ اور یا یورپ میں۔ اگر کسی شخص کو شکایت ہے۔ کہ پنجاب سے گیہوں باہر بھیجا جا رہا ہے۔ تو اُسے اِس بات کی آزادی حاصل ہے۔ کہ یہ گیہوں خرید کر تجارت برآمد کو روک دے تجارت میں ہر شخص آزاد ہے بحالت موجودہ گیہوں کی قیمت اس قدر زیادہ[1] ہوگئی ہے۔ کہ اس سے اکثر اشخاص مبتلائے مصیبت ہو رہے ہیں۔ اور یہ عام قاعدہ ہے۔ کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے۔ تو لوگ اقتصادی نقائص کا علاج سیاسیات میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں۔ کہ قیمت کی زیادتی کے اسباب کیا ہیں۔ اور اس قیمت کو معقول حد تک گھٹانے کیلئے کیا جا سکتا ہے۔ ہم اس سلسلہ میں جو کچھ لکھ چکے ہیں۔ اگر اُسے ذہن میں محفوظ رکھا جائے۔ تو ان مسائل کا جواب دینے کی سعی ممکن العمل ہے گیہوں کے نرخ میں اضافہ ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ کیونکہ جنگ کی وجہ سے تمام اشیاء کے نرخ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر لاکھوں انسان غلہ کی پیدائش کی بجائے تباہی و بربادی میں سالہا سال مصروف رہیں۔ تو یہ ضروری ہے۔ کہ اشیاء کی قیمت اس وقت تک بڑھتی چلی جائے تا آنکہ اشیاء کی پیدائش ضروریات پوری کرنے کیلئے کافی نہ ہو۔ مزید برآں جیسا کسی ملک کی کرنسی میں مداخلت کی جائے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہو۔ کہ سونے یا چاندی کے سکوں کی جگہ کاغذ کے نوٹ لے لیں خاص طور پر جب کہ مجموعی طور پر کرنسی بہت چڑھ جائے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ قیمتوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ جنگ کے زمانہ میں تمام ملکوں میں سونے کے سکوں کا چلن

---

[1] ۱۹۲۱ء کے موسم خزاں میں۔

نہ رہا۔ چنانچہ قیمت کا حساب زرِ کاغذی سے ہونے لگا۔ ہندوستان میں بھی چاندی کے روپوں کی بہت مانگ ہو گئی۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی۔ کہ لوگ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے تھے اور کچھ یہ سبب تھا۔ کہ فلسطین مشرقی افریقہ اور دوسرے مقامات کی فوجوں میں اس کی ضرورت تھی۔ جنگ سے پہلے ٹیکسال میں جسقدر روپیہ تیار ہوتے تھے۔ اگرچہ ان کا اوسط ہر سال مختلف ہوا کرتا تھا۔ تاہم ۱۹۱۳ء و ۱۹۱۴ء تک پانچ سال کے حصہ میں سات کروڑ چالیس لاکھ روپے سالانہ تیار ہوتے تھے۔ آئندہ دو سالوں کے اندر یعنی ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۵ء میں ٹکسال کے تیار شدہ روپوں کی تعداد کم ہو کر ایک کروڑ اسی لاکھ رہ گئی۔ اور ۱۹۱۵ء و ۱۹۱۶ء میں صرف ایک کروڑ چالیس لاکھ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نوٹوں کا بھنانا آسان نہیں تھا۔ اور حکومت اس امر پر مجبور ہو رہی تھی۔ کہ نوٹوں کو کسی دوسری صورت میں تبدیل ہونے کے ناقابل بنا دیا جائے۔ ۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء میں جس قدر نیا روپیہ تیار ہوا۔ وہ مجموعی طور پر ۲۹ کروڑ اسی لاکھ تھا۔ ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء میں ۲۲ کروڑ پچاس لاکھ۔ اور ۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء میں پچاس کروڑ دس لاکھ کی عظیم رقم تک جا پہنچا۔ اس تاریخ سے نوٹوں کو بھنانے میں کوئی دقت نہ رہی۔ روپے کے علاوہ جنگ کے زمانہ میں بیشمار کرنسی نوٹ غیر متوقع طور پر تیار کئے گئے۔ ان کے اثرات کی وسعت کا اندازہ اس سیدھے سادھے بیان سے ہو سکتا ہے۔ کہ ۱۹۱۴ء ۶۶ کروڑ کے نوٹ چلائے گئے اور ۱۹۱۹ء میں ایک ارب ۴۵ کروڑ کے۔

اگر ہم سونے کی قیمتوں کا نرخ قائم کرنے کی اساس و بنیاد قرار دیں۔ تو یہ اغلب ہے کہ قیمتیں کم ہو جائینگی۔ لیکن اسکے لئے بھی کئی سال چاہیئے۔[1] جنگ کے زمانہ میں گیہوں کی برآمد ایک ضبط و نظام کے ماتحت آ گئی تھی۔ اس لئے نرخوں کے اضافہ کے اثرات کو لوگوں نے پوری طرح محسوس نہیں کیا۔ چنانچہ جس قدر گیہوں باہر بھیجا گیا۔ وہ مجموعی پیداوار کا ۲ فیصدی تھا۔ اور یہ یقیناً بہت کم مقدار ہے۔ مزید برآں لائل پور میں تجارت برآمد کے لئے گیہوں کی خرید ۔ ۵ آنہ فی من مقرر کی گئی تھی۔ اسلئے یقیناً موجودہ نرخ کی وجہ تجارت برآمد نہیں ہو سکتی۔ بدقسمتی سے سال گذشتہ (۱۹۲۰ء) کی فصل خراب اچھی نہیں ہوئی۔ چنانچہ سستے غلوں کا نرخ معمول کی نسبت

---

[1] کرنسی کی تبدیلی کے اثرات کا مسئلہ ایسا پیچیدہ ہے۔ کہ یہاں اس پر بحث نہیں کی جا سکتی۔ ان اعداد سے صرف یہ مقصود ہے کہ کرنسی کی تبدیلیاں [illegible]

بڑھ گیا۔ اس لئے اکثر لوگ گیہوں کھانے پر آمادہ ہو گئے۔ اس پر ایک اور بدقسمتی کا اضافہ ہوا۔ یعنی ۱۹۲۱ء کی فصل اوپر خراب ہوئی۔ ہندوستان کے تمام حصوں میں جہاں جہاں گیہوں پیدا ہوتا تھا۔ اسکی پیداوار اوسط سے کم تھی۔ سارے ہندوستان کی پیداوار میں پچیس فیصدی کی کمی ہوگئی۔ پنجاب کے متعلق اندازہ کیا جاتا ہے۔ کہ یہاں گیہوں کی فصل معمول سے چالیس فیصدی کم تھی۔ صرف اس صوبہ میں معمول کی نسبت گیہوں کی پیداوار چار کروڑ من کم ہوئی۔ اور آج دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ گذشتہ فروری میں بمقام لائل پور ۔ [illegible] فی من نرخ تھا جولائی تک اس میں اضافہ ہوا۔ اور یہ ۔ [illegible] ہوگیا۔ اس کے بعد پھر فوری اضافہ ہوا جہاں تک فصل کا تعلق تھا۔ اس اضافہ کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اور تجارت برآمد بھی اس کا باعث نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ برآمد کی نہایت سختی سے حد بندی کر دی گئی تھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا سب سے بڑا سبب جوا یا سٹہ تھا۔ گیہوں میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ اور یہ یقین تھا۔ کہ اس کا سارا ذخیرہ جلد فروخت ہو جائیگا۔ گیہوں کی آئندہ فصل میں ابھی کئی مہینے باقی تھے۔ اور باہر سے گیہوں منگانے کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ گیہوں کے تاجروں کے لئے یہ اچھا موقع تھا چنانچہ ان میں سے اکثر نے سٹہ بازی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اگست میں گیہوں کا نرخ ۔ [illegible] فی من ہوگیا۔ اور ستمبر میں ۔ [illegible] ۔ اسکے بعد اس کی قیمت گر رہی ہے۔

گیہوں کے نرخ میں اس کمی اور بیشی کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اس لئے یہاں یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اندرونی حالات پر تجارت برآمد کس حد تک اثر انداز ہو سکتی ہے۔

چونکہ سرکاری تخمینوں کی ترتیب میں بہت احتیاط برتی جاتی ہے۔ اس لئے یہ بتانا آسان نہیں۔ کہ پنجاب کی مجموعی پیداوار میں سے کتنا حصہ باہر بھیجا جاتا ہے لیکن سرسری تخمینہ کی بنا پر یوں سمجھنا چاہئیے۔ کہ صوبہ کی پیداوار کا ۱/۶ یا ۱۶ فیصدی بیرونی مقامات میں صرف ہوتا ہے۔ زراعت کے ڈائرکٹر کا تخمینہ ہے۔ کہ گیہوں اور گیہوں کے [illegible] پیداوار کا [illegible] ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ تناسب محض مفروضہ خام پیداوار کی بنا پر ہے بعض لوگ اسے خطرہ سمجھتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ گیہوں کا صوبہ سے باہر بھیجنا ممنوع قرار دیا جائے۔ یہ لوگ اس امر کو بعین سمجھ

سکتے۔ کہ زائد از ضرورت پیداوار سے کیا فایدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اگر گیہوں کی برآمد ممنوع قرار دی گئی۔ تو ہر شخص کیلئے کافی غلہ ہوگا۔ نرخ کم ہو جائینگے۔ اور ہر شخص خوش نظر آئیگا لیکن اگر اسے احمد آباد یا بمبئی کے کپڑے پر چسپاں کیا جائے تو واضح ہو جائیگا کہ یہ محض ایک منطقی مغالطہ ہے۔ یہاں یہ دلیل پیش کرنا چاہیئے۔ کہ بمبئی میں اکثر لوگ ایسے ہیں۔ جو کپڑا خریدنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور تقریباً ننگے پھرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ بمبئی سے لاکھوں روپے کا کپڑا باہر بھیجا جاتا ہے۔ اسلئے کپڑے کی برآمد کو ممنوع قرار دی جائے۔ تو کپڑے کی قیمت میں کمی واقع ہو جائیگی۔ بلکہ اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا۔ کہ کارخانے اتنا کپڑا تیار نہیں کرینگے۔ جسے نفع پر نہ بیچ سکیں گے۔ اور اس طرح پہلے کی نسبت کم کپڑا تیار ہوگا۔ گیہوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اگر تجارت برآمد ممنوع قرار دی جائے تو گیہوں کی کاشت کم ہو جائیگی۔ زمیندار کپاس اور دوسری اجناس کی جانب توجہ کرینگے جن میں حکومت کی مداخلت کی اُمید کم ہو۔ اب بھی اگر گیہوں کی قیمت کم کردی جائے اور دوسری اجناس کی قیمت میں کوئی تخفیف نہ کی جائے۔ یا مصارف پیداوار میں کمی نہ ہو۔ تو زمیندار ایسی جنس کی کاشت پر اپنی توجہ صرف کرینگے۔ جس سے زیادہ منفعت حاصل ہو سکے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ تجارت برآمد قحط سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ ہے۔ یہ ایک ایسا محرک ہے جس کی وجہ سے صوبہ کی ضروریات سے زیادہ گیہوں پیدا کیا جاتا ہے۔ اور ہر سال صوبہ کے پاس زائد از ضرورت غلہ ہوتا ہے۔ اس زائد از ضرورت غلہ کا اندازہ حسب تفصیل بالا ۱۶ فی صدی اور ۲۸ فی صدی کیا گیا ہے۔ اگر فصل اچھی نہ ہوئی۔ تو برآمد بھی کم ہو گئی۔ اگر فصل معمول سے ۱۶ فی صدی کم ہے۔ جب بھی لوگوں کی ضروریات کے لئے کافی غلہ ہوگا۔

معمولی طور پر ہر سال جو زائد از ضرورت غلہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایسے اوقات میں جب اشیائے خورد و نوش میں کمی واقع ہو جائے رسپر کا کام دیتا ہے۔ اگر صوبہ میں اسی قدر گیہوں پیدا ہو۔ جو یہاں کی مقامی ضروریات کے لئے کافی ثابت ہو۔ اور کسی سال فصل اچھی نہ ہو

تو اس صورت میں خواہ گیہوں معمول سے دس فیصدی کم پیدا ہو۔ قحط پڑ جائیگا۔ اس طرح برآمد کے لیے جس قدر گیہوں کی پیداداری کی جاتی ہے۔ وہ بڑے وقتوں میں کام آتا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ۱۴ فیصدی پیداوار کم ہو گئی تھی۔ اسلیئے یہ محفوظ غلہ لوگوں کو مصیبت سے بچانے میں ناکافی ثابت ہوا۔

ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ اگر تجارت برآمد کیلئے ۵ ۔ ۸ ۔ ۰ فی من کے حساب سے گیہوں خریدا جائے۔ تو نفع ہو سکتا ہے۔ اس طرح جب گیہوں کا نرخ اس سے بڑھ جائے۔ تو یہ سمجھا جائے۔ کہ اسکے اسباب داخلی ہیں۔ ان میں سے بڑا سبب موسم بہار کی فصل کا اچھا نہ ہونا ہے۔ جب زائد از ضرورت پیداوار مقامی صرف پیداوار سے اسقدر زیادہ ہو۔ کہ فصل کے خراب ہو جانیکی حالت میں یہ زائد از ضرورت پیداوار مقامی ضروریات پوری کرنے میں صرف ہو۔ تو اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ غلہ کی قیمت تجارت برآمد کے نرخ سے زیادہ ہو جائیگی۔ اس غرض کیلئے کہ دوسرے سال نرخ اسقدر زیادہ نہ ہوں۔ بہترین طریقہ ہے۔ کہ زراعت کے طریقوں کی اصلاح کرکے۔ یا نہروں کے توسط سے آبپاشی کی توسیع کر کے پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ تاکہ اس سال کیطرح دوسرے سال نرخ گراں نہ رہے۔

اگر فی ایکڑ پیداوار میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ تو اُس کے یہ معنی نہیں۔ کہ مجموعی طور پر فصل میں بھی اضافہ ہوگا۔ کیونکہ فرانس میں ۱۸۶۲ء سے ۱۹۱۰ء تک فی ایکڑ پیداوار میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اور گیہوں کی فصل کے رقبہ میں کمی واقع ہوتی رہی۔ چنانچہ رقبہ مذکور ایک کروڑ ساٹھ اسی لاکھ ایکڑ کی بجائے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ رہ گیا ہے۔ وہاں فی ایکڑ پیداوار اس قدر ہوئی کہ رقبہ کی کمی پوری ہو گئی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ اگر پنجاب میں بھی گیہوں کی برآمد پر محصول لگا دیا جاوے۔ تو فی ایکڑ اضافہ پیداوار اُسکی کمی کو پورا کرے۔ شائد ایسا ہو۔ کہ پیداوار میں جسقدر اضافہ ہو۔ اُس کی نسبت گیہوں کے رقبہ میں زیادہ ترقی سے کمی واقع ہو جائے۔ اور اس طرح مجموعی طور پر گیہوں کی مقدار کم رہ جائے۔ اگر فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ نہ ہو۔ تو یہ امر تقریباً یقینی ہے۔ کہ منافع میں کمی کے باعث رقبہ بھی کم ہو جائیگا۔

جب تک ہم اس منزل تک پہنچیں۔ اسکا آسان ترین علاج یہ ہے کہ انجمن امداد باہمی

قائم کی جائیں۔ جن کیوجہ سے مصارف تقسیم میں بہت بچت ہو جائیگی۔ اور ان مجالس کے ارکان کیلئے کم سے کم نرخوں پر اشیائے خورد و نوش کی خرید ممکن ہو جائیگی۔ فرض کر لیجئے کہ امداد باہمی کی کوئی انجمن جون سنہ ۱۹۳۱ء میں اشیائے خورد و نوش خرید لیتی ہے۔ تو یقیناً اُس کے تمام ارکان اُس نقصان سے محفوظ رہیں گے۔ جو جولائی اگست اور بہترین نرخوں کے زیادہ ہونیکے سبب پیش آتے ہیں۔

بہرحال ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ جو اپنی مدد آپ کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے۔ بلکہ حکومت کو اس امر پر توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ کہ وہ ملک کی تجارت میں جو باقاعدہ چل رہی ہیں۔ مداخلت کرے۔ ایک خیال یہ ہے۔ کہ اگر حکومت نے تجارت برآمد کی ممانعت کر دی۔ تو حالات تبدیل ہو جائینگے۔ اور آج جو لوگ اجناس کی گرانی کے سبب تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔ اُنہیں فائدہ ہوگا۔ تجارت برآمد کی ممانعت ایک بھدا سا طریق ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ صوبہ تباہ و برباد ہو جائیگا۔ جب ذرائع رسل و رسائل میں آسانیاں موجود نہیں تھیں۔ یا حمل و نقل کے طریقوں میں نقائص تھے۔ تو عملی طور پر تجارت برآمد کا وجود نہیں تھا۔ اسلیئے کبھی یہ کوشش نہیں کیگئی کہ مقامی ضروریات سے زیادہ گیہوں کی کاشت کیجائے۔ اُس زمانہ میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اور نہ ہو سکتا تھا۔ کہ ہر سال زائد از ضرورت غلہ موجود ہو۔ سنہ ۱۸۷۱ء و سنہ ۱۸۷۲ء میں صرف چار لاکھ روپیہ کا گیہوں باہر بھیجا جائے۔ اور جبتک رسل و رسائل کیوجہ سے زمینداروں کا تعلق بڑی بڑی منڈیوں سے نہیں ہو گیا۔ زراعت کو اتنی توسیع نہیں دی گئی۔ کہ نفع کے متعلق یقین ہو جاتا ہے اب بڑی بڑی نہروں کی تعمیر سے یہ یقین ہو گیا ہے۔ کہ ہر سال فصل ہوا کریگی۔ اور آہستہ آہستہ یہ ضرورت نہ رہی۔ کہ غلّہ کا ذخیرہ رکھا جائے۔ لیکن جو لوگ اس امر پر زور دیتے ہیں۔ کہ حکومت کی جانب سے غلّہ کا بہت بڑا ذخیرہ رکھا جائے۔ تاکہ جب غلّہ کی قلت ہو۔ تو قیمتیں زیادہ نہ ہو جائیں۔ وہ اسے معقول جانتے ہیں۔ کبھی اس بات پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ کہ ایک سال میں جسقدر غلّہ صرف ہوتا ہے حکومت اُسے خرید کر روک لے۔ اس کی قیمت تیس کروڑ روپیہ ہوگی۔ اور اس سے جسقدر سود نقصان ہوگا۔ اُس کی مالیت ایک کروڑ اسی لاکھ روپیہ سالانہ ہوگی۔ کیونکہ حکومت کو اس کی قیمت قرض لے کر ادا کرنا پڑیگی۔

اگر تجارت برآمد کو ممنوع قرار دیا گیا۔ تو اُسکا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ملک پھر پُرانے زمانے کی
طرح افلاس ونکبت اور قحط کی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیگا۔ کوئی ایسی چیز نہیں رہیگی۔ جو لوگوں
کو زائد از ضرورت غلّہ پیدا کرنیکی محرک ہو۔ اگر عارضی طور پر گیہوں کو ممنوع قرار دیا جائے۔ تو
یہ صحیح ہوسکتا ہے۔ کیونکہ عارضی طور پر تو جنگ بھی گوارا کرنا پڑتی ہے۔ لیکن اگر قیمتیں کم کرنیکی
غرض سے اِسے مستقل حکمتِ عملی بنایا جائے۔ تو اس سے سراسر نقصان ہے۔ اگر ہندوستان سے
غلّہ کی برآمد ممنوع قرار دی جاتے۔ تو پنجاب کے لوگ پھر بھی قیمتوں کی گرانی سے نجات حاصل
نہیں کرسکیں گے۔ بلکہ غلّہ کمیاب ہو جائیگا۔ کیونکہ دوسرے صوبوں میں مانگ بڑھ جائیگی۔ اسی
طرح ایسی صورت میں جبکہ پنجاب میں ہمسایہ صوبوں سے غلّہ آرہا ہو۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کہ
صرف پنجاب سے غلّہ کی برآمد ممنوع قرار دی جائے۔ جو لوگ تجارت میں مداخلت کا مشورہ دیتے
رہتے ہیں۔ وہ ایک اور بات بھی بھول جاتے ہیں۔ کہ اگر مصنوعی طریقوں سے قیمتوں کو کم کرنیکی
کوشش کی جائے۔ تو غلّہ کا صرف بڑھ جائیگا۔ اور چونکہ اس اضافہ کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا
اسلیئے اِس امتناعی حکم کے اثرات کا بھی ٹھیک اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اِس صوبہ اور دوسری
ممالک کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسان ایسی صورت میں کسی اور جنس کی کاشت کی جانب
توجہ کریگا۔ جسمیں لوگوں کے غل شور مچانے پر حکومت وقت کی مداخلت کا امکان کم ہو۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جب ایک موسم کی پیداوار مقامی ضروریات پُورا کرنے کیلئے کافی نہ
ہو۔ تو قیمتیں بڑھتے بڑھتے اس حد تک جا پہنچیں گی۔ کہ تجارت میں کوئی فائدہ نہیں رہیگا جب
برآمد اِس طرح بند ہوگئی۔ تو آئندہ قیمتوں میں جو کمی بیشی ہوتی رہے گی۔ اُس کے اسباب مقامی
ہونگے۔ امسال اگست سے بہت پہلے گیہوں کا نرخ اسقدر گراں ہوگیا۔ کہ تجارت برآمد بالکل
غیر منفعت بخش رہ گئی۔ اِس لئے اگست اور ستمبر میں نرخوں میں جو اضافہ ہوا۔ اُس کی وجہ
تجارت برآمد یا دنیا کی منڈیوں کا نرخ نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اگر فصل ربیع اچھی ہوجائے
تو قیمتیں کم ہوتی ہوئی اس حد تک پہنچ جائینگی۔ کہ برآمد میں نفع ہوگا۔ بحالت موجودہ تو یہی
قرینِ قیاس ہے۔ کہ مقامی نرخ دنیا کی منڈیوں کے نرخ کے اثرات سے آزاد ہے۔

۱؎ گریگوری کنگ کا قانون

ایک اور قابل ذکر نکتہ یہ ہے۔ کہ کبھی غلّہ میں معمولی سی بھی قلت ہو جائے۔ تو نرخوں میں اسقدر اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو اس قلت سے نسبت نہیں رکھتا۔ اسی طرح غلہ کی طلب سے اگر اسکی رسد تھوڑی بھی زیادہ ہو۔ تو قیمتیں اسقدر کم ہو جاتی ہیں۔ کہ زائد از ضرورت غلہ سے اُن کا کوئی تناسب نہیں ہوتا۔ جب تجارت برآمد پر محصول لگانیکی تجویز پیش کی جائے۔ تو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ پنجاب کے مصائب کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ زائد از ضرورت پیداوار مقامی مانگ سے کسیقدر ہی زیادہ ہے۔ اور اسکا صحیح علاج یہ ہے۔ کہ پیداوار کو اسقدر ترقی دی جائے کہ قلت غلہ کے زمانہ میں کافی غلّہ موجود ہے۔ چونکہ ہر معمولی سال میں مقامی مانگ پوری ہو جاتی ہے۔ اسلیئے پیداوار میں جس قدر اضافہ ہوگا۔ وہ اُسی غلہ میں اضافہ کریگا۔ جو برآمد کیا جا سکتا ہے۔ اور جیسا ہم کہہ چکے ہیں۔ قحط کے زمانہ میں یہی غلّہ کام آسکتا ہے۔ پیداوار میں اضافہ کرنیکے بہترین وسائل یہ ہیں۔ کہ موجودہ رقبہ میں جو زراعت ہوتی ہے۔ اُسے ترقی دی جائے۔ مزید نہریں تعمیر کرکے رقبہ مزروعہ کو وسیع کیا جائے۔ پنجاب کے لوگ اگر اس بات پر زور دیں۔ کہ محکمہ زراعت کو ترقی دی جائے تو مزید نہروں کی تعمیر میں اُنکا حصہ بہت اہم ہوگا۔

باقی رہی یہ تجویز کہ جو گیہوں باہر بھیجا جاتا ہے۔ اس پر محصول برآمد لگایا جائے۔ تو یہ بات ظاہر نہیں۔ کہ آیا محصول لگانے چاہتے ہیں۔ جو اس مُلک سے برآمد کیا جاتا۔ یا محض اسی گیہوں پر محصول لگانا اُنکا مقصود ہے۔ جو اس صوبہ سے برآمد کیا جاتا ہے۔ اگر صرف اُسی گیہوں پر محصول لگایا جائے۔ جو اس صوبہ سے برآمد کیا جاتا ہے۔ تو جب کبھی ہندوستان کے کسی دوسرے حصہ میں اچھی فصل نہ ہوئی۔ پنجاب کے گیہوں کی مانگ بڑھ جاویگی۔ اور اس صوبہ میں بھی گیہوں کا نرخ گراں ہو جائیگا۔ جیسا کہ آج بھی صوبجات متحدہ میں یہ شکایت عام ہے۔ کہ پنجاب میں گیہوں کی مانگ بڑھ جانیکی وجہ سے وہاں بھی گیہوں کی قیمت بڑھ گئی۔ گویا اگر اس قسم کا محصول برآمد لگا دیا گیا۔ تو ہندوستان کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ کے مفاد کی خاطر قربانی کرنی پڑیگی۔ پھر یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ آیا لوگوں کی اچھی خاصی تعداد اس تجویز کی حمایت بھی کریگی۔ یا نہیں۔ جو گیہوں بیرونی ممالک میں بھیجا جاتا ہے۔ اس پر محصول برآمد لگانا اُن لوگوں کے نزدیک جو تجربہ کی روشنی میں اسکے اثرات

سلہ گریگوری کنگ کا قانون

و نتائج پر غور نہیں کرتے۔ نرخوں کی گرانی کا مناسب علاج ہوگا۔ لیکن ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ کہ ایام قدیم میں انگلستان نے بھی تجارت برآمد پر پابندیاں عائد کرنیکی کوشش کی تھی۔ ابتدا میں اسکا مقصد یہ تھا۔ کہ عوام کے فائدہ کی خاطر نرخ گھٹایا جائے۔ لیکن آخرکار اس طریقہ سے زراعت کو ترقی دینا۔ اور نرخوں کو اس حد تک بڑھانا مطمح نظر بنگیا۔ جس سے کسان کو فائدہ پہنچ سکے۔ ہم کسی دوسرے مقام پر بیان کر چکے ہیں۔ کہ حکومت کا مقصد زراعت کی حوصلہ افزائی کرنا اور اُسے ترقی دینا ہے۔ اُس کی کمی یا کسان کی دلشکنی کبھی اسکا مقصود خاطر نہیں ہو سکتا۔

اگر تجارت برآمد پر محصول لگایا گیا۔ تو اُسکا مقصد یہ ہوگا۔ کہ برآمد کو اس حد تک محدود کر دیا جائے کہ غلہ کی قیمتیں باشندگانِ شہر کی مرضی کے مطابق ہو جائیں۔ اگر یہ قیمتیں اسقدر کم ہوں۔ کہ باہر غلہ بھیجنے والوں کے منافع میں تخفیف کر کے باشندگانِ شہر کے منشاء کے مطابق ہو سکتی ہو۔ تو اس طرح حقیقی مقصد حل نہ ہوگا۔ قیمتیں اسقدر گراں ضرور ہو جائینگی۔ کہ برآمد پر تخفیف کی جائے۔ اس کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ گیہوں کی تجارت میں آزادی ہونی چاہیئے۔ گیہوں فروخت کیلئے ہے۔ اور ہر شخص اسے خرید سکتا ہے۔ فرض کیجیئے۔ کہ اگر قیمتیں کم کر دی جائیں۔ تو گیہوں کے صرف میں اضافہ ہو جائیگا۔ کیونکہ ایسے لوگ ہی اسے خریدیں گے۔ جو اب اسے خریدنے کی طاقت نہیں رکھتے لیکن یہ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ لوگ صوبہ سے باہر ہوں۔ اور اُن کیوجہ سے مانگ اسقدر بڑھ جائے۔ کہ پنجاب کے شہروں میں بسنے والے غریب لوگوں کیلئے خریدنا ویسا ہی مشکل ہو جائے۔ جیسا بحالت موجودہ ہے۔ یہی دلیل ہر ملک میں ہر جنس اور ہر کپڑے بلکہ تمدن جدید کی ہر چیز کے متعلق پیش کیجا سکتی ہے۔ کیونکہ گیہوں پر محصول برآمد لگانے کے متعلق جو دلائل دیئے جاتے ہیں۔ وہ تمام اشیائے خوردنی اور اکثر دوسری اشیاء پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ گیہوں اشیاء خورد و نوش میں اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ اس نوع کی ضروریات زندگی میں سے نہیں۔ کہ وہ اگر لوگوں کو نہ مل سکیں۔ تو اُنکی موت واقع ہو جائے۔ لاکھوں کروڑوں انسان گیہوں کے بجائے چاول کھاتے ہیں۔ مزید برآں اگرچہ یہ امر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کہ لوگ کافی مقدار میں گیہوں حاصل کر سکیں اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر گیہوں کا صرف بڑھ گیا۔ تو اس سے کوئی اقتصادی فائدہ حاصل ہو سکیگا۔ یورپ کے لوگوں کی خوراک ایکدوسرے سے مختلف ہے۔ اکثر لوگوں میں اتنی طاقت نہیں۔ کہ اچھا گیہوں کھا

سکیں۔ مثال کے طور پر اطالیہ کے لوگوں کو لیجئے۔ وہ اعلیٰ درجہ کا گیہوں جو میدہ کیلئے اچھا ہے۔ فروخت کر دیتے ہیں۔ اور اپنا گذارہ ادنیٰ درجہ کے گیہوں سے کرتے ہیں۔ فرانس اور جرمنی میں مفلس لوگوں میں اتنی طاقت نہیں۔ کہ بڑی مقدار میں گیہوں کھا سکیں۔ چنانچہ وہ آلو اور دیگر اشیاء خوردنی پر گذارہ کرتے ہیں۔ اس لئے یہ دلیل کہ حکومت کو اس معاملہ میں مداخلت کرنا چاہیئے۔ تاکہ لوگ زیادہ گیہوں کھا سکیں۔ بہت بودی ہے۔ دنیا کی منڈیوں میں گیہوں کی قیمت وقتاً فوقتاً کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے اگر گیہوں باہر بھیجا گیا۔ تو اس کا محصول بھی مختلف ہوگا۔ اور اگر برآمد کو کلیۃً روکنا مقصود ہوا۔ تو ضروری ہے۔ کہ محصول بہت زیادہ ہو۔ اگر مستقل طور پر برآمد ممنوع قرار دی جائے۔ تو جب اچھی فصل ہوگی قیمتیں گر جائیں گی۔ اور یقیناً مصارف پیداوار میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور یہ خطرہ یقین کی حد تک پہنچ جائیگا۔ کہ زراعت میں نفع نہیں رہیگا۔ جب زراعت میں نفع نہ ہو۔ تو کسان رقبہ زراعت میں تخفیف کر دینگے۔ اور جن چیزوں میں انہیں زیادہ نفع ہوگا۔ اس کی کاشت کرینگے۔ اس طرح پھر گیہوں کم ہو جائیگا۔ اور مفلس لوگ پھر گیہوں حاصل نہیں کر سکیں گے۔

یہ ہو سکتا ہے۔ کہ جو لوگ محصول برآمد کے اسقدر حامی ہیں۔ وہ اُس کا کوئی ایسا انتظام کریں۔ کہ کسی قدر برآمد بھی ہوتی رہے۔ اور قیمتیں بھی کم رہیں۔ اس راہ میں ایک بڑی دشواری محصول کی تعیین ہوگی۔ یا یہ کہ گیہوں کا کسقدر نرخ مقرر کیا جائے۔ جس سے وہ

لہ ملاحظہ ہو "سر جیمس ولسن" کا مقالہ "دنیا کا گیہوں" یہ واضح رہے۔ کہ اگرچہ گیہوں معتدل آب و ہوا کے علاقوں میں مقبول عام جنس خوردنی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن نوع انسان کی اکثریت دوسری اجناس مثلاً چاول۔ جئی۔ باجرا۔ وغیرہ استعمال کرتی ہے۔ ایسی میں بھی جب کہ وہ "گیہوں" خریدنے کے لئے کافی روپیہ رکھتے ہیں۔ وہ نہیں خریدتے۔ مزید برآں اکثر لوگ کھانیوالوں کی یہ حالت ہے۔ کہ جب گیہوں بہت زیادہ گراں ہوتا ہے۔ تو وہ اُس کے بجائے دوسری اجناس استعمال کرتے ہیں۔ جنگ کے تجربات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب کسانوں کو یہ یقین ہو جاتا ہے۔ کہ گیہوں کی کاشت منفعت بخش ہے۔ تو وہ نہایت سرعت سے گیہوں کا رقبہ بڑھا لیتے ہیں۔ اور وہ یقیناً ایسا کرینگے۔

بڑھنے نہ پائے۔ محصول اِس طرح مقرر کیا جائیگا۔ کہ وہ ہر ضلع بلکہ ضلع کے ہر سٹیشن کے لئے مناسب ہو۔ بہرحال اصل مقصد یہ ہوگا۔ کہ تجارت برآمد میں تخفیف کردی جائے۔ اور قیمتیں کم رکھی جائیں۔

چونکہ تجارت درآمد تجارت برآمد کی بدولت قائم ہے۔ اِس لئے اگر گیہوں کی برآمد پر تخفیف کر دیگئی۔ تو اِس کا تو یہ نتیجہ ہوگا۔ نو کروڑ روپیہ میں سے جو اب تجارت برآمد کی بدولت اِس صوبہ میں آتا ہے۔ اچھے خاصے حصّہ کو نقصان ہو جائیگا۔ اور تجارت درآمد کو جبکی صورت میں ۹ کروڑ روپیہ پنجاب میں آیا ہے۔ نقصان پہنچے گا۔ اِس طرح نہ صرف کسانوں کی آمدنی کم ہو جائیگی۔ بلکہ تجارت پیشہ جماعتوں کو نقصان پہنچے گا۔ کسانوں کو جو قیمت ملتی ہے۔ اس میں کمی ہوئی۔ تو یوں سمجھیئے۔ کہ اُن کی آمدنی کم ہوگئی۔ اِس کا لازم نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اُنہیں مالگذاری ادا کرنے کے لئے زیادہ پیداوار فروخت کرنا پڑے گی۔

پُرانے زمانہ میں جب کہ مالگذاری تقریبًا ۱۴ ارفی ایکڑ ہوا کرتی ہے۔ یہ قسم ۲۶ سیر گیہوں کی قیمت تھی۔ اب مالگذاری تقریبًا ۲۵ ار آنے ہے۔ جو دس سیر کی قیمت ہے۔ کیونکہ آجکل گیہوں کا نرخ چھ روپیہ من ہے۔ اِس طرح تجارت برآمد پر محصول لگانیسے کسان کے لئے گویا مالگذاری بھی بڑھ گئی۔ اور اِس سے اُسے دُگنا نقصان ہوگا۔ ایک ایکڑ زمین میں دس من گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ اگر محصول کیوجہ سے گیہوں کا نرخ چھ روپے من کی بجائے چار روپے من ہو جاتا۔ تو اُسے بیس روپیہ کا نقصان ہوگا۔ داگر یہ فرض کیا جائے۔ کہ وہ اپنی پیداوار کا ½ حصّہ فروخت کرتا ہے۔ جب بھی چھ روپے فی ایکڑ نقصان ہے۔ چونکہ صُوبہ میں گیہوں کی پیداوار ۸ کروڑ من کے قریب ہے۔ اِس لئے کسان کو ہر سال کئی کروڑ روپے کا نقصان ہوگا۔ اِس تجویز کے یہ معنی ہیں۔ کہ ہم گاؤں کے رہنے والوں کو غیر موزوں طریقہ پر اِس لئے تھوڑی قیمت دے رہے ہیں۔ تاکہ شہر کے باشندے جن کی تعداد نسبتًا کم ہے۔ اور جو زیادہ روپیہ کمانے کی قابلیت پیدا کرنیکی کوشش نہیں کرتے۔ فائدہ حاصل کریں۔ اِس قسم کی حکمت عملی کا نتیجہ صوبہ کے

کے لئے تباہی خیز ثابت ہوگا۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے۔ کہ قوم کی آمدنی کیونکر بڑھائی جاوے۔ ہر شخص کی اعانت کے لئے ایسے کونسے طریقے اختیار کئے جائیں۔ تاکہ وہ اپنی آمدنی میں اضافہ کرسکے۔ تاکہ عام طور پر معیار زندگی بلند ہو جائے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں۔ کہ قوم کی آمدنی کیونکر کم کی جائے۔ لوگوں کو زیادہ روپیہ کمانے سے کیونکر روکا جائے اور افلاس میں اضافہ کس طرح کیا جائے۔ جنگ کے تجربہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب حکومت نے بعض خاص اجناس کی قیمتوں کو اپنے قابو اور اختیار میں رکھنا چاہا۔ تو اُسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ملک کی مجموعی آمدنی میں تخفیف ہوگئی پروفیسر هیگو اپنی کتاب اکنامکس آف ویلیفٹ کے باب ۹ پیرا ۷ میں کہتے ہیں۔

"یہ امر بدیہی ہے" کہ جب حکومت کی حکمت عملی یہ ہو جائے۔ کہ جب کسی صنعت میں اشیاء کی رسد اور طلب کے حالات واسباب کی وجہ سے خاص نفع حاصل کرنے کا موقعہ ملے۔ تو قیمتیں کم کر دی جائیں۔ تو اس کا اثر یہ ہوگا۔ کہ وہ صنعت دوسری صنعتوں کے مقابلہ میں مقہور و مردود سمجھی جائیں گی۔ مثلاً اگر حکومت کسانوں کو ممانعت کر دے۔ کہ جب دنیا کے مختلف حصّوں میں اچھی فصل نہ ہونے کے باعث اُنہیں زیادہ قیمتیں لینے کا موقعہ ہاتھ آئے۔ تو وہ زیادہ قیمت نہ لیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ لوگ زراعت پر روپیہ لگانے سے رُک جائیں گے۔ کیونکہ اس امر کے منتظر رہتے ہیں۔ کہ کب خراب فصل ہونے کے باعث اِنہیں زیادہ قیمت حاصل کرنے کا موقعہ ہاتھ آتا ہے۔ وہ اس امر کا انتظار نہیں کرتے۔ کہ کب غلہ غلہ کی فراوانی ہوئی۔ اور ہمیں قیمت ملے۔

اس امر کے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔ کہ آبادی کی اکثریت کو محض اس لئے مبتلائے آفت کرنا کہ اکثریت کو فائدہ پونہچے۔ کسانوں کو ۱۶ کروڑ روپیہ سالانہ سے محروم کرنا ہے۔ تاکہ وہ لوگ جنہیں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا اور اپنے ذرائع آمدنی کے مطابق غذا کھانا نہیں آتا۔ جیسا کہ دوسرے ممالک میں انسان کرتے ہیں۔ سستا گیہوں ملے۔ کس قدر بددیانتی پر مبنی ہے۔ لیکن یہ بتادینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ دوسرے ملکوں کی حکمت عملی یہ ہے۔ کہ نرخ گراں رہیں۔ تاکہ لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ اور وہ گیہوں کی کاشت کرتے رہیں۔ ایسے صوبہ میں جس کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبروں کی اکثریت زمینداروں پر مشتمل ہے۔ جو خود گیہوں پیدا کرتے ہیں۔ یہ امر بہت قرین قیاس ہے۔ کہ جب ان لوگوں کو تجربہ ہو جائے گا۔ کہ ایسے معاملات میں حکومت کی مداخلت کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ تو یہ ممبر ایسی تدابیر اختیار کرنے پر زور دینگے۔ جن سے کسانوں کو فائدہ پہنچے۔ مثلاً یہ کوشش کریں گے۔ کہ جب گیہوں ارزاں ہو۔ تو تجارت برآمد کو بڑھایا جاسکے۔

ایک اور علاج یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ سٹا یا قمار بازی کو روک دیا جائے۔ کیونکہ کسی حد تک سٹا کی وجہ سے ہی جولائی ستمبر ۱۹۲۱ء میں گیہوں کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ اس راہ میں بھی حسب سے بڑی دشواری ہے۔ کہ سٹا کو روکنے کے لئے کیا طریقہ تلاش کیا جائے۔ صوبہ میں دیسی ریاستوں کے علاقے بھی ہیں۔ اس لئے جو لوگ قانون سے بچنا چاہیں۔ تھوڑا سا سفر کر کے کسی ریاست میں جاکر سٹا کھیل سکتے ہیں۔ اور قانون سے بھی محفوظ رہ سکتے ہیں۔ بعض لوگوں میں یہ تجویز بھی قبول عام حاصل کر سکتی ہے۔ کہ بڑے بڑے تاجروں کے کاروبار میں دخل دیا جائے۔ لیکن اگر کوئی متبادل انتظام کئے بغیر ان لوگوں کو اپنے مفید کام سے روکا گیا۔ تو اس سے اہم نقصانات پہنچنا لازمی ہے۔ بہرحال کوئی نہ کوئی شخص ایسا بھی ہونا چاہیئے۔ جو گیہوں کا ذخیرہ رکھے۔ تاکہ نرخوں میں حد سے بڑھی ہوئی کمی بیشی نہ ہو۔ اور ساتھ ہی غلہ حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع سے بھی اس کے تعلقات ہوں۔ ان لوگوں کے خلاف جو جذبات پائے جاتے ہیں۔ اسی قسم کے جذبات نفرت انگلستان میں بھی اس طبقہ کے لوگوں کے خلاف پیدا ہو گئے تھے۔ ایک زمانہ میں گرانی کے زمانہ میں فروخت کرنے کیلئے غلہ

ذخیرہ رکھنا جرم قرار دیا گیا تھا۔ اور یہ حکم دیا گیا تھا۔ کہ ہر شخص کو مناسب نفع پر قناعت کرنا چاہئے جو شخص غلہ اس لئے خرید لیتا تھا۔ تاکہ جب غلہ گراں ہو۔ تو اُسے فروخت کرکے نفع اُٹھائے۔ اُسے مستوجب سزا سمجھا جاتا تھا۔ بڑے بڑے تاجروں کا کاروبار اور سٹا لازم و ملزوم چیزیں ہیں لیکن یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ آیا سٹے کو قانون کی مدد سے قطعی طور پر مٹا دیا جا سکتا ہے۔ یا نہیں۔

تمام مصائب کا حقیقی اور مستقل علاج یہی ہے۔ کہ زراعت اور دوسری صنعتوں پر زیادہ سرمایہ لگایا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے۔ کہ صوبہ میں جس قدر سرمایہ ہے۔ سب متواتر و مسلسل منفعت بخش کاروبار پر لگایا جاتا ہے۔ تو سب کے روزگار کا سامان ہو سکتا ہے۔ اس طرح صوبہ کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ اور بیش از بیش لوگ معقول سامان معاش مہیا کرسکیں گے۔ اور زیادہ روپیہ کما کر نرخ کی گرانی سے عہدہ برا ہوسکیں گے۔ گیہوں کے نرخ کی گرانی سے جو تکالیف پیش آرہی ہیں۔ ان کا بہترین علاج یہ ہے۔ کہ سرمایہ کی بڑی بڑی رقوم منفعت بخش کاروبار پر لگائی جائیں۔

ضمیمہ

ذیل میں گیہوں کی مجموعی پیداوار اور تجارت برآمد کا نقشہ دیا گیا ہے۔ جو ریلوے اور جہازوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ (اس میں گیہوں کا آٹا بھی شامل ہے جسے گیہوں کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے) یہ نقشہ پنجاب کے متعلق ہے۔ لیکن اسمیں دیسی ریاستیں بھی شامل ہیں۔ مقدار کا حساب ٹن سے کیا گیا ہے

سنہ	مجموعی پیداوار	مجموعی خالص برآمد او بعد کے سالونکی برآمد	وہ گیہوں جو کراچی جاتا ہے۔ جو سب کا سب ممالک ماورائے بحر میں بھیجا جاتا ہے	صوبہ سے کراچی کے سوائے باقی دوسرے حصوں میں کسقدر گیہوں بھیجا جاتا ہے
سنہ ۱۹۰۰ء	۲۶۲۳۰۹۴	۶۲۵۸۲۶ (۲۴)	۴۲۴۵۸۷ (۱۶)	۲۰۱۰۳۹ (۶)
سنہ ۱۹۰۱-۲ء	۱۸۳۴۴۸۴	۵۲۵۸۹۴ (۲۹)	۴۲۴۴۷۳ (۳۳)	۱۰۱۵۲۱ (۶)
سنہ ۱۹۰۲-۳ء	۲۳۰۳۹۲۶	۸۰۱۱۹۴۲ (۸)	۸۰۴۷۷۰ (۳۵)	۱۷۲۷۷ (۳)

سنہ				
۱۹۰۳-۴ء	۳۰۶۳۰۳۰	(۳۹) ۱۰۱۹۳۳۰۰	(۳۷) ۱۱۳۶۴۴۷	(۲) ۵۶۹۴۱
۱۹۰۴-۵ء	۲۰۴۴۲۷۰	(۲۸) ۷۸۳۲۷۷	(۲۲) ۶۱۱۴۹۳	(۶) ۱۷۱۷۸۴
۱۹۰۵-۶ء	۳۴۹۸۸۹۵	(۳۳) ۱۱۶۵۲۹۹	(۲۴) ۸۲۶۰۰۶	(۹) ۳۳۹۲۹۳
۱۹۰۶-۷ء	۲۶۴۱۲۰۵	(۴۴) ۱۱۶۴۹۳۳	(۳۱) ۸۲۶۱۰۱	(۱۵) ۳۳۸۸۲۲
۱۹۰۷-۸ء	۲۴۸۲۱۴۶	(۱۳) ۳۱۲۰۶۶	(۷) ۱۷۱۶۹۴	(۶) ۱۴۱۰۳۷
۱۹۰۸-۹ء	۳۳۵۰۸۸۷	(۲۶) ۸۰۴۵۱۴	(۲۴) ۸۰۱۴۴۴	(۲) ۸۳۰۷۰
۱۹۰۹-۱۰ء	۳۶۰۷۷۷۴	(۱۷) ۹۷۸۴۰۰	(۲۴) ۸۰۱۳۰۰	(۳) ۹۷۱۰۰
۱۹۱۰-۱۱ء	۳۷۰۹۴۸۱	(۲۵) ۹۳۲۳۹۳	(۲۳) ۸۴۵۰۸۵	(۲) ۸۷۳۰۸
۱۹۱۱-۱۲ء	۳۸۳۰۴۵۳	(۳۱) ۱۱۷۹۶۲۴	(۲۸) ۱۰۵۶۶۴۲	(۳) ۱۲۲۹۸۲
۱۹۱۲-۱۳ء	۳۲۴۲۳۷۵	(۲۹) ۹۴۵۸۲۹	(۲۳) ۷۵۶۲۷۳	(۶) ۱۹۲۲۵۶
۱۹۱۳-۱۴ء	۳۱۸۸۵۳۷	(۳۲) ۱۰۰۷۸۸۹	(۲۳) ۷۲۰۰۷۰	(۹) ۲۸۷۸۱۹
۱۹۱۴-۱۵ء	۳۷۲۵۰۰۰	(۱۹) ۷۰۱۰۹۵	(۱۳) ۴۷۷۲۰۸	(۶) ۲۲۳۸۸۷
۱۹۱۵-۱۶ء	۲۴۸۱۲۹۶	(۳۵) ۸۷۸۶۴۶	(۲۸) ۶۹۴۸۰۰	(۷) ۱۸۳۷۶۶
۱۹۱۶-۱۷ء	۲۹۳۷۲۱۲	(۳۴) ۹۹۶۶۶۰	(۲۹) ۸۶۰۱۱۹	(۵) ۱۳۶۴۵۱
۱۹۱۷-۱۸ء	۳۴۲۵۵۰۰	(۱۹) ۶۴۸۰۰۱	(۱۰) ۳۳۱۴۹۰	(۹) ۳۱۶۵۱۱
۱۹۱۸-۱۹ء	۲۸۹۳۳۶۸	(۱۵) ۴۳۴۴۷۴	(۳) ۸۴۱۱۳	(۱۲) ۳۵۰۳۴۱
۱۹۱۹-۲۰ء	۳۰۸۴۳۷۲	(۲۵) ۹۲۵۷۷۸	(۱۱) ۴۳[illegible]۰۷۵	(۱۴) ۵۲۶۷۰۰۰
۱۹۲۰-۲۱ء	۲۳۰۱۳۸۸	..	..	..
اوسط بیس سال	۳۰۷۸۳۲۰	(۲۸) ۸۶۰۵۴۷۰	(۲۱) ۶۵۸۶۲۴	(۷) ۲۰۱۸۰۶

له نوٹ:- جو اعداد خطوط وحدانی میں ہیں وہ دوسرے کالم کے تناسب فی صدی سے متعلق ہیں۔

مندرجہ بالا بیان مسٹر سی ایچ ٹونسنڈ آئی۔ سی۔ ایس۔ ڈائرکٹر زراعت پنجاب نے مرتب کیا۔ اور ان کی اجازت سے نقل کیا گیا ہے۔

بارھواں باب

صنعت و حرفت کی ترقی کا میدان

گذشتہ ابواب میں ہم بار بار دوسرے ممالک کے دیہاتی حالات کا ذکر کرتے رہے ہیں جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ ان سے ایسے قیمتی اور قابل قدر سبق سیکھیں جو مقامی مسائل پر بھی چسپاں ہو سکیں۔ اس سلسلہ میں بنیادی اصول یہ پیش کیا گیا ہے۔ کہ زراعت سب سے بڑی اور اہم صنعت اور لوگوں کی دولت اور سود و بہبود کا سب سے بڑا عنصر ہے۔ اور اسے ہمیشہ یہی حیثیت حاصل رہے گی۔ لیکن پنجاب کو صرف زراعت ہی وہ تمام فائدے پہنچانے کے لئے کافی نہیں جو اس کے قدرتی ذرائع کو ترقی دینے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ بتا چکے ہیں۔ کہ دوسرے ملکوں میں چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی دوسری معاون صنعتوں کی مدد کے محتاج ہیں۔ جن کی بدولت وہ معقول طریق پر اسباب معاش فراہم کر لیتے ہیں پنجاب کے دیہات میں جو صنعتیں موجود ہیں۔ انہیں مختلف قبائل یا ذاتوں کے لوگ کرتے ہیں۔ انہیں زراعت پیشہ لوگ اپنے اوقات فرصت میں انجام نہیں دیتے۔ بعض حلقوں میں یہ خواہش پائی جاتی ہے۔ کہ دیہات کی ان صنعتوں کو فروغ حاصل ہو اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا۔ کہ کسانوں کیلئے کام نکل آئے۔ بلکہ اس خواہش کا سرچشمہ محبت وطن کا جذبہ ہے۔ کیونکہ اس پیشوں کا از سر نو فروغ صوبہ کی عزت و وقار میں اضافہ کا باعث ہو گا۔ اس سلسلہ میں ماہرین اقتصادیات کا زاویہ نگاہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان قدیم صنعتوں کی حوصلہ افزائی صرف اس حد تک کی جائے۔ کہ دیہاتی کارکنوں کو اس قدر آمدنی ہو جائے۔ جو دوسرے ذرائع سے نہ ہو سکتی ہو۔ یا جب تک زیادہ آمدنی حاصل کرنے کا کوئی طریقہ معلوم کیا جائے۔ وہ ان صنعتوں سے متمتع حاصل کرتے رہیں۔ ان صنعتوں میں سب سے بڑا نقص ہے۔ کہ ان میں سرمایہ لگانے کا موقع

بہت کم ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگا کر ہی دولت حاصل کر سکتے اور اپنی آمدنی بڑھا سکتے ہیں۔ مزید براں جو اشخاص انفرادی طور پر آزادانہ محنت کرتے ہیں۔ انہیں وہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے۔ جو کسی فن میں مہارت خصوصی حاصل کرنے یا جماعت کی شیرازہ بندی کر کے مصروف کار ہونے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دیہات کے ارباب خوسمہ کو زیادہ کام کرنا پڑے گا۔ اور محنت کا معاوضہ کم ملے گا۔

جو لوگ آزادانہ انفرادی طور پر کام کرتے ہیں۔ وہ اُسی وقت تک اسباب معیشت فراہم کر سکتے ہیں۔ جب تک کارخانہ سے گاؤں تک کے مصارف حمل ونقل اور اخراجات تقسیم زیادہ ہیں۔ لیکن جب ان مصارف میں کمی واقع ہو گئی۔ تو انہیں اشیاء تیار کرنے کی بجائے محض اُن کی مرمت پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ لیکن اُن کی یہ حیثیت مستقل طور پر قایم رہے گی۔

بہر حال ایک قلیل التعداد گروہ کی رائے یہ ہے۔ کہ حصول دولت کے لئے عملی حیثیت سے زراعت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اور لوگ کارخانوں میں وسیع پیمانہ پر اشیاء تیار کرنیکی جانب توجہ کریں۔ تاکہ یہاں کی بنی ہوئی اشیاء کی تجارت برآمد کو وسعت دی جائے۔ لیکن اس مقصد تک پہنچنے کے ذرائع اسقدر اہم ہیں۔ کہ جو لوگ اس طریق کار کے اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ کہ وہ بھی بیرونی اعانت کے بغیر اس راہ میں روپیہ صرف کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ ایک بڑا گروہ جو نسبتاً زیادہ اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ محسوس کرتا ہے۔ کہ خام اجناس کا بیشتر حصہ زمین سے پیدا ہوتا ہے۔ اسلئے ضروری ہے۔ کہ خام اجناس کا معائنہ غور سے کیا جائے۔ اور اس قسم کے تجربات بھی کئے جائیں جن سے معلوم ہو سکے کہ ان میں کونسی جنس ایسی ہے۔ جس سے اس صوبہ میں فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن جب ان تجربات کے اخراجات کا سوال آتا ہے۔ تو پھر وہی تامل اور پس و پیش پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ کہ وہ صنعتی ترقی میں شریک ہو۔ بلکہ صنعتی ترقی کے لئے جو قدم اُٹھایا جائے۔ اُن سے اعانت بھی کرے۔ یہ مطالبہ درحقیقت نتیجہ ہے۔ اس عام خیال کا جو لوگوں کے ذہن میں جاپان کے حالات کے متعلق[1] موجود ہے۔ یہ یقین کیا جاتا ہے

[1] ملک کی صنعتوں اور ملک کے اندر آنے والی صنعتوں کی تقسیم کے بارہ میں یہ عقیدہ غلط بخش ہے۔ امریکہ ایک بہت بڑا صنعتی ملک ہے لیکن اسکی صنعتیں چند شہروں تک محدود ہیں مثلاً نیویارک کے شہر میں یا ریاست ہائے پنسلوینیا تمام ریاستوں سے زیادہ صنعتی سازوسامان موجود ہے۔ ملاحظہ ہو مارشل صفحہ ۱۵۱۔

کہ جاپان میں صنعت و حرفت کو بہت وسعت حاصل ہوئی ہے۔ اور وہ ان کی وجہ سے ایک متمول ملک بن رہا ہے۔ اور اب یہ حکومت پنجاب کا فرض ہے کہ جس طرح جاپان نے صنعت و حرفت کے لئے مالی امداد دی ہے۔ اسی طرح یہ بھی امداد دے۔ تاکہ اس سے وہی نتائج پیدا ہوں جن سے جاپان کے لوگ منفعت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ مسئلہ درحقیقت محتاج ہے۔ اس امر کا کہ اسکے تمام پہلوؤں پر غور کیا جائے۔

اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر صنعتی کمیشن کی رپورٹ پر غور وخوض کیا گیا ہے لیکن یہاں اس رپورٹ کے بیانات کا اعادہ کرنا غیر ضروری ہے۔ اس کتاب کا تعلق سب سے پہلے تو پنجاب سے ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو بیانات تمام ہندوستان کیلئے صحیح ہو سکتے ہیں۔ شاید وہ ایک صوبہ پر جس کا محل وقوع اسقدر عجیب ہو منطبق نہ ہو سکیں۔ اس صوبہ کی جغرافیائی حالت نے اسے جسقدر محدود کر دیا ہے۔ اس پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ انگلستان یا جاپان کو اپنی بناوٹ کی وجہ سے جو فوائد حاصل ہیں۔ یا وسائل رسل ورسائل ہیں جو آسانیاں میسر ہیں۔ اور یا بلجیم اور ہالینڈ کو دریاؤں یا نہروں کی وجہ سے جو سہولتیں فراہم ہیں۔ انہیں اس ملک کے لیڈروں نے نہیں سمجھا۔ لوگ طفلانہ طریق پر اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔ کہ حکومت صنعتوں کو مالی امداد دے سکتی ہے۔ یا کسی دوسرے طریقے سے انکی اعانت کر سکتی ہے۔ حالانکہ دوسرے ملکوں کے تجربوں اور مثالوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہی صنعتیں زندہ رہتی ہیں۔ جو کسی مقامی قدرتی خصوصیت سے فائدہ اٹھا سکیں۔ دوسرے ملک اس نوع کے بڑے بڑے کاموں کا اقدام کرنے پر باشندگان ملک کو آمادہ کرتے رہے ہیں۔ اور اب بھی اسی کوشش میں مصروف ہیں۔ اور انہیں یقیناً اس راہ میں کسیقدر کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن کسی ملک میں ان کد و کاوش (جدوجہد) سے ایسے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ جو ان صنعتوں کا مقابلہ کر سکیں جو خود بخود بلا اعانت غیرے کسی قدرتی خصوصیت کی بنا پر معرض وجود میں آگئی ہیں۔ اس صوبہ میں یہ ضرورت کہ زراعت کے علاوہ لوگوں کے لئے کوئی دوسرا کام بھی ہونا چاہئے۔ اس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ کہ اس مقصد کے حصول کے لئے جسقدر ذرائع و اسباب سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ان پر غور کرنا اور انہیں استعمال میں لانا چاہیئے۔ اگر اس کوشش کا نتیجہ حوصلہ افزا ثابت نہ ہو تو یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ آغاز کار میں دشواری کا احساس عام طور پر کامیابی کے لئے مفید ہوتا ہے۔

اب حکومت کی اعانت کے سوال کو لیجئے۔ یورپ کے چھوٹے چھوٹے ممالک میں اسکے متعلق ایسی مثالیں ملتی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سردیہ میں حکومت ملک کی صنعتوں کو فروغ دینے کی

ہر ممکن کوشش کی۔ جن لوگوں نے صنعت و حرفت کی نئی شاخوں کی جانب توجہ کی۔ حکومت نے اُن سے نہایت فیاضانہ سلوک کیا۔ انہیں عمارتیں بنانے کے لئے زمینیں عطا کیں۔ انہیں محصول کے بغیر خام اجناس اور مشین منگوانے کی اجازت دی لیکن بایں ہمہ سرویہ کی صنعت و حرفت نے ابھی تک کوئی قابل قدر ترقی نہیں کی۔ سرکاری کاغذوں میں جن کارخانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن میں سے اکثر چھوٹے چھوٹے ورکشاپ ہیں۔ اور بہت کم ایسے ہیں جو سال بھر میں ہی پچاس ہزار پونڈ سے زیادہ مالیت کی اشیا تیار کرتے ہیں۔ ان کارخانوں میں جس قدر خام اجناس استعمال کی گئی ہیں۔ وہ بھی تقریباً سب کی سب سرویہ میں[1] ہی پیدا ہوئی ہیں۔

بلغاریہ میں ابھی تک صنعت و حرفت کے فرسودہ اور دقیانوسی طریقوں کا رواج ہے۔ خانگی دستکاری کی جگہ ابھی تک کارخانوں نے نہیں لی۔ حکومت کو یہ احساس ہمیشہ رہا ہے کہ صنعت و حرفت کے جدید طریقوں کو فروغ دینا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اُسے کئی خاص قوانین منظور کرکے صنعت و حرفت کا ذوق اور ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن پارچہ بافی کی صنعت کے سوا جو ملک کے اکثر حصوں میں خانگی دستکاری کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری صنعتوں کی رفتار ترقی بہت سست رہی ہے۔ ۱۹۰۹ء میں بلغاریہ کی حکومت نے ملکی صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ دینے کے لئے جو قانون منظور کیا تھا۔ اُس کی اہم ترین دفعات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک صنعتی کونسل کا قیام جس کا فرض یہ ہوگا کہ وزیر صنعت و تجارت کو مراعات کی منظوری کے متعلق مشورہ دے۔

(۲) ایسے کارخانوں کیلئے جو حسب ذیل امور کا خیال رکھتے ہیں۔ بعض مراعات کی منظوری:۔

(ا) جو مشینوں میں دس گھوڑوں کی طاقت سے کم طاقت استعمال نہیں کرتے:۔

(ب) جنہوں نے مشینوں پر ۲۰۰۰۰ لیوا (یا تقریباً ۸۰۰ پونڈ) سے کم صرف نہیں کیا۔

(ج) جن کے پاس گذشتہ چھ ماہ سے کم از کم دس کارکن کام کرتے ہیں۔

(۳) یہ مراعات حسب ذیل ہیں۔

---

[1] الیف۔ او۔ جیننگ۔

(ا) پانی کی طاقت مفت دی جائے۔

(ب) جو مشینیں اس ملک میں تیار نہیں ہوتیں۔ وہ باہر سے درآمد کی جائیں۔ تو اُن پر محصول نہ لیا جائے۔

(ج) خاص اجناس کی درآمد پر محصول نہ لیا جائے۔

(د) کارخانوں کی عمارتوں کیلئے زمینیں مفت۔ دی جائیں۔

(۱) ریلوے کے کرایہ میں ۳۵ فیصدی کی تخفیف۔ کر دی جائے۔

(۳) سرکاری فائز۔ اور بلدیہ و اضلاع کے حکام کی ضروریات میں دیسی اشیاء کو بدیشی اشیاء پر ترجیح دی جائیگی۔

(۴) بعض علاقوں میں بعض صنعتوں کو ایک خاص مدت کیلئے جاری رکھنے کا خاص حق نیشنل اسمبلی نے عطا کیا ہے۔

ان کارروائیوں سے صنعتی کاموں کا ولولہ بہت بڑھا دیا ہے لیکن جو ادارے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اُن کی تعداد سنہ ۱۹۱۲ء میں ۵۹ ۳ تھی جنمیں سے ۱۵۰ اشیاء خوردونوش مثلاً بیر۔ الکحل وغیرہ مہیا کرتے تھے۔ اُن میں زیادہ تر آٹے کے کارخانے تھے۔ ان صنعتوں میں حصہ لینے والوں کی تعداد ۵۶۰۰ تھی۔ چونکہ اس عہد میں دستکاری کو زوال ہوا ہے اور انسان کی جگہ مشین نے لے لی ہے اسلئے اُن لوگوں کو دشواریاں پیش آ رہی ہیں جنکا گذارہ دستکاری پر تھا۔

یونان اور یورپین ترکی میں صنعت و حرفت کو چنداں ترقی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان ممالک میں کوئلہ کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت دشواری پیش آ رہی ہے۔ اطالیہ میں صنعت و حرفت نے ترقی تو کی لیکن اس پر جرمنی نے بھی سرمایہ لگایا۔ اور اُسی کی نگرانی میں صنعت و حرفت کو ترقی ہوئی۔ اس صوبہ میں جاپان کی مثال کو قابل تقلید سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ جاپان کے اقتصادی حالات کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اسلئے جاپان کے حالات ہم کسی قدر تفاصیل بیان کر دینا چاہتے ہیں۔

جاپان میں ڈیڑھ کروڑ ایکڑ کا رقبہ مزروعہ ہے جسپر ساڑھے پانچ کروڑ انسان بسر اوقات کرتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ ایک کروڑ مزروعہ زمین سے چار آدمیوں کی خوراک مہیا ہوتی ہے۔ پنجاب میں تین کروڑ ایکڑ رقبہ مزروعہ ہے جسپر دو کروڑ انسانوں کی بسر اوقات ہوتی ہے۔ یعنی چار آدمی ایک ایکڑ کی بجائے چھ ایکڑ زمین سے خوراک حاصل کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس صوبہ کے لوگوں کی ضروریات اور تجارت برآمد کے لئے کافی غلہ موجود ہے۔ یہاں کے لوگ اشیائے خوردنی پیدا کر کے اور انہیں دوسرے ملکوں کو بھیج کر سامان معیشت فراہم کر سکتے ہیں لیکن جاپان میں یہ ممکن نہیں۔

---

۵ ایف۔ او ہینڈ ٹیک۔

دوسری بات یہ ہے۔ کہ جاپان میں محاصل بہت زیادہ ہیں۔ جو حیثیت مجموعی تقریباً ۱۵ روپیہ فی کس پاتے ہیں۔ اور قومی قرضہ تقریباً پچاس یا ساٹھ روپیہ فی کس ہے۔ اس لئے لوگوں کے لئے یہ ضروری ٹھہرا کہ نہایت محنت سے کام کریں۔

تیسرا یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ جو لوگ اس صوبہ کو بھی جاپان کی طرح کامیاب ہو یکھنا چاہتے ہیں۔ آیا یہ منظور کریں گے کہ حکومت جاپان نے لوگوں پر جسقدر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ اور جس طرح ہر بات میں دخل دیتی ہے۔ یہاں بھی حکومت اس کی پیروی کرے۔ یہ امر یقینی ہے۔ کہ حکومت برطانیہ کبھی اُن ناجائز ذرائع کے استعمال پر آمادہ نہ ہوگی جو جاپان میں استعمال کئے گئے ہیں۔ وہاں کے اسباب وحالات بہت خراب تھے۔ لوگ افلاس کی مصیبت میں گرفتار تھے۔ مُلک کی آبادی بہت گنجان تھی۔ مزارعہ رقبہ بمشکل اتنا تھا۔ کہ لوگ اس سے پیٹ پال سکیں اور سب سے زیادہ اہم امر تو یہ تھا۔ کہ ہاتھ سے جو مصنوعات تیار کی جاتی تھیں۔ وہ ایسی تھیں جنہیں بآسانی مشینوں کی مدد سے تیار کیا جاسکتا تھا۔ پھر یہ مصنوعات اس قابل نہ تھیں۔ کہ انہیں دوسرے ملکوں میں بھیجا جائے جب ایک مرتبہ بیرونی تجارت کے دروازے مُلک پر کھل گئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تو اہل جاپان صنعت وحرفت کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مُلک میں مغربی مشینوں کی درآمد ہونے لگی۔ اور انہوں نے مغربی طریقوں کی نقل کرنا شروع کر دیا۔ جاپان کے متعلق یہ امر باعث تعجب نہیں۔ کہ یہ ایک صنعتی مُلک ہے۔ بلکہ حیرت انگیز تو یہ بات ہے۔ کہ اُس نے اس قدر قلیل عرصہ میں موجودہ حیثیت حاصل کر لی ہے جاپانی سفیر متعینہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے باشندگان امریکہ کے ایک مجمع میں کہا تھا کہ ۱۹۱۳ء میں فلڈ[illegible] میں پورے جاپان سے دُگنا صنعت وحرفت کا سامان موجود تھا۔ جاپان کی بیرونی تجارت کے اسباب دو ہیں۔ مُلک بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے۔ جو ایک بحر اعظم کے بالمقابل واقع ہیں۔ ان میں ساٹھ بندرگاہیں ہیں۔ جہاں غیر مُلکی جہاز آکر ٹھہر سکتے ہیں۔ جب بحری رسل ورسائل کے ذرائع اس قدر وسیع ہوں تو غیر ملکی تجارت ضرور ترقی کرے گی۔ دوسرے جاپان کی جدید مصنوعات

سلہ جو لوگ کارخانوں میں کام کرتے ہیں ان کی تعداد ۱۹۱۱ء میں ۸۱۲۰۰۰ تھی جن میں ۵۸ سے ۶۰ فیصدی تک تو عورتیں تھیں ۱۰ فیصدی بچے تھے جنکی عمر ۱۴ سال سے کم تھی۔ ہندوستان میں کارخانوں کے اندر کام کرنیوالوں کی مجموعی تعداد تعداد ۱۹۱۷ء میں تقریباً ۱۱ لاکھ ۲۰ ہزار تھی اور پنجاب میں ۱۶ ہزار۔

مُلک کے اندر صرف نہیں ہوتیں۔ بلکہ سمندر پار کی منڈیوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ اس طرح مصنوعات کا بہت بڑا حصہ باہر بھیجدیا جاتا ہے ۱۹۱۷ء میں تجارت برآمد و تجارت درآمد کی مجموعی مالیت ۲ ارب ۴۲ کروڑ ۸۰ لاکھ تھی۔ یا باعتبار آبادی ۸۴ ین فی کس۔ پنجاب میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء تک تین سال کی تجارت درآمد برآمد کا اوسط ۲۰ کروڑ ۲۷ لاکھ یا ۱۸[1] روپیہ فی کس تھا۔ چونکہ پنجاب خشکی سے گھرا ہوا ہے اور اپنا جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے بھی بعض فوائد حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لئے یہ اعداد و شمار قطعی طور پر یاس انگیز ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں جاپان کی بیرونی تجارت (درآمد و برآمد) کا اوسط فی کس ۳۲ روپیہ سے کم تھا۔ اور پنجاب کی تجارت کا اوسط ۵۲ روپیہ فی کس تھا چونکہ پنجاب خشکی سے گھرا ہوا ہے۔ اور اپنا جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے بھی بعض فوائد حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لئے یہ اعداد و شمار قطعی طور پر یاس انگیز ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں جاپان کی بیرونی تجارت (درآمد و برآمد) کا اوسط فی کس ۳۲ روپیہ سے کم تھا۔ اور پنجاب کی تجارت کا اوسط ۵۲ روپیہ فی کس تھا۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ کارخانوں کی مصنوعات کی وجہ سے بہت بڑی غیر مُلکی تجارت ہو سکے۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے۔ کہ صرف ڈنمارک کی زرعی پیداوار متذکرہ بالا اعداد و شمار سے زیادہ ہے ۱۹۱۷ء میں سارے جاپان کی برآمد کی باعتبار تناسب آبادی اتنی بھی نہیں تھی۔ جتنی ڈنمارک کی مکھن کی برآمد کی مالیت ہے۔ ہمیں جاپان کی حیرت انگیز ترقی کی تعریف و توصیف تو کرنا چاہئے۔ لیکن اس تناسب کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اور ساتھ ہی برٹش انڈیا کی ترقی کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔ جو جاپان کی ترقی سے کم حیرت انگیز نہیں ✦

ذیل کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ برٹش انڈیا کو جاپانی تجارت میں جو اہم حیثیت حاصل ہے۔ وہ جاپان کو برٹش انڈیا کی تجارت میں حاصل نہیں

---

[1] ین عام طور پر دو شلنگ کے برابر ہوتا ہے۔ گویا جنگ سے پہلے اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ تھی۔ نئی شرح مبادلہ کے حساب سے دو شلنگ ایک روپیہ کے برابر ہوتے ہیں۔ اس لئے اب ین ایک روپیہ کے برابر ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جاپان کے اعداد میں روئی کو دو مرتبہ محسوب کیا گیا ہے! ایک مرتبہ تو خام روئی کو برآمد میں محسوب کیا گیا ہے۔ اور پھر اس کو کپڑے کی صورت میں برآمد کے اندر محسوب کیا گیا ہے۔ اگر جاپان نے صرف یہی کیا ہے۔ کہ روئی کو کپڑے کی صورت میں تبدیل کرکے اس کی قیمت بڑھا دی ہے۔ تو اس کی غیر ملکی تجارت باعتبار فی کس پنجاب کی غیر ملکی تجارت سے کم ہے۔

اسباب تجارت کی مالیت[۱]

	جتنی مالیت کی چیزیں جاپان سے برٹش انڈیا میں آئی ہیں ۔	جتنی مالیت کی چیزیں برٹش انڈیا سے جاپان میں گئی ہیں
سنہ ۱۸۷۵ء و سنہ ۱۸۷۶ء ایک سال میں	۵۲۰۰۰	۶۱۰۰۰
سنہ ۱۸۷۵-۷۶ء سے سنہ ۱۸۸۴-۸۵ء تک دس سال کے عرصہ کا اوسط	۱۰۶۰۰۰	۱۲۰۰۰۰۰
سنہ ۱۸۸۴-۸۵ء سے سنہ ۱۸۹۴-۹۵ء تک "	۸۸۰۰۰۰	۴۷۵۰۰۰۰
سنہ ۱۸۹۵-۹۶ء سے سنہ ۱۹۰۴-۰۵ء تک "	۷۳۷۶۰۰	۵۵۸۰۰۰۰۰
سنہ ۱۹۰۵-۰۶ء سے سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء تک	۲۹۸۰۰۰۰۰	۱۳۳۱۰۰۰۰۰
سنہ ۱۹۱۵ء و سنہ ۱۹۱۶ء صرف ایک سال میں	۷۵۶۰۰۰۰۰	۱۸۴۵۰۰۰۰۰
سنہ ۱۹۱۶ء و سنہ ۱۹۱۷ء "	۱۳۲۴۰۰۰۰۰	۲۸۲۵۰۰۰۰۰
سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء "	۱۸۳۲۰۰۰۰۰	۳۴۱۶۰۰۰۰۰

ایسے اعداد و شمار پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ ہندوستان سے خام اجناس کی برآمد ہوتی اور جاپان سے مصنوعات باہر بھیجی جاتی ہیں لیکن اصل نکتہ یہ نہیں۔ کہ کسی قسم کی اشیاء کی درآمد یا برآمد ہوتی ہے بلکہ وہ فوائد جو اس نوع کے مبادلے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اصل چیز ہیں۔ ایک خیال تو یہ ہے۔ کہ اگر ہندوستان میں ایسی چیزیں کی درآمد ہوتی ہے جنہیں فوراً استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کے عوض ایسی چیزیں باہر بھیجتا ہے۔ جنہیں قابل استعمال بنانے کے لئے اُن پر بہت محنت صرف کرنیکی ضرورت ہے۔ تو یقیناً ہندوستان فائدہ میں رہا۔ لیکن دوسری جانب اس امر پر زور دیا جاتا ہے۔ کہ اگر ہندوستان خام اجناس کے بجائے مصنوعات باہر بھیجے تو

---

[۱] ملاحظہ ہو برٹش انڈیا کے اعداد و شمار جلد اول میں سے تجارتی اعداد و شمار کا حصہ سنہ ۱۹۱۹ء میں چین امریکہ کے سوائے دوسرے تمام ملکوں سے جاپان کی تجارت برآمد زوال پذیر ہو گئی اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جاپان میں پوری طرح یہ احساس پیدا نہیں کیا۔ کہ وہ ان مواقع سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اور اُنسے اپنی حیثیت کو ان منڈیوں میں مستحکم کر سکتا ہے جن میں یورپ کی جنگ عظیم کے باعث اسے بار حاصل ہو گیا تھا۔ اُسے بس یہی دھن لگی تھی کہ فوراً زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرے اس لئے اُن سے اپنے معنی ساز وساماں کی جانب توجہ نہیں کی ملاحظہ ہو ملک معظم کے تجارتی سکرٹری کی رپورٹ جس کا اقتباس سوان بک جرنل بابت جون سنہ ۱۹۱۸ء میں دیا گیا ہے۔

اسے تمام نفع حاصل ہوگا جو سرمایہ محنت قابلیت اور تجارتی و کاروباری صرف کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس دلیل میں یہ فرض کر لیا گیا ہے۔ کہ اس ملک میں وہ چیزیں موجود ہیں۔ جو صنعتوں کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ اب بحالت موجودہ اُن سے وہ فائدہ حاصل نہیں کیا جاتا۔ جو ان حالت و اسباب میں[1] حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ان مفروضات پر مختصراً غور و خوض کرنے سے پیشتر یہ کہدینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ صنعت و حرفت کیلئے جو صدا بلند ہو رہی ہے۔ یہ اس گروہ نے بلند نہیں کی جو پشتہا پشت سے مختلف صنعتوں میں مصروف ہے۔ کیونکہ اس گروہ کو "کمین" سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ معاشرتی درجہ کے اعتبار سے بہت پست تصور کیا جاتا ہے۔ اس گروہ کو اپنے طریق صنعت کی اصلاح و ترقی کرنے اور اپنے سود و بہبود کی خاطر زیادہ صنعت کرنے کی کوئی خواہش نہیں۔ صوبہ میں کہیں بھی ان کاریگروں کی کوئی بڑی جماعت ایسی موجود نہیں۔ جو بے روزگار ہو۔ اور جو کسی نئی صنعت کو ذریعہ معاش بنانا چاہتے ہوں۔ صنعت و حرفت کی یہ آواز اس لئے بلند نہیں کی جا رہی۔ کہ ہمیں نئے نئے خیالات سے فائدہ اٹھانے یا نئی ایجادات کے بروئے کار لانے کا موقع میسر نہیں۔ اور نہ اس کا باعث یہ ہے۔ کہ اہل ملک میں صنعتی قابلیت حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس کی ابتدا زمانہ جدید کے نقاد اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں، حکومت کی اس خواہش سے ہوئی۔ کہ لوگ کلیۃً موسمی ہواؤں کے محتاج ہونیکی وجہ سے جن خطرات میں مبتلا ہیں۔ انہیں کم کرنا چاہئے موسمی ہواؤں کی کیفیت کبھی یکساں نہیں رہی ان میں ہمیشہ اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ اور ان میں کمی بیشی ہوتی رہیگی چنانچہ اس تغیر و اضطراب نے یہ واضح کر دیا ہے۔ کہ جبتک لوگوں کیلئے کوئی دوسرا مشغلہ تلاش نہ کیا جائیگا ۱۸۸۰ء میں ہی لکھا تھا۔ صوبہ کا شدید مصیبتوں سے بار بار دو چار ہونا ناگزیر ہے۔ اس سے یہ فائدہ مقصود تھا۔ کہ آبادی کا وہ حصہ جس کے لئے زراعت میں گنجائش نہیں کھیتی باڑی کی بجائے صنعت و حرفت یا اس قسم کے کسی دوسرے کام میں مصروف ہو کر اپنے گذارے کا سامان مہیا کر لے گا۔ کمیشن مذکور کی رائے یہ نتائج اسی وقت رونما ہو سکتے ہیں۔

---

[1] بعض لوگ جو کارخانوں کے قیام پر زور دیتے ہیں یہ بھول جایا کرتے ہیں۔ کہ خام اجناس بھی سرمایہ۔ محنت اور ہمت صرف کرنے سے حاصل ہوتی ہیں ہاں یہ صحیح ہے۔ کہ خام اجناس کو مختلف مرحلوں میں سے گذار کر مصنوعات کی قیمت دینے کے لئے زیادہ سرمایہ زیادہ قابلیت اور زیادہ ہمت کی ضرورت ہے۔

جب صنعتی کاموں میں سرمایہ لگانے کی بیش از بیش خواہش پیدا ہو جائے اور یہ خواہش اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب لوگوں کا اس امر کا یقین ہو جائے کہ صنعت و حرفت میں روپیہ لگانے سے معقول فائدہ حاصل ہوگا۔ کمیشن نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا۔ کہ اگر حکومت نے اس کی ذمہ داری لے لی یا براہ راست صنعتوں کے لئے مالی مدد دی تو اس راہ میں بہت سی دشواریاں پیش آئیں گی۔ لیکن ساتھ ہی اس امر پر زور دیا تھا۔ کہ حکومت کو جہاں تک ہو سکے صنعت و حرفت کی ترقی میں اعانت کرنا چاہیئے۔

۱۸۸۰ء سے حالات میں بہت نمایاں تبدیلی ظاہر ہوئی ہے۔ اس وقت محض افلاس کی بنا پر صنعت و حرفت کے قیام کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ اور حکومت نے محض اس خواہش کے ماتحت صنعت و حرفت سے دلچسپی ظاہر کی تھی۔ کہ لوگ اس حد تک زراعت کے محتاج نہ رہیں۔

اس وقت دولت نے نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے۔ نئی نہریں تعمیر کی گئی ہیں ریلوے کو وسعت دی گئی ہے تعلیم پھیل گئی ہے۔ اور اب جو صنعت و حرفت کی حمایت میں صدا بلند کی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ ہے۔ کہ کچھ تو لوگوں کے پاس خاصی تعداد میں روپیہ ہو گیا ہے جسے وہ کسی منفعت بخش کاروبار میں لگانا چاہتے ہیں۔ اور کچھ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد جس کا بیشتر حصہ زراعت پیشہ لوگوں کے فرزندوں پر مشتمل ہے منفعت بخش مشغلہ کی تلاش میں سرگرداں اب صنعت و حرفت کی حمایت کا باعث افلاس نہیں۔ بلکہ دولت کی فراوانی اور ایک ایسے گروہ کا وجود ہے۔ جو اپنی خاندانی روایات کے اعتبار سے ۔۔۔۔ صنعت و حرفت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ دولت بڑھانے کا قابل تعریف ولولہ لے کر صنعت و حرفت کے میدان میں بڑھنا چاہتے ہیں۔

یہ امر تو سب پر ظاہر ہے۔ کہ گذشتہ پچاس سال کے اندر پنجاب میں دولت بڑھ گئی ہے۔ بڑی بڑی نہروں کی وجہ سے مزروعہ رقبہ میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ اور پیداوار میں اس سے بھی کہیں اضافہ ہوا ہے۔ ۱۸۷۳ء میں صوبہ کو زائد از ضرورت غلہ کے عوض صرف ۴۳ لاکھ روپیہ ملے تھے۔ اور ۱۹۱۳ء میں اسے ۴ کروڑ ۸ لاکھ روپیہ ملے۔ اور ۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء میں ۴۲ کروڑ ۳۱ لاکھ روپے ہاتھ آئے۔ گویا تیس سال کے اندر تجارت برآمد سات گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ اور تجارت درآمد میں چار گنا

اضافہ ہوا ہے۔ انکم ٹیکس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تجارت پیشہ اور کاروباری اشخاص کی آمدنی میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ ساہوکاروں اور مہاجنوں کی تعداد ۱۸۸۱ء سے ۱۹۱۱ء تک چوگنی ہوگئی ہے۔ اور اُن کی آمدنی جس پر انکم ٹیکس لیا جاسکتا ہے۔ گذشتہ ۱۵ سال میں دوگنی ہوچکی ہے۔ جس قدر خزانہ (سونا اور چاندی) گذشتہ پچاس سال کے اندر ہندوستان میں لایا گیا۔ اس کی مجموعی تعداد سات ارب ستر کروڑ روپیہ ہے۔ بعد کے سالوں میں ۳۲ کروڑ سالانہ رہی ہے۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۱۷ء میں یہاں ۱۲ کروڑ روپے صرف ہوگئے ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء میں ۲۲ کروڑ روپے ٹکسال میں ڈھالے گئے۔ اگست ۱۹۱۴ء اور مارچ ۱۹۱۸ء کے درمیان تو یہ کیفیت رہی ہے۔ کہ دُنیا میں جتنی چاندی پیدا ہوئی ہے۔ اس میں چالیس فیصدی ہندوستان میں لائی گئی۔ یہ اعداد وشمار تمام ہندوستان کے متعلق ہیں۔ لیکن اس دعویٰ کی تائید میں کہ اس کثیر دولت میں پنجاب کو اچھا خاصہ حصہ ملتا رہا ہے۔ ہم ذیل کے اعداد وشمار پیش کرتے ہیں ٭

سہ سالہ مدت

کس قدر سونا چاندی پنجاب کے اندر تین سال میں صرف ہوا

۱۹۱۱ء و ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۲ء و ۱۹۱۳ء	ایک ارب
۱۹۱۳ء و ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۵ء	ایک ارب چھ کروڑ سترہ لاکھ روپیہ
۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء	۲ ارب ایک کروڑ ۶۹ لاکھ روپیہ

ان اعداد وشمار کے صحیح معنی سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ اعداد اس روپیہ کے متعلق ہیں۔ جو پنجاب کے اندر صرف ہوا۔ یعنی اس قدر کثیر رقوم یہاں جمع ہیں۔ ٭

۱۸۹۰ء تا ۱۸۹۶ء میں جب نہر لوئر چناب کا افتتاح ہوا تو پنجاب میں خوشحالی کا ایک مستقل دور شروع ہوگیا۔ منی آرڈروں کے متعلق حسب ذیل اعداد وشمار

پیش کئے جاتے ہیں جن سے اس امر کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

پنجاب میں جسقدر منی آرڈر تقسیم کئے گئے۔
جس قدر رقم منی آرڈر کی صورت میں پنجاب
سے باہر بھیجی گئی۔ وہ ان میں سے منہا کر دی
گئی ہے۔ اور یہ خالص آمدنی ہے۔

	اندرون ملک سے	بیرون ملک سے
۱۸۸۰ء و ۱۸۸۱ء	۲۱۳۸۰۰۰	۱۶۳۰۰۰
۱۸۸۵ء و ۱۸۸۶ء	۲۳۸۰۰۰	۱۵۷۰۰۰
۱۸۹۰ء و ۱۸۹۱ء	۲۳۵۷۰۰۰	۳۴۰۰۰
۱۸۹۵ء و ۱۸۹۶ء	۳۱۲۸۰۰۰	۳۲۰۰۰
۱۹۰۰ء و ۱۹۰۱ء	۵۶۵۶۰۰۰	۲۵۲۸۰۰۰
۱۹۰۵ء و ۱۹۰۶ء	۵۹۵۹۰۰۰	۱۴۹۳۰۰۰
۱۹۱۰ء و ۱۹۱۱ء	۹۲۰۵۰۰۰	۴۳۵۷۰۰۰
۱۹۱۵ء و ۱۹۱۶ء	۱۱۸۰۱۰۰۰	۳۳۱۴۰۰۰
۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء	۱۴۵۶۳۰۰۰	۴۵۳۷۰۰۰
۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء	۲۳۵۸۴۰۰۰	۵۸۶۹۰۰۰

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس صوبہ کو کس قدر خالص منافع ہوا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ پنجابیوں نے غیر ممالک میں روپیہ کما کر اپنے گھروں کو بھیجا۔ اس کے اثرات کیا ہیں۔ اس کے بعد اس دورسانہ کار۔ افسانہ کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ کہ پنجاب میں دولت نہیں رہی۔ گذشتہ دس سال کے عرصہ میں ماہانہ منی آرڈروں

سے جو خالص منافع ہوا ہے۔ وہ چھ کروڑ روپیہ سے زیادہ ہے۔
ڈاک خانوں کے سیونگ بنکوں میں جو روپیہ محفوظ ہے۔ اس میں بھی بہت اضافہ ہؤا ہے۔ اور یہ امر خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ پنجاب میں اوسطاً جس قدر روپیہ بعد امانت سیونگ بنک رکھوایا جاتا ہے۔ (۱۵۰ روپے) وہ تمام ہندوستان (سثنائے پنجاب) کے محفوظ روپیہ کے اوسط (۷۵ روپیہ) سے دُگنا ہے۔
رہن شدہ زمین پر اُس کے قرض دیا گیا ہے۔ اُس میں جس سرعت سے اضافہ ہوا ہے۔ اور اراضی کی قیمت جس قدر بڑھ گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ پنجاب میں دولت کی فراوانی ہے۔ جسے لوگ کسی کاروبار میں لگانا چاہتے ہیں۔ قانون انتقال اراضی کے خلاف بعض طبقوں نے جو غیظ و غضب ظاہر کیا ہے۔ اُس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کے پاس بہت سارو پیہ بیکار پڑا ہے۔ جسے کسی منفعت بخش کام میں لگانے کا قدرتی جذبہ اُن کے قلب میں موجزن ہے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے مُطالبہ کا دوسرا اہم سبب یہ ہے۔ کہ صوبہ میں متوسط درجہ کی ایک تعلیم یافتہ جماعت موجود ہے۔ جس میں حصول معاش کے لئے باہمی سابقت و مُقابلہ کا سلسلہ جاری ہے۔ زراعت کے علاوہ صوبہ میں صرف دو اہم ذرائع معاش ہیں۔ ایک تو ساہوکاری دوسرے قانون۔ انکم ٹیکس کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صوبہ میں ۱۵۰۳۵ ساہوکار ایسے ہیں۔ جن کی آمدنی ٹیکس لگانے کے قابل ہے۔ اور دوسرے تجارت پیشہ اشخاص جن کی آمدنی اتنی ہے ۱۳۰۳۹ ہیں۔ اور صرف ۱۵۷۵ اشخاص جو صنعت و حرفت میں معروف

ہیں۔ (اُن میں رجسٹرڈ کمپنیاں بھی شامل ہیں)، اتنی آمدنی رکھتے ہیں۔ کہ اس پر ٹیکس لگایا جائے۔ اب مختلف پیشوں کی جانب توجہ کیجئے۔ تو اُن میں صرف ۱۲۰۶۸ ایسے ہیں۔ جن کی آمدنی ٹیکس لگانے کے قابل ہے۔ اِن میں سے ۱۹۵۵ کے سوا سب کے سب بیرسٹر۔ اٹارنی۔ اور پلیڈر وغیرہ ہیں۔ اس طرح ساہوکاری اور قانون سب سے زیادہ منفعت بخش پیشے ہیں۔ اور چونکہ قانون پیشہ لوگوں کی آمدنی کا اوسط زیادہ ہے۔ اس لئے نوجوانوں میں یہی پیشہ اختیار کرنے کا عام رجحان پایا جاتا ہے۔ ۱۸۶۵ء میں صوبہ کے اندر (صوبہ کی موجودہ حدود کے اعتبار سے) چالیس پلیڈر۔ اور بیرسٹر وغیرہ تھے۔ جن میں سے ۲۵ لاہور میں تھے۔ ۱۸۹۲ء تک انکی تعداد ۲۸۰ تک جا پہنچی۔ اور اب ۱۲۰۰ سے متجاوز ہے۔ داگر انکم ٹیکس کے اعداد شمار کو صحیح تسلیم کرلیا جاوے۔ تو انکی خالص آمدنی کا اوسط ۲۲۰ روپیہ ماہانہ ہے) ایک درجہ یہ ہے۔ کہ شہروں میں ایک متوسط درجہ کی جماعت کی ایسی پیدا ہوگئی ہے۔ جس نے کالج کی تعلیم کا ذوق حاصل کرلیا ہے۔ اس جماعت نے اس سرعت سے ترقی کرلی ہے! در اس کے فرزندوں نے اسقدر جلد تعلیم حاصل کرلی ہے۔ کہ اب امیدواروارانِ ملازمت کیلئے حصولِ ملازمت کے مواقع کم رہ گئے ہیں۔ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کہ اچھی تنخواہ کی ملازمتوں کی مانگ انکی فراہمی سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ امر قابل ذکر ہے۔ کہ تقریباً ہر شعبہ میں تربیت یافتہ اور قابل اور مستعد لوگوں کا قحط ہے[۱] اس عجیب غریب حالت پر کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بحث کی ہے۔ اس کمیشن کو تحقیقات سے معلوم ہوا ہے۔ کہ بنگال کالج کے طلبہ کا تناسب مجموعی آبادی سے تقریباً برطانیہ عظمیٰ کے برابر ہے مجموعی تعلیم یافتہ آبادی سے انکی تعداد دس گنا زیادہ ہے۔ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ برطانیہ عظمیٰ سے دس گنا اشخاص بنگال کی یونیورسٹی

---

[۱] تعلیم کے مقابلہ کے متعلق بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ پروفیسر مارشل کا بیان ہے کہ امریکہ میں بھی جہاں تعلیم کو بہت اہمیت دیجاتی ہے کبھی یہ نہیں سمجھا گیا۔ کہ تعلیم لوگوں کو کاروبار میں مستعد اور قابل بنا دیتی ہے۔ تعلیم سے کبھی کسی شخص نے وہ ہمہ بلندی حاصل نہیں کی۔ جو فطری ذہانت کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی اس کی وجہ سے کوئی نیا کارنامہ انجام نہیں دیا گیا۔ اور نہ کوئی مفید مجلس بر سرِ کار نہیں آئی۔ جو اپنے مقاصد پورے کرسکے۔

کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ انکی اکثریت بھی آرٹس کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ ایسے طلباء کی تعداد بہت کم ہے۔ جو کوئی پیشہ سیکھتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ بہت بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ نوجوان ملازمتیں تلاش کرتے پھرتے ہیں لیکن اُنہیں کسی خاص پیشہ کی تعلیم حاصل نہیں ہوتی۔ اگرچہ سب لوگ اس کے بعض نتائج سے متفق نہیں ہوسکتے۔ لیکن کم ازکم تعلیم کی اس صورتِ حال سے سب کو ہمدردی ہے۔ انگلستان نے ایسے نوجوانوں کو اقتصادی جدوجہد میں شریک ہوکر اپنا راستہ آپ پیدا کرنے کیلئے چھوڑ دیا ہے۔ وہاں آرٹس کے نصاب کو عیش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ایک افلاس زدہ ملک میں عیش کی گنجائش نہیں ہوسکتی

اب ہم بعض ایسے اصول بیان کرنیکی کوشش کرینگے جنکی بناپر صنعت وحرفت کو ترقی دیجاسکتی ہے۔ اور نفع کی کافی امید ہوسکتی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ کسی ایسی چیز کا تیار کرنا مشکل نہیں۔ جو آجکل دوسرے ممالک سے لائی جاتی ہے۔ یہ تو جاپان نے بھی ثابت کردیا ہے۔ کہ نقل کرنا بہت آسان ہے۔ دشواری تو یہ ہے۔ کہ جو چیزیں تیار کی جائیں۔ وہ اپنی قیمت اور اوصاف کے اعتبار سے ایسی ہوں۔ کہ فوراً فروخت ہوجائیں۔ ہم نے ذیل میں جو تقسیم کی ہے اس کے مکمل ہونے کا ہمیں دعویٰ نہیں ہوسکتا۔ لیکن کم ازکم ان سے اتنا معلوم ہوجائیگا۔ کہ کن اصولوں پر ترقی کرنا ممکن ہے ؛

الف ۔ قدیم
(۱) موجودہ صنعتوں کی اصلاح و ترقی۔
(۲) زرعی صنعتوں کی ترقی۔

ب ۔ جدید
(۱) نئی صنعتیں جن کی بنیاد زراعت پر ہو۔
(۲) نئی صنعتیں جن کی بنیاد زراعت پر نہ ہو۔

ج۔ نامعلوم یعنی وہ صنعتیں جو کسی نئی ایجاد یا انکشاف کی وجہ معرضِ وجود میں آجائیں۔ اور جن سے صوبہ کے اندر فائدہ اٹھایا جائے ؛

۱۔ موجودہ صنعتوں کو ترقی دینے کا میدان بہت وسیع ہے۔ اور وہ سب سے پہلے توجہ کی مستحق

لہ انگلستان کی تاریخ صنعت سے اس قسم کے بہت سے فوائد دستیاب ہوسکتے ہیں۔ کہ صدیوں کی مصیبتوں نے لوگوں میں عزم راسخ۔ کفایت شعاری کے جذبات پیدا کردیئے۔ لوگوں میں ایک ایسا جذبہ خود بخود پیدا ہوا جس کی بدولت انہوں نے دشواریوں پر فتح حاصل کرلی۔ اور محنت سے کام کرنے لگے۔ تاکہ وہ پھر افلاس اور درد و مصیبت کی اس گہرائی میں نہ جاویں۔ جس سے وہ اپنی قوتِ بازو کے بل بوتے ہوتے تھے ؛

ہیں۔ ان میں بڑی بڑی صنعتیں۔ پارچہ جاتی۔ رنگ سازی و باغت۔ لوہے اور لکڑی کا کام شامل ہیں۔ انہیں حسب ذیل طریقوں سے بہت کچھ ترقی دی جاسکتی ہے ؂

(الف) کاریگروں کو اپنے اپنے فن کی تعلیم دیجائے۔ تاکہ وہ اپنی فنی استعداد بڑہائیں ؂

(ب) مزید سرمایہ صرف کیا جائے۔ جو جدید مشینوں آلات اور سامان اور مزید طاقت بہم پہنچانے میں لگایا جاوے ؂

(ج) دانشمندانہ اقدام وہمت کا عنصر بھی ضروری ہے۔ تاکہ کاریگر سرمایہ کے استعمال سے زیادہ نفع حاصل کرسکیں ؂

اگر ان صنعتوں کو دیہات میں فروغ دیا گیا۔ تو اغلب ہے۔ کہ موجودہ اہل حرفہ کے طبقہ سے کاریگر فراہم ہوجائینگے۔ اگر ان لوگوں کی اقتصادی حالت کی اصلاح مقصود ہے۔ تو یہ ضروری ہے۔ کہ وہ زیادہ دولت پیدا کریں۔ اور یہ مقصد اس صورت میں حاصل ہوسکتا ہے۔ کہ سرمایہ اور طاقت دونوں نہایت دانشمندانہ طریق پر حاصل کئے جائیں ؂

یہ امر قابل غور ہے۔ کہ ہندوستان جوں جوں صنعت و حرفت کی تنظیم میں ترقی کرتا جائے گا۔ پنجاب میں باہر سے آئے ہوئے لوہے سے جو چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ زوال پذیر ہوتی چلی جائیں گی۔ کیونکہ خام جنس کی بجائے بنی بنائی چیزوں کی درآمد زیادہ ارزاں ہوگی۔ "ناہن شوگر فیر" واقع ریاست ناہن کی مصنوعات کا مدار لوہے اور کوئلہ پر ہے۔ جو بنگال سے ریل گاڑی اونٹ پر لایا جاتا ہے۔ اور پھر صوبہ کے مختلف دیہات میں گاڑی اور اونٹ کے توسط سے تقسیم کردیا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ ایسی مصنوعات کو اس جگہ جو لوہے اور کوئلے کی کانوں کے قریب ہو۔ تیار کرنا زیادہ ارزاں ہے۔ اس کے بعد جہاں مصنوعات کی مانگ ہو۔ انہیں ریل گاڑی کے ذریعہ بھیجا جاسکتا ہے۔

۲۔ زراعتی صنعتوں کی ترقی۔

زراعتی صنعتوں کی مثال۔ تیل نکالنا۔ آٹا پیسنا۔ کپاس سے روئی اور دھان سے چاول نکالنا۔ گنے کا رس نکالنا۔ اونی کپڑے دھونے وغیرہ سے مل سکتی ہے۔ خام اجناس ان مراحل سے گذرنے کے بعد کہیں استعمال کے قابل ہوتی ہیں۔ ابھی تک عام طور پر ان صنعتوں میں ناقص طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ بہت حد تک یہ اغلب ہے۔ کہ ان صنعتوں کے لئے زراعت پیشہ طبقہ سے

کارکن بھی فراہم ہو جائینگے۔ جس طرح آجکل جو لوگ گنے کا رس نکالتے ہیں۔ وہ زراعت پیشہ طبقہ کے افراد پر ہی مشتمل ہوتے ہیں۔ ان صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بہترین طریق کار یہ ہے۔ کہ بہتر مشینوں کو رواج دیا جائے۔ بیکار اجزاء کو علیحدہ کر کے اجناس برآمد کو اس طرح پاک اور صاف کیا جاوے۔ کہ مقدار کے تناسب کے مقابلہ میں انکی قیمت بڑھ جائے ؂

۳۔ نئی صنعتیں جن کی بنیاد زراعت پر ہے۔

اس قسم کی صنعتوں سے نہایت اُمید افزا نتائج کی توقع ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے۔ کہ ان کی ترقی کے لئے اب بھی وسیع میدان موجود ہے۔ دوسرے یہ امکان تو ہمیشہ ہے۔ کہ صوبہ کی آب و ہوا اور زمین بھی، ایسی دوسری اجناس کی کاشت کے لئے موزوں ثابت ہو۔ جو صنعتی حیثیت سے بہت قیمتی ہوں۔ اور جن کی کاشت بحالت موجودہ نہیں کی جاتی۔ مثلاً گنے کے علاوہ کسی دوسری جنس کی کاشت کی جائے۔ جس سے شکر نکالی جا سکے۔

جو صنعتیں غور و خوض اور تحقیق کی محتاج ہیں۔ ان میں ایک ریشم کے کیڑے پالنے کا پیشہ بھی ہے یہ صنعت جاپان میں زراعت کے بعد سب سے بڑی صنعت ہے) گیہوں کے بھوسہ سے مختلف اشیاء بنائی جائیں۔ دھان کے پیال اور چھلکوں سے کاغذ تیار کیا جائے۔ آلوؤں سے الکحل حاصل کی جائے۔ جو طاقت کا سرچشمہ ہے۔ پھلوں کو محفوظ رکھا اور سوکھایا جائے۔ سبز لوبیا اور ترکاریوں کو سوکھایا جائے۔ شہد کی مکھیاں پالی جائیں۔ اور شہد فراہم کیا جائے۔ ارنڈ کا تیل بھی نکالا جائے۔ اور اس سے کھاد کا کام بھی لیا جائے۔ مرغی خانے قائم کئے جائیں۔ بلکہ مکھن کے لئے ڈاریاں بھی قائم ہوں ؂

یہ تمام صنعتیں ایسی ہیں۔ جنہیں زراعت پیشہ طبقہ کے لوگ اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کی رہنمائی دانشمندانہ طریق پر کی جائے ؂

۴۔ وہ نئی صنعتیں جن کی بنیاد زراعت پر نہیں۔

ان میں ایک صنعت تو ایسی ہے۔ جو اس قسم کی صنعتوں (غیر زرعی) اور زرعی صنعتوں کو آپس میں ملا دیتی ہے۔ اس صنعت میں جو خام جنس استعمال ہوتی ہے۔ وہ زراعت سے حاصل نہیں کی جاتی۔ لیکن اس کی اشیائے ساختہ زراعت میں استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ

صنعت جدید قسم کے آلات کشاورزی کی ساخت ہے ۔اس کے علاوہ اس قسم کی صنعتوں میں پٹرول اور اس سے بنائی ہوئی اشیاء ۔ سمینٹ بنانا ۔ شیشہ بنانا ۔ نمک کی کانیں کھودنا (نئی کانوں سے مراد نہیں) لوہا (کانگڑہ ۔ کوئلہ (میانوالی) ریت سے سونا نکالنا (سندھ) اور وہ صنعتیں شامل ہیں جن میں جنگلوں کی پیداوار استعمال کی جاتی ہے ۔ مثلاً تارپین نکالنا ۔ لکڑی کے گودے سے کاغذ بنانا ۔ مختلف جڑیاں بوٹیاں جن سے دوائیاں بن سکیں شامل ہیں ۔

غور کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا ۔ کہ اس قسم میں وہ صنعتیں شامل ہیں ۔ جن کے لئے بہت حد تک کاریگروں کو خاص تعلیم دینی پڑے گی ۔ وہ ذاتیں اور قبیلے جو آج کل صنعت و حرفت میں مصروف ہیں ۔ ان صنعتوں میں انکا عمل و دخل نہیں ہوگا ۔ اس کے لئے بہت کافی سرمایہ کی ضرورت پڑے گی اور یہ بھی ضروری ہوگا ۔ کہ منتظمین بہت قابل ہوں ۔

نامعلوم صنعتوں کی مثال اس قسم کی مصنوعی کھادیں ہیں ۔ جو نائٹروجن سے حاصل ہو سکتی ہیں ۔

صنعت و حرفت کی ترقی کے جس قدر ممکن اصول تھے ہم انہیں بیان کر چکے ہیں ۔ اب ان مقامی مواقع پر بحث کرنا باقی رہ گیا ہے ۔ جو صنعتوں کی ترقی کا دائرہ محدود کر دینگے ۔

ان مواقع میں سب سے پہلے تو صوبہ کا جغرافیائی محل وقوع ہے ۔ جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں ۔ صوبہ کے محل وقوع کا اثر یہ ہوگا ۔ کہ یہاں کی منڈیوں اور بیرونی منڈیوں کے درمیان مقابلہ نہیں ہو سکے گا مصنوعات کی برآمد نہیں کی جا سکے گی ۔ اور صوبہ میں صرف مرمت کا کام ہوا کرے گا ۔ صوبہ کی صنعتیں جس حد تک اثر پذیر ہو سکتی ہیں ۔ اس کا انحصار بہت حد تک صوبہ کے اندرونی ذرائع و رسائل اور حمل و نقل کی سہولتوں پر ہے ۔ بحالت موجودہ لنکاشائر سے مصنوعات کے امرتسر پہنچانے پر اس قدر مصارف نہیں آتے ۔ جس قدر روپیہ امرتسر سے مصنوعات کے دیہات میں پہنچانے پر صرف ہوتا ہے ۔ کسی تجارت برآمدہ کو فرض کر لیجئے ۔ کہ سوتی کپڑے کی تجارت برآمد میں ہی اگر رکاوٹیں پیش آئیں ۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا ۔ کہ پنجاب کے کاریگر اپنے کاروبار لنکاشائر کی طرح قانون تکثیر حاصل سے مطابق پورا پورا نفع حاصل کر سکیں ۔ پنجاب اپنے جغرافیائی محل وقوع

کے اعتبار سے الگ تھلگ ہے۔ اور تین طرف سیکڑوں میلوں تک ایسے اقطاع واقع ہیں۔ جن میں بہت کم آبادی ہے۔ مزید برآں سمندر سے بہت دور واقع ہوا ہے۔ بس یہ ناممکن نہیں۔ کہ پنجاب اس پیمانہ پر صنعتوں کو ترقی دے سکے۔ جس وسیع پیمانہ پر جاپان نے صنعتوں کو ترقی دی ہے[1]۔

صنعتی ترقی کی راہ میں دوسری رکاوٹ سرمایہ کی مقدار ہے۔ ہم یہ تو بیان کر چکے ہیں۔ کہ صوبہ میں بہت کافی دولت موجود ہے۔ جسے لوگ کسی کاروبار پر لگانا چاہتے ہیں۔ اور اگر رہن شدہ زمینیں اپنے قبضہ میں کر لی جائیں۔ اور غیر زراعت پیشہ لوگوں کے قبضہ میں جا بجا جو قطعات اراضی موجود ہیں۔ انہیں فروخت کر دیا جائے۔ اور جس قدر روپیہ ساہوکار لوگوں کو سود پر قرض دیتے ہیں۔ وہ امداد باہمی میں صرف کیا جائے۔ تو مزید دولت بھی مہیا ہو سکتی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ پر مبنی نہیں۔ کہ اگر امداد باہمی کی تحریک کو وسعت دی جائے۔ تو چالیس کروڑ روپیہ ایسا فراہم ہو سکتا ہے۔ جسے صنعت و حرفت پر صرف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگرچہ ابتدائی ضروریات کے لئے کافی سرمایہ موجود ہے۔ تاہم اس امر کا یقین نہیں۔ کہ لوگ اس سرمایہ کو صنعت و حرفت میں لگانے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ابھی تک محض غیر ملکی سرمایہ کے استعمال سے ملک نے ترقی کی ہے۔ تمام ہندوستان میں سرمایہ مشترکہ کے اصول پر جو کمپنیاں قائم ہیں۔ ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء میں ان کا ادا شدہ سرمایہ تقریباً ایک ارب روپیہ تھا۔ پچھلے دنوں دولت کی جو فراوانی ہوئی۔ اس سے پیشتر[2] چھ ارب روپیہ صرف

---

[1] یہ واقعہ پنجاب کے لئے بہت مضر ہوا ہے۔ کہ پنجاب اور کراچی کی بندرگاہ کے درمیان پانچسو میل لمبا علاقہ واقع ہے۔ جسکی آبادی گنجان نہیں۔ بندرگاہ اور ریلوے کے اخراجات کا بیشتر حصہ پنجاب کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر سندھ ایک آباد اور زرخیز صوبہ ہوتا۔ تو کراچی کا بندرگاہ پنجاب کے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ اور اسکے مصارف بھی کم ہو جاتے۔

[2] اس کی تقسیم حسب قرار ذیل ہے۔ بنکنگ وغیرہ میں ۱۱ کروڑ روپیہ۔ تجارت میں ۱۷ کروڑ۔ ریلوے میں ۱۳ کروڑ ملوں اور چھاپہ خانوں میں ۳۵ کروڑ۔ چائے اور دوسرے پودے لگانے میں ۷ کروڑ۔ کانکنی اور پہاڑوں سے پتھر نکالنے میں ۱½ کروڑ زمین اور عمارتوں میں ۲ کروڑ۔ شکر سازی میں ۱ کروڑ۔ پنجاب میں جو کمپنیاں صنعت و حرفت میں مصروف ہیں۔ ان کا مجموعی ادا شدہ سرمایہ ۱۹۲۰ء میں ۱۳ لاکھ سے کم تھا۔ جاپان میں ۷۷۰۰ صنعتی کمپنیوں کا ادا شدہ سرمایہ ۱۹۱۷ء میں ایک ارب ۷ کروڑ دس لاکھ ین ۔ ایک ارب سات کروڑ روپیہ۔ بقیہ صفحہ آئندہ پر

ریلوں اور نہروں پر لگایا گیا ہے۔ جس کا بیشتر حصہ بھی برطانیہ سے قرض لیا گیا تھا۔ بڑی بڑی صنعتوں میں جسقدر سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کے اعداد و شمار کو ہی لیجئے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ سوتی کپڑے کے کارخانوں میں جو روپیہ لگا ہوا ہے۔ اس کا اوسط ۶۱ روپے فی کس ہے۔ ادنی کارخانوں کا اوسط ۲۰۰ فی کس اور اعلے درجہ کے ادنی کارخانوں مثلاً دہاریوال وغیرہ کا اوسط ۱۲۵۲ فی کس اور ریلوے کا اوسط ۸۳۰۰ روپیہ فی کس۔

اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ہندوستان کے لوگ جنگ عظیم سے پہلے حکومت کو روپیہ دینے میں بہت جھجک محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ریلوے نہروں کی تعمیر پر جو چھ ارب روپیہ صرف ہوا۔ وہ تقریباً سب کا سب انگلستان سے آیا تھا۔ آئندہ یہ اغلب نہیں معلوم ہوتا۔ کہ ہندوستان برطانیہ سے پہلے کی طرح روپیہ قرض لے سکے گا۔ کیونکہ برطانیہ نے زمانۂ جنگ میں نو ارب ساٹھ کروڑ پونڈ صرف کیا۔ اور اس کا قرضہ عامہ اس کی مجموعی دولت میں سے ۴۴ فی صدی ہے۔ انگلستان کے قرب وجوار میں زائد از ضرورت سرمایہ کے استعمال کے لئے کافی میدان موجود ہے۔ یہ اغلب ہے۔ کہ نئے عہد حکومت کے اندر ہندوستان میں سرمایہ لگانا نسبتاً کم محفوظ خیال کیا جائے۔ اور دوسری جانب شرح مبادلہ کی گرانی کی وجہ سے حکومت کے لئے بھی غیر ممالک سے روپیہ قرض لینا کم منفعت بخش ہوگا۔ اس لئے یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ امور عامہ کے لئے جس قدر روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ وہ ہندوستان سے ہی فراہم کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے مستقبل قریب میں کافی روپیہ

بقیہ صفحہ پچھلا۔ بشرطیکہ روپیہ اور دونوں دو شلنگ کے برابر ہوں۔ (۲) اگر وقت سے کمپنیوں کی برباد ہوگئی۔ مسٹر اکنامک جرنل کا بیان ہے۔ کہ ۱۹۱۴ سے ۲۰۰۰۰ کمپنیاں بن گئی ہیں۔ جن کا مجموعی سرمایہ چار ارب بن د تقریباً چار ارب روپیہ) ہے۔ کمپنیاں قائم کرنے والوں نے جاہل لوگوں میں حصے فروخت کئے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جن کمپنیوں کی بنیاد غیر مستحکم تھی۔ وہ تباہ ہوگئیں۔

کی ضرورت پڑے گی۔ ریلوے کی توسیع کی شدید ضرورت ہے۔ اور کئی مقامات پر آب پاشی کے لئے نہروں کی تعمیر ضروری ہے۔ دوآبہ سندھ ساگر کی نہر بیس لاکھ ایکڑ زمین کو سیراب کرے گی۔ اس کے مصارف تعمیر کا اندازہ ۹ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ جب اس کی تعمیر مکمل ہو جائے گی۔ اس کی آمدنی مجموعہ مصارف کا دس فی صدی ہوگی۔ بھکر کے بند پر تقریباً ۱۴ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ یہ ۹۵ء۳ فٹ بلند ہوگا۔ اور ایک کھرب ۱۲ ارب مکعب فٹ پر مشتمل ہوگا۔ اسوان کا بند ۲۳ ارب مکعب فٹ پر مشتمل ہے۔ بھکر کے بند سے دس فی صدی نفع[1] ہوگا۔

اس طرح گویا صوبہ کی ترقی کا مدار اس امر پر ہے۔ کہ ہندوستان کے ارباب دولت آگے بڑھ کر روپیہ لگائیں۔ اپنا روپیہ امورِ عامہ کے لئے بطور قرض دیں۔ اور صنعتی امور پر بھی روپیہ لگائیں۔

صنعتی ترقی کی راہ میں ایک بہت رکاوٹ ہے۔ کہ ایسے تربیت یافتہ آدمیوں کی قلت ہے۔ جو نگرانی اور انتظام کے فرائض ادا کر سکیں۔ اور انہیں فرائض کو قابلیت سے انجام دینے پر صنعت و حرفت کی کامیابی کا انحصار ہے۔ ہنرمندی اور استعداد محض کسی عام کالج کا نصاب تعلیم پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ اگر کسی شخص میں یہ قوتیں موجود ہوں۔ تو کالج کا نصاب تعلیم انہیں بیدار کر سکتا ہے۔

---

[1] آنریبل مسٹر ڈونس نے پنجاب کونسل میں یہی کہا تھا۔ ملاحظہ ہو پنجاب گزٹ بابت ۲۶ مارچ ۱۹۲۲ء حصہ پنجم صفحات ۹۵-۹۶۔ وادی ستلج کی مجوزہ نہر سے جو رقبہ سیراب ہوگا۔ اس کا بیشتر حصہ برطانوی پنجاب کی حدود سے باہر ہوگا۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے۔ کہ محاصل تعیزات کی وجہ سے جن کے اثر کا دائرہ بہت وسیع ہے صنعتوں پر سرمایہ دل کھول کر صرف نہیں کیا جاتا۔

تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ کارخانہ کا منتظم اُسی کارخانہ کے اندر رہ کر بہترین طریق پر تربیت حاصل کرسکتا ہے اور یہ فن صنعت و حرفت کی فضا میں ہی حاصل کیا جاسکتا ہے اور اس بارہ میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ جب تک صنعتی ادارے قائم نہ ہو چکے ہوں۔ نوجوانوں کو اُن کے انتظام و اہتمام کی تربیت دینا تقریباً ناممکن ہے۔ جاپان نے اس دشواری سے عہدہ برآں ہونے کی کوشش اس طرح کی۔ کہ یورپ سے با استعداد اور قابل نیجر منگوائے۔ اور نوجوانوں کو یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کو بھیجا۔ یہاں بھی اسی قسم کی حکمت عملی کا اختیار کرنا ضروری معلوم ہوگا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ محض نقل کرنے سے صنعت و حرفت میں سربلندی حاصل نہیں ہوسکتی۔ ایسی چیزوں کو بنانے کا طریقہ سیکھنا چنداں مفید نہیں۔ جنہیں پرانے صنعتی ادارے بہت بڑی مقدار میں اور نہایت ارزاں قیمت پر تیار کرتی ہیں۔ یہاں تو طاقت عقل و دانش۔ سرمایہ اور ہمت کو انہیں چیزوں کی ساخت پر صرف کر دینا چاہیئے۔ جنہیں تیار کرنے کے لئے صوبہ قدرتی طور پر بہت موزوں و مناسب واقع ہوا ہے۔ جب ان مختلف عناصر کو متحد کرکے استعمال میں لانے کے متعلق پورا پورا تجربہ حاصل ہو جائے۔ تو اپنی سرگرمیوں کے لئے نیا میدان تلاش کر لینے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ جب تک انسانی جبلّت تربیت و تعلیم کے مرحلہ سے نہ گذر چکی ہو اور انسان کو تجربہ نہ ہوا ہو۔ اُس وقت تک حفاظت کے مصنوعی طریقے اختیار کرنے کے سوائے کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور صنعت و حرفت کی حفاظت کے لیئے اس قسم کے طریقے اختیار کرنا ہمت اور حوصلہ کو پست اور ولولوں کو افسردہ کر دیتا ہے۔ عہد جدید کی صنعت و حرفت کی تو یہ کیفیت ہے کہ بڑے بڑے صنعتی مرکزوں کی مخصوص فضا اور پرانی روایات ذہن کو ایک ایسے قالب میں ڈھال دیتی ہیں۔ جس کی بدولت حصول کامیابی کی صحیح راہ معلوم کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ مانچسٹر اور شیفلیڈ میں جو خصوصیات اور صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ پنجاب میں قطعاً ناپید ہیں۔ وہاں ایک حوصلہ مند نوجوان جب دشواریوں سے دوچار ہوتا ہے۔ تو اُس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے لیکن اگر پنجاب میں یہی دشواریاں پیش آئیں تو زیادہ ترین قیاس یہی ہے کہ ہمت پست ہو جائے۔ تکلیفوں اور دشواریوں کے متعلق دونو قوموں کا زاویہ نگاہ جداگانہ ہے۔ اکثر

انگریزوں کا عقیدہ ہے۔ کہ جب ہم ایسی مشکلوں سے آشنا ہوں جن میں بتدریجی طور پر ترقی ہوتی جائے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ تو ہماری طاقت و قوت اور ذہنی استعداد میں اضافہ ہو جائیگا۔ ہندوستان میں محنت و مشقت کی زندگی کی ناگزیر دشواریوں اور جسمانی تکلیف اذیت کے متعلق لوگوں کے خیالات نہایت مبالغہ آمیز ہیں، مجبوری کو بُرا سمجھا جاتا ہے۔[1] ضبط و نظم کی قدر کم کی جاتی ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جو لوگ کارزار حیات میں جد و جہد کرنے کی قابلیت کم رکھتے ہیں۔ وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تباہی کو تقریباً دہشت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن لوگ اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے کہ وہی لوگ زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں۔ وہی جو کشمکش حیات سے عہدہ برا ہوتے ہیں۔ بعض اشخاص کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ اکثر اشخاص ناکامیاب ہوں۔ لنکا شائر میں یہ جملہ زبان زد خاص و عام ہے۔ کہ صرف دو پشتیں آقا اور خادم کے درمیان حائل ہے۔ یعنی جو شخص آج آتا ہے غالباً کسی کارخانہ کی مزدوری کا پروردہ ہوتا ہے۔ اور اغلب ہے۔ کہ اس کا پوتا ناز و نعمت میں پرورش پانے کے باوجود پھر ایک مزدور کی حیثیت اختیار کرے۔ امریکہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ تقریباً ہر مشہور صنعتی ادارہ کی بنیاد کسی مستری۔ کلرک اور اسی طرح کے کسی ادنے مزدور نے ڈالی تھی۔ اس لئے یہ خیال کہ کسی خاص ذات کے لوگ صنعت و حرفت اختیار کریں۔ سرمایہ بہم پہنچائیں۔ دماغ صرف کریں۔ اور نیچ ذاتوں کے مزدوروں کے لئے کام فراہم کریں۔ عملی حیثیت اختیار کرنے کے قابل نہیں۔ پنجاب کی سب سے بڑی صنعت زراعت ہے۔ جب اس کی اصلاح اور اس کی امدادی صنعتوں کی ترقی پر سرمایہ عقل و دانش اور ہمت صرف کی جائے۔ تو یقیناً ذہنی تربیت کے لئے ایک اچھی نامی درسگاہ معرض وجود میں آجائیگی۔ جس میں طلبا کو بہت محنت کرنی اور بہت سختیاں اٹھانی پڑیں گی۔ اور جن لوگوں کو قدرت نے کاروباری جوہر استعداد عطا کر رکھی ہے۔ وہ یقیناً ترقی کر کے صنعتی رہنما کا مرتبہ حاصل کر لیں گے۔ ابتداء میں

[1] تمام مجالس اور اداروں کی بنیاد ضبط و نظم ہے۔ جب تک ضبط و نظم کی استعداد میں ترقی نہ ہو صنعتی اداروں کا قیام ناممکن ہے۔

ایسے لوگ چند ہی ہونگے۔[1] لیکن ضرورت بھی تو صرف چند اشخاص کی ہے۔ ہندوستان میں جو صنعتیں موجود ہیں۔ اُن میں ایسے رہنماؤں کی تعداد بہت کم ہے۔ جو کوئی نمایاں حیثیت رکھتے ہوں۔ بلکہ جو لوگ ان صنعتوں کے انتظام اور نگرانی میں مصروف ہیں۔ ان کی تعداد بھی چنداں زیادہ نہیں۔

ہندوستان کے تمام کارخانوں کے ملازمین ۳ فیصدی اشخاص نگرانی اور کلرکی پر مامور ہیں۔ ان میں یوروپین کا تناسب ۴ ہے۔ اور ہندوستانیوں کا ۲۹۶ باقی رہے ۹۷ اُن میں ۲۶ تربیت یافتہ کاریگر ہیں۔ اور باقی

روئی کی صنعت میں ملازمین کا تناسب یہ ہے۔ ۱۹ یوروپین۔ ۴ ہندوستانی (اعلے عہدوں پر) ۴۵ تربیت یافتہ کاریگر ۸ و ۱۴ غیر تربیت یافتہ۔

روئی کی صنعت میں ۴ یوروپین ہیں۔ ۱۰ ہندوستانی (ڈائرکٹر اور نگران) ۲ ہندوستانی (کلرک) اور ۵۷ تربیت یافتہ۔ ۲۹ غیر تربیت یافتہ کاریگر۔ اس فرق کے اسباب خاص ہیں۔ ان صنعت میں جو مشینیں کام کرتی ہیں۔ وہ زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ مزید براں اُن کو کپڑے کی صورت[2] میں تبدیل ہوتے تک کئی مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ صیح تناسب صنعت کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن تمام صنعتوں میں ایک بات دیکھی گئی ہے۔ کہ ان کے ڈائرکٹروں اور مہتمموں کی تعداد کم ہے۔

دوسری دشواری مزدوروں کی فراہمی ہے۔ صوبہ میں جس قدر تربیت یافتہ کارکن ہنروں اور ریلوں کی تعمیر کا کام کرتے ہیں۔ اُن کا بیشتر بیرونی لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ زائد

---

[1] آفیسر ایلیزڈ کی کتاب "انڈسٹری اینڈ ٹریڈ" سے اس امر کے متعلق بہت قیمتی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ کہ صنعتوں کو مختلف ممالک میں کسی حد تک ترقی ہوئی ہے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے۔ کہ ایک بھی مثال نہیں مل سکتی جس سے یہ ثابت ہو کہ حکومت کی اعانت اور صنعتوں کی حفاظت کی حکمت عملی سے کوئی مستقل کامیابی حاصل ہوئی ہو۔ یہ امر بات ہے کہ وقتی طور پر اُن کے اثرات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

[2] "ملز کمپنی دھاریوال" کے متعلق تفصیلات کی فراہمی کے لئے میں اس کارخانہ کے منیجر کا شرمندہ احسان ہوں۔ میں نے ان کارخانوں سے بھی تفصیل طلب کی جن کے منیجر ہندوستانی ہیں۔ لیکن انہوں نے بہم پہنچانے سے انکار کردیا

ازضرورت مزدور اول تو ہوتے ہی نہیں۔ اور اگر ہوتے بھی ہیں تو بہت کم۔ یہ امر بات ہے۔ کہ ایسے مزدور کتنی تعداد میں موجود ہیں۔ جنہیں پورے سال کے لئے مزدوری نہیں ملتی۔ اس سے بھی زیادہ قابل غور یہ امر ہے۔ کہ صنعتوں کو تربیت یافتہ مزدوروں کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور جیسا کہ مندرجہ بالا اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے۔ تربیت یافتہ مزدوروں کی تعداد کم ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے۔ کہ غیر تربیت یافتہ مزدوروں کی تربیت کی جائے لیکن یہ کام بہت دشوار ہے۔ اور اس پر بہت وقت صرف ہوگا یہی وہ حل طلب مسئلہ ہے جسے جاپان بھی حل نہیں کرسکا۔ جاپان کے پاس مزدوروں کی کثرت ہے۔ اور انہیں اُجرت بھی تھوڑی دینی پڑتی ہے۔ لیکن ان میں وہ اوصاف موجود نہیں۔ جس کا ہونا اعلےٰ درجہ کی مصنوعات تیار کرنے کے لئے ضروری ہے۔ چونکہ یہ خواہش عام تھی۔ کہ صنعت وحرفت میں سرعت سے ترقی کی جائے۔ اُسے جلد وسیع کیا جائے۔ اور کثیر تعداد میں اشیاء تیار کی جائیں۔ انہیں اس غرض کے لئے ایسے مزدوروں کو ملازم رکھنا پڑا۔ جو پوری طرح تربیت یافتہ نہیں تھے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جو چیزیں تیار کی گئیں۔ ادنےٰ درجہ کی تھیں۔ اس طرح جاپانی مصنوعات بہت بدنام ہوگئیں۔ جاپان کے کارخانوں کے مزدوروں میں سے عورتوں کی تعداد ۵۰ فیصدی سے[1] زیادہ ہے۔ لڑکوں کو جن کی عمر بارہ سال سے کم ہوتی ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے کی اجازت ہے۔ اور قانون کی رو سے کارخانہ والوں کو یہ بھی حق حاصل ہے۔ کہ وہ مزدوروں سے گیارہ بارہ گھنٹے روزانہ کام لیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ جاپانی مزدوروں پر ایک غفلت کی حالت طاری رہتی ہے۔ انہیں اپنے کام میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ یکسوئی سے کام نہیں کر سکتے۔ انہیں بار بار سستانے کے لئے ٹھہر جانا پڑتا ہے۔ ہمیشہ ان کی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ تاکہ وہ بدسلیقگی سے کام بگاڑ نہ دیں۔ لیکن جاپان کی صنعت وحرفت کو جس خصوصیت کے باعث حیرت انگیز ترقی ترقی ہوئی ہے۔ وہ جاپانیوں کی نقالی ہے۔ انہیں مغربی طریقوں کی پوری پوری نقل

---

[1] کوئلے کی کانوں میں عورتیں وہی کام کرتی ہیں۔ جو مرد کرتے ہیں۔ کوئلے کی کانوں میں عورتوں کی تناسب ۴۰ فیصدی ہے۔

کرنے میں بہت مہارت حاصل ہے۔ انگلیوں سے کام لینے کی مہارت اور چابکدستی جو بعض صنعتوں میں بہت قدر و اہمیت رکھتی ہے۔ ایسی صنعتوں میں چنداں قابل قدر نہیں۔ جن میں بیشتر کام مشینوں سے کیا جاتا ہو۔

جاپان میں صنعت و حرفت کو جس تیزی سے ترقی ہوئی ہے۔ اس میں ایک اور وجہ سے بہت آسانیاں مہیا ہوگئی ہیں۔ یعنی جاپان میں اجرت بہت کم دی جاتی ہے۔ زیادہ عرصہ تک کام کرایا جاتا ہے۔ بچوں سے بھی محنت لی جاتی ہے۔ مزدور رات کو بھی کام کرتے ہیں اور تو اور لڑکیاں بھی رات کو کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔ لیکن اب مزدوری پر جو بین الاقوامی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ جاپان پر اُن کا بہت اثر ہوگا۔ (یعنی جاپانی مصنوعات میں ⅓ کی کمی ہوجائیگی) یہ حقیقت بہت دلچسپ ہے کہ جاپانی صناعوں کی کامیابی کا انحصار دوسرے ملکوں کی صنعتی مشکلات (یعنی ہڑتالوں وغیرہ) پر ہے۔ کیونکہ اس طرح مقابلہ میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اور منڈیاں اُن کے قبضہ میں آجاتی ہیں۔ جاپان میں کوئی ٹریڈ یونین نہیں۔ جو لوگ مزدوروں کو ہڑتال کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اُنہیں[۱] چھ ماہ سزائے قید کا مستوجب سمجھا جاتا ہے[۲]

[۱] ملاحظہ ہو۔ ملک معظم کے نائب قونصل متعینہ جاپان کی وہ رپورٹ جو اس نے جاپانی مزدوروں کے متعلق سپرد قلم کی ہے (تجارتی رپورٹ کا نمبر ۱ بابت ۱۹۲۶ء) جاپان کی ییر بک بھی دیکھئے۔

[۲] حسب ذیل اقتباط جو حضور ملک معظم کے تجارتی سکرٹری متعینہ ٹوکیو کی رپورٹ سے ماخوذ تھا اور جسے میسور اکنامک جرنل بابت جون ۱۹۲۶ء نے نقل کیا تھا۔ اس سلسلہ میں دلچسپ ہوگا۔

جاپان کے اقتصادی حالات کو بہت سے خطرات سے مجبور ہیں۔ اس ملک کی غیر متوقع کامیابی کے متعلق بہت کہا اور لکھا جاچکا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا جاتا کہ یہ خوشحالی اُن غیر معمولی حالات کا نتیجہ ہے۔ جو زمانہ جنگ میں جاپان کو اپنی عجیب حیثیت کے باعث میسر تھے۔ جاپانی قوم کے خیلات و جذبات میں کوئی ایسی قطعی تبدیلی نہیں ہوئی۔ جسے حریف ملکوں میں خوف و خطر کی نظر سے دیکھا جائے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ جاپان بہت حد تک اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو گیا ہے اور اسکی صنعتوں کو معقول ترقی ہوئی ہے۔ لیکن عین نقائص مثلاً مزدوروں میں اضطراب اور بہت زیادہ بلند معیار زندگی پیدا ہوگئے ہوگئے ہیں جن سے جاپان پیشتر ازیں آشنا نہیں ہوا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ سٹا کھیلنے وغیرہ کا سودا اس حد تک بڑھ گیا ہے جو ملکی ضروریات سے کوئی تناسب نہیں رکھتا۔ حصہ دار بہت غافل اور کوتاہ اندیش واقع ہوئے ہیں۔

امور متذکرہ بالا سے یہ ظاہر ہے کہ جاپان کی سی غلامانہ نقالی نہ تو یہاں ممکن ہے۔ اور نہ مناسب جب مزدور تھوڑی اُجرت پر کافی تعداد میں فراہم ہو سکیں۔ اور ساتھ ہی ملک میں بسرعت تمام تمول حاصل کرنے کی خواہش موجود ہو۔ تو اس سے اکثر نقائص پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ پنجاب میں محنت اس قدر سستی بھی نہیں۔ اور نہ جاپان کی طرح اُس کا کثیر مقدار میں فراہم کرنا ممکن ہے۔ تربیت یافتہ مزدوروں کی قلت ہے۔ اور جاپان کی گذشتہ تاریخ سے صاف ظاہر ہے۔ کہ جب تک پوری طرح تربیت یافتہ مزدور کافی تعداد میں موجود نہ ہوں اس وقت تک بڑی بڑی صنعتوں کو مضبوط و مستحکم بنیادوں پر بسرعت تمام قائم کرنا ناممکن ہے۔[51]

ان حالات میں ہماری امیدوں کا صرف سہارا یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ موجودہ مزدوروں کی تربیت کی جائے۔ تو وہ زیادہ استعداد اور قابلیت حاصل کر سکیں۔ تاکہ اگر موجودہ صنعتی کام نسبتاً قلیل التعداد مزدوروں کی مدد سے کیا جا سکے۔ تو جدید صنعتوں کے لئے کافی مزدور بچ رہیں۔ اس ملک میں اوسط درجہ کی اراضی بہت چھوٹی ہوتی ہے یعنی اگر ایک شخص کسی نوآبادی میں ۵۰ ایکڑ زمین حاصل کرے۔ تو اُسے یا تو مزدوروں سے کام لینے کی ضرورت پڑیگی۔ یا اراضی کا ایک حصہ کسی مزارع کو لگان پر دیدینا پڑیگا۔ دوسری جانب انگلستان میں ایک کسان اپنے کُنبے سمیت ۵۰ ایکڑ زمین کی غور و پرداخت کر سکتا ہے۔ اور مزدوروں سے اجرت پر کام لینے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اس سے زیادہ وسیع آراضی پر کام کرنے والوں کا تناسب[52] حسب ذیل ہے۔

۵۰ سے ۱۰۰ تک اراضی	۱.۵	کام کرنے والے
۱۰۰ سے ۱۵۰ تک	۴	" "

---

[51] ملاحظہ انٹرنیشنل ریویو آف اکنامکس بابت دسمبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۶۶۱ مزید برآں زراعت کے مزدوروں اور ان کی تنخواہوں کے متعلق رپورٹ بابت ۱۹۱۹ء بھی دیکھئے پنجاب میں زراعتی نظام ایسا ہے کہ ہمیشہ زیادہ مزدوروں کی ضرورت پڑیگی۔

[52] انٹرنیشنل ریویو آف اگری اکنامکس نومبر اور دسمبر ۱۹۱۹ء۔

۱۵۰ سے ۲۰۶ تک اراضی ۵ و ۷ کام کرنے والے

۳۰۰ سے زیادہ ۱۶ " "

گویا یہ ممکن ہے۔ کہ کسانوں کی تربیت اس طرح کی جائے۔ کہ وہ زیادہ وسیع اراضی کو سنبھال سکیں۔ اور پیداوار میں بھی کمی واقع نہ ہو۔ مدراس میں اس کے متعلق جو تخمینہ کیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسان اوسطاً سال بھر میں ۱۲۰ دن کام کرتا ہے۔ انگلستان میں چالیس سال کے اندر جانوروں کی تعداد جن کی نگہبانی اوسط درجہ کا کسان کرسکتا ہے۔ اچھی خاصی بڑھ گئی ہے۔

	سنہ ۱۸۷۱ء	سنہ ۱۹۱۱ء
مویشی کی تعداد فی کس	۳	۴ و ۵
بھیڑیں	۲ و ۱۴	۲ و ۱۷
گھوڑے	۶۳ و ۰	۹۵ و ۰

گھوڑوں کی طاقت میں پچاس فی صدی کا اضافہ اس امر کی بہت بڑی وجہ ہے۔ کہ فی کس مقدار کارکردگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اس طرح پہلی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ کسانوں کو اگر اپنی فنی استعداد اور قابلیت بڑھانے کے لئے عملی اصولوں پر تعلیم دی جائے۔ تو یہ امر ممکن ہو جائیگا کہ مزدوروں کی ایک بہت بڑی تعداد زراعت سے آزاد ہو جائے۔ اور دوسری صنعتوں میں حصہ لے سکے۔ لیکن اس سلسلہ میں دو تین اہم اسباب و عوامل پر غور کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ نہروں کی تعمیروں کی جو نئی اسکیمیں زیر غور ہیں۔ انہیں اگر عملی جامہ پہنایا جائے۔ تو ان بڑے بڑے قطعات اراضی کی آبپاشی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ جو بحالت موجودہ غیر مزروعہ پڑے ہیں۔ اور اس طرح کسانوں کی مانگ بڑھ جائیگی۔

دوسرا امر یہ ہے۔ کہ گھی اور دودھ کی مانگ روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ اگر ان کی قیمتیں اسی طرح بڑھتی چلی گئیں۔ تو یہ اغلب ہے۔ کہ مکھن اور دودھ کی ڈیریاں کھولنا

بھی ایک کامیاب صنعت سمجھی جائیگی۔ جب مویشیوں کی جانب رجحان ہؤا۔ اور دودھ کی فروخت کا پیشہ منفعت بخش ہوگیا۔ تو زرعی مزدوروں کی تعداد بڑھ جائیگی کیونکہ فی سو ایکڑ زمین کے لئے جتنے مزدوروں کی ضرورت ہے۔ زرعی صنعت کی اس خاص شاخ کے لئے اس سے دُگنے مزدوروں[1] کا ہونا لازمی ہے۔

ان اسباب وعوامل کے باوجود یہ امر بدیہی ہے۔ کہ جو لوگ زراعت میں مصروف ہیں۔ اگر زیادہ محنت کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ تو دوسری صنعتوں کے لئے کثیر التعداد مزدور فراہم ہو سکتے ہیں۔ اور لوگ زیادہ محنت پر بھی آمادہ ہو سکتے ہیں۔ جب انہیں اس امر کا یقین ہو جائے۔ کہ پوری آمدنی جو اُن کے لئے بہت کافی ہوگی۔ انہی کی جیب میں جائیگی اور انہیں سودخواروں کے مطالبات کا بھی خطرہ نہیں رہے گا۔

مزدوروں کا شہروں سے فراہم کرنا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہندوستان کے کسی بازار میں گھوم پھر رہا ہو۔ تو اُسے یقیناً یہ محسوس ہوگا۔ کہ چھوٹی چھوٹی دوکانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن میں وقت اور محنت ضائع ہوتی ہے۔ انگلستان میں اب بڑے بڑے عظیم ذخائر اشیا عام ہیں۔ اور اگر ہندوستان میں بھی بعض باہمت لوگ شہروں میں بڑی بڑی دوکانیں کھولیں۔ جنہیں اقتصادی اصولوں پر چلایا جائے تو اغلب ہے کہ بہت سی محنت کی بچت ہوجائیگی۔ اور بہت سے کارکن مل جائینگے لیکن شہری مزدور ایسے کاموں کے لئے موزوں ثابت نہیں ہونگے۔ جن میں جسمانی محنت ومشقت بھی صرف ہوتی ہے۔ اور بہت تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اس طرح اس مسئلہ پر کسی زاویہ نگاہ سے نظر ڈالیئے۔ یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محنت کا سوال اس ملک کی صنعتی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا۔ اور اُسے محدود کردے گا۔

ایک اور اہم چیز جس کی وجہ سے صنعت وحرفت تیزی سے ترقی نہیں کرسکتی

---

[1] ایضاً انگلستان میں ایک ہزار ایکڑ کے اندر جو لوگ محنت کا کام کرتے ہیں ان کا تناسب حسب ذیل ہے۔ مویشی اور بھیڑیں پالنے اور دودھ دوہنے میں ۱۱۰ - ۲۹ انک دودھ دوہنے اور مویشی پالنے میں ۱۶ اور زیادہ تر زراعت میں ۴۶۔

کاروباری تجربہ کار رہا ہے۔ لوگوں کو فنی تعلیم دی جائے۔ تو انہیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ مختلف اشیاء کو کیونکر بنایا جاتا ہے۔ اور جب تربیت یافتہ مزدور کافی تعداد میں موجود ہونگے تو اشیاء بھی تیار کی جا سکیں گی۔ لیکن صنعت و حرفت کو منفعت بخش بنانے کے سلئے اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔

عہد جدید کی صنعتوں کی یہ کیفیت ہے کہ ہر صنعت میں خاص مہارت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور کامیابی کے بے شمار اسباب و عوامل کو جو بظاہر ہر مختلف نظر آتے ہیں۔ صحیح طور پر سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ عرصہ تک کسی صنعت کی عملی تعلیم حاصل کی جائے۔ انگلستان ہو یا پنجاب۔ دنیا کا کوئی ملک کیوں نہ ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ جس شخص کے پاس سرمایہ ہو۔ اس میں کاروباری قابلیت یا ایک وسیع صنعت کا انتظام کرنے کی اہلیت بھی موجود ہو۔ گذشتہ صدی کے وسط تک یہ کیفیت تھی کہ اس ملک کی طرح انگلستان کے تاجر اور قانون دان زمین پر ہی اپنا روپیہ لگایا کرتے تھے۔ بسا اوقات ایسا اتفاق ہوا کہ متمول صناعوں کے فرزندوں کو صنعتی ادارے ایسے لوگوں کے سپرد کرنے پڑے جن کی تعلیم معمولی تھی۔ لیکن وہ کیریکٹر کے مالک تھے۔ کاروباری سمجھ اور صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ ملک کی صنعتی تاریخ میں برطانوی یونیورسٹیوں کا بہت کم حصہ ہے۔ صنعتوں کے قیام کے لئے ایسی قابلیت کی ضرورت ہے۔ جو صرف تجربہ سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ جاپان اب بہت نقصان اٹھا کر یہ تجربہ حاصل کر رہا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا قبل از وقت ہے۔ کہ آیا کبھی جاپان میں کاروباری قابلیت اور دوسری خصوصیات بھی پیدا ہونگی۔ جن کے بغیر مغربی ممالک کی منظم صنعتوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ برطانیہ عظمےٰ کی بڑی بڑی جہازراں کمپنیوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تدریجی طور حاصل کی ہوئی مہارت اور تجربہ کیا اہمیت رکھتے ہیں۔

انہوں نے اس حد تک اپنے فن میں مہارت خاص حاصل کی ہے۔ کہ دوسرے ممالک اُن سے کبھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور امریکہ جاپان جرمنی نے ناجائز امتیاز روا رکھ کر اور مالی اعانت اور اسی قسم کے دوسرے طریقے استعمال کر کے اس حقیقت کا خاموش اعتراف

کرلیا ہے۔ برطانیہ عظمے نے آزاد تجارت کی جو حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ برطانیہ کو اپنی قابلیت پر اعتماد ہے۔ اور اُسے معلوم ہے کہ وہ اپنے حریفوں کو شکست دے سکتا ہے۔ صنعت کے تحفظ کا سوال تو اُس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب اپنی کمزوری اور عدم قابلیت کا احساس ہو اور دوسروں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہو۔ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ صنعت وحرفت کا تحفظ نئی صنعتوں کے قیام میں آسانیاں بہم پہنچا دے۔ لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ اعلیٰ درجہ کی ہنرمندی اور قابلیت کاروباری سمجھ اور ان تمام دوسرے اوصاف کی ضرورت ہی نہیں رہیگی۔ جن کا وجود صنعت وحرفت میں کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

کاروباری سمجھ اور تجربہ کا ایک جزو اعظم اشیاء کو منڈیوں میں فروخت کرنے کی قابلیت ہے۔ اس بدیہی حقیقت پر زور دینا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب تک مال کو منڈیوں میں پہنچا کر فروخت نہ کیا جائے۔ اُس کا تیار کرنا چنداں سود مند نہیں۔ لیکن عام طور پر اس امر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کہ مصنوعات کو تیار کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو فروخت کرنے کا انتظام کرنا بھی ضروری ہے۔ لنکاشائر جیسے صنعتی مرکز میں بہت سے کارخانے موجود ہیں۔ جو سب کے سب اپنے سازو سامان محنت۔ انتظام۔ خام اجناس مہیا کرنے کے ذرائع اور تجارت برآمد کی سہولتوں کے اعتبار سے یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی کسی کارخانہ کی کامیابی اور ناکامی کا مدار بہت حد تک اس امر پر ہے۔ کہ مینیجر مال کی فروخت کے لئے کوئی منڈی فراہم کر سکتا ہے۔ نہیں۔ یہ چیز سود مند نہیں۔ کہ جنس۔ صنعت اور سرمایہ کو ایسے کپڑے کی تیاری پر لگا دیا جائے۔ جن کی مانگ کافی نہیں۔ ایسی کمپنی کوئی ہی ہوگی۔ جو صرف اس خیال کی بنا پر کوئی کپڑا تیار کرے کہ آگے چل کر منڈی میں اس کی مانگ ہوگی۔ اسی طرح گویا سامان کی تیاری کا مدار منڈی پر ہے۔ جب ہم فنی زاویہ نگاہ سے پنجاب میں صنعتوں کے قیام پر بحث کرتے ہیں۔ تو مسئلہ کا یہ اہم پہلو ضرور نظر انداز ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ امر بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے۔ کہ سوت کاتنے کے کارخانے قائم کئے جائیں۔ جو خام روئی کو

سلہ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کی دلچسپ تفاصیل کے لئے مارشل کی کتاب انڈسٹری اینڈ ٹریڈ دیکھئے۔ علی الخصوص اُس کا دوسرا حصہ کا چھٹا اور ساتواں باب۔

تاگے کی صورت میں تبدیل کردیں۔ لیکن باہر کی دنیا کو پنجاب کے سوت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اُسے خام روئی چاہیئے۔ پنجاب میں سوت کاتنے کی تجویز کو عملی حیثیت سے بروئے کار لانے کے لئے ضروری ہے۔ کہ کوئی بالکل نئی منڈی تلاش کی جائے۔

اگر ہم اس تجویز سے ایک قدم آگے بڑھائیں۔ اور کہیں۔ کہ روئی سے جو سوت تیار ہو۔ اُس سے کپڑا بھی بنایا جائے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہمیں بمبئی اور جاپان کے کپڑے سے مقابلہ کرنا پڑیگا۔ اور کوئی شخص نظر نہیں آئیگا۔ جو بمبئی کے مقابلہ میں پنجاب کی صنعت پارچہ بافی کو محفوظ رکھنے کی حمایت کرے مال کو فروخت کرنے کی قابلیت میں اُسی وقت ترقی ہو سکتی ہے۔ کہ سرمایہ بکثرت موجود ہو۔ جس شخص کے پاس کثیر سرمایہ موجود ہے۔ اُسے کئی حیثیتوں سے اُس شخص پر فوقیت حاصل ہے۔ جس کے پاس تھوڑا سا سرمایہ ہے۔ اس لئے جب نسبتاً تھوڑے سرمایہ سے ایک نئی صنعت شروع کی جائیگی۔ تو بمبئی جیسے صنعتی مرکز کے مقابلہ میں اُسے بہت دشواریاں پیش آئیں گی۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے امور میں وہ اپنے حریفوں سے کم ہیں۔

یہ بھی اغلب معلوم ہوتا ہے کہ بعض حیثیتوں سے لوگوں کی خوراک بھی صوبہ کی صنعتوں کی توسیع پر اثر انداز ہوگی۔ اور انہیں محدود کردیگی۔ اس امر کا احساس بہت کم ہو جاتا ہے۔ کہ خوراک کا مدار اتفاقی حالات واسباب یا مقامی خصوصیات پر ہے بدقسمتی سے ہندوستان میں خوراک مسئلہ مذہبی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس پر خالص اقتصادی اصولوں کے ماتحت آزادانہ بحث نہیں کی جا سکتی۔ یہ حقیقت ہے کہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے باشندے دنیا بھر میں سب سے زیادہ گوشت خوار ہیں۔ لیکن اس کا باعث یہ نہیں۔ کہ انہیں غیر معمولی طور پر زیادہ بھوک لگتی ہے۔ یا یا ان ممالک میں اس قسم کی خوراک ضروری ہے۔ بلکہ اس کا باعث صرف یہ ہے۔ کہ ان لوگوں کی سب سے بڑی صنعت اُون پیدا کرنا ہے۔ اور وہاں بھیڑ کا گوشت ثانوی پیداوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک بھیڑ جو بھوکی رہنے یا کسی بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مرگئی ہو۔ اس کی نسبت ایک زندہ بھیڑ دگنی قیمت رکھتی ہے۔ کیونکہ

زندہ بھیڑیں جو ایک خاص رقبہ میں چر سکتی ہیں۔ ان کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ اور اُون[1] کی پیداوار میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ بھیڑوں کے ذبح کرنے کا بھی کوئی باقاعدہ نظام ہو۔ اسی طرح بھیڑ کا گوشت بہت ارزاں خوراک ہے۔ بافراط مل سکتا ہے۔ اور بہت صرف ہوتا ہے۔ پرانے زمانہ میں جب کہ انگلستان کے لوگ شلجم کی قسم کی ترکاریوں اور ایسی اجناس سے جو آج کل موسم سرما کے اندر خوراک مہیا کرتی ہیں نا آشنا تھے۔ یہ ناممکن تھا۔ کہ جاڑوں میں بھی مویشی زندہ رہ سکیں۔ آج کل مصنوعی طریقوں پر جو مختلف قسم کی گھاس پیدا کی جاتی ہے۔ اُس زمانہ میں اس کا وجود نہیں تھا۔ ملک کے اندر جس قدر گھاس ملتی تھی۔ اُسے سکھا کر جمع کر لیا جاتا۔ اس کے علاوہ کچھ بھوسہ بھی فراہم کر لیا جاتا تھا۔ اور مویشیوں کے چارہ کا کام دیتا تھا۔ اس لئے کسان یا بڑے بڑے زمینداروں کے ایجنٹ ہر سال یہ حساب لگا لیا کرتے تھے۔ کہ چارہ کتنے مویشیوں کے لئے کافی ہے۔ اُن کے اندازہ کے مطابق جس قدر بھیڑیں۔ بیل اور بچھڑوں کے لئے چارہ کافی ہوتا تھا۔ انہیں رہنے دیا جاتا تھا۔ اور باقی کو ہلاک کر کے اُن کے گوشت کو نمک لگا کر محفوظ رکھ لیا جاتا تھا۔ اور لوگ جاڑے میں اُس سے پیٹ بھرتے تھے۔ پھر بھی جاڑے میں مویشی بھوکے ہی مرتے تھے[2]۔ یہ بھی ملحوظ رہے۔ کہ انگلستان کی چراگاہوں میں دوسرے ممالک

---

[1] دو سال عمر کی بھیڑ سے بہترین اُون حاصل ہو سکتی ہے۔ اور انگلستان میں عام طور پر دشوار ہے۔ کہ دوسری مرتبہ اُون حاصل کرنے کے بعد اُسے گوشت کے لئے ذبح کر لیا جاتا ہے۔ بھیڑ کی عمر بھی پانچ یا سات سال ہوتی ہے۔ لیکن اگر انہیں ذبح نہ کیا جائے تو ایسی بھیڑوں کی تعداد نسبتاً کم ہو گی۔ جن کی عمر اتنی ہوتی ہے۔ کہاں سے بہترین اُون حاصل کی جائے اگر بھیڑوں کے ذبح کرنے کے فلاں کا سیاب شورش برپا کی جائے۔ جو یہ صنعت ہی معدوم ہو جائے گی۔

[2] ملاحظہ ہو رولڈ راجرس کی کتاب "ہسٹری آف اگری کلچر اینڈ پرائسز" جلد اول صفحات ۱۶ و ۵۳۔ اس غرض کے معالجوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو انگلستان اور ہندوستان میں تجارت شروع ہو گئی۔ چونکہ لوگ ابتدا سے مویشی کے چارہ کے لئے قدرتی گھاس کے محتاج رہے ہیں۔ اس لئے چراگاہوں کے مزروعہ زمین سے بھی زیادہ قیمتی ہو گئیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بعض دیہات میں ابھی تک یہ رواج ہے کہ سال بھر کے لئے گوشت کا ذخیرہ رکھنے کی غرض سے جاڑے میں مویشی کو ذبح کر لیا جاتا ہے ملاحظہ ہو نوٹ صفحہ ۱۶۰

کی نسبت گھاس کا ذخیرہ زیادہ پیدا ہوتا تھا۔ کیو ملک کی آب و ہوا معتدل اور مرطوب ہے۔ چنانچہ انگریز ابتدا سے کثیر مقدار میں گوشت کھاتے رہے ہیں۔ اور اسی مقوی غذا کا اثر ہے کہ وہ قحط اور وبا کے بدترین اثرات سے محفوظ رہے ہیں[۵۱]۔ آب و ہوا کی اس خصوصیت سے ایک اور فائدہ ہؤا ہے۔ اگرچہ سبزی خور لوگ جسقدر زمین کی پیداوار پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس سے آٹھ گنا زمین خالص گوشت خوروں کے لئے ضروری ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ جب گوشت تھوڑی مقدار میں پیدا کیا جائے۔ اور زراعت کی ثانوی پیداوار کی حیثیت رکھتا ہو۔ تو یہ اقتصادی حیثیت سے بہترین خوراک ہے۔ لیکن اس مسئلہ پر بحث کرتے وقت یہ امر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کہ ایک ملک کا گوشت فراہم کرنے کے لئے اپنی زمین وقف کر دینا جداگانہ چیز ہے۔ اور اس کا دوسری زرعی صنعتی کے ضمن میں ایک ثانوی پیداوار کی حیثیت رکھنا الگ چیز ہے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ انگلستان میں گوشت لوگوں کے لئے ایک اچھی خوراک ہے۔ جو سستی بھی ہے۔ اور مقوی بھی۔ ہندوستان کے علاوہ تمام ممالک اس امر پر متفق ہیں۔ کہ زیادہ تر تک قائم رہنے والی قوت اور ہمت کے لئے خالص سبزی کی بجائے کسی ایسی خوراک کی ضرورت ہے۔ جس کی تھوڑی سی مقدار میں زیادہ غذائیت موجود ہو۔ معلوم ہؤا ہے۔ کہ فرانسی مزدور اس وقت انگریز مزدوروں جتنی محنت و مشقت نہیں کر سکے۔ جب تک انہیں انگریزوں جیسی ہی غذا نہ دی جائے۔ فرانس صنعت و حرفت میں بہت عرصہ تک دوسرے ملکوں سے پیچھے رہا اس کا سبب یہی تھا۔ کہ اس کے مزدوروں کو اچھی خوراک نہیں۔ جاپان میں بھی یہی دیکھا گیا ہے کہ جاپانی موجودہ خوراک سے انگریزی کی طرح کام نہیں کر سکتے[۵۲] وہاں انقلاب کے بعد گوشت کھانے کا رواج برابر پھیل رہا ہے۔ اور مذہبی تعصبات کم ہو گئے

---

[۵۱] مارشل انڈسٹری اینڈ ٹریڈ صنعت ۱۰۷۔

[۵۲] سرانے ڈی ہال کتاب اگری کلچر آفسر ڈی وار صلٹ ۹ کارور کی کتاب ہر آف رورل اکنامکس صلے ۱۶۳۔ مغربی پنجاب میں بکریوں کی کثرت اس امر کی ایک بدیہی مثال ہے۔

[۵۳] مارشل کی کتاب "انڈسٹری اینڈ ٹریڈ" صفحات ۱۱۵ و ۱۶۱۔

ہیں۔ لیکن ابھی تک یہ کیفیت نہیں ہوئی۔ کہ مزدوری پیشہ طبقے بھی گوشت کھالیں۔

خوش قسمتی سے پنجاب کے لوگ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی نسبت زیادہ مقوی غذا کے عادی ہیں۔ یہی ایک ایسا صوبہ ہے۔ جہاں گیہوں کو خوراک کا ضروری جزو سمجھا جاتا ہے۔ اس صوبہ کی اکثریت ہمیشہ نہ سہی۔ تو گاہے گاہے ضرور گوشت بھی کھاتی ہے۔ مسلمانوں کو ان صنعتوں میں بہت فائدہ رہیگا۔ جس میں زیادہ جسمانی محنت کرنی پڑتی ہے۔

یہ سوال کہ کم غذائیت کی خوراک کہاں تک لوگوں کے جمود اور کاہلی کی ذمہ وار ہے اس بحث کے دائرہ سے باہر ہے۔ ہر شخص کام پر اسی قدر طاقت و قوت صرف کرسکتا ہے جیسے وہ غذا سے حاصل کرتا ہے۔ گویا وہ جس قدر محنت صرف کرسکتا ہے۔ غذا اسکی انتہائی حد مقرر کردیتی ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ اگر مقوی غذا کھائی جائے۔ تو اس کی وجہ سے زیادہ کام ہوگا۔ اور اسی طرح بلند معیار کی زندگی بسر کرنے سے لازمی طور پر کوئی اقتصادی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر زندگی کے بلند معیار کی بدولت منفعت بخش کاموں کے لئے زیادہ محنت صرف کی جاسکتی ہے۔ اور اُس سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ تو ایسے معیار زندگی کا حصول پیش نظر ہونا چاہیئے۔ اور اس کی خواہش کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر اچھی خوراک سے یہ فائدہ حاصل نہ ہو۔ تو یقیناً اُس پر روپیہ صرف کرنا فضول ہے۔ مسلمان ہندوؤں سے زیادہ محنتی کاشتکار ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ سکھ جاٹ جو گوشت بھی کھاتے ہیں۔ اور نیز شراب بھی استعمال کرتے ہیں۔ اہیروں سے زیادہ محنتی ہوتے ہیں۔ جو سبزی خور ہیں اور شراب سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سکھ جاٹ جسمانی اعتبار سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لوگوں کی موجودہ خوراک اس قدر طاقت تو فراہم کرسکتی ہے۔ جو بحالت موجودہ استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن اگر لوگ آئندہ زیادہ محنت کرنا چاہیں۔ جو خوشحالی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ تو انہیں اپنی خوراک میں اصلاح کرنی پڑیگی۔

---

[1] اکثر بنگالی کافی گوشت کھاتے ہیں۔ اور اسی طرح اپنی جسمانی طاقت بڑھاتے ہیں۔

یہ بحث جو پنجاب میں صنعت و حرفت کی ترقی کے مواقع سے تعلق رکھتی ہے۔ اس وقت تک تشنہ رہیگی۔ جب تک طاقت کے مسئلہ پر کچھ نہ کچھ کہا جائے۔ دنیا کی بڑی بڑی صنعتیں کوئلے اور لوہے کے ذخائر کے ارد گرد واقع ہوئی ہیں۔ اسٹیم انجن کی ایجاد سے پہلے زیادہ گہری کانیں نہیں کھودی جاسکتی تھیں۔ کیونکہ لوگ زیر زمین کارخانوں کو پانی سے محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے۔ لیکن جب سے سٹیم پمپ ایجاد ہوا ہے۔ یہ دشوار دُور ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے کارخانے نہروں کے کنارے قائم ہوا کرتے تھے۔ اور انہیں چلانے کے لئے پانی سے طاقت حاصل کی جاتی تھی۔ جب سٹیم انجن کی ایجاد ہوا۔ اور کوئلہ کی افراط کی وجہ سے ہم پانی کی طاقت کے محتاج نہ رہے۔ تو کارخانے انہی علاقوں میں قائم ہونے لگے۔ جہاں کوئلہ اور لوہا پایا جاتا تھا۔ اور چونکہ انگلستان میں کہیں یہ علاقے سمندر سے دور نہیں تھے۔ اس لئے انگلستان کی صنعتوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ فرانس میں کوئلہ کے بڑے بڑے میدان طرف شمالی میں واقع ہیں۔ لوہے کا سب سے بڑا مرکز لورین ہے۔ اس کی وجہ سے فرانس کے کارخانے ملک کے شمال مشرق میں یعنی اُن بندرگاہوں اور شہروں کے قریب قائم ہوئے۔ جنہیں جہازرانی کے قابل دریاؤں نے سمندر سے ملحق کر رکھا ہے۔ ان مختصر علاقوں کے سوا سارا فرانس بڑے بڑے صنعتی کارخانوں سے خالی ہے۔

جرمنی ۱۸۵۰ء تک انگلستان اور فرانس سے بھی زیادہ مفلس رہا۔ ۱۸۷۱ء میں اُس نے فرانس سے السس اور لورین کے صوبے چھین لئے۔ اس طرح لوہے کے میدان اُس کے قبضے میں آگئے۔ کوئلہ جرمنی کے پاس تھا ہی اُس نے کوئلے اور لوہے سے بڑی بڑی صنعتیں قائم کریں۔ یہ مقولہ صحیح ہے۔ کہ جرمن سلطنت کی بنیاد خون اور تلوار پر نہیں۔ بلکہ لوہے اور کوئلے پر قائم ہے۔ بڑے بڑے کوئلے کے میدانوں سے فائدہ اٹھا کر فولاد کے کارخانے قائم کئے گئے۔ برقی اور کیمیائی صنعتیں عالم وجود میں آئیں۔ اور اسی طرح جرمنی براعظم یورپ[۱] کا سب سے بڑا صنعتی

---

[۱] ملاحظہ ہو "دی اکنامک کانسی کونسز آف پیس" (صلح کے اقتصادی نتائج) مصنفہ جے۔ ایم کینس باب چہارم۔

ملک سمجھا جانے لگا۔ عہدنامہ صلح کے مطابق الساس اور لورین کی آہنی کانیں فرانس کے قبضہ میں چنی گئیں۔ اور ساتھ ہی یہ شرط بھی کی گئی۔ کہ فرانس کو جرمنی کوئلہ بھی بہم پہنچائیگا اطالیہ کے پاس کوئلہ نہیں۔ چنانچہ وہاں دوسری جگہ سے جہازوں پر کوئلہ لایا جاتا ہے اور اطالیہ اُن ملکوں کا دست نگر ہے۔ جن کے پاس کوئلہ موجود ہے۔ اب اطالیہ پانی کی طاقت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جاپان کے اندر کافی لوہا دوسری دھاتوں میں ملا ہؤا پایا جاتا ہے۔ مزید برآں اس کے پاس اپنی ضروریات سے زیادہ کوئلہ موجود ہے۔ اور وہ زائد از ضرورت کوئلہ دوسرے ملکوں میں بھیج دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی پانی کی طاقت بھی کافی ہے پنجاب میں لوہے کی کانیں نہیں ہاں لوہا دوسری دھاتوں میں ملا ہؤا پایا جاتا ہے۔ کوئلہ بھی ہے۔ لیکن اچھی قسم کا نہیں۔ اور صوبہ میں جس قدر کوئلہ استعمال ہوتا ہے۔ اُس کا بیشتر حصّہ باہر[۱] سے لایا جاتا ہے۔ پنجاب میں کوئلہ مغرب میں پایا جاتا ہے۔ اور لوہا شمال میں۔ اس کے وسیع وسطی میدان میں نہ کوئلہ ہے۔ نہ لوہا۔ ہمالیہ میں بہت سی پانی کی طاقت موجود ہے۔ جس سے ابھی تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ لیکن یہ علاقہ بحالت موجودہ صنعت و حرفت کے مرکزوں سے بہت دور ہے۔ شاید اٹک کے تیل کے میدان جلد حالات تبدیل کر دیں بھکر کے بند کے سلسلہ میں جو ہائیڈرو الکٹرک اسکیم پیش نظر ہے۔ اُس سے یہ امید ہوتی ہے۔ کہ صوبہ کے شمال مشرق میں کافی طاقت فراہم ہو سکیگی۔ گویا کیفیت یہ ہے۔ کہ ابھی تک نہ تو کوئلہ ہے۔ اور نہ لوہا۔ جس سے صنعت و حرفت کے لئے طاقت فراہم کی جائے۔ البتہ یہ توقع ہے۔ کہ مستقبل قریب میں طاقت کی فراہمی آسانی ہوگی۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے۔ کہ پنجاب میں صنعت و حرفت کی ترقی کا میدان بہت تنگ ہے۔ ہم نے جن مختلف ضروری امور پر بحث

---

[۱] ناظرین کتاب کو یہ یاد دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ پنجاب سمندر یا دریا کے راستہ سے کوئلہ درآمد کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ ایک بہت بڑا نقص ہے جسے صنعتی امکانات ہر بحث کرتے وقت پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

کی ہے۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس صوبہ کے اندر مستقبل قریب میں بڑے بڑے صنعتی کارخانے قائم کرلینا اغلب نہیں۔ اور اس غرض کے لئے صرف تعلیم یافتہ نوجوانوں اور سرمایہ کی بھی ضرورت نہیں۔ بلکہ بعض اور چیزیں بھی چاہیئے۔ حکومت کارخانے کھول سکتی ہے۔ لیکن ایک وسیع صنعتی ادارہ یا مجلس قائم نہیں کرسکتی کیونکہ اس کی رفتار ترقی نہایت آہستہ ہوگی۔ حکومت اس سلسلہ میں خواہ کچھ ہی کیوں نہ کرے۔ اس امر کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے۔ کہ لوگ آگے بڑھیں۔ اور جرأت کرکے صنعت و حرفت پر سرمایہ لگائیں۔ حکومت ایسے کارخانے تو قائم کرسکتی ہے۔ جو دوسروں کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوں۔ لیکن وہ کسی میں یہ خاص اوصاف اور خصوصیات پیدا نہیں کرسکتی۔ جو کامیاب کاروباری اشخاص کے لئے ضروری ہیں۔ کیونکہ یہ ضروری ہے۔ کہ صنعت و حرفت کے مسئلہ پر بحث کی جائے گی۔ تو اس کا دائرہ صرف اس امر تک محدود رہیگا۔ کہ فنی حیثیت سے اُن کی کامیابی کے امکانات کیا کیا ہیں۔ اس لئے ہم نے انہیں اسباب و عوامل پر زور دیا ہے۔ جو اس دنیا میں کامیابی کے ضروری ہیں۔ جہاں ہر شخص ایک دوسرے سے گوے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جنگ نے یہ تمام ملکوں پر ظاہر کردیا ہے۔ کہ اگر عظیم مالی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا مقصود ہے۔ تو یہ ضروری ہے۔ کہ پیداوار میں بہت اضافہ ہو۔ اور یہ اضافہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے۔ کہ جس قدر اسباب و ذرائع فراہم ہوسکیں۔ اُن کا استعمال زیادہ سلیقہ اور قابلیت سے کیا جائے۔ اس لئے جو لوگ صنعت و حرفت سے حصول معاش کی پوری پوری قابلیت نہیں رکھتے۔ ان کے لئے معاش حاصل کرنے کا موقعہ زیادہ کم ہوجائیگا۔ کیونکہ صنعت و حرفت پر بین الاقوامی مقابلہ اور مسابقت نے بہت اثر ڈالا ہے۔ پنجاب کے لوگ کہیں سالہا سال میں اس قدر تجربہ اور ہنرمندی حاصل کرنے کے قابل ہونگے۔ جن کا وجود بڑے بڑے صنعتی کارخانوں کے قیام کے لئے ضروری ہے۔ لیکن صوبہ میں اب بھی سرمایہ ہنرمندی اور ہمت و حوصلہ کے استعمال کا کافی میدان موجود ہے۔

یعنی یہ چیزیں اُن کاموں پر صرف کی جا سکتی ہیں۔ جن کے لئے یہ صوبہ موزوں واقع ہوا ہے۔ اور جنہیں ترقی دینے میں اُسے خاص سہولتیں حاصل ہیں۔ مثلاً کھالوں کی صنعت کے لئے یہاں کافی وسعت ہے۔ اسی طرح کئی اور صنعتیں بھی ہیں۔ جن کے لئے نسبتاً کم کوئلے اور کم تربیت یافتہ مزدوروں[1] کی ضرورت ہے۔ ان میں اکثر زراعت کی امدادی صنعتوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں لوگوں کو یہ بھی معلوم ہوجائیگا کہ ان صنعتوں پر صوبہ کے ذرائع یعنی آدمی۔ عقل۔ سرمایہ اور ہمت صرف کرنے کی بدولت ان اوصاف کی تربیت اور نشوونما کا موقعہ ہاتھ آجائیگا۔ جو دوسری صنعتوں میں کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ اگر پنجاب ایک شاندار صنعتی مستقبل کا خواہشمند ہے۔ تو اس کی ابتدا نہایت چھوٹے پیمانہ پر ہونی چاہیئے۔ اس کی بنیاد نہایت احتیاط سے رکھنا چاہیئے۔ لوگوں کی صلاحیت اور قابلیت میں جوں جوں اضافہ ہوتا جائے گا۔ یورپ نے چھ سو سال کے اندر صنعت و حرفت میں جو ترقی کی ہے۔ ہم اگر اس قدر ترقی حکومت کی مالی امداد کے بل پر ایک مختصر عرصہ میں کرنا چاہیں۔ تو اس کا نتیجہ ناکامی اور مایوسی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

ایک اور اہم امر بھی طویل بحث کا محتاج ہے۔ بڑے بڑے محنتی کاموں بلکہ اکثر مصنوعات کے لئے ضروری ہے۔ کہ بہت سے لوگوں کے سرمایہ کو ایک جگہ جمع کردیا جائے۔ لیکن انگلستان کی خوشحالی کی بنیاد اس طرح پڑی۔ کہ یا تو افراد نے تن تنہا کاروبار شروع کیا۔ اور یا کسی کو اپنا ساجھی بنالیا۔ لیکن لمٹیڈ کمپنیاں جن میں ذمہ واری بہت سی آدمیوں پر منقسم ہوتی ہے۔ اس وقت عالم وجود میں آئیں۔ جب کہ انگلستان کی معدنی دولت سے فائدہ اُٹھانے کے لئے زیادہ سرمایہ کی ضرورت پڑی۔ ایک

[1] جن صنعتوں کے لئے کوئلے کی ضرورت نہیں۔ ان کی ایک مثال وباعث ہے۔ آپ کے علاوہ وہ دوسری صنعتیں بھی ہیں۔ جن کی بنیاد علم کیمیا ہوگی۔ اور اس کے لئے یہ صوبہ غیر موزوں نہیں۔ اٹک میں تیل دریافت ہؤا ہے۔ اگر اس سے ایک ارزاں اور کثیر المقدار طاقت فراہم ہو جائے۔ تو پنجاب کے مستقبل میں کلی انقلاب رونما ہو جائیگا۔

شخص یا دو تین شرکائے کار میں نہ تو یہ حوصلہ تھا۔ کہ اپنا سرمایہ معرض خطر میں ڈالدیں۔ اور شاید کسی فرد واحد یا دو تین شرکا کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہیں تھا۔ تجارت وصنعت وحرفت میں سرمایہ مشترک کے اصولوں پر کمپنیاں کھولنے کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ حکومت نے مختلف تجارتوں کے لئے خاص مالکانہ حقوق اختیارات عطا کرنے کا حق اپنے لئے محفوظ کرلیا۔ سترھویں صدی میں سند یافتہ کمپنیوں کی بنیاد پڑی۔ جس کی مثال ایسٹ انڈیا کمپنی سے مل سکتی ہے کچھ عرصہ تک تو یہ شاہی سند صرف ایسی کمپنیوں کو دی جاتی تھی۔ جن کا کام باعتبار وسعت یا نوعیت ایسا ہوتا تھا۔ کہ پرائیویٹ طور پر انجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ پہلے یہ حق بادشاہ کو حاصل تھا۔ بعد میں پارلیمنٹ میں منتقل ہوگیا۔ اور صرف اسی کو یہ اختیار حاصل تھا کہ تجارت کے بارہ میں مالکانہ حقوق و اختیارات عطا کرسکے۔ اس کی مثال بنک آف انگلینڈ ہے۔ اسی قسم کی سند یافتہ کمپنی ایسے ممبروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ جن کی ذمہ واری غیر محدود ہوتی تھی۔ غیر محدود (لمٹیڈ) ذمہ داری کا خیال آہستہ آہستہ ترقی پذیر ہؤا۔ اور کہیں بعد میں جاکر پارلیمنٹ نے اس کی منظوری عطا کی۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں جو قوانین منظور کئے گئے۔ اُن میں تو اس اصول پر کمپنیاں قائم کرنے کی اجازت محض خاص حالات میں دی گئی تھی۔ بلکہ ۱۸۵۶ء میں لمٹیڈ ذمہ واریوں کے لئے جو قانون منظور کیا گیا۔ اس کے دائرہ عمل سے بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کو مستثنےٰ رکھا گیا تھا۔ اس قانون کو ۱۸۵۹ء میں منسوخ کردیا گیا۔ اس طرح گویا ۵۰۲ سال تک یہی بدستور تھا۔ کہ جن کمپنیوں کو شاہی سند عطا کی جاتی تھی۔ ان کی ذمہ واری غیر محدود ہؤا کرتی تھی۔ لیکن اس عرصہ میں بھی لوگوں نے انجمنوں کے اُن قواعد وضوابط کے متعلق جن کا جاننا کامیابی کے لئے ضروری تھا۔ کافی علم حاصل نہیں کیا تھا۔ اس صوبہ میں امن و قانون کا دَور دورہ ہوئے چند سال ہوئے ہیں۔ اور جب سے کہیں یہ ممکن ہؤا ہے۔ کہ وسیع پیمانہ پر تجارتی اور صنعتی کام کئے جائیں۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ مختصر عرصہ اس مقصد کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ کمپنیوں کے قوانین کے مقاصد اور ضرورت کے متعلق بہت ہی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ کمپنیوں کے

قیام میں روڑے اٹکائے۔ بلکہ ان کا مقصد تو ان اغراض کے لئے سہولتیں مہیا کرنا ہے۔ اس سے مقصود تو یہ ہے۔ کہ کمپنیوں کا دستور ایسا ہو۔ کہ حصہ دار ڈائرکٹروں سے محفوظ رہیں۔ اور ڈائرکٹروں پر حصہ دار کوئی الزام نہ لگا سکیں۔ اس کا منشاء یہ ہے۔ کہ قرضخواہوں اور دوسرے لوگوں میں باہمی اعتماد قائم ہو جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے۔ کہ اس قانون میں حساب رکھنے اور ان کی جانچ پڑتال کر کے شائع کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ بہت سے آدمیوں کے خلاف مقدمے چلانے میں جو دشواریاں پیش آتی تھیں۔ ان کا علاج یہ کیا گیا۔ کہ ہر کمپنی کو ایک ایسی انجمن کی حیثیت دی گئی۔ جو قانوناً فرد واحد کا حکم رکھتی ہے وہ دوسروں پر مقدمہ چلا سکتی ہے۔ اس پر بھی مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ اور اُسے ضبط کیا جا سکتا ہے۔ مزید برآں اس قانون نے تمام فرائض اور ذمہ واریوں کی تقسیم کر دی ہے۔ کمپنیوں پر جو پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ وہ صرف انگلستان ہی نہیں۔ بلکہ دنیا بھر کے طویل تجربات کے نتائج ہیں۔ اس لئے اسے ادنےٰ ترین لازمی قیود سمجھنا چاہیئے بدقسمتی سے اس زاویہ نگاہ کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا جاتا۔ جو لوگ کمپنیاں قائم کرتے ہیں۔ وہ ان شرطوں سے ناراض ہیں۔ حالانکہ ان کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ انہیں اپنے کام میں مستقل اور پائدار کامیابی حاصل ہو۔ وہ بعض شرائط کی تنسیخ کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ اور ان شرائط کی تنسیخ خاص طور پر اُن کے پیش نظر ہوتی ہے۔ جن کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اُن کی ذات سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ سرمایہ مشترک کے اصول پر جو کمپنیاں قائم کی جاتی ہیں۔ انہیں لوگوں کی نظروں میں چنداں اعتبار و قعت حاصل نہیں لوگوں کو بہت دیر میں کہیں جا کر اعتماد ہوتا ہے۔ اول تو صنعتی اداروں کی تعداد ہی تھوڑی سی ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ ناکامی کے واقعات بکثرت معرض وجود میں آتے رہتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ دنیا بھر کے تجربہ سے جن شرائط کی اہمیت اور ضرورت تسلیم کر لی گئی ہیں۔ انہیں پورا کرتے

پر زیادہ سختی سے زور دیا جائے۔ اس کے سوائے اعتماد حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ صوبہ کے ذرائع خوشحالی کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ سرمایہ مشترکہ کا طریقہ ہر دلعزیزی حاصل کرے۔ کیونکہ صوبہ میں ایسے سرمایہ دار خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ جن کے پاس صنعتی کاموں کو چلانے کے لئے کافی روپیہ موجود ہے۔ لیکن اگر مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے متعلق لوگوں کو شک وشبہ ہے اور وہ ان میں اپنا روپیہ لگاتے ڈرتے ہیں۔ تو اُن کے شکوک دور کرنے اور ہر دلعزیز بننے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ دیانتداری سے محنت کرکے کمپنی کو کامیاب بنایا جائے۔ آج کل تو کیفیت یہ ہے۔ کہ لوگ کھیتوں کے متعلق تحقیق وتفتیش بھی کرتے ہیں۔ پھر بھی ایک قابل اعتبار کمپنی اور صریح جعلساز ادارہ میں امتیاز نہیں کرسکتے۔ کہ کسی کمپنی سے محتاط اور دانشمندانہ طریق پر معاملہ کرنے کے لئے جن اطلاعات کی ضرورت ہوتی ہے۔ قانون نے ان کی فراہمی کے لئے سہولتیں مہیا کر رکھی ہیں۔ لیکن لوگ ان سہولتوں سے بھی قطعی طور پر فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ پھر جس کمپنی کے حصے خریدتے ہیں۔ اُس سے عملی طور پر اتنی بھی دلچسپی نہیں لیتے کہ اُس کے عام جلسوں میں شریک ہوجایا کریں۔ بہت کم ایسے حصہ دار ہونگے۔ جو فرد حساب کو سمجھ سکتے ہوں۔ اس لئے بڑے صنعتی ادارے قائم کرنے سے پہلے ضروری ہے۔ کہ لوگوں نے سرمایہ مشترکہ کے طریقہ کی نسبت جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اس میں قطعی طور پر تبدیلی رونما ہوجائے۔

صوبہ بھر میں ۷۹ کمپنیاں ہیں۔ جن میں سے ۱۴ کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں۔ اُن کا سرمایہ اداشدہ دو کروڑ ۷ ۴ لاکھ روپیہ ہے۔ ۶۵ کا انتظام ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اُن کا اداشدہ سرمایہ ۸۷ لاکھ ہے صرف بیس کمپنیاں مصنوعات میں مصروف ہیں۔ جن کا اداشدہ سرمایہ ۱۴ لاکھ ہے۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے معلوم ہوگا۔ کہ لوگوں کے اعتماد کی

رفتار ترقی کس قدر سست ہے۔

سنہ	کمپنیوں کی تعداد	اداشدہ سرمایہ
۱۸۸۹ء – ۱۸۹۰	۲۲	۳۹۶۰۰۰۰
۱۸۹۴ء – ۱۸۹۵	۲۰	۴۷۸۰۰۰۰
۱۸۹۹ء و ۱۹۰۰ء	۵۲	۷۴۱۰۰۰۰
۱۹۰۴ء و ۱۹۰۵ء	۵۹	۱۰۱۸۰۰۰۰
۱۹۰۹ء و ۱۹۱۰ء	۱۳۶	۱۷۲۰۶۰۰۰
۱۹۱۴ء و ۱۹۱۵ء	۹۹	۱۴۹۷۰۰۰۰
۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء	۷۹	۳۲۵۱۴۰۰۰

۱۹۱۱ء و ۱۹۱۲ء میں کمپنیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اس وقت ۴۹۱ کمپنیاں موجود تھیں۔ ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء کے اداشدہ سرمایہ میں سے کم از کم ۸۸ لاکھ الائنس بنک شملہ کا سرمایہ تھا۔ اس سال تمام انجمن ہائے امداد باہمی کا اداشدہ سرمایہ ۶۶ لاکھ تھا۔ گذشتہ اوراق میں ہم نے جو بحث کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر صنعت وحرفت کو وسعت دی جائے۔ جب بھی موجودہ اقتصادی حالات سے فوری نجات کی توقع نہیں کرنا چاہیئے۔ کامیابی کے لئے کئی اسباب وعوامل ضروری ہیں۔ حکومت خواہ کتنی ہی امداد کیوں نہ دے یا صنعت وحرفت کی حفاظت کا کیسا ہی سامان کیوں نہ مہیا کردے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں۔ جسے حرکت دیتے ہی ہر چیز تیار ہو جائیگی۔ ہمیں اس سے تو انکار نہیں۔ کہ اگر حکومت کثیر روپیہ صرف کرے۔ تو بہت جلد تبدیلی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس تبدیلی

سے مستقل طور پر فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ آخر کار پھر اُسے ضرور زوال ہو گا۔ جاپان کی مثال سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر ترقی کے تمام ضروری اسباب و عوامل ضروری اور مناسب مقدار میں موجود نہ ہوں۔ تو صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے مصنوعی محرکات کا استعمال خطرناک ہے۔ جنگ عظیم کے دوران میں جاپان کے صناعوں کو صنعت و حرفت کی توسیع کے لئے جو موقع مل گیا تھا۔ اس کی نظیر پوری صنعتی تاریخ میں نہیں ملتی لیکن جاپان اس سے زیادہ فائدہ اُٹھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہر جگہ سے یہ شکائتیں آنے لگیں کہ پہلی مرتبہ جو مال بھیجا گیا۔ وہ تو مال کے نمونہ کے مطابق تھا۔ لیکن بعد میں جو مال بھیجا گیا۔ وہ اتنا اعلےٰ نہیں تھا۔ ہندوستان میں جن تاجروں نے جاپان کا مال منگوایا۔ انہیں شکایت رہی۔ کہ وہ جو خطوط لکھتے تھے۔ اُن کا جواب نہیں ملتا تھا۔ اور جاپانیوں کا طریق عمل کاروباری اصولوں کے بالکل مخالف تھا۔ اس لئے انہیں بے حد تکلیف ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ جاپانی تاجروں اور اُن کے مال کو ہندوستان میں ناقابل رشک شہرت حاصل ہو گئی۔ جاپان[1] کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنگ کے زمانہ میں جن چیزوں کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی۔ اب اُن کی تجارت برآمد کم ہو گئی ہے۔ اس کی کچھ تو یہ بھی وجہ تھی۔ کہ جاپان میں قیمتیں بڑھ گئی تھیں۔ لیکن بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ جن سلطنتوں کے مابین جنگ ہو رہی تھی۔ اُن میں صلح ہو گئی تھی۔ جاپانی صنعت و حرفت کو غیر معمولی طور پر وسعت حاصل ہو گئی۔ جو غیر مفید ثابت ہوئی۔ مثلاً ۱۹۱۹ء میں وہاں ۲۷۰۰ کارخانے قائم ہوئے

---

[1] ملاحظہ ہو۔ ہندوستان میں برطانی تجارت کے حالات اور مستقبل کے متعلق رپورٹ بابت ۱۹۱۹ء۔

جن پر ۵۲۲۰۰۰۰۰۰ ین لگائے گئے۔ لیکن بعد میں اقتصادی دباؤ شروع ہوا
بازار سرد پڑ گیا۔ اور اکثر کارخانے تباہ ہو گئے۔ چونکہ کمپنیوں کے قیام میں اعتدال
ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا۔ اس لئے اس کا رد عمل بھی شدید تھا۔ صرف جون ۱۹۲۰ء
میں ۱۳۴۲[۵] کمپنیوں کا دیوالہ نکل گیا۔ جنہیں سرمایہ مشترکہ کے اصول پر قائم کیا
گیا تھا۔ جاپان کے صنعتی حالات کے متعلق صحیح اطلاعات فراہم کرنا نہایت
ضروری ہے۔ کیونکہ دوسرے ممالک میں اس کے متعلق بہت مبالغہ آمیز خیالات
پائے جاتے ہیں۔ بعض اہل قلم جاپان اور برطانیہ کی صنعت و حرفت کا ذکر
ساتھ ساتھ اور اس طرح کرتے ہیں۔ گویا دونوں ہم پلہ ہیں۔ اور ہندوستان
کی حکومت پر زور دیتے ہیں۔ کہ وہ بھی جاپان کی پیروی کرے۔ گویا ان کے
نزدیک اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کہ جاپان نے
صنعت و حرفت سے بہت فائدہ حاصل کیا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ
جاپان کی ترقی حیرت انگیز ہے۔ لیکن نہ تو وہ اور دوسرے ملک غلطیوں
سے مبرا ہیں۔ اور وہ اقتصادی قوانین سے سرتابی کر سکتے ہیں۔ پنجاب
میں فائدہ حاصل کرنے کی بعض قدرتی خصوصیات موجود ہیں۔ اس لئے اس
صوبہ میں خوشحالی کی لہر دوڑا دینے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ان خصوصیات
کو مناسب طور پر ترقی دی جائے۔ لیکن جادو کی چھڑی سے وہ کام نہیں ہو سکتا
جو مستقل و پیہم کوشش سے ممکن ہے۔ لیکن اس کوشش کا مقصد یہ ہونا
چاہیئے۔ کہ صوبہ میں جو اہلیت اور صلاحیت موجود ہے۔ اُسے بہترین طریق
پر استعمال کیا جائے۔ دوسرے ملکوں کی غلامانہ نقالی کر کے ایسی صنعتوں
کا قائم کرنا اس کا مقصد نہیں ہونا چاہیئے۔ جن کے لئے پنجاب موزوں نہیں +

---

۵ ملاحظہ ہو مضمون مندرجہ جریدہ ٹائمز بابت ۲۷ اگست ۱۹۲۰ء

تیرھواں باب

زراعت اور دوسری صنعتوں کا مقابلہ

یہ سوال کہ آیا کوئی ایسا بھی زمانہ گذرا ہے۔ جب کہ ہندوستان میں بڑی بڑی صنعتیں فروغ پر تھیں۔ ہمارے موضوع بحث سے تعلق نہیں رکھتا۔ کیونکہ ہماری بحث کا تعلق ماضی سے نہیں۔ بلکہ مستقبل سے ہے۔ بعض اہل قلم ہندوستان کی گذشتہ خوشحالی کی داستان مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے اس دور اقبال کے متعلق کوئی قابل قدر شہادت موجود نہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر کیل کو لیجئے۔ جنہوں نے ہندوستان کے اس ہردلعزیز عقیدہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ کہ ہندوستان کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا صنعتی ملک تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کی جہازرانی اور جہاز سازی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں یہ خیال بھی ظاہر فرمایا ہے۔ کہ ہندوستان کو محض ایک ایسی سرزمین بنانا جو محض زراعت پیشہ لوگوں پر مشتمل ہو۔ گویا عوام کی ترقی کی تمام راہیں بند کر دینا ہے۔ لیکن حقیقت صرف اسی قدر معلوم ہوتی ہے۔ کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی سے پہلے جب کہ مغرب نے ترقی کی منزلیں طے نہیں کی تھیں مغرب کی صنعتیں ہندوستان کی صنعتوں سے بہتر حالت میں نہیں تھیں۔ یہ قرین قیاس ہے۔ کہ اس وقت ہندوستانی

دستکاری کئی حیثیتوں سے یورپ والوں سے بہتر ہو۔ اگر لفظ (صنعت) کو
انہوں معنوں میں استعمال کیا جائے۔ جن معنوں میں شہنشاہِ اکبر یا ملک الزبتھ کے
زمانہ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ تو یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ ہندوستان میں بڑی
بڑی صنعتیں موجود تھیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے۔ کہ آج جن معنوں میں لنکاشائر
اور سٹیفورڈشایر کے لوگ لفظ "صنعت" کو استعمال کرتے ہیں۔ ان معنوں
میں کوئی "صنعت" ہندوستان میں موجود تھی۔ تو یہ خیال اس حد تک ناقابل
قیاس ہے۔ کہ اسے مسترد کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں۔ پرانے زمانہ میں
جتنا مال ہندوستان سال بھر میں باہر بھیجتا تھا۔ اتنا مال تو بحر اطلانٹک سے گزرنے
والے ایک جہاز پر لدا ہوتا ہے۔ یہی کیفیت جنگِ عظیم سے پہلے جاپان کی تھی۔ یعنی
جنگ عظیم سے پہلے جاپان کا سارا صنعتی ساز و سامان انگلستان یا امریکہ کے ایک
شہر جتنا بھی نہیں تھا۔ جاپان ان معنوں میں صنعتی ملک نہیں۔ جن معنوں میں انگلستان
بلکہ یوں کہیئے۔ کہ بلجیم صنعتی ملک ہے۔ ہندوستان کی صنعت و حرفت نے سترھویں
صدی کے انگریز سیاحوں کو حیران کر دیا۔ لیکن اس کی صنعت بلفاسٹ یا گلاسکو جیسے
شہروں جیسی نہیں ہو سکتی۔ بہرحال یہ بحث بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ اس سے
کوئی ایسا نتیجہ نہیں نکلتا۔ جو ہمارے موجودہ مقصد کے لئے مفید ثابت[1] ہو۔
کیونکہ اس وقت مستقبل کی خوشحالی کے متعلق صحیح اصول دریافت کرنا ہوا مقصد
ہے۔ مغرب نے محض نئی علمی معلومات اور ایجادات کی بدولت ترقی کی۔ جس نے صدیوں
کی کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح یورپ یا یوں کہیئے۔ کہ شمالی مغربی یورپ کی قوموں
نے دولت حاصل کی۔ اور آج بھی اس سرزمین کی سرگرمیوں میں یہی چیز نمایاں

---

[1] پنجاب میں کبھی ایسی دیسی صنعتیں نہیں تھیں۔ جیسی گذشتہ کئی صدیوں سے بمبئی میں موجود ہیں۔ پنجاب اجتماعی تنظیم
کی اہلیت موجود نہیں۔ ہمت، واقدام کا ترقی یافتہ جذبہ بھی مفقود ہے۔ غرض کہ کوئی ایسی چیز نہیں
نوجوانوں کے سامنے کبھی صنعت کے حقیقی سالار کی حیثیت سے پیش کیا جائے

نظر آتی ہے۔ یہ علمی معلومات اور ایجادات ہندوستان تک دیر میں پہنچیں۔ وہ
یہاں کے حالات کے لئے مناسب و موزوں نہیں تھیں۔ اور اب سے کچھ
عرصہ پہلے تک اس ملک کے لوگوں کی توجہ کا بیشتر حصہ فراہمی دولت کے
بجائے۔ دوسرے امور پر صرف ہوتا تھا۔ اس صوبہ میں ابھی تک ایجاد و اختراع
کے مادہ نے کوئی زیادہ کامیابی حاصل نہیں کی۔ جو چیزیں اختراعی قابلیت
کو ترقی دے سکتی ہیں۔ اُن کا وجود یہاں نہیں۔ ایسی چیزیں بھی موجود نہیں۔ جو
باہمی مقابلہ و سابقت کے جذبہ کی متحرک ہوں۔ اور نہ تو اور ان سے بڑا متحرک یعنی
فاقہ کشی کا خوف بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ اس بحث کے سلسلہ میں ان لوگوں کا نکتہ نگاہ
خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ جن کی نگاہ مستقبل کی بجائے ماضی پر ہے۔ اور سب
سے زیادہ اہم خیال یہ ہے۔ کہ مصنوعات میں زراعت سے زیادہ دماغی اور
اخلاقی اوصاف کی ضرورت ہے۔ اور زراعت میں جس قدر ترقی کی جا سکتی ہے
وہ صنعت و حرفت میں ممکن نہیں۔ قصہ مختصر زراعت جب صنعت و حرفت[1]
کے مقابلہ میں آتی ہے۔ تو وہ کوئی ایسی چیز نہیں رہتی جسے جائز طور پر قابل
فخر سمجھا جائے۔ لیکن یہاں صنعتی ترقی کا مسئلہ زیر بحث ہوتا ہے۔ یہ حقیقت
ضرور نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ کہ دنیا بھر میں زراعت سب سے زیادہ اہم صنعت
ہے۔ اور ہمیشہ اس کی یہی حیثیت رہیگی۔ اسے انگلستان کی سب سے بڑی
صنعت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر تمام دوسری صنعتوں کو ایک صنعت فرض کر کے
زراعت سے مقابلہ کیا جائے۔ تو زراعت ان کے مقابلہ میں بہت حقیر نظر آتی
ہے۔ جاپان میں یہ بہت اہم پیشہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس ملک کی

---

[1] انڈین اکنامکس مصنفہ پروفیسر کیل، تیسرا ایڈیشن ص ۲۴۸۔ یہ خیال انگلستان اور ڈینمارک
کے صحیح حالات سے اس قدر مخالف واقع ہوا ہے۔ کہ اگر اس سے بالکل متضاد رائے ظاہر کی
جاتی۔ تو وہ زیادہ تر یہی صنعت ہوگی۔ جدید تر زراعت کے لئے صنعت و حرفت کی نسبت اعلٰے تعلیم کی ضرورت ہے

۶۰ فی صدی آبادی زراعت میں مصروف ہے۔ اکثر ممالک میں زراعت ہی لوگوں کا سب سے بڑا مشغلہ ہے۔ جزائر برطانیہ کے اکثر صوبوں اور امریکہ کی اکثر ریاستوں میں اسے سب صنعتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ امر باعث تعجب ہے۔ کہ اس ملک کے تعلیمیافتہ اور متمول لوگ اس بات پر تو زور دیتے ہیں۔ کہ حکومت صنعت و حرفت کی مالی اعانت کرے۔ لیکن زراعت میں حکومت کی مالی اعانت سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم نے اس کے بعض اسباب و وجوہ پر اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں بحث کی ہے۔ لیکن صنعتوں کی حمائیت و اعانت کے لئے جو صدا بلند کی جا رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ لوگ صنعت و حرفت کو زائد از ضرورت دولت کے لگانے کا منفعت بخش ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جس سے بہت نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ صنعت و حرفت کی حمایت کی تہ میں ہر جگہ یہی راز پنہاں ہے۔ اگر انگریز دوسرے ملکوں مثلاً جنوبی امریکہ۔ روس اور چین میں دلچسپی لیتے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہی ہے۔ ایسے موقع تو بہت ہیں۔ کہ روپیہ ۶ فی صدی نفع پر لگایا جائے۔ لیکن اتنے سے تسلی نہیں ہوتی۔ اس لئے بیقرار نگاہیں۔ دنیا پر لگی رہتی ہیں۔ کہ کہیں اس سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ اگر ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کو یقین ہو جائے۔ کہ زراعت سے صنعت و حرفت کی نسبت زیادہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ تو وہ زراعت پر روپیہ لگائیں گے۔ لیکن انہوں نے فرض کر لیا ہے۔ کہ زراعت پر روپیہ لگانے سے زیادہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ امر واضح نہیں۔ کہ انکا یہ مفروضہ کس بات پر مبنی ہے۔ یہ تو صحیح ہے۔ کہ زراعت سے بہت دولت کمائی نہیں جا سکتی لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ زراعت صنعت و حرفت کی نسبت بہت زیادہ لوگوں کے لیے معقول سامان معشیت مہیا کرتی ہے۔ صنعت و حرفت میں ان لوگوں کے لئے جن کا مدعا محض قیاس آرائی اور سٹہ بازی ہے۔ یا ان لوگوں کے لئے جو خداداد ذہانت رکھتے ہیں۔ ایسے موقع ہیں۔ جن کا زراعت میں کہیں

پتہ نہیں۔ بہت کم ایسے لوگ نظر آئینگے۔ جو نہائیت جلد اس قدر روپیہ کمائیں۔ جس سے لوگ متاثر ہوں چنانچہ پروفیسر مارشل اس سلسلہ میں لکھتے ہیں "بعض غیر معمولی ذہانت کے لوگوں نے پیداوار بڑھا کر یا تجارت کر کے جو عظیم دولت حاصل کر لی اس سے تخیل بہت متاثر ہوتا ہے۔ کہیں جب اس قسم کی دولت کو جمع کیا جاتا ہے۔ تو وہ اس سرمایہ کے تناسب سے بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ جو کاروبار کی مختلف شاخوں پہ لگایا گیا ہے۔ سرمایہ جو فائدہ ہوا ہے۔ وہ اوسط درجہ کا تھا حالانکہ کاروبار میں نقصان کی وجہ سے سرمایہ کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔ کہیں جو لوگ ناکام رہتے ہیں۔ ان پر دنیا کی نظر نہیں پڑتی۔ اب پنجاب کو ہی لیجیئے۔ آپ کو یہاں نہروں کی تعمیر کا عظیم کام نظر آئے گا۔ جو ایک وسیع زرعی اصلاح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ۱۹۱۰ء و ۱۹۱۱ء[1] کے اندر ۵ و ۱۳ فیصدی نفع خالص ہوا۔ سرمایہ ۲۳ کروڑ ۵۴ لاکھ تھا۔ زیرین نہر چناب سے ۴۰ فیصدی منافع خالص ہوا۔ اور زیرین نہر جہلم سے ۲۰ فیصدی سے زیادہ یہ نفع نارتھ ویسٹرن ریلوے سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ وہ تقریباً ۸ فیصدی ہے۔ البتہ ریلوے لائن کے بعض خاص حصوں میں زیادہ نفع ہوا ہے۔ یہ مثالیں تو حکومت کی سرگرمیوں کے نتائج پر مشتمل ہیں۔ اور یقیناً اس سلسلہ میں یہ دلیل نہیں دی جائیگی کہ حکومت زمین کی منفعت بخش اصلاح یا ذرائع رسل ورسائل کی سہولتیں بہم پہنچانے میں پرائیویٹ ارادوں کو شکست دے سکتی ہے۔ جب تک یہ دلیل نہ دی جائے۔ یہ فرض کر لینا بے جا نہیں۔ کہ اصلاح اور ترقی کے بعض ایسے منفعت بخش طریقے بھی ہیں جن سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ صنعت وحرفت میں سرمایہ لگا کر جتنا نفع ہوتا ہے۔ وہ اوسطاً زیادہ نہیں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ کسی پیٹنٹ چیز یا ایجاد کی وجہ سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یا کوئی ایسا کاروبار شروع کیا گیا ہے۔ جس میں خطرات ہیں۔ اگر کوئی کارخانہ بہت اچھی مصنوعات

---

[1] "انڈسٹری اینڈ ٹریڈ" ص ۲۹۳ و ۲۹۴

تیار کر رہا ہو۔ لیکن ان کی مصنوعات ایسی ہوں۔ جن کی نقالی کی جا سکتی ہو۔ تو یقیناً ان کی نقالی کی جائیگی۔ اور مقابلہ کا اثر یہ ہوگا۔ کہ منافع کم ہو جائے گا۔ اس طرح یوں کہنا چاہیئے۔ کہ قدرتاً فی صدی منافع کی مقدار اتنی ہی رہے گی۔ جسے دیکھکر لوگوں کے مُنہ میں پانی نہ بھر آئے۔ اور بہت زیادہ مقابلہ نہ شروع ہو جائے[1] اگر ایک باہمت نوجوان کو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ مقابلہ پر ایک اور کارخانہ کھولکر چلا سکتا ہے۔ اور اس سے بہت منافع بھی حاصل کر سکتا ہے۔ تو یقیناً وہ ایسا ضرور کریگا۔ کارخانہ کے مالکوں پر اس کا اندیشہ چھایا رہتا ہے۔ وہ اپنی حالت پر افسوس کرتے رہتے ہیں۔ کہ اے کاش ہم میں اتنی ہمت ہوتی۔ نئی مشین لگاکر یا نئے طریقے رائج کرکے سابقت۔ اور مقابلہ کی اس دوڑ سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے۔

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ آج کل جب دُنیا میں مقابلہ کی گرم بازاری ہے۔ صنعتی اداروں کو نہایت اعلےٰ طریق پر منظم کیا گیا ہو۔ اگر صنعت و حرفت میں زراعت کی نسبت زیادہ نفع ہوتا۔ تو جو روپیہ آج کل زراعت میں لگایا جا رہا ہے۔ وہ یقیناً صنعت و حرفت میں لگایا جاتا۔ ان دونوں صنعتوں کے مزدوروں کی آمدنی کا موازنہ کرنا آسان نہیں۔ کیونکہ ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ صنعت و حرفت میں پورا پورا نظم و ضبط ملحوظ رکھا جاتا ہو۔ اور زراعت کا شیرازۂ انتظام بکھرا ہوا۔ لیکن پنجاب میں جہاں دونوں غیر منظم ہیں۔ یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ زراعت میں آمدنی کا اوسط صنعت و حرفت کی نسبت زیادہ ہے۔ اور جن ملکوں میں صنعت و حرفت اور زراعت دونوں کا انتظام بہت اعلےٰ ہے۔ مثلاً انگلستان کی صنعت و حرفت اور ڈنمارک کی زراعت تو وہاں بھی یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ زراعت

---

[1] یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ ایسے کارخانوں کی تعداد کثیر ہے۔ جو ایسے کاموں میں مصروف ہیں۔ جن کی نقل بآسانی کی جا سکتی ہے۔ اور پھر اس کا نفع سرمایہ پر ۸ فیصدی سے زیادہ ہے۔ اس صوبہ میں تو ایسی صنعتوں کا تصور مشکل ہے جن سے ساہوکاری کی نسبت زیادہ روپیہ حاصل ہو سکے

سے جو آمدنی ہوتی ہے۔ اس کا اوسط نسبتاً زیادہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن اگر انگلستان
کی صنعت[1] و حرفت کو جس کی تنظیم نہایت اعلےٰ طریقہ پر کی گئی ہے۔ اس کی زراعت
کے مقابلہ پر لائیے۔ جو زراعت کی نسبت غیر منظم حالت میں ہو۔ تو یہ کیفیت نظر نہیں
آئیگی۔ جن صنعتوں کی تنظیم اچھی ہوئی ہو۔ وہ یقیناً قابل ترین لوگوں کی استعداد
سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ اُن کے پاس سرمایہ کافی ہو۔ اور ان
کی ضروریات پورا کرنے کیلیے بنکنگ کا بھی خاص انتظام ہوگا۔ تاکہ انہیں مزید[2] ذرائع
سے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی مل سکے۔ ڈنمارک کے سوا اور کہیں زراعت کو
کاروباری اصولوں پر منظم کرنے اور تعلیم سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش
نہیں کی گئی۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کہ بعض
لوگوں کے قول کے مطابق ڈنمارک میں دنیا کے تمام ملکوں کی نسبت فی کس
اوسط دولت زیادہ ہے۔

یہ تو ممکن نہیں۔ کہ ہم فی کس اوسط پیداوار متعلق صحیح اعداد و شمار پیش
کرکے اس سوال کو حل کرسکیں۔ لیکن انگلستان میں جنگ سے پہلے یہ اندازہ
کیا گیا تھا۔ کہ زراعت میں سالانہ پیداوار کا اوسط فی کس ۹۰ پونڈ ہے۔
اور دوسری صنعتوں میں ۱۰۴[3] پونڈ "بمبئی کاٹن ملز" ایک اوسط درجہ کا منظم
صنعتی ادارہ ہے۔ اسکی اوسط پیداوار فی کس ۱۱۱۰ ہے۔ سارے ہندوستان
میں اوسط ۲۱۲ روپیہ ہے۔ لیکن ان اعداد میں خام اجناس کی قیمت

---

[1] اکنامک آف پراگریس صفحہ ۱۴۰ ملاحظہ ہو۔ اس ملک (انگلستان) میں زرعی پیداوار میں مصنوعات سے
زیادہ نہیں۔ بلکہ کم منفعت ہوتی۔ صنعت و حرفت میں سرمایہ اور محنت صرف کرکے جسقدر فایدہ ہوگا۔ اُس کی نسبت
زراعت کے موجودہ طریقوں اور آمد سے کشاورزی کی بدولت اسی قدر سرمایہ صرف کرنے سے کم فایدہ ہوگا۔

[2] "سٹیٹ ہلپ فار اگریکلچر" صفحہ ۱۶

[3] "پوزیشن آف رورل ورکمان انڈسٹری" (دیہاتی مزدور کی حیثیت صنعت و حرفت ہے) صفحہ ۵۵

بھی شامل ہے۔ ہندوستان کی کوئلے کی کانوں میں پیداوار کا اوسط ۱۵۴
فی کس ہے۔ چونکہ اُون کا نرخ بہت گراں ہے۔ اس لئے اُون کی پارچہ باقی
میں اوسط ۲۳۰۰ ہے۔ ہندوستانی ریلوے کے ملازمین کی خام آمدنی کا اوسط
۱۸۰۱ ہے۔ کسانوں کے متعلق صحیح اعداد و شمار پیش کرنا تو ناممکن ہے۔ لیکن پنجاب
کی سالانہ پیداوار کا اوسط ۳۵۰ اور ۵۰ کے درمیان سمجھنا چاہیئے۔ لوگوں نے
زراعت اور صنعت و حرفت میں محنت و مشقت کر کے جس قدر مزید دولت کا اندازہ
کیا ہے۔ اگر اس کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا تو اغلباً زراعت کا پلہ ہی بھاری
نظر آتا۔ اگر اس صوبہ کی زراعت بمبئی کی صنعت پارچہ باقی کی طرح منظم اور
قابل لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی۔ تو اس امر کے متعلق کوئی شک و شبہ نہ
رہتا۔ کہ صنعت و حرفت اور زراعت میں سے کس کا پلہ بھاری رہے گا۔
ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیئے۔ کہ بمبئی کی ملوں میں ہر اوسط درجہ کا کارکن موجودہ
حالات میں جس قدر کپڑا تیار کر سکتا ہے۔ کرتا ہے۔ اور اس صنعت میں نفع
حاصل کرنے کے لئے جس قدر سرمایہ اور طاقت کی ضرورت ہے۔ اسے بھی صرف
کیا جا رہا ہے۔ اور مزدور بھی زائد از ضرورت نہیں۔ لیکن پنجاب کی زراعت
کی یہ حالت نہیں۔ یہاں مزدوروں کی تعداد بہت زیادہ ہے جس قدر طاقت
صرف کی جاتی ہے۔ وہ ضرورت سے بہت کم ہے۔ اور سرمایہ بھی بہت کم لگایا
جاتا ہے۔ اگر صوبہ میں طریق زراعت کا معیار ہی بلند کیا جاتا۔ تو پیداوار میں
بہت اضافہ ہوتا۔ لیکن یہاں تو یہ کیفیت ہے۔ کہ آج زراعت کے لئے جو بہترین
طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ وہ حقیقی منفعت بخش طریقوں سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

لہ پنجاب کے متعلق یہ بیان واقعی صحیح ہے۔ انگلستان کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو
در سٹیٹ پلپ فار اگری کلچر صفحہ ۲۔ ایک کھیت کی پیداوار دوسرے کھیت کی آمدنی سے
دگنی ہوتی ہے۔ جو اسی ضلع میں واقع ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ

باقی دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

صنعت و حرفت اور زراعت کو ترقی دینے سے جو اضافی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ان پر بحث کرتے وقت یہ یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ جب ہم صنعت و حرفت پر بحث کرتے ہیں۔ تو ہم قیاس کی حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ انہی امور کا ذکر کرتے ہیں جنکا وجود میں آنا قرین قیاس ہے۔ لیکن جب زراعت ہمارا مرکز بحث ہوتی ہے۔ تو ہم فوراً عملی یقینیات کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ پنجاب میں جس قدر کپاس پیدا ہوتی ہے۔ اسے صوبہ کے اندر کاتا اور بُنا نہیں جا سکتا۔ یہ تو ایک سیدھا سادہ سوال ہے۔ دوسری جگہوں میں جس طرح لوگ روئی کاتتے اور اس سے کپڑا بُنتے ہیں۔ ہمیں محض اس کی نقل کرنی پڑے گی۔ لیکن یہ یاد رہے۔ کہ کپڑا بُننے کا طریقہ بتا دینا نسبتاً آسان ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ جس طرح دوسری جگہوں میں روئی کی صنعت کا کامیابی ہوئی ہے۔ پنجاب میں اسی طرح اس کی کامیابی کیونکر ممکن ہے۔ دونوں میں جو فرق ہے۔ اُسے نہیں بھولنا چاہیئے۔ اول الذکر کا تعلق محض صنعتی قابلیت سے ہے۔ لیکن آخر الذکر اقتصادی نفع کے ٹیڑھے سوال سے تعلق رکھتا ہے۔ کوئی شخص

بقایا پچھلا صفحہ:۔ کہ ایک کھیت کا اعلےٰ انتظام کیا جاتا ہے۔ اُس پر کافی روپیہ لگایا جاتا ہے۔ اور دوسرے کو یہ چیزیں معلوم نہیں میسور کے دیوان نے ریاست مذکور کی اکنامک کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے جون ۱۹۲۰ء میں کہا تھا "ایک ایکڑ خشک زمین پر جتنی فصل ریاست کے اندر پیدا کی جاتی ہے۔ اس کی قیمت تقریباً ۱۵ روپے ہے۔ اور تری میں جس قدر فصل پیدا کی جاتی ہے۔ اسکی قیمت ۳۰ روپے ہے۔ اگر ریاست سے ہی مقابلہ کیا جائے۔ جب بھی ایک ہی زمین کی کاشت کے بہترین طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جبقدر فصل پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس فصل سے چھ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ جو معمولی طریقوں سے تیار کی جاتی ہے۔ صرف زراعت سے جو نفع حاصل ہوتا ہے۔ وہ بآسانی تقریباً دگنا کیا جا سکتا ہے۔ خواہ لوگ پرانے طریقے استعمال کریں۔ لیکن اتنا ضروری ہے۔ کہ جس سے اپنا کام دانشمندانہ طریق پر کرتے ہیں۔ اور اچھا سرمایہ حاصل کرنے میں سہولتیں میسر ہوتی رہیں۔ اگر ایک مزارعہ ایک بڑے قطعہ اراضی کو ادھار پر لے سکے۔ جیسا کہ میانوالی میں ہوا ہے۔ تو اسکی سالانہ پیداوار ایک ہزار روپیہ سے بارہ سو تک ہو گی تربیت یافتہ کسان اس سے بھی زیادہ پیدا کر سکتا ہے۔

یہ دعویٰ نہیں کرسکتا۔ کہ صوبہ کی موجودہ صنعتی کارخانوں مثلاً ہاتھ سے کپڑا بُننے چمڑے کو بُننے اور لوہے کا کام کرنے سے کسی شخص کو چنداں نفع ہوا ہے۔ پارچہ بافی کے کارخانے قایم کرنے کی جو کوشش کی گئی۔ ان میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ کسی صنعتی کارخانہ یا انتظام کی نقل کرلینا تو بے شک آسان ہے۔ لیکن یہ یاد رہے۔ کہ جن کاموں میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ وہ شاذ ہی منفعت بخش ثابت ہوتے ہیں۔ ریلوے ورکشاپ کو اگر کامیابی ہوئی۔ تو اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس کی مصنوعات کی فروخت یقینی تھی۔ جلو ٹرپنیں فیکٹری کو اس لئے کامیابی ہوئی۔ کہ عملی حیثیت سے خام جنس اس کی اپنی ملکیت تھی۔ ان کے علاوہ جن کارخانوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کی کامیابی کا باعث یہ ہے۔ کہ وہ مقامی مانگ کو پورا کرسکتے ہیں۔ اور اب ان کے کسی حریف کی گنجایش نہیں رہی۔ "دھاریوال وولن ملز" اپنے مال کی خوبی کی وجہ سے زندہ ہے۔ اس کارخانہ سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے۔ کہ اگر انتظام قابل لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اور ساتھ ہی اسکی امید بھی بندھ جاتی ہے۔ کہ صنعت وحرفت کے اور میں بھی کامیابی ناممکن نہیں۔ لیکن اتنا ملحوظ رہے ہے۔ کہ زراعت میں معقول کامیابی حاصل کرنے میں نسبتاً کم خطرات پیش آتے ہیں۔ مسٹر ملنے کے امریکن (۴ ف ۲) کپاس سے جس قدر پیداوار ہوئی۔ اس کا اندازہ اس طرح کیا گیا ہے۔ کہ اتنے ہی رقبہ[1] میں دیسی کپاس کی کاشت سے جس قدر روپیہ حاصل ہوتا اُس سے ۹۰ لاکھ روپیہ زیادہ حاصل ہوا ہے۔ جوں جوں امریکن کپاس مقبول ہوتی جائیگی۔ سالانہ نفع میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اب ایک اور قسم کی کپاس کی کاشت کا تجربہ کیا جارہا ہے۔ اور اس سے زیادہ بہتر نتائج کی توقع کی جاتی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے۔ کہ آجکل جس گیہوں کی کاشت کی جاتی ہے۔

---

[1] سنہ ۱۹۱۹ء و سنہ ۱۹۲۰ء میں اس رقبہ کا اندازہ ۵ لاکھ ۲۵ ہزار ایکڑ کیا گیا ہے۔

اس کی بجائے اگر نئی قسم کا گیہوں بویا جائے۔ تو پندرہ روپیہ فی ایکڑ کے حساب پیداوار میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور پھر خالص گیہوں بونے کی وجہ سے بہت زیادہ[1] فائدہ ہونگے۔ محکمہ زراعت نے اس سلسلہ میں اب تک جو ترقی کی ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اگر اعلےٰ قسم کا خالص گیہوں بویا جائے زراعت کے بہتر طریقے اختیار کئے جائیں۔ اور بہتر قسم کے آلات کشاورزی کام میں لائے جائیں۔ تو موجودہ رقبہ مزارعہ کی پیداوار کی خام قیمت میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ جن نہروں کی تعمیر زیر غور ہے۔ اگر وہ بن گئیں۔ تو بیس لاکھ ایکڑ مزید رقبہ سیراب ہو جائے گا۔ اور پیداوار بڑھ جائیگی۔ ٹیوب ویلز اور اس قسم کی دوسری اصلاحات کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ زراعت کا جس قدر علم اس وقت حاصل ہو چکا ہے۔ اور جس قدر مزدور فراہم ہو سکتے ہیں۔ ان کی مدد سے یہ اغلب ہے کہ صوبہ کی خام[2] پیداوار کی قیمت میں ایک ارب روپیہ کا اضافہ ہو جائے۔ ہاں اس کے لئے سرمایہ کی ضرورت پڑیگی۔ سارے صوبہ میں زراعت کی تعلیم کو وسعت دینے کی زبردست کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی لازمی ہے۔ کہ امداد باہمی کی تحریک کو بہت جلد ترقی دی جائے۔ تاکہ تمام کسان کاروباری اصولوں پر اپنی تنظیم کریں۔ اگر ایسا ہو گیا۔ تو تجارت بہت وسیع ہو جائیگی۔ اور زراعت کی ابتدائی صنعتوں کو فروغ دینے کا ولولہ بھی پیدا ہو جائیگا۔ زراعت کے مستقبل کا نقشہ کھینچنے کے وقت ہمیں انہیں کامیابیوں تک اپنا دائرہ نظر محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔ جو اس وقت حاصل ہو چکی ہیں۔ ہندوستان میں زراعت کی تحقیق و تدقیق اپنی نہایت

---

[1] بسنہ ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں بمقام لائل پور (پنجاب ۸ الف) سے ۴۳ من فی ایکڑ پیداوار ہوئی تھی۔ پنجاب ۱۱ کا رقبہ ۳۷۷۵۰۰ تھا۔

[2] اس ایک ارب سے معیار زندگی بلند ہو جائیگا۔ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں صوبہ کی تمام برآمد کی مجموعی قیمت ۴۴ کروڑ تھی۔ لوگوں نے زراعت کے متعلق جو علم حاصل کر لیا ہے۔ اسے مناسب طریقہ پر استعمال کیا جائے تو صوبہ کی تجارت دگنی ہو جائے

ابتدائی حالت میں ہے۔ موسم کے تغیرات اور مقامی حالات کے باعث ترقی میں رکاوٹ واقع ہوگئی ہے۔ اس صوبہ میں موسم کا تلون ایک ایسی چیز ہے۔ جن کے باعث پورے یقین اور وثوق سے کوئی مشورہ دینے کیلئے سالہا سال تک تجربات کرنا ضروری ہے۔ اس قسم کی علمی تحقیق کرنیوالے معدودے چند ہیں۔ زمانہ گذشتہ کے متعلق معتبر اور مستند حالات بہت کم موجود ہیں۔ یونیورسٹی کے شعبہ سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی۔ کہ علمی اور فنی تحقیق کرنے والوں کی اعانت کر سکے۔ اس لئے زمانہ گذشتہ میں ہم نے جسقدر کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ اس کامیابی کے سامنے جو مستقبل کے پردہ میں پنہان ہے۔ بالکل ہیچ ہے۔ ان امور کو ملحوظ رکھیئے۔ تو یہی اغلب معلوم ہوگا۔ کہ جاپان کی غلامانہ پیروی کر کے یورپ کے نمونہ پر بڑے بڑے کارخانے قائم کرنے کی بجائے ملک کی آئندہ خوشحالی اور فارغ البالی کا مدار زراعت اور متعدد صنعتوں پر ہے۔ جن سے زراعت کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ یا جو زرعی پیداوار کی بدولت قائم ہیں۔ یقیناً کوئی شخص پنجاب میں ان مصیبتوں کو رونما ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا۔ جو انگلستان میں کارخانوں کی بدولت عالم وجود میں آئیں۔ یا جو جاپان اور بمبئی کے مزدور[ل‍ه] رقبہ میں موجود ہیں۔ کارخانوں کے قیام نے بعض ایسے دشوار مسئلے پیدا کر دیئے ہیں۔ جن کا تعلق عمران اور حفظان صحت سے ہے۔ اور انگلستان میں بھی ابھی تک ان کا حل نہیں کیا جا سکا۔ صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والوں کی صحت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ مزاج میں چڑچڑاپن آجاتا ہے۔ شائد یہ چیزیں ناگریز نہ

[ل‍ه] ملاحظہ ہو۔ انڈین اکنامکس مصنفہ پروفیسر کیل۔ تیسرا ایڈیشن پیرا ۶۰۔ اس کے مطالعہ سے ہندوستانیوں کے خیالات کا اندازہ ہو جائے گا۔

ہوں۔ لیکن تقریباً دنیا میں ہر جگہ یہی کیفیت نظر آئی ہے۔ صنعتی کارخانوں نے لوگوں کی نگاہوں میں جو چکاچوند پیدا کر دی ہے۔ اس کا باعث صرف یہی ہے۔ کہ بعض سرمایہ داروں نے صنعت و حرفت سے بہت سی دولت کمالی ہے۔ تاہم صنعت و حرفت کی اوسط آمدنی تو انگلستان میں بھی بہت زیادہ نہیں۔ حالانکہ انگلستان کے صناع دنیا میں بہترین سمجھتے جاتے ہیں۔ پروفیسر مارشل نے ایک مقام پر صحیح لکھا ہے۔ کہ اگر ہم صنعتی کارخانوں کے مجموعی منافع کو اس سرمایہ پر تقسیم کریں۔ جو آج تک صنعت و حرفت پر لگایا جا چکا ہے۔ (ان میں وہ صنعتیں بھی شامل ہوں۔ جنہیں ناکامی ہوئی ہے۔ اور جن میں سرمایہ ذائع ہو گیا ہے) تو نفع کا اوسط بہت قلیل ہوگا۔ خوشحالی یا دولت جمع کرنے کے لئے کارخانوں کا وجود ضروری نہیں۔ اس کی ایک بہت بڑی مثال تو ڈنمارک ہے۔ اور دوسری مثال فرانس کا ایک بہت بڑا حصہ۔ پروفیسر مارشل فرانس کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ فرانس ایک بڑا صنعتی ملک ہے جس کے باشندے ایسے طریقے اختیار نہیں کرتے۔ جن کی بدولت وہ بہت بڑی تعداد میں مصنوعات تیار کر سکیں۔ فرانس کے لوگوں کو اقتصادی استحکام حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے ان کا رجحان کارخانوں کی جانب نہیں۔ فرانس کی دولت کارخانوں کی شرمندہ احسان نہیں بلکہ انفرادی کوششوں کی مرہون منت ہے۔ اس کی علت پر فرانسیوں کا وہ ذوق خاص ہے۔ جو قدرت نے انہیں فنون لطیفہ میں عطا کیا ہے۔ اور اس کا اصلی باعث وہ مہارت ہے۔ جو اہل فرانس اعلیٰ درجوں کی صنعتوں میں رکھتے ہیں۔ لیکن انگلستان اس لئے متمول ہے۔ کہ وہ فنون میں بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ اور اس کے کارخانوں میں بکثرت

---

[1] انڈسٹری اینڈ ٹریڈ۔ حصہ اول۔ باب ششم۔

مصنوعات تیار ہوتی ہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ ہم نے یہاں جو دلیلیں پیش کی ہیں۔ رائے عامہ ان کی مخالفت کرتی ہے۔ اور صنعت وحرفت کی حوصلہ افزائی کے لیے برابر کوششیں کی جارہی ہیں۔ پھر بھی اس چیز کی ضرورت باقی رہے گی۔ کہ ساتھ ساتھ زراعت کو بھی ترقی دی جائے۔ کیونکہ جب شہروں کی آبادی کارخانوں کے قیام کی وجہ سے بڑھ جائے گی۔ تو زرعی پیداوار کی مانگ میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ جو لوگ کارخانوں میں کام کرینگے۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اجناس خوردنی زیادہ مقدار میں پیدا کی جائینگی۔ اور نئی صنعتوں کی وجہ سے جوں جوں لوگ دولت حاصل کرتے جائینگے۔ اُن کی ضرورتیں بڑھتی چلی جائینگی۔ پنجاب کا محل وقوع ہی ایسا ہے۔ کہ اس صوبہ کی آبادی کے لیے باہر سے اشیائے خوردونوش منگوانا قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ صرف اس صوبہ کی حکومت ہی صنعتی ترقی کے کاموں میں حصہ نہیں لے گی۔ بلکہ آئندہ یہ حکمت عملی تمام صوبوں میں اختیار کی جائے گی۔ اس لئے جب یہاں اشیائے خوردونوش میں کمی واقع ہو گئی۔ تو اسے پورا کرنے کے لیے قرب وجوار کے علاقوں سے غلہ نہیں مل سکے گا۔ اور پنجاب سمندر سے اس قدر دور ہے۔ کہ سمندر پار کے ملکوں سے سالہا سال میں بھی غلہ منگوانے کا امکان نہیں۔ بہرحال صنعتی ترقی کی تحریک کا خواہ کچھ ہی اثر کیوں نہ ہو۔ زرعی طریقوں میں اصلاح اور پیداوار میں اضافہ نہایت ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے۔ کہ جب تک زراعت کو اس قدر ترقی نہ دی جائے۔ کہ زرعی پیداوار سے روزافزوں شہری آبادی کیلئے خوراک فراہم کیجائے اس وقت تک صنعتوں کو وسیع پیمانہ پر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اسطرح ان دونوں بڑے بڑے پیشوں یعنی زراعت اور صنعت وحرفت میں بظاہر جو اختلاف نظر آرہا ہے۔ وہ غیر حقیقی

ہے۔ اگر ان میں سے ایک پر توجہ صرف کردی گئی۔ اور دوسری کو نظر انداز کردیا گیا۔
تو یہ حکمت عملی کوتاہ نظری پر مبنی ہوگی۔

صنعتی کمیشن کی رپورٹ پر جو اختلافی نوٹ لکھا گیا تھا۔ اس میں کئی منطقی مغالطے
پائے جاتے ہیں۔ ان میں اہم ترین منطقی مغالطہ یہ تھا۔ کہ ایک قوم کے سیاسی اعمال
ہندوستان کے صنعتی زوال کا باعث نہیں۔ اور اس صنعتی زوال کی بدولت بار بار قحط
رونما ہو رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ آبادی کا جتنا حصہ زراعت میں
مصروف ہوگا۔ اشیائے خوردنی کی مقدار کا تناسب بھی اسی قدر رہوگا۔
اگر آبادی کا زیادہ حصہ زراعت پیشہ لوگوں پر مشتمل ہوگا۔ تو اشیائے
خوردنی بھی اسی نسبت سے زیادہ ہونگی۔ اور آبادی کا جتنا حصہ صنعت وحرفت
میں مشغول ہوگا۔ اشیائے خوردنی کی پیداوار میں اسی تناسب سے کمی واقع
ہوجائے گی۔ اگر اصل زراعت اپنی ضروریات سے بہت زیادہ اشیائے خوردنی
پیدا نہ کریں۔ تو اصل حرفہ کی کثرت نہیں ہوسکتی۔ اس امر کی شہادت
کہیں نہیں ملتی۔ کہ ہندوستان نے بیرونی ممالک سے اشیائے خورد نوش
منگوائی ہوں۔ اس لئے یہ ضروری ہے۔ کہ ملک کا انحصار اپنے ہی ذرائع
پیداوار پر رہا ہوگا۔ اس لئے اگر کبھی ہندوستان میں صنعت
وحرفت عروج پر رہی ہے۔ اور آبادی بیشتر حصہ صنعت وحرفت پر
گزارہ کرتا رہا ہے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ کہ بارش ہونے کی وجہ سے جب
غلہ میں کمی ہوئی ہوگی۔ تو صنعتی آبادی کی کثرت اشیائے خوردونوش کی قلت
میں ممد ومعاون ثابت ہوئی ہوگی۔ اس لئے جو لوگ یہ دلیل دیا کرتے ہیں۔ کہ عام
طور پر ہر سال ہندوستان میں جسقدر پیداوار ہوتی ہے۔ وہ اپنی ضروریات کے لئے
بھی کافی نہیں۔ انہیں چاہیئے۔ کہ صنعت وحرفت کو فروغ دینے پر زور نہ دیں۔ بلکہ
زراعت کی سماعت کریں۔ کیونکہ صنعتوں کی ترقی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ آبادی
بڑھ جائیگی۔ اور اس کے لئے خوراک مہیا کرنے کی غرض سے یہ ضروری ہے۔ کہ

اجناس خوردنی زیادہ مقدار میں پیدا کی جائیں۔
لیکن صرف مزدوروں کی خوراک کا مسئلہ ہی غور وفکر کا محتاج نہیں۔ بلکہ اور مسائل بھی قابل غور ہیں۔ اگر صنعتوں کو قائم کرنا مقصود ہے۔ تو ان کیلئے خام اجناس کی بھی ضرورت ہوگی۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ کہ ریلوے کے ذریعہ دُور دراز علاقوں سے اجناس خام لائی جائیں۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا۔ کہ اس صوبہ کی صنعتوں کا انحصار انہی خام اجناس پر ہوگا۔ جو اسی صوبہ کے اندر پیدا ہونگی۔ گویا صوبہ کی زمین ہی صنعت وحرفت کا مدار علیہ ہوگی۔ اس زاویہ نگاہ سے مسئلہ پر نظر ڈالیے۔ تو صنعت وحرفت اور زراعت کے مابین جو اختلاف اور دوری دکھائی دیتی ہے۔ ناپید ہو جاتی ہے۔ اگر اس صوبہ میں صنعتیں قائم کرنا اور انہیں فروغ دینا مقصود ہے۔ تو اس کا انحصار اسی پیداوار پر ہوگا۔ جو اس صوبہ کی زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے اس امر کی بہت طویل تحقیقات کرنا چاہیئے۔ کہ آیا اس صوبہ کی زمین ایسی خام اجناس پیدا کر سکتی ہے۔ جو صنعتوں میں کام آئیں۔ یہاں زراعت اور صنعت وحرفت کے موازنہ کا سوال ہی نہیں۔ بلکہ اصل سوال تو یہ ہے۔ کہ اکثر بڑے بڑے پیشے ایسے ہیں جن میں خوشحالی وامن کا ساتھ ہے۔ جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ فروغ حاصل کرتے ہیں۔ اور زراعت پیشہ ان سب سے پیش پیش نظر آتی ہے۔
ہم اس کتاب کے ایک ابتدائی باب میں جغرافیائی محلِ وقوع کے متعلق جو کچھ کہہ چکے ہیں۔ اس کی روشنی میں آپ کو صاف نظر آئے گا۔ آئندہ ہمیں ایسی اشیاء کی تلاش وجستجو پر اپنی تحقیق و تدقیق صرف کرنا چاہیئے۔ جن کی پیداوار کے لئے یہ صوبہ بہترین طریقہ پر موزوں واقع ہوا ہے۔ یا جن کی پیداوار دوسری چیزوں کی پیداوار سے زیادہ مفید ہے۔ ایسے معاملات میں انسان کو لازماً جذبات کے اشارہ چشم وابرو کی پیروی کرنے کے بجائے فطرت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے۔

اگر دوسرے لوگ سائنس اور اقتصادی قوانین پر اپنی توجہ صرف کر رہے ہوں اور پنجابیوں کے دل و دماغ پر جذبات کی حکمرانی ہو۔ تو اس مقابلہ کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ کسی شرح کا محتاج نہیں۔ اب تو یہ واضح ہو چکا ہے کہ دیہاتی اقتصادیات کا گہرا مطالعہ جس قدر زرعی خوشحالی کے لئے ضروری ہے۔ اسی قدر یہ چیز صنعتی ترقی کے شاندار دور کی بنیاد محکم کرنے کیلئے بھی لازمی ہے۔ کسان کو ضرور ایسی تعلیم دینا چاہیئے۔ جس کی بدولت وہ اپنے پیشہ کی وسعت اور فروغ کے تمام امکانات کو پوری طرح محسوس کرے۔ کیونکہ عظیم صنعتوں کا قیام بھی انہی امکانات کی ذیل میں آتا ہے۔ صوبہ کے ذی علم اور صاحب فہم لوگوں کو چاہیئے۔ کہ وہ زراعت کو بسرعت تمام ترقی دینے کی کوشش کریں کیونکہ کارخانوں کے لئے زراعت سے ہی خام اجناس مہیا کی جا سکتی ہیں۔ پنجاب کی صلاحیت و استعداد اس کے حل مطلب مسائل اور خصوصیات کا مطالعہ نہایت امعان نظر سے کرنا چاہیئے۔ اس کی تاریخ کا وہ حصہ جو اس کے موجودہ عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اُسے منظر عام پر لے آنا چاہیئے۔ اور اس سے آئندہ رہنمائی کے لئے صحیح نتائج اخذ کرنے چاہئیں۔ حکومت نے صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی جو حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے۔ اس سے اگر مستقل طور پر فائدہ اٹھانا مقصود ہے۔ تو اس کے لئے مناسب فضا پیدا کرنی چاہیئے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا۔ تو آئندہ چل کر نقصانات ناکامیوں اور مایوسیوں کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لوگوں کی آرزو تو یہ ہے۔ کہ صنعت و حرفت میں نہایت تیزی سے ترقی کی جائے۔ تاکہ صدیوں سے بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار ہنگامہ کی وجہ سے جو نقصان ہوا ہے۔ اس کی تلافی ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا علم صحیح ہو اور استدلال مربوط۔ آئندہ ابواب میں ہم چند قابل لحاظ امور کے متعلق کچھ لکھیں گے۔

چودھواں باب

زمانہ جدید کی سلطنت میں امداد باہمی کا ذکر

شاید یہ ہندوستان کی بدقسمتی ہے۔ کہ انگلستان ایک صنعتی ملک واقع ہوا ہے۔ اور انگلستان کے صنعتی مرکزوں میں امداد باہمی کو بہت فروغ حاصل ہے۔ وہاں امداد باہمی کے اکثر سٹور قائم ہیں۔ جو لوگوں کے لئے خانگی ضروریات مہیا کرتے ہیں اس لئے جو برطانی افسر ہندوستان میں آئے۔ وہ اپنے ساتھ امداد باہمی کا تخیل بھی لیتے آئے۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ انگلستان میں بھی گذشتہ صدی کے خاتمہ سے پیشتر لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ دیہاتی مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے امداد باہمی کی تحریک اکسیر اعظم کا حکم رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ اس تحریک کا ابتدائی کام انگریز کارکنوں کے ہاتھوں انجام پایا۔ انہوں نے اس راہ میں بہت سے تجربات کئے ناکامیاں بھی ہوئیں اور آخر کار کامیابی بھی حاصل کی۔ اور یہ خیال بھی جسے بعد میں ساری متمدن دنیا نے قبول کر لیا۔ سب سے پہلے انگلستان میں ہی پیدا ہوا تھا۔ لیکن مسٹر وولف کے انگلستان کا کوئی مصنف نظر نہیں آتا۔ جو امداد باہمی کو کسانوں کی تنظیم کا ذریعہ سمجھا ہو۔ چونکہ جزائر برطانیہ میں اراضی کے مالکانہ حصوں کا نظام قائم تھا۔ زمین پر بڑے بڑے نیک اور رحم دل زمینداروں کا قبضہ تھا۔ اور مزارعین سالانہ اجارہ ادا کر کے یہ سمجھ کر پوری محنت سے کام کرتے تھے۔ کہ لگان میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اس لئے وہاں امداد باہمی کی چنداں ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ مالکان اراضی زمین کی اصلاح و ترقی اور عمارات کی تعمیر کے لئے ضروری

سرمایہ مہیا کرتے تھے۔ اور مزارعین کے پاس جو تھوڑی بہت پونجی جمع ہوتی تھی۔ اس سے وہ مویشی اور کھاد وغیرہ خریدتے تھے۔ اس لئے انہیں قرض لینے کی اتنی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ خلیتی کسی ایسے ملک میں ہوسکتی ہے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی کی کثرت ہو۔ مزید برآں انگلستان کے کھیت ۱۰۰ یا ۵۰۰ یا اس سے زیادہ ایکڑوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور کسانوں میں اتنی استطاعت ضرور ہوتی ہے۔ کہ بنک میں کچھ نہ کچھ روپیہ ضرور رکھیں۔ پھر بنک بھی پرانے دیہاتی وضع کے جنہیں اس امر کا خاص خیال رہتا تھا۔ کہ ہمارا مفاد کسانوں کی خوشحالی سے وابستہ ہے۔ اور وہ اپنے مستحق موکلوں کی اعانت کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے جہاں کہیں لوگ مقامی بنک سے قرض نہ لے سکتے تھے۔ آلات کشاورزی اور کھاد وغیرہ کے تاجروں سے باسانی قرض لے لیا کرتے تھے۔ لیکن مغربی یورپ میں جہاں کسان ہی مالکان اراضی میں اس سے بالکل مختلف حالت تھی۔ چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی کو کسی دولتمند زمیندار کا سہارا انہیں تھا۔ کہ جب کبھی فصل خراب ہو۔ یا غلہ کی قیمت گر جائے۔ تو اس کا دامن پکڑیں۔ چنانچہ جب گذشتہ صدی کے وسط اور نصف ثانی میں یورپ پر زرعی دباؤ کا زمانہ آیا۔ تو یورپ کے پاس اتنے وسیع ذرائع نہیں تھے۔ کہ اس مصیبت سے عہدہ برا ہو سکے۔ لے دے کے اراضی ہی اس کی امیدوں کی آخری جائے پناہ تھی۔ اس لئے افلاس سے بھاگنے کی کوئی راہ دکھائی نہ دی اور کسان ساہوکاروں کے پھندے میں گرفتار ہوگئے۔ اس پر طرفہ یہ کہ امریکہ سے کثیر مقدار میں ارزاں گیہوں آگیا۔ جائداد کی قیمت گر گئی۔ کسانوں کی رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہی۔ اور مصیبت و افلاس کے اس المناک عہد کا آغاز ہوگیا جس سے آخرکار امداد باہمی کی ترقی اور لیگ اور اس کے پیرووں کی کوششوں کی بدولت نجات حاصل ہوئی۔

گذشتہ صدی کے نصف آخر میں طریق زراعت کے اندر ایک انقلاب رونما ہوگیا۔ اور زرعی اقتصادیات کی ساری بساط الٹ گئی۔ اس عہد میں جو تبدیلیاں

برروئے کار آئیں۔ ان میں امداد باہمی کے اصولوں کا رواج سب سے زیادہ خیر و برکت کا باعث تھا۔ ۱۹۰۸ء سے صدی کے خاتمہ تک یہ جدید تحریک اکثر پھیل چکی تھی۔ لیکن انگلستان نے اس کی جانب اسوقت توجہ کی۔ جب سر ہوریس پلینکٹ نے آئرلینڈ میں اس تحریک کو فروغ دے کر لوگوں کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ ادھر امریکہ میں پریزیڈنٹ روزولٹ نے دیہاتی زندگی کی تحریک شروع کی۔ انہوں نے اس تحریک کے سلسلہ میں سب سے پہلا یہ کام کیا۔ کہ ایک کمشن کو جو امریکہ کی بڑی بڑی ریاستوں کے نمائندوں اور بعض غیر سرکاری ارکان پر مشتمل تھا۔ یورپ میں بھیجا۔ تاکہ مختلف ملکوں کی لیاقت کرکے امداد باہمی کی تحریک کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کمشن کے ساتھ کناڈا نے بھی اپنے نمائندے بھیجے۔ یورپ میں ریاست ہائے متحدہ کی جس قدر سفارت گاہیں موجود ہیں۔ سب کو یہ ہدایت کردی گئی تھی۔ کہ مختلف ملکوں میں تحریک امداد باہمی نے جس قدر ترقی کرلی ہے۔ اس کے متعلق مواد فراہم کرلیں۔ اس طرح جو مواد فراہم ہوا۔ اسے مسٹر ہیرک امریکن سفیر متعینہ فرانس نے ترتیب دیا کمشن نے یورپ میں شہادتیں جمع کیں اور امریکہ کے دیہاتی حالات فراہم کرنے کے لئے ہر ریاست میں ایک چھوٹی سی تحقیقاتی مجلس مقرر کردی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یورپ کی امداد باہمی کی جانچ پڑتال غیر جانبدار امریکن نے کی۔ جن کے ذہن مقامی تعصبات اور جھگڑوں قضیوں سے متاثر نہیں تھے۔ ان میں سے بعض تو سرکاری رپورٹوں میں موجود ہیں۔ لیکن اس تحقیقات کے زیادہ قیمتی نتائج ان کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ جو اس کمشن کے بعض ممبروں نے لکھی ہیں۔ یورپ کے نظام امداد باہمی کی اس تحقیق زراعت کو بہت فائدہ پہنچا۔ اور یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ چھوٹی چھوٹی اراضی کو کامیاب کرنے اور بڑی بڑی اراضی کو منفعت بخش بنانے کے لئے امداد باہمی کے اصولوں کا رواج نہایت ضروری ہے۔ دیہات کے مالی معاملات میں امداد باہمی کو مناسب درجہ حاصل ہوگیا۔ اور یہ عام اصول تسلیم کرلیا گیا۔ کہ امداد

باہمی کی امداد سے پیداوار کو فروخت کرنا بہترین طریق کار ہے۔

یہ ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے۔ عام حالات میں تو اغلب تھا۔ کہ کئی نسلوں تک جدوجہد کرنے کے بعد ان نتائج کو صحیح تسلیم کیا جاتا۔ لیکن جنگ کی وجہ سے یہ حقیقت جلد پوری طرح واضح ہو گئی۔ کہ ہر ملک کو خوراک کے لئے اپنے ہی ذرائع پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ اس طرح زراعت کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی۔ اور یہ مان لیا گیا۔ کہ جنگ کا زمانہ ہو۔ یا امن کا دور۔ زراعت ہر حالت میں ملک کی بہترین صنعت ہے۔ چنانچہ مسٹر لائڈ جارج نے کہا تھا۔ کہ حکومت کا مفاد اولیت کا حق رکھتا ہے۔ اور حکومت کے مفاد کی ترقی کا مدار پیداوار پر ہے[۱]

اس کے بعد تو ہر ملک میں نہایت سرگرمی سے ایسی تدبیریں اختیار کی جانے لگیں۔ جو ہر قسم کی زرعی مجالس کے قیام میں ممدو معاون ثابت ہوسکیں عہدنامہ صلح کے بعد ان تمام علاقوں میں جو جنگ کے منحوس اثرات سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ زراعت و صنعت اور حرفت کی تجدید کا کام انجمن ہائے امداد باہمی کے سپرد کر دیا گیا۔ براعظم یورپ میں پچاس سال کے اندر زراعت پر صنعت وحرفت نے سبقت حاصل کر لی تھی۔ اس لئے وہاں امداد باہمی کی تحریک کو زراعت کے فروغ کا بہترین ذریعہ سمجھا جانے[۲] لگا

امریکن کمشن کو جلد معلوم ہو گیا۔ کہ ان کے سامنے جو مسئلہ پیش تھا۔ وہ

---

[۱] اسٹر حال اکتوبر ۱۹۱۹ء

[۲] ۱۹۲۰ء میں مسٹر ایم ایل ڈارلنگ آئی سی ایس۔ اور مسٹر سی الیف مسٹر کلینڈ آئی سی ایس۔ جو دوران پنجاب میں ڈپٹی رجسٹرار کے عہدہ پر فائز رہ چکے تھے۔ یورپ کے بعض ملک میں چند مہینے بسر کر کے وہاں کی تحریک کا مطالعہ کیا۔ اول الذکر اس وقت رجسٹرار ہیں۔

کسانوں کے لئے باسانی روپیہ حاصل کرنے کے مسئلہ سے زیادہ وسیع اور پیچیدہ واقع ہوا تھا۔

ابتدائے تحقیقات میں ہی انہیں یقین ہو گیا تھا۔ کہ زیر بحث مسئلہ کو دیہاتی زندگی کے اہم اصول کی طرح اساسی خشت حاصل ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا۔ زرعی پیداوار میں امداد باہمی کے اصولوں کے استعمال نے اراضی کو صرف اقتصادی حیثیت سے ہی فائدہ نہیں پونچایا۔ یا محض زراعت کے ذرائع کو ملحوظ ہی نہیں رکھا۔ بلکہ اس سے افراد کی تعلیم کو بھی ترقی حاصل ہوئی۔ اور دیہات کی سوسائٹی کو زیادہ استحکام اور پائداری حاصل ہو گئی ہے۔ اس طرح زراعت کو جس کی تعلیم کی جانب لوگوں کو سب سے پہلے متوجہ ہونا چاہئے دوسری تمام صنعتوں کے بعد ترقی کرنے کا موقع ملا[1]۔

امریکہ والوں کا حسب ذیل بیان اس سے بھی زیادہ پر زور ہے۔

"اب ہم امداد باہمی کے نہایت ابتدائی اصولوں سے واقف ہونے لگے ہیں۔ اور اگر اس سلسلہ میں ناکامیاں ہو رہی ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں ابھی تک اس بات کا بھی صحیح علم نہیں ہوا کہ امداد باہمی دراصل کیا شے ہے۔ یہ کوئی ایسا اصول نہیں۔ جو ابھی تک غیر مسلم حیثیت رکھتا ہو ہم ایک پر زور حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ جس میں ذرہ بھر ابہام نہیں عملی حیثیت سے یورپ کے ہر ملک میں یہ حقیقت اس حد تک ثابت ہو چکی ہے۔ کہ اب اس میں نہ کسی دلیل کی گنجائش ہے۔ اور نہ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ امداد باہمی کی وجہ سے اجناس سستی ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی فراہمی بھی آسان ہو جاتی ہے۔ منافع میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی فروخت بھی یقینی ہو جاتی ہے۔ انسانی قوت اور قابلیت میں اس قدر مضبوطی آجاتی ہے کہ اس سے منفعت بخش کام

---

[1] یہ اقتباس سکت جیوان رپورٹ سے لیا گیا ہے۔

لیا جا سکتا ہے۔ اس کے بالواسطہ اثرات یہ ہیں۔ کہ عملی علم وسیع ہو جاتا ہے تعلیمی قابلیت نمایاں طور پر بڑھ جاتی ہے۔ خیالات میں تحریک پیدا ہوتی ہے اس کا مقصد کھیتی باڑی کے کام کو منفعت بخش اور زیادہ آسان بنانا اور ایک اعلیٰ دیہاتی تمدن قائم کرنا ہے۔ جس میں خوش حالی فراغت اور قناعت کا دور دورہ ہو۔ اور یہ اس عہد کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ کسانوں کے لئے جو چیزیں مفید ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ حکومت کے لئے بھی مفید ہوں[1]۔

امداد باہمی کی تحریک سے جو بڑے بڑے فائدے ہو سکتے ہیں۔ انہیں سب لوگوں نے جنہوں نے اس موضوع کا مطالعہ کیا ہے۔ تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن ایک مقصد کی اہمیت کو تسلیم کرنا آسان ہے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنا زیادہ دشوار۔ کیونکہ مقصد کے حصول کے لئے ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے۔ جو اس امر سے باخبر ہوں۔ کہ اس راہ میں کیا کرنا چاہیے جو بے نفس بھی ہوں اور ساتھ ہی تعمیری کام کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے۔ اور شاذ ہی ایسا ہوا۔ کہ اس گروہ سے کوئی ایسا شخص پیدا ہوا ہو۔ جس نے ذاتی[2] مفاد کو ہی پیش رکھ کر صحیح کوئی نئی تحریک چلائی ہو۔ یہ حقیقت بہت اہمیت رکھتی ہے کہ امداد باہمی کی تحریک کے سلسلہ میں زراعت پیشہ طبقہ سے کوئی کامیاب رہنما[3] پیدا نہیں ہوا۔ دیہات

---

[1] امریکن کمیشن کی بناوٹ بینٹنی کمیٹی ص۶۴

[2] سمتھ گوردن کی کتاب "کوآپریشن فار فارمرز" (کسانوں کے لئے امداد باہمی)

[3] ہیرک ص۴۵۶ ڈنمارک اس سے مستثنیٰ ہے۔ "ڈنمارک میں تحریک امداد باہمی کی تحریک جن لوگوں نے نہیں شروع کی۔ بلکہ اسے شروع کرنے والے مالکان اراضی بھی نہیں تھے۔ یہ تحریک آہستہ آہستہ دیہات کے اندر کسانوں میں پیدا ہوئی۔ اس کی بنیاد استحکام اور تعاون کے جذبات کی بدولت پڑی تھی۔ جو صدیوں سے ڈنمارک کے کسانوں میں چلے آتے تھے۔

بقایا دوسرے صفحہ پر

میں جنہوں نے اس تحریک کو پھیلایا۔ وہ اس طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ دیہات میں جو ذی ہوش نوجوان پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے حالات و اسباب انہیں مجبور کرتے ہیں کہ شہروں میں معاش تلاش کریں۔ اس لئے یہ ضروری ہے۔ کہ شہروں سے ایسے دانشمند رہنما پیدا ہوں جو گاؤں والوں کی ضروریات کو سمجھیں اور انہیں پورا کرنے کے لئے مجلسیں قائم کریں۔ اس لئے خواہ انجمن ہائے امداد باہمی شہری ہوں یا دیہاتی یہ ضروری ہے۔ کہ تحریک کا آغاز شہروں سے ہو شہر والوں کو یہ تعلیم ضرور دینا چاہیئے کہ وہ دیہات کے مسائل میں عملی دلچسپی لیں تحریک امداد باہمی کے سلسلہ میں جن لوگوں کو پہلے پہلے کامیابی ہوئی۔ ان میں کاروباری قابلیت بھی تھی۔ اور ساتھ ہی اس بارے میں ان کا عقیدہ بہت پختہ تھا کہ وہ اس تحریک سے بہت معاشرتی فوائد حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ لوگ مزدور پیشہ تھے۔ تعلیمیافتہ بھی نہیں تھے۔ لیکن قدرت نے انہیں ذکاوت فہم کی دولت عطا کی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا۔ کہ مزدور پیشہ لوگوں کے ہاتھ جو چیزیں فروخت کیجاتی ہیں۔ وہ نہایت ناقص ہوتی ہیں اگر کوئی ایسا طریقہ معلوم ہو جائے جس کی بدولت یہ لوگ سستے داموں میں اچھی خوراک حاصل کرسکیں۔ جو یہ یقیناً معاشرتی فلاح و بہبود کی راہ میں ایک کامیاب قدم ہوگا۔ انہوں نے ایک سیدھی سادی کاروباری تجویز پر ایک بڑا معاشرتی نصب العین قائم کرلیا۔ ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا۔ کہ مقابلہ و سابقت کی جگہ امداد باہمی

بقایا پچھلا صفحہ۔ اسلئے ڈنمارک میں امداد باہمی کے قیام کی صحیح تاریخ نہیں بتائی جاسکتی۔ کیونکہ یہ صدیوں میں قایم ہوئی۔ اور کسی فرد واحد یا کسی مجلس کی بدولت وجود میں نہیں آئی۔ ملاحظہ ہو۔ فیبر کی کتاب (کوآپریشن ان ڈینش اگری کلچر) صفحہ ۹۔ ۱۸۶۶ء نے بعض مخیر اشخاص نے ادنشڈیل سٹور کی وضع کے امدادی سٹور قایم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش میں انہیں ناکامی ہوئی۔

ؔ ”رورل لائف پر ایلمنز آف یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ“ صفحہ ۱۵۱

کا ہمدردانہ جذبہ پیدا ہو جائے۔ یہاں اس تحریک کی تدریجی ترقی کا تذکرہ موزوں نہیں صرف اتنا کہ دینا کافی ہوگا۔ کہ "راشڈیل ایکوٹیبل پاؤنیرز" کے نام سے پہلے پہل جو مجلس ۱۸۴۴ء میں قایم ہوئی۔ اب اس کے ۲۲۲۵۷ ممبر ہیں۔ اور اس کا سرمایہ تین لاکھ پونڈ سے متجاوز ہے برطانیہ میں امداد باہمی کے تمام ممبروں کی تعداد ۳۷۷۰۰۰ لاکھ سے زیادہ ہے۔ سال بھر میں چودہ لاکھ تیس ہزار پونڈ کی اجناس فروخت ہوئیں۔ اور گذشتہ ۵۵ سال کے اندر ممبروں کو ۲ کروڑ پونڈ بطور حصہ واپس مل گئے۔ بڑی بڑی انجمنوں نے ایک کروڑ اسی لاکھ پونڈ تو عمارتوں میں لگایا گیا۔ اور تیس کروڑ پونڈ رہن[1] وغیرہ ہیں۔

اگرچہ امداد باہمی کی تحریک نے باشندگان برطانیہ کی شاندار خدمات کی ہیں۔ اور اب بھی کر رہی ہے۔ لیکن ابھی تک تو یہ حاصل نہیں ہو سکا۔ کہ امداد باہمی کی ایک دولت مشترکہ قایم کی جائے۔ جس میں ہر شخص مفاد عامہ کے لئے خدمت کرے۔ اُسے اپنی محنت کا پورا ثمرہ ملے اور ملک میں یک جہتی اور یگانگت کا دور دورہ ہو۔ جو لوگ اس میدان میں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ان میں احساس پیدا ہو گیا ہے۔ کہ بڑے بڑے ذخیرے قایم کرنے اجناس کو نقد قیمت پر فروخت کرنے اور قلیل منافع حاصل کرنے کا کیا فایدہ ہوتا ہے۔ آجکل کاروبار میں کامیابی کا مدار اس امر پر ہے۔ کہ دماغی اور ذہنی قوا بہت ترقی یافتہ ہوں۔ خیالات اچھوتے ہوں اور اس بات کی سمجھ ہو۔ کہ کس چیز سے نفع ہو سکتا ہے۔ امداد باہمی کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ ہمارا انتظام ایک مجلس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہ طریقہ اس بات کے لئے موزوں نہیں۔ کاروبار کے دوران میں یہ ضروری ہوتا ہے۔ کہ ایک فیصلہ کیا جائے۔ تو اس کے مطابق بلا کاوش

[1] جمیعتہ حرفا کی سالانہ رپورٹ۔

فہم اور دانشمندی سے کام لے کر عمل بھی کیا جائے۔ لیکن دوسرے ممبروں کو یہ سمجھانے میں کہ جو چیز پہلی نظر میں بہترین معلوم ہوتی ہے۔ لازماً بہترین نہیں ہوتی۔ بہت سا وقت اور محنت صرف ہوتی ہے۔ ایک ایسا ہی شخص جو دور اندیش بھی ہو۔ اور کیریکٹر کا بھی مضبوط ہو۔ عام آدمیوں کی ایک مجلس کو اپنا زاویہ نگاہ سمجھانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے۔ کہ ایک شخص میں یہ تمام اوصاف ہوں۔ مزید براں جوں جوں امداد باہمی کی تحریک ترقی کا قدم بڑھاتی جا رہی ہے۔ ان لوگوں کے خیالات و عقاید کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ جن کے قلب میں امداد باہمی کے عقیدہ نے پہلے پہل پرورش پائی تھی۔ امداد باہمی کا کام برابر وسعت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور جن لوگوں کے ہاتھ میں دیر کا انتظام ہے۔ انہیں کاروبار کی زیادہ تربیت نہیں ہوئی۔ اس کے مسایل بھی اپنی عمر کی حیثیت کے اعتبار سے تقریباً تجارت کے عام مسئلوں کی مانند ہیں۔ اور ذہین لوگ فوراً اُن خصوصیات کو سمجھ لیتے ہیں۔ جن کی بدولت کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

پروفیسر مارشل نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ جسمانی مشقت کرنیوالے لوگ اور محدود اشخاص امداد باہمی کے سلسلہ میں صرف اس قدر کر سکتے ہیں۔ کہ عام لوگوں علے الخصوص مزدوری پیشہ طبقوں کی خوراک کیلئے اشیائے خورد و نوش پیدا کریں۔ یا انہیں فروخت کریں لیکن صنعتوں کو خاص کاروباری اصولوں پر چلانا تو اُنہیں لوگوں کا کام ہے۔ جن میں کاروبار چلانے کی قابلیت ہو۔ یا جو کاروبار کی تنظیم کے اہل ہوں۔ اکثر چھوٹی چھوٹی صنعتیں جنہیں چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار امداد باہمی کے اصولوں پر چلاتے ہیں۔ اس

اس لئے ناکام رہی ہیں۔ کہ انہیں مدد نہیں ملتی۔ اور ان میں ایسے رہنما ہیں جو کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں*

جہاں تک تقسیم کا تعلق ہے۔ امداد باہمی کی تحریک کی حدود مقرر ہیں جن سے آگے یہ نہیں بڑھ سکتی۔ یہ تحریک اس لئے محدود ہو گئی ہے۔ کہ آجکل کارو بار میں مہارت خصوصی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر ایسے قابل رہنما نہیں ملتے۔ جو امداد باہمی کی انجمنوں میں کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے۔ کہ شہروں میں امداد باہمی کی تحریک ناکام ہوئی۔ شہروں میں بھی اس سے وسیع اخلاقی اور اقتصادی نتائج ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ کیونکہ مزدوری پیشہ طبقہ جن حالات میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اُن میں بہت اصلاح ہو گئی ہے۔ ہندوستان میں بے نفسی اور سرگرمی سے کام کرنے والوں کے لئے کافی میدان ہے۔ یہ نسل یا آیندہ نسل اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا بھی دیکھ لے گی۔ غالباً امداد باہمی کی تحریک ہی کی بدولت غریب لوگ ولالوں اور ایجنٹوں سے محفوظ رہے گی۔ اور اس تحریک کے طفیل ہی لوگوں کو اقتصادی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا موقع حاصل ہو جائے گا*

تقسیم سے قطع نظر کرکے دیکھئے گا۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ شہری تحریک امداد باہمی نے اطالیہ اور اکثر دوسرے مقامات پر اور عوام کے بنکوں کے توسط چھوٹے چھوٹے تاجروں اور کاریگروں کی ساکھ قایم کر دی ہے۔ تجارت کی کامیابی کا اصل الاصول تنظیم ہے۔ جب تک کسان کو صرف اپنی ضروریات پورا کرنے کی فکر رہی۔ اُسے متحد ہونے کا خیال نہ آیا۔ کہ جب وسایل رسل و رسایل کو ترقی ہوئی۔ اور منڈیوں کے دروازے اُس پر کھل گئے۔ تو کسان پر تاجروں کی توجہ مبذول ہوئی۔ ان لوگوں کا مقصد یہ تھا۔ کہ کسان کو کم از کم روپیہ دیں۔

اور زیادہ سے زیادہ غلہ حاصل کریں۔ جب کہ گرد و پیش کے لوگ منظم ہو کر اپنے لئے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ تو کسان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ کہ یا اپنے اندر بھی تنظیم پیدا کرے یا مٹ جائے۔ یہ اور بات ہے کہ خواہ کوئی دوسرا شخص یعنی گاؤں کا دوکاندار تنظیم[۱] کا باعث ہو جائے یا کسان خود اپنی تنظیم آپ کریں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلے پہل بیرونی اثرات نے کسان کو منظم کیا۔ یعنی دوکانداروں کی حرص نے کسان کے لئے بہت محرک ثابت ہوئی۔ اور کسان اپنے پراگندہ شیرازہ کو مجتمع کر کے ایک مجلس[۲] قائم کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ چونکہ زراعت سب سے بڑی اور سب سے اہم صنعت ہے۔ اور تجارت کا سارا انحصار انہی پر ہے۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ اس کی تنظیم کی جائے۔ لیکن زراعت کے حالات کچھ ایسے عجیب و غریب واقع ہوئے ہیں۔ کہ اس کی تنظیم غیر معمولی طور پر مشکل ہو گئی۔ زراعت کی عنان کثیر التعداد چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کا مجموعی سرمایہ بہت بڑا ہے۔ کسان سرمایہ دار بھی ہوتا ہے۔ مزدور بھی۔ اور فن زراعت کا ماہر بھی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ کوئی شخص ان تینوں چیزوں میں کامل نہیں ہو سکتا وہ فروخت کرنیکے لئے اجناس پیدا کرتا ہے۔ تو اُسے یہ بھی جاننا چاہیئے۔ کہ انہیں کیونکر فروخت کیا جائے۔ کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ

---

[۱] ملاحظہ پوٹاو صفحات ۱ تا ۳ [۲] بنیاف کی "کوآپریشن ان رشیا" (روس میں امداد باہمی) صفحہ ۳ ایجنٹوں کے مٹ جانے کی وجہ سے جو اپنی جیب میں بہت سا نفع ڈال لیتے ہیں۔ جن کے معمول کا اپنی کوئی حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ صدا بلند ہوئی ہے۔ کہ ایجنٹوں کو تباہ کر دو۔ تا وبا زرعی مجالس اس سے مستثنےٰ ہیں۔ لیکن امداد باہمی کی باقی تمام مجالس میں ایجنٹوں سے نجات حاصل کرنیکی خواہش اس تحریک کا سرچشمہ بنی ہوئی ہے

حاصل ہو۔ ورنہ دوسرے لوگ اُس سے اجناس کی فروخت کے بارہ میں بازی لے جائیں گے۔

کسان تنظیم کے ایسے عام طریقے بھی اختیار نہیں کر سکتا۔ جو کارخانوں کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں۔ اس کی صنعت چھوٹی چھوٹی زمینوں پر مشتمل ہے۔ زمین کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ممکن ہے۔ کہ ساری اراضی ایک جگہ جمع کر دی جائے۔ اس لئے یہ تو ممکن نہیں کہ سرمایہ کا بیشتر حصہ ایک جگہ جمع کرکے زراعت کو ترقی دی جائے۔ البتہ ان لوگوں کی مجلسیں قایم کی جا سکتی ہیں۔ جن کے ہاتھ میں زراعت کی زمام اہتمام ہے۔ انہیں اس بات کے ماتحت زراعت کی تنظیم تمام صنعتوں کے بعد ہوئی۔ لیکن اس کے سوا بعض دوسرے قابل ذکر اسباب بھی ہیں۔ صنعت و حرفت بعد تجارت سے جس قدر آسانی کے ساتھ دولت حاصل کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ اُس قدر آسانی سے زراعت میں دولت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور کئی نسلوں سے یہی کیفیت چلی آتی ہے۔

باہمت لوگوں نے ناکامیوں کی پرواہ نہ کی۔ اور زراعت کو نظر انداز کرکے شہروں میں جا کر اس کوشش میں مصروف ہو گئے۔ کہ جس قدر جلد دولت سمیٹی جا سکے۔ سمیٹ لیں۔ یہ تو صحیح ہے۔ کہ زراعت کی بدولت لوگوں نے چنداں زیادہ دولت فراہم نہیں کی۔ زراعت ایسا کارو بار نہیں جس سے بہت نفع حاصل ہو سکے۔ زراعت جتنے لوگوں کے لئے اچھی طرح زندگی بسر کرنے کا سامان مہیا کر دیتی ہے۔ کوئی دوسرا پیشہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس میں بلند حوصلہ اور صاحب ہمت لوگوں کے لئے کوئی وسعت نہیں۔ ہر ملک میں یہ دیکھا گیا ہے۔ کہ جو نوجوان زیادہ سرگرم اور صاحب صلاحیت اور باہمت نہیں ہوتے۔ اُن کے حصہ میں کاشتکاری آتی ہے۔ بلکہ کچھ اس قسم کا تخیل

پیدا ہو گیا ہے۔ کہ ہر احمق شخص کسان بن سکتا ہے۔ اکثر لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر انہیں موقع ملے۔ تو وہ زراعت کو بھی منفعت بخش بنا سکتے نہیں۔ لیکن یہ احساس کم لوگوں کو ہے۔ کہ زراعت میں سائینس کے جدید طریقوں سے فایٔدہ اٹھانے کے اعلےٰ درجہ کی تعلیم اور دوسرے تمام پیشوں کی نسبت جو تعلیم یافتہ لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ باستثنائے محب سائنس[۱] کی زیادہ مکمل تعلیم کی ضرورت ہے۔ ان حالات کو پیش نظر رکھیئے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ سائینس کی جانب لوگوں کی بے التفاتی چنداں حیرت انگیز نہیں۔ لوگ بیچارے کسانوں کو بھول چکے ہیں۔ اور یہ تو کہیں پچھلے دنوں سے حکومت یا عوام نے اس کی جانب تھوڑی بہت توجہ کی[۲] ہے۔

زراعت ابھی تک غیر منظم صنعت ہے۔ ابھی تک اس کا مقصد کسان کی ضروریات زندگی پورا کرنا سمجھا گیا ہے۔ اُن اجناس کی کاشت کی جانب توجہ ہی نہیں۔ جن کی فروخت سے بہترین منافع بھی ہو سکتا ہے۔ اور یا اس منافع سے کسان اپنی ضروریات کی تمام چیزیں بھی خرید سکتے[۳] ہیں۔ اگر ہر صنعتی ادارہ ایسی چیزوں کی پیدائش میں وقت ضائع کرے۔ جو باعتبار محبت و کیفیت مزدوران کے لئے ضروری ہیں۔ اور فروخت کرنے کے لئے اشیاء پیدا نہ کرے۔ تو اس کی کامیابی میں بہت سخت رکاوٹ واقع ہو جائے گی۔ اور کسانوں میں یہ عام دستور ہے۔ یہ اصول تو اب کہیں جا کر تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ اگر کسان اشیاء کو فروخت کرکے اُن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ تو اُن کی فنی قابلیت کو ترقی دینا بے سُود ہے۔ اُن کے پیشہ کی نوعیت ہی ایسی ہے۔ کہ اشیاء کی پیدائش کے بارہ میں وہ آزاد ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ خرید و فروخت کے بارہ میں بھی وہ آزادی

---

[۱] پرنسپلز آف اورل اکنامکس مصنفہ کارور صنہ ۲۰ سٹیٹ بلیپ فار ایگری کلچر صہ ۴۹ اورل ای کنسٹرکشن ان آئرلینڈ صہ ۲۶

[۲] ستھ گورڈن کو آپریشن فار فارمرز صہ ۲۳ [۳] آرون کی "پلیس آف اگری کلچر ان انڈسٹری"۔

برت کر اپنے آپ کو نقصان پہنچائیں۔ پرانی وضع کے کسانوں کی یہ کیفیت تھی
کہ وہ اپنے لئے اشیائے ضروری تو گراں سے گراں قیمت پر خریدتے
تھے۔ اور ارزاں سے ارزاں نرخ پر اجناس فروخت کرتے تھے۔ شاید یہ مقبول
عام خیال کہ زراعت کی نسبت دوسری صنعتوں سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے
اسی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن جب سے زراعت کے کاروباری معاملات
میں امداد باہمی کے اصولوں سے کام لیا گیا ہے۔ کایا پلٹ گئی ہے آج
سے بیس سال پہلے امداد باہمی سے بالکل ہی بے پروائی برتی جاتی تھی۔ بلکہ
حکومت کے ماتحت ادارے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن اب اس
کے سر پر یورپ کی تمام ترقی یافتہ سلطنتوں کا دست شفقت[1] ہے

زراعت نے کاروبار کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس لئے ضروری
ہے۔ کہ کسان بھی کاروباری شخص بنے۔ جوں جوں وہ ایسی اجناس پیدا
کرتا جاتا ہے۔ جن کے لئے اس کی زمین زیادہ موزوں واقع ہو گئی ہے۔ اُن
کی زندگی زرعی پیداوار کے بجائے زراعت کے منافع پر منحصر ہو جاتی ہی
وہ منڈی اور منڈی کے حالات کا بیش از بیش محتاج ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے
ضروری ہے۔ کہ وہ پیداوار میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اجناس کی فروخت
کے بہترین[2] ذرائع کا بھی مطالعہ کرے۔

اگر وہ خود رائی سے کام لے۔ تو اُسے کامیابی کی کوئی امید نہیں
رکھنا چاہیئے۔ اُسے یقیناً وہ مروجہ ذرائع و رسائل استعمال کرنا چاہیئے
جن کی مدد سے کوئی بڑی صنعت دوسری بڑی صنعتوں کے مقابلہ کا بوجھ
برداشت کر سکتی ہے۔ چونکہ وہ اپنے ہمسایوں کے سرمایہ اور اپنے سرمایہ

---

[1] وولف ص ۲۲۲ پیرک ص ۳۵ ساری متمدن دنیا میں یہ تحریک ہو رہی ہے۔ کہ زراعت کے لئے امداد باہمی طفیل ساکھ حاصل کرنا ضروری ہے

[2] رگل ولیتھ اینڈ ویلز ص ۱۸ کا اور ص ۱۶ نورس ص ۱ زراعت کا مقصد یہی نہیں کہ زیادہ مفصل حاصل کی جائے یا زیادہ سور پالے جائیں۔ بلکہ اس سے زیادہ مال نفع مقصود ہے۔ اب تو اس تعلق کا گہرا اور وسیع علم حاصل کرنا ضروری ہے جو زراعت اور صنعتوں کے مابین موجود ہے۔ اور یہی چیز کسان اور اسکے بہی خواہوں کی امیدوں کا مرکز بنتی جاتی ہے۔

کو متحد و مجتمع نہیں کر سکتا۔ اس لئے۔ اُسے کم از کم تنظیم ہی کرنا چاہیے یعنی اگر سرمایہ مجتمع نہیں ہو سکتا۔ تو وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ متحد ہو جائے۔ اور زرعی سوالات و امداد باہمی کا منشا یہی ہے۔ اور زراعت کی کامیابی کیلئے امداد باہمی ضروری چیز ہے۔ دنیا بھر میں ہر جگہ ارباب فکر اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہو۔ اور جن لوگوں کو اس تحریک سے تعلق ہے۔ اُن پر اس حقیقت کی اہمیت واضح کی جاری ہے۔ اب کسان یہ سوال نہیں کر سکتے۔ کہ آیا ہمیں امداد باہمی پر عمل کرنا چاہیئے۔ یا نہیں" بلکہ وہ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہمیں امداد باہمی پر کب سے عمل شروع کر دینا چاہیئے" ہندوستان کیلئے یہ حقیقت بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ سر جان مسٹرچی آج سے بہت عرصہ پہلے یعنی ۱۸۷۳ء میں کہہ چکے ہیں۔ "ہندوستان کی موجودہ اور آیندہ خوشحالی اور ہندوستان میں ہماری حکومت کی خوشحالی کا دار و مدار اس ملک کے وسیع ذرائع پر ہے۔ جو عملی حیثیت سے غیر محدود لیکن اکثر و بیشتر محروم التفات ہیں۔ اگر ہم اُن ذرائع و وسائل سے فائدہ حاصل کرنا چاہیں۔ جو سائنس اور دولت کے طفیل ہمیں میسر ہیں۔ اور جن سے ملک کی اصلاح اور ترقی کی جا سکتی ہے۔ اور اگر ہم اُن اصولوں کو نظر انداز کر دیں جو ہندوستان کے واحد ذریعہ دولت یعنی زراعت سے تعلق نہیں رکھتے۔ تو ہم باسانی یہ پیشنگوئی کر سکتے ہیں۔ کہ ہندوستان کے زرعی خوشحالی نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کرے گی"

یہ فخر انیسویں صدی کی برطانی حکومت کو حاصل ہے۔ کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے۔ کہ زراعت کو ترقی دینا اور اس کی حوصلہ افزائی کرنا حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ اُن سے ساتھ ہی یہ بھی زمین کی اصلاح اور زراعت کی ترقی کے لئے زمیندار کے اکثر فرائض اپنے ذمہ[۱] لے لئے اور اب اُسے قطعی طور پر یہ امر تسلیم کر لیا ہے۔ کہ دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود کے لئے امداد باہمی کے جذبہ کو ترقی دینا چاہیئے۔ امداد باہمی کے اصولوں کی تشریح کرنا چاہیئے اور اُس کے

سلہ موقعے کے کمیشن کی رپورٹ بابت ۱۹۰۱ء۔ اے صفحہ [illegible]

طول و عرض میں زراعت کو اقتصادی اصولوں پر چلانا چاہیئے۔
اوپر ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہو جائیگا۔ کہ اگر کوئی ملک جسکا انحصار زراعت پر ہو۔ خوشحالی کو ترقی دینا چاہیئے۔ تو امداد باہمی کے اصولوں پر اس کی تنظیم ضروری ہے۔ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب کبھی کسانوں نے امداد باہمی کے سوا دوسرے اصولوں پر متحد ہونے کی کوشش کی ہے۔ انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ اگر امداد باہمی کی تحریک کو فروغ ہوا۔ تو اکثر لوگ جو اب ایسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جن کا انجام دینا انجمن ہائے امداد باہمی کا مدعا ہے۔ بیکار ہو جائینگے۔ اس طرح کسانوں کی دولت میں اضافہ تو ضرور ہوگا لیکن ساتھ ہی اکثر اشخاص کے افلاس میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ یہ دلیل تھوڑی سی توجہ کی مستحق ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ابتدا میں ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ ہمارا مقصد صوبہ کی خوشحالی کو ترقی دینا اور لوگوں کی اقتصادی سود و بہبود ہے۔ اور عوام کی مادی اور معاشرتی اور اخلاقی فلاح کیلئے امداد باہمی کا وجود ضروری تسلیم کیا جا چکا ہے۔ ان بنیادی امور کو یاد رکھنا ضروری ہے، کیونکہ بعض اوقات ہمیں ایسا معلوم ہوگا کہ درحقیقت اجناس پیدا کرنیوالی جماعت کا دولتمند اقلیت کے پاؤں تلے آ کر کچلا جانا مقصود اصلی ہے۔ ملک کی آبادی کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو پیدائش اجناس و اشیا میں مصروف ہے۔ اور دوسری وہ جو اجناس پیدا نہیں کرتی۔ آخر الذکر میں بعض کوئی مفید خدمت انجام نہیں دیتے۔ اس لئے وہ تو خارج از بحث ہیں۔ وہ اگر معدوم ہو جائیں۔ تو اس سے ملک کو اقتصادی فائدہ ضرور پہنچیگا۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اس سے ملک کے حسن ظاہری میں

---

[1] ملاحظہ ہو فورسس صفحہ ۱۱ امداد باہمی پر اسلئے زور نہیں دیا جاتا۔ کہ یہ اقتصادی تنظیم کی ایک خاص صورت ہے۔ جسکا اثر اور فائدہ اس کی مخصوص وضع اور ہیئت کا تابع ہے جو خاص حالات کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ یہ دیہات کے تمام نقائص کا علاج ہے ڈنمارک فی کس دولت کے اعتبار سے یورپ کے تمام ممالک پر فوقیت رکھتا ہے اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہاں زرعی امداد باہمی کا نظام بہت اچھا ہے۔

اضافہ نہیں ہو گا - باقی جو مفید خدمات انجام دیتے ہیں - انہیں بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - ایک تو وہ جنہیں اپنی خدمات کا معاوضہ مناسب مل جاتا ہے - اور دوسرے وہ جن کا معاوضہ انکی اقتصادی قدر و قیمت کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے -

پہلے گروہ کو تو امداد باہمی کی تحریک سے مخالف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں - البتہ آخر الذکر گروہ زراعت کیلئے ایک کابوس کی حیثیت رکھتا ہے - اور امداد باہمی کی تحریک اس کابوس کو دور کرنا چاہتی ہے - یہی لوگ ملک کی پستی کا باعث ہیں - اور ملک کا افلاس انہیں لوگوں کی کثرت اور اثرات کا تابع ہے - اور تو اور انگلستان میں غلے کے تاجروں[۱] اور دلالوں کی تعداد زرعی پیداوار کے تناسب کے اعتبار سے زیادہ ہے - اور ہندوستان کی تو یہ کیفیت ہے - کہ اگر ایک ضلع کی زرعی پیداوار سے صرف کسانوں کی ضروریات پوری کرنا مقصود ہو - تو اس صورت میں ہی یہ ضروریات پوری ہو سکتی ہیں - کہ انکی تعداد اتنی ہی رہے جتنی اب ہے - اگر ان کی تعداد میں اضافہ ہو جائے - تو ضروریات پوری کرنے کے لئے ضروری ہے - کہ زراعت کی اصلاح کی جائے تاکہ پیداوار میں بھی اضافہ ہو - لیکن زراعت پیشہ لوگوں سے ساہوکار بہت سا روپیہ وصول کر لیتے ہیں - اس میں سے اکثر روپیہ ایسا ہوتا ہے - جو مصارف زراعت پر صرف نہیں کیا جاتا - اگر احتیاط سے اندازہ لگایا جائے - تو معلوم ہو گا - کہ اگر کسان حکومت کو ایک روپیہ مالگذاری ادا کرتا ہے - تو ایک روپیہ مقدمہ بازی میں صرف کرتا[۲] ہے - اور کم از کم دو روپیہ ساہوکار کو سود کے طور پر ادا کرتا ہے - اگر کسی شخص کو اسکے اہم اثرات میں شبہ ہو تو اسے یہ اندازہ لگانا چاہئے - کہ اگر یہ سارا روپیہ[۳] زمین کی اصلاح و ترقی پر صرف کر دیا جائے - تو اس سے کسقدر

[۱] ایگریکلچر آفٹر دی وار مصنفہ ہال ص۱۴ - [۲] دکن رعیت کمیشن کی رپورٹ بابت ۱۸۷۵ء ملاحظہ ہو صفحہ ۱ -
[۳] ملاحظہ ہو صفحہ ۲ - وحشی اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہو سکتا - کہ کسان مقروض ہونے کیوجہ سے زمین کی پیداوار بڑھا نہیں سکتے - وہ جانتے ہیں - کہ اگر زمین میں قرض لیکر کنوئیں کھودے جائیں - تو ان سے صرف ساہوکار نفع حاصل کرے گا کسان اسلئے محنت کرتا ہے - کہ دوسرے لوگ آرام کریں - وہ بوتا ہے، اور دوسرے کاٹتے ہیں -

فائدہ ہو سکتا ہے۔ جو شخص اسطرح روپیہ ضائع کرتا ہے۔ سو یقیناً موجودہ افلاس کا باعث بنتا ہے
چونکہ اس سلسلہ میں قوم کی جو خدمات کی گئی ہیں۔ سو وہ اہم اور ضروری ہیں۔ اس لئے ہمیشہ اُن کی
ضرورت رہے گی۔ لیکن خدمت کرنیوالے بہت زیادہ معاوضہ لیتے ہیں۔ اسلئے یہ ضروری ہے۔
کہ ایسی خدمت ایک ایسے نظام کے تابع ہو۔ جسکا مقصد قوم کی اقتصادی سربلندی اور فلاح و بہبود ہے
ہمارا یہ منشا نہیں۔ کہ جن لوگوں کی خدمت قوم کے لئے نزدیک قیمت اور ہمت رکھتی ہے۔ انہیں علیحدہ
کردیا جائے، بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے۔ کہ وہ اپنی خدمات کے لئے جو حد سے بڑھا ہوا معاوضہ لیتے ہیں
اُس میں کسیقدر قطع و برید کردی جائے۔ ایجنٹ اور دوکاندار رہیں گے تو ضرور لیکن اُن میں نقصان
پہنچانے کی وہ طاقت نہ رہیگی۔ جو آجکل موجود ہے۔[1]

اِس بات میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کہ اگر زراعت کو ایک ایسا پیشہ بنانا مقصود ہے
جس میں اہلِ دانش و ہوش اور سرمایہ دار دو تو اپنے لئے کشش محسوس کریں۔ اگر زراعت کو خوشحالی
کے بلند سے بلند مقام پر پہنچانا ہے۔ تو یہ امر ضروری ہے۔ کہ جو لوگ اس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کو
اپنی محنت کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ حاصل ہو۔ زراعت کے طریقوں کو ترقی دینے، زمین کی
اصلاح کرنے اور کسی خاص فصل کی کاشت کو مقبولِ عام بنانے کے لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ کسان
کو زیادہ نفع حاصل ہو۔ جب یہ اعتراض کیا جائے۔ کہ امدادِ باہمی کو زیادہ وسعت حاصل ہوئی تو دوکانداروں
اور دلالوں میں بیروزگاری پھیل جائیگی۔ تو اس کا یہ جواب دینا چاہئے۔ کہ اصل بات تو یہ ہے کہ جس
شخص کو بیروزگاری کے پھندے میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے۔ آیا وہ جماعت کی کوئی ضروری
خدمت انجام دے رہا ہے۔ یا نہیں۔ اگر وہ واقعی کوئی خدمت انجام دے رہا ہے۔ تو اُسے اپنے سامان

[1] دیکھئے ڈارلنگ صاحب صفحہ ۱۷۲۔ ایجنٹوں اور دوکانداروں کی جماعت جو ادنیٰ النظر میں بیہود معلوم ہوتی ہے۔ کچھ نہ کچھ کام بھی کرتی ہے۔ اگر وہ معدوم ہوجائیں تو انکا کام کرنے کیلئے اتنی ہی تعداد میں دوسرے لوگوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ تو اغلب معلوم ہوتا ہے۔ کہ دیہات کی چھوٹی چھوٹی صنعتیں انہیں دوکانداروں کی دست برد کے باعث زوال پذیر ہیں جولاہا اپنی ضروریات کیلئے تو کافی کما لیتا ہے۔ لیکن اُسکی کمائی اتنی نہیں ہوتی۔ کہ وہ دوکانداروں کی ضروریات کیلئے بھی کافی ہو سکے۔ جولاہے کی نسبت بیکاری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور سود تاہی بھی نفع حاصل کرلیتے ہیں۔ اور کپڑے سے بچا۔

معیشت کے چھن جانیکا اندیشہ نہیں کرنا چاہئیے۔ ہاں اُسے اِتنا نقصان ضرور ہوگا۔ کہ اس کی آمدنی میں کمی واقع ہوجائیگی۔ اور اسیقدر معاوضہ ملیگا۔ جس قدر اسکی اقتصادی خدمات کی تحقیقی قیمت ہے۔ لیکن اگر وہ کوئی مفید خدمت انجام نہیں دیتا۔ تو وہ حکومت کے منفعت کا سبب ہے۔ اور اس کے معدوم ہوجانے سے خوشحالی کو ترقی ہوگی۔ اور خوشحالی کی ترقی ہر شخص کی آواز ہے۔

اس امر سے خائف ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ کہ مزدوروں کی مانگ کم ہوگئی تو بیروزگاری کا مسئلہ پیش ہوجائیگا۔ زراعت کی ترقی کیوجہ سے اسکی امدادی صنعتوں کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ آمدنی میں اضافہ ہوجائیگا تو مصارف بھی زیادہ ہوجائینگے۔ معیارِ زندگی بلند ہوجائیگا یا بہت کفایت شعاری سے کام لیا جائیگا۔ اور مزید مہمات انجام دینے کے لئے سرمایہ فراہم ہوجائیگا۔ ان حالات میں یقیناً تجارت کو ترقی ہوگی۔ اجناس کے رسل و رسائل اور تقسیم کیلئے زیادہ کارکنوں کی ضرورت پڑیگی۔ معیارِ زندگی کے بلند ہوجانیکی وجہ سے نئی ضروریات پیش آئینگی۔ جب روپیہ زیادہ مقدار میں صرف کیا جائے تو بیروزگاری کا بہت کم امکان ہے۔

جن لوگوں نے اقتصادیات کا مطالعہ کیا ہے۔ انکا عقیدہ ہے۔ کہ اگر کوئی اقتصادی مشکل پیش آئے تو یقیناً اسکی تہ میں اقتصادی اسباب شامل ہونگے۔ اور اغلب ہے۔ کہ اس کا اقتصادی طور پر مداوا بھی ہوسکے۔ بد قسمتی سے ہندوستان میں عام طور پر موجودہ حالات کی اصلاح سے مایوسی ظاہر کی جاتی ہے۔ مختلف اہلِ قلم جو خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ انکا مفہوم یا تو یہ ہوتا ہے۔ کہ موجودہ افلاس حکومت کی بدعنوانیوں کا شرمندۂ احسان ہے یا یہ کہ اس افلاس کو کسی طرح دور نہیں کیا جاسکتا۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں۔ جو پنجاب کے حالات پر پوری صحت سے منطبق نہیں ہوسکتے۔ یورپ کے بعض ممالک کو جو تمدن و تہذیب میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ جانے دیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ یورپ کے اکثر ممالک ایسے ہیں۔ جنکا مقابلہ اگر پنجاب سے کیا جائے تو ہمیں مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ پنجاب کی ترقی اور فلاح بہبود کیلئے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ اور یہاں کے حالات محنت کیلئے بہت سازگار واقع ہوئے ہیں۔ لیکن دوسرے ملکوں کی کامیابی اور ناکامی کے تجربات سے اس ملک کو بہت فائدہ اٹھانا چاہئیے۔ اور اس راہ پر جو دوسرے کے تجربات سے معین کردی ہے۔ نہایت تیزی سے بڑھتے چلا جانا چاہئیے۔ مثلاً یہ امر واضح ہوچکا ہے کہ جس [illegible] میں زراعت ترقی کررہی ہو سو وہاں حکومت بھی اسے فروغ دینے اور امدادِ باہمی کو پھیلانے کیلئے روپیہ اور محنت صرف کریگی۔ لیکن جس ملک میں زراعت روبہ زوال ہو۔ وہاں حکومت زراعت کی ترقی کی نئی راہ نکالنے کا کام

لوگوں پر چھوڑ دیتی ہے۔ اور امدادِ باہمی کے اصولوں پر کسانوں کی تنظیم کے مسئلہ کو نظرانداز کر دیتی ہے مختلف ملکوں کی زرعی حالت کا مطالعہ کئے بغیر اس قسم کا کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کی صحت پر اعتراض کرے۔ تو اس سے کسی ایسے ملک کا نام پوچھنا چاہئے۔ جہاں اس خیال کی تائید نہیں ہوتی اب تو اس قسم کے شواہد بکثرت دستیاب ہو چکے ہیں۔ کہ زراعت کو ترقی دینے کے لئے بیرونی محرکات کی ضرورت ہے۔ اگر زراعت کو شہر کی صنعتوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ تو امدادِ باہمی کے اصولوں پر اسکی تنظیم کرنا چاہئے۔ ایک زرعی ملک میں امدادِ باہمی ایک رشتہ کی حیثیت رکھتی ہے جسمیں تمام جماعت منسلک ہے جب اسے پنجاب پر منطبق کیا جائے۔ تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر زمانہ گذشتہ میں اس صوبہ کے اندر ایسے لوگوں کی تعداد کثیر تھی۔ جنہیں آرام و آسائش کی زندگی نصیب نہیں ہوئی۔ تو اسکی وجہ بہت حد تک یہ تھی۔ کہ اسکی تنظیم ان اصولوں پر نہیں کی گئی۔ جن سے دولت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ چند سالوں کے عرصہ میں تقریباً ۸ فیصدی کسانوں نے زمیندارہ بنکوں میں ایک کروڑ سے زیادہ روپیہ جمع کرا دیا ہے۔ اگر عام کسان اس امر پر آمادہ ہو جائیں۔ کہ منظم ہو کر کفایت شعاری اختیار کریں۔ اور امدادِ باہمی سے جسقدر نفع حاصل ہو سکے حاصل کریں تو امید ہے۔ کہ ایک پشت تک کسانوں کے اقتصادی حالات میں انقلاب رونما ہو گا امدادِ باہمی پنجاب میں وہی معجزے دکھا سکتی ہے۔ جو اُس نے ڈنمارک میں دکھائے ہیں +

پندرھواں باب

پنجاب کی مفلسی کے اقتصادی اسباب

اس ملک میں افلاس کے متعلق جو غلط خیالات اور غلط اندیشے پھیلے ہوئے ہیں۔ ویسے غلط اندیشے کسی دوسرے مسئلہ کے متعلق نہیں ہونگے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ امر کیوں ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ اس ملک کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے اور اس طریقہ کو کسی طرح حق بجانب[1] قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس امر کے متعلق جو عام خیالات رائج ہیں۔ اُن کی تردید کا کافی مسالہ موجود ہے۔ لیکن اس سے کوئی ایسا شخص ہی کام لے سکتا ہے جو اقتصادیات میں بصیرت رکھتا ہو۔ اور لوگوں کے ذہن کو سیاسی اور مذہبی تعصب سے نجات دینے کا پختہ اقرار کرلے۔ اس سلسلے میں اسقدر غلط خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں کہ غلط فہمی کے سرچشمہ کا پتہ لگانا آسان نہیں۔ بعض خیالات تو صریح طور پر بیہودہ ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں صرف ہندوستان ہی ایسا ملک ہے۔ جہاں مالگذاری[2] وصول کیجاتی ہے۔ کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ

---

[1] سر ایم۔ ویشویشرائے کی کتاب "ری کنسٹرکٹنگ انڈیا" (ہندوستان کی تعمیر جدید) صفحہ ۲۳۷ و صفحہ ۲۳۸ "ہندوستان میں عام طور پر زندگی کے متعلق اس قسم کا مایوسانہ زاویہ نگاہ قائم کر لیا گیا ہے۔ کہ کوئی انفرادی یا اجتماعی ترقی نہیں ہو سکتی۔ یہ عقیدہ عام ہے۔ کہ زندگی تو ایک ارتقائی منزل ہے۔ جس پر روح ایک دنیا سے دوسری دنیا تک جاکے ٹھہر جاتی ہے۔ یہ خیال جوش و سرگرمی کو افسردہ کر دیتا ہے۔ خوشیاں مٹ جاتی ہیں۔ اور تقدیر پرستی کو رواج ہوتا ہے۔ پھر کچھ مشترکہ کنبہ کا رواج باعثِ مصیبت ہے۔ لوگ اس امر پر فخر کرتے ہیں۔ کہ ہم اتنے بیکار آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ ہندوستانی تو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ زندگی بارِ گراں ہے۔ اور یورپ کے لوگ امید سے لبریز ہیں۔ اور وہ بیحد سرگرمی سے کام لیتے ہیں۔

[2] پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ایک ممبر کا بیان۔

لیجئے۔ اِس خیال کی غلطی کا اندازہ ہو جائیگا۔ اسی طرح یہ خیال ظاہر کرنا کہ زرعی پیداوار کی قیمت میں جو اضافہ ہُوا ہے۔ اُس سے لگان لینے والوں کو کوئی فائدہ نہیں ہُوا۔ غلط ہے۔ جو لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اِس امر کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کہ صوبہ کی نصف زمین ایسے مزارعین کے قبضے میں ہے۔ جو لگان جنس کی صورت میں (بٹائی) ادا کرتے ہیں۔ اِس طرح لگان لینے والوں کو اضافہ قیمت پیداوار سے پورا پورا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ان منطقی مغالطوں پر غور کیا جائے۔ تو آپ کو معلوم ہو گا۔ کہ ان میں سے اکثر اِس لئے پیدا ہو گئے ہیں۔ کہ لوگ موجودہ صورتِ حال کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا چاہتے۔ اُنکے نزدیک اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں۔ بلکہ اس کی ذمہ داری دوسروں پر عائد ہوتی ہے۔

اِن بے بنیاد اندیشوں کا ازالہ کرتے وقت یہ اعتراف کر لینا چاہیئے۔ کہ اس قسم کی کوئی کتاب موجود نہیں۔ جس میں مختلف ملکوں کے دیہاتی حالات و معلومات کا خلاصہ موجود ہو۔ ایک محبِ وطن پنجابی اگر اپنے اہلِ وطن کے سامنے دوسرے ملکوں کے حالات پیش کرنا چاہے تو اس سے یہاں کے حالات کا موازنہ کرنے کی خواہش کرے۔ تو اُسے بہت دشواریاں پیش آئینگی یہاں کتابوں کا انتظام اچھا نہیں۔ اس صوبہ کے متعلق کوئی کتاب موجود نہیں۔ جس میں بعض حقائق جو سرکاری رپورٹوں میں پائے جاتے ہیں۔ جمع کر دیئے گئے ہوں۔ غیر سرکاری اشخاص شاذ ہی سرکاری رپورٹوں کو پڑھتے ہیں۔ اسلئے انہوں نے بعض ایسے عقاید اختیار کر لئے ہیں۔ جن کی تردید بآسانی کیجا سکتی ہے۔ چونکہ سرکاری اعداد و شمار مختلف صورتوں میں بیان کئے جاتے ہیں۔ اس لئے وہ انہیں سمجھ نہیں سکتے۔ وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ صوبہ کی مجموعی مالگذاری معلوم کرنا آسان نہیں۔ اور صحیح صحیح مزروعہ رقبہ معلوم کر لینا تو ناممکن ہے۔ فصل کی مجموعی پیداوار کے متعلق بھی کسی کتاب میں اعداد و شمار موجود نہیں۔ سرکاری اعداد و شمار نہایت احتیاط سے جمع کئے جاتے ہیں۔ تاکہ حکومت پر کسی ایسی غلطی کے ارتکاب کا الزام نہ لگایا جائے۔ جس سے مالکانِ اراضی کے مفاد کو نقصان پہنچ سکتا ہو عام طور پر مالگذاری کے متعلق نہایت غلط خیالات رائج ہیں۔ بندوبست کی رپورٹوں میں اِس قسم کا کافی مسالہ موجود ہے

---

[1] یہ اکنامکس کے ایک پروفیسر کا خیال ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حکومت نے مالکان اراضی سے مزید مطالبات کرنے میں کسقدر احتیاط سے کام لیا ہے تاہم اس کے متعلق جو خیالات رائج ہیں وہ بالکل بے ربط اور بے بنیاد ہیں ہم اس کتاب میں ایک مقام ظاہر کر چکے ہیں۔ کہ حکومت جو مالگذاری لیتی ہے سو وہ خالص پیداوار کا ۵ فیصدی ہے۔ جاپان میں مالگذاری کا تناسب ۱۷ فیصدی ہے۔ ترکی میں پہلے ½ ۱۲ فی صدی ہوا کرتی تھی۔ لیکن جنگ کے دوران میں پہلے ۲۵ پھر ½ ۳۷ اور آخرکار ۵۰ فی صدی تک پہنچ گئی یہ مالگذاری سرکاری عہدیداروں کی سالانہ رپورٹ پر مبنی ہوتی ہے۔ اور سرکاری عہدیداروں کے لئے بعض خاص اغراض کے ماتحت جنکا ذکر یہاں ضروری نہیں، ایسا تخمینہ لگانا معمولی بات تھی۔ جن کی بدولت پیداوار میں حکومت کا حصہ نصف بلکہ نصف سے بھی زیادہ ہو۔ انگلستان میں مالگذاری کی سالانہ قیمت پر لیجاتی ہے۔ اور بحیثیت مجموعی بہت زیادہ ہوتی ہے پھر مالگذاری اسطرح لگائی جاتی ہے۔ کہ پنجاب سے اس کا مقابلہ دشوار ہے۔ ہالینڈ میں یہ طریقہ ہے۔ کہ زمین کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ اور جسقدر قیمت مقرر ہو۔ اسے راس المال فرض کرکے اس پر ۴ فیصدی آمدنی شمار کیجاتی ہے پھر اس آمدنی پر ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ اور اس ٹیکس کو مزارع اور مالک اراضی پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ہسپانیہ میں بھی زمین پر محصول لگایا جاتا ہے۔ لیکن اس محصول کا طریقہ ایسا ناقص ہے۔ کہ اکثر مالکان اراضی تو بچ نکلتے ہیں۔ اور باقیوں کو اپنے متناسب حصہ سے زیادہ مالگذاری ادا کرنا پڑتی ہے۔ صرف ایک صوبہ میں یہ تخمینہ لگایا گیا ہے۔ کہ دس لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین پر محصول نہیں لگایا گیا۔ بلجیم میں جائیداد پر محصول لگایا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی چونگی بھی وصول کیجاتی ہے۔ یونان میں اراضی کی آمدنی پر محصول لگایا جاتا ہے۔ بلغاریہ میں زمین پر محصول لگانے کا رواج ہے۔ اور رومانیہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ قصہ مختصر زمین یا جائیداد کا ٹیکس ہر ملک میں ملکی مالگذاری کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن ایک ملک کا نام بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں پنجاب کی نسبت زیادہ احتیاط سے مالگذاری مقرر کی گئی ہو۔

ایک اور غلط خیال جو افلاس کی بحث کے سلسلے میں عام طور پر ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ ہے۔ کہ یورپ متمول ہے اور ہندوستان مفلس۔ صنعتی کمیشن کی رپورٹ کے سلسلے میں ایک نوٹ لکھا گیا تھا جسمیں یورپ اور ہندوستان کا فرق بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اس خیال کی تردید کیگئی ہے۔ کہ ہندوستان کے لوگ صنعت و حرفت کے معاملات میں یورپ والوں جیسی قابلیت نہیں رکھتے۔ نوٹ لکھنے والے کے نزدیک یورپ ایک صنعتی سرزمین ہے۔

اور ہندوستان زرعی ملک یہی وجہ ہے۔ کہ یورپ متمول ہے۔ اور ہندوستان مفلس۔ اب غور کیجئے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ یورپ میں صنعتی کارخانے بعض خاص علاقوں تک محدود ہیں علی الخصوص ایسے علاقوں میں کارخانے پائے جاتے ہیں۔ جہاں کسی خاص صنعت کو ترقی دینے میں خاص آسانیاں میسر ہوں۔ شمالی مغربی یورپ کو صنعتی ملک کہا جاسکتا ہے۔ لیکن انگلستان اور اس سے بھی زیادہ سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کے بعض حصے ایسے ہیں۔ جہاں کارخانوں کا وجود نہیں لیکن وہاں کے لوگ خوشحال ہیں۔ اور اگر انہیں پست اور درماندہ کہا جائے۔ تو اسپر اظہار ناراضی کریں گے۔ جنوبی یورپ اور یورپی روس زرعی ممالک ہیں۔ کیونکہ وہاں کوئلہ نہیں پایا جاتا جس سے دخانی قوت حاصل کیجائے۔ اور صنعت وحرفت کو ترقی دیجائے۔ کوئی صحیح اور مفید موازنہ کرنا تو دشوار ہے لیکن ہسپانیہ کے متعلق اس بیان کو یاد رکھنا چاہئے۔ کہ زراعت کو قبضہ زمین کے طریقہ سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ اور یہ چیز عمدہ زراعت کی راہ میں بہت مانع ثابت ہوئی ہے۔ زمین کی کاشت ایسے لوگوں پر چھوڑ دی گئی ہے۔ جو بہت مفلس ہیں۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا۔ کہ ساتھ ہی بے حد جاہل بھی ہیں۔ ہسپانیہ کی زراعت بہت بری حالت میں ہے۔ اور کشاورزی کے پرانے طریقے ابھی تک رائج ہیں۔ جہاں آلات کشاورزی اچھے نہ ہوں۔ اور بہت محنت کرکے بہت کم پیداوار حاصل ہو۔ تو ضروری ہے۔ کہ افلاس بھی زیادہ ہو۔ مزدور میلے کچیلے مکانوں میں بھر دئے گئے ہیں۔ انہیں بہت تھوڑا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ ادنے درجہ کی روٹی دی جاتی ہے جس میں سلاد اور سرکہ کے ساتھ۔ کسی قدر تیل اور سبزی ملائی جاتی ہے۔ اب یونان کی کیفیت سنئے۔ اس ملک کے اکثر حصوں میں زراعت کے جو طریقے اور آلات استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہ بہت پرانے ہیں۔ زمین میں سائنٹیفک اصولوں پر باری باری سے مختلف اجناس بونے کا رواج نہیں کھاد سے لوگ ناواقف ہیں۔ سسلی میں جو لکڑی کے ہل استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہ اُن ہلوں سے چنداں مختلف نہیں۔ جو آج سے دو ہزار سال پیشتر استعمال کئے جاتے تھے۔ سرویہ میں زراعت کا طریقہ مختلف مقامات میں مختلف ہے۔ جو علاقے نسبتاً کم زرخیز ہیں۔ بہت بھدے طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ دقیانوسی چوبی ہل جو محض زمین کی سطح کو کرید سکتے ہیں۔ عام طور پر زیر استعمال ہیں بعض دوسرے علاقوں میں حکومت زراعت کی اصلاح و ترقی میں کوشش کر رہی ہے۔ اور یہ کوشش بار آور ہو رہی ہیں۔ لیکن نئے علاقوں میں رشوت خوار عہدہ دار بیچارے کسان کا خون چوس لیتے ہیں۔ یا رہزن لوٹ لیتے ہیں۔ اسلئے کسان کی جان ومال محفوظ نہیں۔ اسپر طرہ یہ ہے۔ کہ یہاں جو زراعت کے طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہ پرانے

علاقے سے بھی زیادہ دقیانوسی ہیں۔ آلات کشاورزی بہت بھدے ہیں۔ کھاد شاذونادر ہی استعمال میں لائی جاتی ہے۔ اور مختلف اجناس کو باری باری بونے کے فوائد کا علم لوگوں کو نہیں۔ یورپی ترکی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں عام طور پر زراعت کے طریقے نہایت فرسودہ ہیں۔ چنانچہ جس ہل سے کھیتی کی جاتی ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے چلایا جاتا ہے۔ اس قسم کا ہل کہیں اس زمانہ میں استعمال ہوتا تھا جس کا ذکر انجیل میں موجود ہے۔ زمین کی گہری جتائی نہیں ہوتی۔ کھاد کا استعمال صرف انہی دیہات میں ہوتا ہے جہاں یورپ کے دوسرے علاقوں سے لوگ آکر آباد ہو گئے ہیں۔ فصل بونے اور کاٹنے کا کام ہاتھ سے کیا جاتا ہے۔ گھاس سے دانہ کھلے میدان میں علیحدہ کیا جاتا ہے۔ دانہ سے کوڑا کرکٹ علیحدہ کرنے کا کام ہوا سے کیا جاتا ہے۔ دانہ سے کرکل شاذونادر ہی علیحدہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ جب اُسے بویا جاتا ہے۔ اسوقت بھی بین لیا نہیں جاتا۔ فصل پر اس کا نہایت افسوسناک اثر ہوتا ہے۔ بلغاریہ میں دقیانوسی چوبی ہل ابھی تک استعمال کیا جاتا ہے۔ مختلف اجناس کو باری باری بونے کے متعلق لوگوں کو کچھ علم نہیں۔ مصنوعی کھاد بھی شاذ ہی استعمال کی جاتی ہیں۔ قصہ مختصر کہ جنوبی یورپ میں بھی پنجاب کی طرح زراعت نے پرانے زمانہ کی نسبت چنداں زیادہ ترقی نہیں کی۔ اگر کہیں کسی قدر اس سلسلہ میں ترقی ہوئی ہے تو اسوجہ سے حکومت نے لوگوں میں مطالعہ کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ امداد باہمی کی انجمن نمبں قائم کرنے میں انکا حوصلہ بڑھایا۔ کالج قائم کئے۔ ایسے فارم قائم کئے جہاں زرعی طریقوں کا تجربہ ہوتا ہے۔ اسلئے یہ صوبہ یورپ سے پیچھے نہیں۔ بلکہ کم از کم جنوبی یورپ جتنی ترقی ضرور کر رہا ہے۔ اور یورپ کے اکثر بڑے بڑے حصوں سے اس معاملہ میں آگے بڑھا ہوا ہے۔ جو لوگ اس ملک کے سیاسی حالات کو افلاس کی علت قرار دینا چاہتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ وہی ملک افلاس زدہ ہیں۔ جن کی حکومت وہیں کے باشندوں کے ہاتھ میں ہے۔

ہم نے جن ملکوں کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ انمیں آبادی کی اکثریت زراعت کی دست نگر ہے۔ اور دولت کا عام معیار بہت پست ہے۔ اب شمال مغربی یورپ کو لیجئے۔ ہاں اگرچہ صنعت و حرفت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ تاہم وہاں بھی شدید افلاس موجود ہے۔ عام طور پر صنعتی ممالک کی نسبت زرعی ممالک میں دولت کی تقسیم زیادہ مساویانہ ہوتی ہے۔ زراعت میں تو چند سالوں کے بعد نفع کا حصول صنعت و حرفت کی نسبت زیادہ یقینی ہے صنعتی ملکوں میں ناکامی کے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس دوڑ میں جو لوگ ناکام ہو جاتے ہیں۔ یا تو وہ افلاس و ذلت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور یا اُن کی بدولت بے روزگاروں یا ناقابل حصول معاش لوگوں کا وہ گروہ عالم وجود میں آجاتا ہے۔ جنکی بدولت دنیا کے مدبرین کے سامنے ایک نہایت دشوار مسئلہ پیش ہے۔

یہ تو شاید صحیح ہو۔ کہ ایک صنعتی ملک میں ایک زرعی ملک کی نسبت آمدنی کا اوسط زیادہ ہوتا ہے۔ یا ایک کارخانے کے مزدور ان کھیتوں میں کام کرنے والوں کی نسبت زیادہ روپیہ کماتے ہیں۔ لیکن یہ چیز بذات خود چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ عام طور پر صنعتوں کی تنظیم زیادہ اچھے طریقہ پر کی جاتی ہے۔ فی کارکن کے حساب سے زیادہ سرمایہ لگایا جاتا ہے۔ صنعت و حرفت کی نگرانی اور رہنمائی کے لئے زیادہ قابل اور عقلمند لوگوں کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور اس میں مالی اعتبار سے زیادہ سہولتیں[1] میسر ہیں۔ صرف ڈنمارک سے اس امر کی مثال فراہم ہوتی ہے۔ کہ زراعت کس حد تک یہ چیزیں حاصل کر سکتی ہے۔ اور اگر اس ملک کو آرام و آسائش کا وہ معیار حاصل ہو جائے۔ جو ڈنمارک کو حاصل ہے تو بڑے سے بڑا محب وطن بھی اس سے مطمئن ہو جائیگا۔ انگلستان یا ریاستہائے متحدہ امریکہ جیسے ملکوں میں دولت کا اکثر حصہ چالیس پچاس ہزار اشخاص یا چند مجالس[2] کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ زراعت سے اسقدر کثیر دولت حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لئے ایسے ممالک میں جہاں زراعت کو غلبہ حاصل ہے۔ بہت زیادہ متمول لوگ زیادہ تعداد میں نہیں ہوتے۔ امور متذکرہ بالا سے شاید یہ خیال کیا جائے۔ کہ آجکل صنعت و حرفت کو فروغ دینے کا جو عام مطالبہ کیا جاتا ہے۔ وہ قابل افسوس ہے لیکن یہ امر حقیقت سے بہت دور ہے۔ صنعت و حرفت کی بدولت مقامی زرعی پیداوار کی فروخت یقینی ہو جاتی ہے۔ اور اسطرح ایسی اجناس بھی کاشت کی جا سکتی ہیں۔ جو موجودہ زرعی پیداوار کی نسبت زیادہ منفعت بخش ہیں۔ یا کسان کو موجودہ زرعی پیداوار کی زیادہ قیمت مل سکتی ہے۔ اگر پنجاب کے کسان گیہوں کی وہ قیمت حاصل کر سکیں جو انگلستان کے کارخانوں میں کام کرنے والے ادا کرتے ہیں۔ تو وہ زیادہ خوشحال ہو جائیں گے۔ اور پھر انہیں یہ بھی امید بندھ جائیگی۔ کہ اگر اس ملک میں صنعت و حرفت کو فروغ دیا گیا۔ تو وہ اس نوع کے بعض فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔

صنعت و حرفت کی کامیابی کیوجہ سے زندگی کا معیار بلند ہو جائیگا۔ ایسی اشیاء خوردنی استعمال میں لائی جائیں گی۔ جنکا استعمال آجکل محض عیش خیال کیا جاتا ہے۔ کسان آجکل گیہوں کی پیداوار میں جس قدر سرمایہ اور دانشمندی صرف کرتا ہے۔ اُسے اس سے زیادہ دانش اور سرمایہ صرف کرنا پڑیگا۔ اور اس طرح

[1] یہ شواہد و حقائق مختلف ہینڈ بکوں سے ماخوذ ہیں۔ [2] دیکھئے آردن کتاب اگری کلچر آکسفورڈ [3] لوگوں کا خیال یہ ہے۔ کہ زراعت کا مقابلہ دوسرے فنوں سے کیا جائے۔ تو اسمیں روپیہ لگانے کا پینلاں قابل اطمینان سامان نظر نہیں آتا۔ لیکن ایسی زمینوں اور فارموں کی تعداد موجود ہے۔ جنکے انتظام و اہتمام کے نتائج مقابلۃً شاندار ہیں۔ اس امر کا مقابلہ تو اکثر کیا جاتا ہے کہ کسی ملک میں زراعت اور دوسری صنعتوں کے اندر کس قدر استعداد ہے لیکن اس امر پر غور و خوض نہیں کیا گیا کہ جن اصولوں پر زراعت اور صنعت و حرفت کی تنظیم کی گئی ہے وہ کسقدر مختلف واقع ہوئے ہیں۔ [4] انگلستان میں صرف ۹۵ ہزار اشخاص کی آمدنی ڈھائی ہزار پونڈ سالانہ سے زیادہ ہے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۹ فیصدی اشخاص کے قبضہ میں ملک کی ۷۰ فیصدی دولت ہے۔ اور ۱۲ فیصدی باشندے ایسے ہیں جنکے قبضہ میں دولت ۵ فیصدی ۰.۵ فیصدی اتنی دولت کے ایک ہیں۔ اور ان کی آمدنی کا اندازہ ۲۴ پونڈ ہے۔

وہ زیادہ نفع حاصل کریگا۔ مثلاً دودھ جیسی اشیاء کی فراہمی تمام تر اس کے قبضہ میں ہوگی۔ اور وہ کسی چیز کی فراہمی اور امداد پر قبضہ رکھنے والوں کو جس قسم کے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اُن سے وہ بھی پوری طرح بہرہ یاب ہوگا۔ دوسری اشیائ پر جنہیں دور دراز مقامات تک بھیجنا دشوار ہے۔ اُن سے ضروری طور پر قبضہ حاصل ہوگا۔ یا کم از کم اُسے یہ خطرہ نہیں رہے گا۔ کہ کوئی دوسرا بھی اس میدان میں اُسکا حریف ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح وہ زیادہ قیمت حاصل کر سکیگا +

اس سلسلہ میں ایک عام غلط اندیشہ جس پر بحث کرنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ یہ ہے۔ کہ صنعت و حرفت قحط کو روک دیگی۔ اور قحط صنعت و حرفت کی عدم موجودگی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے[1]۔ پرانے زمانے میں جب کسی قدرتی واقعہ مثلاً بارش کے نہ ہونے کے باعث اشیائے خوردنی ناپید ہوتی ہے۔ تو اُسے قحط کہتے تھے۔ آجکل جب عوام یا عوام کا ایک گروہ اشیائے خوردنی جو بازار میں فروخت ہوتی ہیں۔ خرید نہیں سکتا۔ تو اسے قحط کہتے ہیں۔ جن دنوں وسائل حمل و نقل ناقص اور رسل و رسائل کے ذرائع نہایت ابتدائی حالت میں تھے۔ یہ ممکن تھا۔ کہ ایک علاقہ میں غلہ کی قلت رُونما ہو جائے۔ اور دوسرے علاقہ کے پاس اپنی فوری ضروریات سے زیادہ غلہ موجود ہو۔ جن مقامات میں اشیائے خوردنی کی آزادانہ تجارت نہیں ہوتی تھی۔ وہاں شاذ و نادر ہی یہ کوشش کی جاتی تھی۔ کہ مقامی صرف سے زیادہ اجناس پیدا کی جائیں۔ تھوڑا سا زائد از ضرورت غلہ بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ تو غلہ کی فروخت بالکل رُک جاتی تھی۔ ان حالات میں اگر ایسے لوگوں کی کثرت ہو جاتی۔ جن کا شغل محض صنعت و حرفت ہوتا۔ تو حالات زیادہ تشویشناک ہو جاتے۔ اس حقیقت کی بنا پر باسانی یہ فرض کیا جا سکتا ہے۔ کہ وسائل حمل و نقل اور ذرائع رسل و رسائل کی اصلاح و ترقی سے پیشتر زیادہ صنعتیں عالم وجود میں نہیں آسکتی تھیں۔ اور ساحل بحر اور قابل جہازرانی دریاؤں کے قرب و جوار کے سوا کسی دوسری جگہ بڑی بڑی صنعتوں کا قیام ناممکن ہے +

---

[1] کمیشن کے جس ممبر نے اختلافی نوٹ لکھا تھا۔ اُسنے تو یہاں تک لکھدیا تھا۔ کہ انگریزوں نے ہندوستانی صنعتوں کو تباہ کیا۔ اس لئے قحط کے بار بار رونما ہونے کے حقیقی باعث انگریز ہیں۔ اس کی وہی مثال ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شخص پہلی مرتبہ ایک علاقہ میں گیا۔ جہاں کوئی پڑھا لکھا شخص کبھی نہیں گیا تھا۔ اس علاقہ میں سانپ تھے۔ لیکن اس کے پہلے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ کہ وہاں سانپ موجود تھے۔ اس لئے یقیناً اس علاقہ میں وہی تعلیم یافتہ شخص سانپ لایا + ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں شدید قحط کے واقعات کا ذکر ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ مہابھارت کے شانتی پرب میں ایک ایسے قحط کا ذکر ہے۔ جو بارہ سال تک رہا تھا۔ اور مشہور رشی وشوامتر جی کی زندگی کی ہلاکت سے بچنے کے لئے کتے کا گوشت کھانا پڑا تھا +

انگلستان جیسے ملک میں جس کا ہر حصہ سمندر کے قرب میں واقع ہؤا ہے۔ اور اس لئے وہاں باہر کی آئی ہوئی اشیاء خوردنی بھی باسانی پہنچ سکتی ہیں صنعت و حرفت کی ترقی کی وجہ سے لوگ اتنا کافی روپیہ کما لیتے ہیں۔ کہ درآمد شدہ اجناس خرید سکیں۔ اور جب تک اشیائے خورد و نوش اس طرح باہر سے لائی جا سکتی ہیں صنعت و حرفت کا وجود قحط کے لئے مانع ہے۔ لیکن جب کبھی اشیائے خورد و نوش کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے جیسا کہ جنگ عظیم کے زمانہ ہؤا تھا تو صنعتی آبادی حالات کو زیادہ تشویشناک بنا دیتی ہے۔ یورپ کے اندر ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء میں چھوٹے چھوٹے قطعات زمین کی کاشت کی ایک تحریک پھیل گئی تھی جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ اشیاء خورد و نوش کی مقدار میں اضافہ کیا جائے۔ اس تحریک سے اس دلیل کی منطقی غلطی واضح ہوتی ہے۔ کہ صنعتیں قحط کو روک دیتی ہیں۔ جب خوراک کی قلت ہو گئی۔ اور باہر سے اس کا لانا ناممکن ہو گیا۔ تو غلہ پیدا کرنے والوں کی تعداد کا بڑھنا ضروری تھا۔ جرمنی نے یہ حکمت عملی جان بوجھ کر اختیار کی تھی۔ کہ انگریز فاقے کریں۔ اور اگرچہ انگلستان میں بڑی بڑی صنعتیں موجود تھیں۔ تاہم جرمنی کو اس حکمت عملی میں کامیابی ہوئی۔

اب ہم پھر پنجاب کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ بڑے بڑے صنعتی مرکز قائم کرنے کیلئے صوبہ کے اندر زائد از ضرورت غلہ کا پیدا کرنا ضروری ہے۔ جس سے کارخانہ کے مزدوروں کا پیٹ پالا جائے۔ جو لوگ اجناس خوردنی کی درآمد پر اس بناء پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اس ملک کے اکثر باشندوں کو خوراک نہیں ملتی۔ وہ اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کہ سال بھر میں تجارت برآمد کی غرض سے جو زائد از ضرورت غلہ پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ محفوظ جنس کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے قلت اجناس کے زمانہ میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مثلاً فرض کیجئے۔ کہ عام طور پر ہر سال پنجاب سے چھ لاکھ ٹن گیہوں باہر بھیجا جاتا ہے۔ اسلئے صوبہ کو قلت غلہ کا حقیقی خطرہ اسیوقت ہو سکتا ہے جبکہ صوبہ کی مجموعی زرعی پیداوار میں اسیقدر غلہ یعنی چھ لاکھ ٹن کی کمی واقع ہو جائے۔ قلت کا اثر سب سے پہلے تجارت برآمد پر پڑیگا۔ اسلئے وسیع تجارت برآمد جو درحقیقت نام ہے۔ صوبہ کی زائد از ضرورت پیداوار کا قحط کو روکنے کا بے خطا نسخہ ہے لیکن موسمی اثرات کے باعث لوگوں کی آمدنی یکبارگی کم ہو جائے۔ تو صنعت و حرفت کی بدولت انہیں اسی قدر روپیہ مل جائیگا۔ جس سے وہ غلہ خرید سکیں۔ اس صوبہ میں جب کبھی بارش کے نہ ہونیکی وجہ سے پیداوار میں نمایاں کمی واقع ہو گئی۔ تو کثیر التعداد صنعتی آبادی وبال جان ثابت ہو گی۔ اس لئے زائد از ضرورت

پیداوار کو جسے باہر بھیجا جا سکے صنعت وحرفت کی ترقی کیلئے ضروری سمجھنا چاہیئے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ صوبہ کا جغرافیائی محل وقوع ایسا ہے۔ کہ باہر کے ملکوں سے وسیع پیمانہ پر اجناس منگوانا دشوار ہے۔ یہ تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اسی صوبہ کے باشندے باہر کے آئے ہوئے غلہ پر بسر اوقات کر سکیں۔ اور اگر کبھی کسی ضرورت کے باعث پنجاب کے لوگ کسی دور و دراز مقام سے آئی ہوئی اجناس کے محتاج ہو جائیں۔ تو یہ بھی ماننا پڑیگا۔ کہ بیشتر لوگ ان اشیاء کی قیمت ادا نہیں کر سکیں گے۔ اسلئے ثابت ہوا۔ کہ صنعت کی ترقی سے پہلے زراعت کی ترقی ضروری ہے +

اگر متذکرہ بالا دلیل معلوم ہو۔ تو یہ اسواقعہ پر غور کرنا چاہیئے۔ کہ جب تک امریکہ کے وسیع میدان جن میں گیہوں کی کاشت کے ذرائع۔ دریافت نہیں ہوئے تھے۔ اور جب تک دخانی جہاز اور ریل گاڑیاں تیار نہیں ہوئی تھیں۔ یورپ نے بھی صنعت وحرفت میں تیزی سے ترقی نہیں کی تھی۔ جب تک مختلف ممالک کا انحصار اپنے ہاں کی پیداوار سے خوراک حاصل کرنے پر تھا۔ اور باہر سے غلہ لانے میں دشواریاں تھیں۔ آبادی میں اس سرعت سے ترقی نہیں ہو سکتی تھی۔ جو صنعتی[1] انقلاب کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ ایک خاص رقبہ سے جسقدر انسان خوراک حاصل کر سکتے ہیں۔ اُن کی تعداد کی ایک حد بھی ہوتی ہے۔ یہ بحث بے سود ہے۔ کہ وہ حد کیا ہے؟ اور کیا اس حد تک آبادی پہنچ چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر کسی ملک میں باہر سے اجناس خوردنی لائی جا سکیں۔ تو صنعت وحرفت کی ترقی کیوجہ سے یہ ممکن ہے۔ کہ اس ملک کی زرعی پیداوار پر جتنی آبادی زندگی بسر کر سکتی ہے اُن سے بہت زیادہ آبادی کیلئے خوراک فراہم ہو سکے۔ لیکن جب کوئی ملک فراہم شدہ خوراک کا محتاج ہو جاتا ہے۔ تو وہ معناً اس ملک کا محتاج ہو جاتا ہے۔ جہاں سے خوراک درآمد کی جاتی ہے۔ بلکہ وہ ان تمام ملکوں کا دست نگر ہوتا ہے۔ جو اس درآمد کو روکنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اگر پنجاب اشیائے خوردنی کیلئے بیرونی ممالک کا دست نگر ہو گیا۔ تو اس کی حالت نازک ہو جائیگی +

---

[1] فرض کیجئے۔ کہ آبادی میں اضافہ ہو گیا۔ تو صنعت وحرفت لوگوں کے لئے ایک نیا سامان معیشت فراہم کر دیگی۔ لوگ اتنا کما لیں گے۔ کہ خوراک خرید سکیں۔ اگر دیسی غلہ میں قلت ہو جائے۔ تو اس کی وجہ سے لوگ فاقے نہیں کریں گے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے۔ کہ جب خوراک وصول نہ ہو سکے۔ جب بھی صنعت وحرفت کی وجہ سے خوراک وصول ہو جاتی اور کم دباؤ پڑتا ہے۔ اگر کسی ملک کا دارومدار ایسی اجناس پر ہے۔ تو صنعت وحرفت کی وجہ سے یہ دباؤ کم نہیں لے گا۔ بلکہ بڑھ جائے گا اس طرح فصل کے نہ ہونے کی وجہ سے زد پڑتی۔ اس میں اضافہ ہو جائے گا۔ جب تک تجارت برآمد کا وجود نہ ہوگا۔ درآمد بھی زائد نہیں ہو گی اس سیدھی سادی حقیقت کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے +

اسوقت ہماری بحث کا دائرہ صرف اُن تمام منطقی مغالطوں تک محدود رہا ہے۔ جو پنجاب کے افلاس کے مسائل کو پوری طرح سمجھنے میں مانع ہو رہے ہیں۔ ہم یہ بتا چکے ہیں۔ کہ صوبہ یورپ کے اکثر ممالک سے زیادہ مفلس نہیں۔ اگر اسکی زراعت شمال مغربی یورپ کی زراعت سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں۔ تو جنوبی یورپ کی زراعت سے زیادہ پیچھے بھی نہیں۔ مزید برآں اسے داخلی اور خارجی امن کی برکت سے بہرہ یاب ہونیکا موقع حاصل ہے۔ یہاں اتنے زیادہ محصول بھی نہیں۔ جو بحیرۂ روم کے ساحلی ممالک کے باشندونکو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اور اُن ممالک کی نسبت یہاں ریلوے کا انتظام بہتر ہے۔ اگر اسکی سڑکیں اسکی ضروریات کیلئے ناکافی ہیں۔ تو جن ملکونکا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اُن کے اکثر علاقوں میں سڑکوں کی حالت اس سے بھی خراب ہے۔ پنجاب سے ان ممالک کا مقابلہ صحیح طور پر کرنا تو مشکل ہے۔ لیکن یہ باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں۔ کہ اس صوبہ کے کسان ان ملکوں کے کسانوں سے اچھا لباس پہنتے ہیں۔ اچھا کھانا کھاتے ہیں +

افلاس ایک اضافی امر ہے۔ عام طور پر ضروریات زندگی سے زیادہ کمانے کی ناقابلیت کو افلاس کہتے ہیں۔ یہ تو منفی پہلو ہُوا۔ اسکا مثبت پہلو دولت ہے۔ دولت نتیجہ ہے۔ دانشمندانہ رہنمائی سرمایہ اور محنت یا قوت کے امتزاج و ربط کا۔ اور افلاس ان اسباب و وسائل میں سے ایک یا ایک سے زیادہ کے نہ ہونے یا اُنکے غیر موزوں امتزاج و اجتماع سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے یہ عام حقیقت واضح ہوتی ہے۔ کہ عام انسان ان عوامل کی (وسائل) امداد کے بغیر صرف زندگی کی ضروریات حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ کلیہ (اصول) ہر ملک اور ہر نسل پر منطبق ہوتا ہے۔ ہندوستان کے افلاس کا اساسی و بنیادی سبب بھی یہی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے۔ کہ ہندوستان کی آمدنی کا اوسط کم ہے۔ بیحد گمراہ کن ہے۔ ہاں کمائی کا اوسط کم ہے۔ اور یہ اسلئے کم ہے۔ کہ پیداوار کا اوسط کم ہے۔ سب انسان عقل و دانش کی رہنمائی اور سرمایہ اور قوت کے بغیر زمین کی وہ گردوپیش کی اشیاء سے دولت فراہم کر سکتا ہے۔ جد وجہد کرتا ہے۔ تو اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ پیداوار کا اوسط کم ہو جاتا ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں۔ کہ افلاس کے دوسرے اسباب بھی ہیں لیکن وہ خواہ کسی صورت میں ہوں۔ بہرحال وہ اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اسباب کیوں موجود ہیں؟ اس سوال کا جواب اس صوبہ کی تاریخ میں مل سکتا ہے۔ اس صوبہ میں صدیوں سے بدامنی اور بےچینی برپا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کو ترقی حاصل نہیں ہو سکی۔ جن کے باعث دوسرے

لہ انقلاب سے پہلے زراعت کو ترقی ہوئی۔ تھورولڈ راجرس نے لکھا تھا سترھویں صدی میں انگریزوں نے زمین کی کاشت اور صنعت و حرفت جو ترقی کی ہے۔ اس کی وجہ سے آبادی دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے (جلد چہارم ص۹۶) انیسویں صدی میں ارزاں سامانِ معیشت کے باعث آبادی میں بیحد اضافہ ہو گا۔ اگر غلہ کی فراہمی نہ ہو سکتی تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

ملکوں میں حصول دولت ممکن ہوگیا ہے۔ ان خصوصیات میں کفائت شعاری کے رجحان کو اولین درجہ حاصل ہے۔ پنجاب نے ہونکہ اسی امر کا احساس نہیں کہ شمالی مغربی یورپ میں کفائت شعاری کو کیا مرتبہ حاصل ہے۔ انگلستان میں عسرت، وافلاس، قحط و فاقہ کشی اور موسم کی خرابی کے ایسے ایسے زمانے آئے۔ کہ کسان کیلئے اپنے قیام و بقا کی خاطر کفائت شعاری پر عمل کرنا ضروری ہوگیا۔ اور جیسا کہ تھورولڈ راجرز نے لکھا ہے۔ اگرچہ پہلے پہل بادل ناخواستہ ہی کفائت شعاری پر عمل کیا گیا لیکن چونکہ عرصہ دراز تک لوگ اسپر عامل رہے۔ اسلیئے کفائت شعاری انکی پختہ عادت ہوگئی ہے۔ بعدمیں جب ایک صنعتی انقلاب رونما ہوا جس کے جلو میں افلاس تمول ناکامی کامیابی کی فوجیں تھیں۔ تو مصیبت زدہ لوگوں کو پھر فاقہ زدگی سے بچنے کیلئے کفائت شعاری کا دامن تھامنا پڑا۔ اس امر پر بارہا اظہار افسوس کیا جا چکا ہے۔ کہ جزائر برطانیہ کے کارخانوں میں کام کرنے والے اسقدر کفائت شعاری نہیں برتتے۔ جسقدر کفائت شعاری کی توقع اُن کے مخلص دوستوں کو ہے۔ لیکن دُنیا کے کسی ملک میں انگلستان کی طرح کثیر التعداد مجالس موجود ہیں۔ جن سب نے کسی نہ کسی صورت میں کفائت شعاری کو ہی اپنا مقصد بنا رکھا ہے۔ فرانس میں عوام کی جزرسی ہر ملک کی خوشحالی کی بنیاد قائم ہے۔ جرمنی والوں نے بھی یہ سبق خوب پڑھا ہے اور وہاں ہزار انجمن ہائے امداد باہمی موجود ہیں۔ جنکی وجہ سے تھوڑا بہت روپیہ پس انداز کیا جارہا ہے۔ اور اس کے نتائج حیرت انگیز ثابت ہو رہے ہیں۔ برطانیہ عظمٰی کی انجمن ہائے امداد باہمی کا مجموعی سرمایہ تقریباً دس کروڑ پونڈ ہے۔ اور صرف ایک سال کے عرصہ میں دو کروڑ پونڈ بد فاضل وصول ہوتا ہے۔ جس میں سے بیشتر حصہ ممبروں کو واپس مل جاتا ہے۔ ایک کروڑ اسی لاکھ پونڈ سے زیادہ عمارتوں کی تعمیر میں لگا ہوا ہے۔ اور تین کروڑ پونڈ رہن وغیرہ میں ممبروں کی اکثریت یعنی انمیں سے ۹۵ فیصدی کی آمدنی اسقدر ہے جسپر انکم ٹیکس لگایا جاسکتا ہے۔ یعنی برطانیہ میں انکم ٹیکس کا بیشتر حصہ مزدور طبقہ سے وصول کیا جاتا ہے امداد باہمی کی یہ عظیم عمارت روپیہ کی توفیر کی وجہ سے تعمیر نہیں ہوئی۔ بلکہ اسکی تعمیر درحقیقت اسی امر کی شرمندہ احسان ہے۔ کہ مفلس لوگ نصف صدی تک کفائت شعاری سے کام لیتے رہے ہیں روپیہ کے پس انداز کرنے کیلئے یہ شرط لگا دینا صحیح نہیں کہ افراد اور جماعتوں کی آمدنی ضرور اتنی کافی ہونی چاہئے کہ وہ مستقل کیلئے دوست کر سکیں کیونکہ تقریباً تمام افراد اور جماعتیں زمانہ آئندہ میں خوشحالی حاصل کرنے کیلئے کافی روپیہ ضائع کرتی ہیں۔ ہم نے اوپر جس دو کروڑ پونڈ کا ذکر کیا ہے۔ وہ درحقیقت نتیجہ یہ ہے اس امر کا کہ امداد باہمی کی بدولت

سلہ آئرلینڈ کے مغربی اضلاع یا سکاٹ لینڈ کے افلاس کا مقابلہ پنجاب سے کیجئے۔ دو سلہ جب باقاعدہ کفائت شعاری کیوجہ سے بہت سا سرمایہ جمع ہوگیا۔

جرمنی اقتصادی عمل در جمل کی اس حکمت عملی پر کاربند ہونے کے قابل ہوا۔ جس نے دنیا میں اسکا اثر و رسوخ اسقدر بڑھا دیا ہے بشلاً ۱۹۱۴ء سے پہلے جرمنی کو دنیا پر تقریباً مکمل اقتصادی تسلط حاصل ہوگیا تھا اور انگلستان میں بھی اسکا اثر بہت بڑھ

ضائع ہو جانیوالے روپے کو محفوظ رکھنے کیلئے ایک باضابطہ انجمن کی تنظیم کیگئی۔ یہ روپیہ آمدنی سے پس انداز نہیں گیا۔ بلکہ مصارف سے بچایا گیا ہے۔ گویا جو روپیہ پہلے ضائع ہو جاتا تھا۔ پس انداز کر لیا گیا ہے۔ جبتک اس صوبہ کے ڈاکخانوں میں سیونگ بنک کا طریقہ رائج نہیں ہوا تھا۔ کوئی ایسا ادارہ موجود نہ تھا جس کے سپرد تھوڑا بہت پس انداز کیا ہوا روپیہ کر دیا جاتا۔ سیونگ بنک پہلے صرف سرکاری ملازمین مثلاً کلرکوں اور دوسرے شہری کارکنوں کیلئے قائم کئے گئے تھے۔ زراعت پیشہ طبقہ نے کبھی ان بنکوں سے اپنے لئے کوئی کوشش محسوس نہیں کی۔ ان بنکوں میں روپیہ جمع کرانے والوں میں سے ۹۰ فیصدی غیر زراعت پیشہ لوگ ہیں اور جو زراعت پیشہ لوگ ان بنکوں میں روپیہ جمع کراتے ہیں۔ اُن کی مجموعی تعداد پنجاب بھر میں ۲۰۰۰ سے زیادہ نہیں +

ہم اس مسئلہ پر بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔ کہ افلاس کا اولین سبب کفایت شعاری کا نہ ہونا ہے۔ صرف کفایت شعاری سے ہی اسقدر سرمایہ جمع کیا جا سکتا ہے۔ جسسے زمین کی اصلاح و ترقی پر صرف کر کے اُسے زیادہ منفعت بخش بنایا جائے۔ کفایت شعاری کے نہ ہونے کی بڑی وجہ تو یہ ہے۔ کہ اس صوبہ میں عرصہ دراز تک امن و ضبط قائم نہیں رہا۔ لیکن اس کے دوسرے اسباب یہ ہیں۔ کہ صوبہ کی زمین زرخیز واقع ہوئی ہے۔ اسلئے فصل پیدا کرنے میں بہت کم محنت صرف کرنی پڑتی ہے۔ سال میں دو مرتبہ فصل ہوتی ہے۔ اور کسانوں کو زیادہ دیر تک فصل کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ پھر ہندوؤں کے ہاں کنبہ کا نظام ایسا ہے۔ کہ سست اور نالائق لوگوں کو یہ کہہ کر باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ کہ جاؤ خود کماؤ اور کھاؤ۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ اس صوبہ میں دولت جمع کرنے کو صرف خطرناک ہی سمجھا نہیں جاتا تھا۔ بلکہ لوگوں کے دائرہ خیال میں یہ چیز داخل بھی نہیں تھی +

اس صوبہ کے کسانوں میں اس قسم کی عام روایتیں اور کہانیاں بھی تو موجود نہیں۔ جن سے معلوم ہو سکے کہ کسی زمانہ میں آج سے بہتر آلات کشاورزی موجود تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہاں زراعت نے کبھی ترقی نہیں کی۔ زمین کی حالت یہ ہے۔ کہ اُس پر سادہ سے سادہ طریقہ سے بھی جوتائی کیجائے۔ تو پیداوار اتنی پیدا ہو جائے گی۔ کہ کسی ایسے آلہ کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی جسکا استعمال زیادہ منفعت بخش ثابت ہو۔ اسطرح گویا اس صوبہ میں کوئی ایسی محرک چیز موجود نہیں۔ جو لوگوں کو کفایت شعاری پر آمادہ کرے۔ محنت یا طاقت کرنے پر

ملہ انگلستان میں جاڑا بہت سخت اور صبر آزما ہوتا ہے۔ اور زمین سے بہت کم پیداوار ہوتی ہے۔ اسکی وجہ سے بھی کفایت شعاری کے خیال کو بہت ترقی ہوئی ہوگی۔ اس صوبہ میں دو فصلیں ہوتی ہیں اور موسم سرما مقدر کم ہوتا ہے کہ زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ انگلستان کے موسم سرما نے مزید لوگوں کو کفایت شعاری پیدا کرنے میں بہت مدد لیا۔ دیکھو پروفیسر مکی کی کتاب زندگی اکنامکس کا تیسرا

آمادہ کر سکے جس شخص کے پاس چار ایکڑ زمین ہے۔ وہ اسطرح گیہوں کی کاشت کرتا ہے۔ گویا ان کی زمین چالیس ایکڑوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ اس بات میں اپنی کسر شان سمجھتے ہیں۔ کہ مزید محنت صرف کر کے سبزی یا چھوٹے چھوٹے پھل پیدا کریں۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ جب زمین پا تنی محنت اور طاقت صرف نہ کی جائے جس کے صرف کرنے سے منفعت حاصل ہو سکے۔ تو پایانِ کار اسکا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ اضافہ دولت میں رکاوٹ واقع ہو جائے گی +

لیکن سب سے زیادہ اس ملک کے افلاس کا باعث یہ ہے۔ کہ قابل اور تربیت یافتہ رہنما موجود نہیں جن ہدایت سے لوگ زراعت فائدہ اُٹھا سکیں۔ لوگوں کو یہ معلوم نہیں۔ کہ پیداوار میں کیونکر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ انگلستان کی زراعت میں صدیوں تک زوال پذیر رہی لیکن جنوبی یوروپ کی زراعت کارنامۂ زوال انگلستان سے بھی زیادہ ہے۔ پنجاب میں کوئی چیز ایجادات کی محرک نہیں ہوئی۔ جن کے باعث شمالی یوروپ نے اس قدر ترقی کی ہے۔ پنجاب کی کیفیت بحیرۂ روم کے ممالک یعنی ہسپانیہ اطالیہ یونان وغیرہ کی سی ہے۔ جہاں ان اکتشافات سے ابھی تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا [۱] +

ہم پنجاب کے متعلق ایک کلیہ پیش کرتے ہیں۔ جو تعمیری پروگرام کی بحث میں بہت مفید ثابت ہو گا۔ اور وہ کلیہ یہ ہے۔ کہ پنجاب محض اسلئے مفلس ہے۔ کہ اس کی تنظیم اُن اصولوں پر نہیں کی گئی۔ جن سے دولت حاصل ہوتی ہے۔ پنجاب میں جو ادارے یا مجالس قائم ہوتی رہی ہیں۔ وہ یا تو فوجی تھیں۔ جنکے قیام سے کسی حکمراں خاندان کے اقتدار کی حفاظت مقصود تھی۔ اور یا مذہبی۔ یہاں معاشرتی مجالس کی تنظیم بھی مذہبی اصولوں پر کی گئی۔ اور بدقسمتی سے مذہبی پیشواؤں نے کبھی اقتصادیات کا مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ بلجیم اور اطالیہ وغیرہ ممالک میں لوگوں کی خوشحالی کو ترقی دینے کیلئے جو مجلس قائم کی گئی ہے۔ وہ کیتھولک کلیسا ہے۔ وہاں پادری اپنے پیروؤں کے مادی سود و بہبودی میں عملی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اور انجمن ہائے امداد باہمی کے قیام کی تحریک شروع کی گئی۔ تو وہ اسکے راہ نما تھے۔ پنجاب میں ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہاں مذہبی اثرات نے صرف روحانی اصلاح کی کوشش کی اور مادی اصلاح کو نظر انداز کر دیا۔ جب دنیا کے تعلقات سے بے پروائی مادی فوائد و منافع کے حصول کی جستجو سے علیحدگی۔ اور دولت سے دستکش ہونے کو محاسن میں شمار کیا جائے

---

[۱] امر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ صوبہ کے اکثر حصوں میں زراعت کی حالت ایسی واقع ہوئی ہے۔ کہ اس میں کسی دوسرے علاقہ سے کوئی مدد دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ پیراں تبدیلیوں میں مانع ہے جن کی بدولت زیادہ نفع حاصل ہو سکتا ہے جب تک کسان زمین کی کا ذریعہ سمجھتا رہے۔ وہ زیادہ ترقی نہیں کر سکتا + [۲] تھورنولڈ رابرٹس جلد پنجم صـ[illegible]

تو یہ ضروری ہے۔ کہ دنیوی مال واسباب جمع کرنے کیخلاف نسلاً بعد نسلاً ایک تحریک جاری رہے۔ اور آج ہم جن باتوں پر افسوس کر رہے ہیں ان کی ذمہ داری اسی تحریک پر عائد ہوتی ہے جسطرح یورپ میں مذہبی عقائد کے اقتصادی اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسیطرح ہندوستان میں بھی ان سے قطع نظر ممکن نہیں۔ براعظم یوروپ میں مذہبی فرقوں اور دولت کی جو تقسیم نظر آتی ہے۔ وہ کسی اتفاقی واقعہ کا نتیجہ نہیں۔ اور نہ انہیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور بے تعلق قرار دیا جا سکتا ہے

ہم اوپر جو دلائل بیان کر چکے ہیں۔ اگر انہیں تسلیم کر لیا جائے۔ تو یہ معلوم کرنا مشکل نہیں۔ کہ کن طریقوں سے دولت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہ صوبہ اسوقت تک خوشحالی حاصل نہیں کر سکتا جبتک اقتصادی اصولوں پر اسکی تنظیم نہ کی جائے۔ بعض معاملات میں تو اس صوبہ کے ذرائع دولت سے پوری پوری طرح فائدہ اٹھانا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ سود کے متعلق مسلمانوں کا جو عقیدہ ہے۔ وہ کفایت شعاری کا محرک ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ مسلمان سود لینے سے تو انکار کرتے ہیں لیکن سود دینے میں انہیں کوئی تامل نہیں۔ لیکن اگر اس صوبہ کے مسلمانوں کی کیفیت اسکے برعکس ہوتی۔ یعنی انہیں سود دینے میں ویسا ہی انکار ہوتا جیسا سود لینے سے ہے۔ تو وہ کفایت شعاری پر جو خراب موسم کے اثرات سے بچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ مجبور ہو جاتے۔ دوسری جانب ہندؤں کے نزدیک گائے کو تقدس واحترام حاصل ہے۔ اسلئے گائے سے جو انسان کیلئے مفید ترین جانور ہے۔ پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اور اس جانور کی منفعت بخش پرورش کو ترقی نہیں ہو سکتی۔ اسطرح صوبہ کو بے حد نقصان پہنچ رہا ہے۔ جو پہنچتا رہیگا۔ بے ریب یہ ایک بہت بڑا سبب ہے۔ جسکی وجہ سے صوبہ کی[1] خوشحالی کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ دوسرے معاملات میں بھی یہی کیفیت ہے۔ یعنی عوام کے مذہبی جذبات صوبہ کی قدرتی دولت کو ضائع کر رہے ہیں۔ اور اس سے اقتصادی فائدہ حاصل کرنے میں مانع ہو رہے ہیں۔ سور۔ ہڈیاں۔ کھالیں اور انڈے مفلس ملکوں میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس ملک میں ان سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اوپر کی بحث میں ہم نے صرف ان منفی اسباب پر بحث کی ہے۔ جو افلاس کا باعث ہیں۔ اب

[1] شمال مغربی یورپ کی جدید زراعت کی تمام تر انحصار مویشی کی خوب پرداخت پر ہے لیکن یہاں جو چیزیں سیکھنے کے قابل سمجھی جاتی ہیں یہاں قابل ہی نہیں۔ اور اس صوبہ کے باشندوں کی ذہانت نے آجتک کوئی مبدل بھی بہم نہیں پہنچایا۔ کسی زمانہ میں جبکہ انگلستان کی اکثر و بیشتر زمین خانقاہوں کیلئے وقف ہوتی تھی۔ خانقاہوں کے راہب بہترین کاشتکار ہوتے تھے۔ اور انکے طریقِ زراعت کو اردگرد کے علاقہ میں قابل تقلید

مثبت اسباب کو لیجئے۔ اُن میں سب سے بڑا سبب نقصان اور اتلاف ہے۔ مشرق نے ابھی تک یہ سبق نہیں پڑھا کہ جو چیزیں ضائع کر دی جاتی ہیں۔ اُن سے دولت بھی حاصل کیجا سکتی ہے۔ کسی مُلک کی دولت میں کمی یا بیشی کا انحصار آبادی کے اس حصہ کی کمی یا بیشی پر ہے۔ جو منفعت بخش کاموں میں مصروف ہے۔ کیونکہ جو لوگ ایسے پیشوں سے اسباب معیشت فراہم کرتے ہیں۔ جنکی بدولت عام پیداوار و منفعت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ قوم کیلئے ضُعف و کمزوری کا باعث ہیں۔ اس صوبہ میں بہت انسانی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ شرح اموات اسقدر زیادہ ہے۔ کہ بہت سے اشخاص کو جو باعتبار عمر قوی خدمت کرنیکے قابل ہوتے ہیں۔ یا جنہیں قابلیت اور قوت حاصل ہوتی ہے اُنہیں موت کسی منفعت بخش کام میں حصہ نہیں لینے دیتی۔ ایسی بیماریوں کے باعث سے بہت سا نقصان ہوتا ہے۔ جنہیں روکا جا سکتا ہے۔ لیکن طبی قابلیت کے فقدان کے باعث لوگ اُن میں گرفتار رہتے ہیں۔ صرف ملیریا بخار کی وجہ سے اسقدر لوگ دن بھر محنت کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں کہ یہی چیز افلاس کے قیام دنیا کا بہت بڑا سبب ہے۔ طریق زراعت کے ناقص ہونے کیوجہ سے بھی بہت سا نقصان ہوتا ہے۔ یعنی لوگ سال کے ایک بہت بڑے حصے میں یا تو کام ہی نہیں کر سکتے۔ اور اگر کام کرتے بھی ہیں۔ تو بہت تھوڑا سا۔ یعنی اوسط درجہ کا کسان بارہ مہینوں میں ۱۵۰ دن سے زیادہ کام نہیں کرتا۔ پھر لطف یہ ہے۔ کہ وہ جسے پورے دن کی محنت کہتا ہے۔ وہ شمالی یورپ کے کسانوں کے پورے دن کے کام کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے۔ اگر اس صوبہ کو ترقی کرنا ہے تو بہ ضروری ہے۔ کہ اس معاملہ میں کسانوں کے جو خیالات ہیں۔ اُن میں سرٍ سبر تبدیلی واقع ہو جائے۔ پھر اجناس کی تقسیم کا کام دوکاندار کرتے ہیں۔ جن کا وجود غیر ضروری ہے۔ اور اُن کی وجہ سے بھی صوبہ کا نقصان ہوتا ہے۔ عام طور پر ہر بازار میں ۸۰ فیصدی دوکاندار ایسے ضرور نکل آئیں گے جو اس سے زیادہ مفید کام کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ اس امر کی کہ چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے بجائے بڑے بڑے سٹور قائم کئے جائیں۔ کچھ نقصان

لہ شمال مغربی یورپ کی جدید زراعت کی تمام تر انحصار اشیا کی خود برداخت یہ ہے۔ لیکن وہاں جو چیزیں سیکھنے کے قابل سمجھی جاتی ہیں۔ یہاں قابل قبول ہی نہیں۔ اور اس صوبہ کے باشندوں کی ذہانت نے اسکا کوئی بدل بھی ہم نہیں پہنچایا +

اس طرح بھی ہوتا ہے۔ کہ صوبہ کے بہترین تعلیمیافتہ دماغ منفعت بخش اور پیداآور کاموں کے بجائے غیر منفعت بخش کاموں مثلاً وکالت۔ بیرسٹری وغیرہ میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ اندازہ لگایا ہے۔ کہ صوبہ کا تین چار کروڑ روپیہ مقدمہ بازی میں صرف ہوجاتا ہے[1]۔

[1] مقدمہ بازی کی کثرت بھی بہت حد تک خوشحالی کی مرہون منت ہے۔ ملاحظہ ہو مقورڈ راجرس جلد چہارم پندرھویں صدی میں مقدمہ بازی کو بہت فروغ ہوا۔ مقدمہ بازی کے جذبہ کی نشوونما پر واضعین قانون اور مصلحین اخلاق نے بہت تشویش ظاہر کی۔ شاہ ہنری چہارم کی سلطنت کے ابتدا میں ہی پارلیمنٹ کے اندر شکایت کی گئی تھی۔ کہ وکلا کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ پندرھویں کے ابتدا میں پارلیمنٹ کو قانون دانوں کی تعداد میں اضافہ کے باعث اس قدر تشویش ہوئی۔ کہ حکم دیدیا گیا۔ کہ وکلا کو اضلاع کی جانب سے نمائندہ مقرر نہ کیا جائے۔ چنانچہ ان کے اضلاع کا نمائندہ منتخب ہونے کا کوئی موقع نہیں تھا۔

پنجاب میں اوسطاً سال بھر کے اندر پانچ لاکھ ۲۰ ہزار دیوانی۔ فوجداری اور مالی مقدمات دائر ہوتے ہیں۔ اپیلوں۔ دیوانی احکام ورمتفرق درخواستوں کی تعداد ڈھائی لاکھ ہے۔ جو لوگ مقدمات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تعداد یقیناً ۱۵ لاکھ ہوگی۔ اور جو لوگ باقی امور کے سلسلہ میں عدالتوں میں پیش کئے جاتے ہیں۔ وہ بھی ۲۰ لاکھ سے کم نہیں ہونگے۔ گواہوں کی تعداد ۱۰ لاکھ سے کم ہیں۔ گو یا ہر سال عدالتوں میں ۲۵ لاکھ اشخاص فریق مقدمہ یا گواہ کی حیثیت سے حاضر ہوتے ہیں۔ اگر ہر شخص اوسطاً دو مرتبہ حاضر ہوتا ہے۔ اور ہر مرتبہ حاضر ہوتے ہیں دو دن ضائع ہو جاتے ہیں تو سال بھر میں ایک کروڑ دنوں کا نقصان ہوا۔ یہ لوگ خیال کیجئے نہ تو بچے ہوتے ہیں۔ نہ عورتوں پر مشتمل۔ بلکہ مرد ہوتے ہیں اور کام کرنے کی عمر کے قابل۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد صوبہ میں ساٹھ لاکھ ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ اس طرح روزانہ ایک روپیہ کا نقصان ہوتا ہے تو مجموعی نقصان ایک کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ لیکن مقدموں میں جو اسٹامپ لگتے ہیں۔ اُن پر چالیس لاکھ روپیہ سالانہ خرچ آتا ہے۔ وہ تقریباً پانچ لاکھ روپیہ صرف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وکلا وغیرہ پر بھی کچھ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اس طرح گویا مقدمہ بازی پر جسقدر روپیہ خرچ ہوتا ہے اس سے صوبہ کے رہن کا قرض اتارا جاتا ہے۔ اگر اس رقم کو دیہات کی تعلیم پر صرف کیا جائے۔ تو انقلاب ہوگا۔ اگر ڈاکٹر فراہم کرنے پر لگایا جائے۔ تو ہر گاؤں میں تربیت یافتہ ڈاکٹر مل سکے۔ یقیناً جو وقت قوت عقل اور قابلیت مقدمہ بازی پر صرف ہوتی ہے۔ اگر وہ طبی امداد پر لگادی جائے۔ تو صوبہ کا ایک اہم ترین مسئلہ حل ہوجائیگا۔ اور غیر محدود کو فائدہ حاصل ہوگا۔

ادہر صوبہ میں ایسے لوگوں کا قحط ہے۔ جو بنکنگ صنعت وحرفت اور تجارت کا اعلےٰ علم رکھتے ہوں۔ زراعت جو صوبہ کی تعلیم تمام جدید دولت کا ذریعہ ہے۔ جاہل لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو اپنے تعلیم یافتہ لڑکوں کو شہروں میں بھیج دیتے ہیں۔ مزارع اور زمیندار کے مابین جو تعلقات ہیں۔ اُن کی وجہ سے بھی بہت نقصان ہوتا ہے۔ یعنی زمیندار مزارع کی رہنمائی نہیں کرتا۔ نئی مہمات میں صرف کرنے کے لئے سرمایہ بہم نہیں پہنچاتا۔ اور خود یہ نہیں جانتا۔ کہ جو زمین اس کے قبضہ میں ہے۔ اس کی اصلاح کے لئے کیا طریقہ بہتر ہے۔ قرض اور لین دین کے منحوس طریقہ کی وجہ سے بہت نقصان ہوتا ہے۔ سودخواروں کی ایک بڑی جماعت نے غافل کسانوں کو اپنے جال میں اس طرح پھنسا رکھا ہے۔ کہ وہ اس سے کسی طرح نکل نہیں سکتے ہر سال وہ جسقدر سود وصول کرتے ہیں۔ اس کی تعداد کم از کم آٹھ کروڑ سے بارہ کروڑ تک ہے۔ حالانکہ اتنی بڑی رقم کو زمین کی اصلاح پر صرف کیا جائے۔ تو اس سے بیحد مفید نتائج ہو سکتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے۔ کہ اب بھی بعض ایسے لوگ ہیں۔ جنہیں تعلیم یافتہ ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور جن کے سامنے اس طریقہ کے مہلک نتائج موجود ہیں۔ لیکن وہ لین دین کے اس طریقہ اور انجمن ہائے امداد باہمی کے طریقہ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اول الذکر کی بدولت مالکان اراضی کی اکثریت پچاس ساٹھ کروڑ روپیہ کی مقروض ہو گئی ہے۔ جس سے انہیں کوئی نفع نہیں ہوتا اور آخر الذکر طریقہ کو جہاں استعمال کیا گیا ہے۔ لوگوں نے قرض سے نجات پا کے آسودگی حاصل کر لی ہے۔ پہلے وہ روپیہ قرض لیتے تھے۔ اب روپیہ جمع کراتے ہیں۔ پہلے وہ سود کی مصیبت میں گرفتار دل شکستہ خاندانوں پر مشتمل تھے۔ اور اب خوشحال ہیں۔ سودخواری کی لعنت ہندوستان یا پنجاب تک ہی محدود نہیں۔ یہ ضرور درست ہے۔ کہ یہ صوبہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی نسبت سودخواری کی ترقی کے لئے زیادہ موزوں واقع ہوا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ امداد باہمی کی تحریک سے پہلے یورپ کے بعض ممالک جس قدر مقروض تھے پنجاب اُس سے زیادہ مقروض ہے۔ جہاں جہاں امداد باہمی کے طریقہ سے زراعت میں مدد لی گئی ہے۔ قرض کم ہوتا جاتا ہے۔ اور لوگ سیونگ بنک میں روپیہ محفوظ کراتے جاتے ہیں۔ امید ہے۔ کہ چند سالوں میں نقصان کا یہ بہت بڑا ذریعہ اس قدر کم ہو جائیگا۔ کہ پھر اسے کوئی

اہمیت نہیں رہیگی ۔

عورتوں سے کوئی خدمت نہیں لی جاتی - اوران کی محنت اور طاقت بیکار جاتی ہے - اس کی وجہ کچھ تو اس ملک کے دستور ہیں - اور کچھ تعصبات - اکثر دوسرے ملکوں کے مزدوروں میں عورتوں کا تناسب بہت زیادہ ہے - اور پھر ان میں اتنی استعداد بھی ہے - کہ جو کام دیا جائے کر سکتی ہیں - اس طرح قوم کو عورتوں کی وجہ سے جو نفع ہوتا ہے - وہ قوم کی مجموعی آمدنی کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے - اگر مغربی ممالک میں یہ تحریک پھیل جائے - کہ عورتیں امور خانہ داری انجام دینے کے سوائے اور کسی قسم کی محنت نہ کریں - تو اس تحریک کی بدولت اقتصادیات کے سارے تار و پود کے بکھرنے کا خطرہ ہو جائے - اور اگر کہیں یہ تحریک کامیاب ہو جائے - تو یہ ممالک بالکل تباہ ہو جائیں - پنجاب نے ایک ایسی چیز سے علیحدگی اختیار کر رکھی ہے - جسے انگلستان اور دوسرے ممالک میں قیام تمدن کے لئے ایک ضروری عنصر سمجھا جاتا ہے - کئی ذاتیں مثلاً برہمن اور راجپوت وغیرہ تو ایسی ہیں - جو اپنے ہاں کی عورتوں کو کھیتوں میں کام کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتیں - بس اسی ایک واقعہ سے ان کے افلاس کے اسباب معلوم ہو سکتے ہیں - ان ملکوں میں عورتیں کلرک بھی ہیں - دوکاندار بھی - ڈاکخانہ اور تار گھر میں اوپریٹر کی خدمت بھی انجام دیتی ہیں - کارخانوں میں مزدوری بھی کرتی ہیں - ماہی گیری کا کام بھی کرتی ہیں - لیکن یہاں اس کی مثال نہیں مل سکتی - کئی پشتوں میں اس سے جس قدر نقصان ہوتا ہے - اتنا اس کی بدولت مادی ترقی ناممکن ہے - اگر عورتیں محنت مشقت میں مردوں کا ساتھ نہ دیتیں - تو کوئی مغربی ملک موجودہ معیار زندگی قائم نہ رکھ سکتا ؎

کیڑے مکوڑوں اور دوسرے جانوروں کی غارتگری کی وجہ سے بہت نقصان ہوتا ہے - اور جب مذہبی جذبات کی بناء پر انہیں خوراک کے لئے ہلاک کرنا بھی ناجائز سمجھا جاتا ہو - تو یہ نقصان بہت بڑا معلوم ہوتا ہے - ایک ریلوے سٹیشن پر جہاں غلہ کی آمد و رفت زیادہ ہوتی رہتی ہے - کبوتر بہت نقصان پہنچاتے رہتے ہیں - لیکن کبوتروں کو کھانا ممنوع سمجھا جاتا ہے - لیکن جب اس کا مقابلہ اس نقصان سے کیجئے - جو کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے فصل کو پہنچتا ہے - تو یہ بہت معمولی نقصان معلوم ہوتا ہے - یا چوہوں سے ان کا موازنہ

لیجئے۔ جو سال بھر میں اچھی خاصی مقدار میں گیہوں ضائع کر دیتے ہیں۔ جانوروں کی تباہی کو مذہب کی رو سے گناہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی افلاس کا ایک بڑا سبب ہے۔ اور جب تک خیالات میں تبدیلی نہ ہو۔ افلاس کا باعث بنا رہے گا+

بہت سا بیج بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ بہت سا غیر زرخیز بیج جو کھانے کے کام آسکتا ہے۔ زمین میں محض یہ سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ کہ شاید اس سے شگوفہ پھوٹ نکلے۔ اور وہ پڑا پڑا سڑتا رہتا ہے۔ اور اگرچہ اکثر عقلمند لوگ اس حقیقت سے باخبر ہیں۔ لیکن دوکانداروں وغیرہ کو اس امر پر آمادہ کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ کہ وہ صرف خالص بیج فروخت کیا کریں+

بہت سی کھاد بھی ضائع ہوتی ہے۔ انگلستان صدیوں تک یہ دستور رہا۔ کہ کسان اجارہ کی شرائط کے مطابق اس امر پر مجبور ہوتے تھے۔ کہ گھاس اور پانی وغیرہ کو زمین میں رہنے دیں۔ انہیں اس امر کی اجازت نہ تھی۔ کہ ان چیزوں کو کھیت سے لے جا کر کسی جگہ فروخت کر دیں+

کچھ نقصان اس وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ کہ ضبط و نظم کا احساس ابھی کمزور ہے۔ اور اس کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا جاتا۔ انگلستان میں صدیوں تک مشقتیں اٹھانے اور دشواریاں

سلہ سر ایم ویسٹو کی کتاب "دی کنسٹرکٹنگ انڈیا" کا یہ نکتہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ و ۲۴۶ اگرچہ بچے کی شادیوں کا انداز ہو جائے۔ تو اس ملک میں کم عورتیں بیوہ ہوں گی۔ اور آج بیوہ کے عقد ثانی کو دھرم نے روک رکھا ہے۔ ان کے اثرات اس قدر نقصان ہوں گے۔ انصاف اور دور اندیشی دونوں کا تقاضا یہی ہے۔ کہ عورتوں کو جبراً بیوہ رکھنے کے نقص اور اس کے ساتھ وحشیانہ اور داغ انسانی رسوم روا رکھی جاتی ہے۔ اُن کی بیخکنی کر دی جائے۔ آگے چل کر انہوں نے اس امر پر اظہار افسوس کیا ہے۔ کہ ملک کی نصف آبادی جس قدر کام اور دانشمندانہ سعی کر سکتی تھی۔ اس سے محروم رکھنا بے حد نقصان رساں ثابت ہوا ہے۔ ملہ ۲ جاپان کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ وہاں حفظان صحت کے انتظامات کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ بیج کی ذلت قرب وجوار کے کسان کوڑا کرکٹ حتےٰ کہ فضلہ وغیرہ بھی لیجا کر کھیتوں میں پھینک دیتے ہیں+

پھیلنے کے بعد تمام طبقوں کے لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی۔ جاپان میں حکومت کو اس کی قدر و قیمت کا احساس ہوا چنانچہ اب حکومت جو بات مناسب سمجھتی ہے کسانوں اور صناعوں کو اس پر عمل کرنے کا حکم دیتی ہے۔ وہاں کے مدبرین نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ کہ ملک کا افلاس اس امر کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ ہر شخص جو کچھ چاہے کرے۔ اس لئے افلاس کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ حکومت کے احکام و ہدایات کی تعمیل کی جائے جرمنی میں اس امر پر اظہار خیال کیا جا رہا ہے۔ کہ سرکاری احکام کی کیا حدود مقرر کی جائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی جاننا پڑے گا۔ کہ حکومت اپنی رعایا سے اچھی طرح واقف ہے۔ اور جانتی ہے۔ کہ لوگوں کو اس راہ پر چلانا ضروری ہے۔ جس پر ان کا چلنا خود اُن کے لئے مفید ہو گا۔ انگلستان میں افراد پر جو قانونی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ اُن کی تعمیل اس سرعت سے کی جاتی ہے۔ کہ اب یہ چیز عوام کی سیرت کا جزو اور عادت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہاں افراد پر ان کی نسبت بہت کم پابندیاں عائد کی جائیں۔ تو انہیں آزادی میں مداخلت تصور کیا جائے گا۔ اگر اس صوبہ میں کبھی مختلف صنعتیں قائم ہوئیں۔ تو اُن سے تعلق رکھنے والے تمام اشخاص کے لئے ضبط کی شدید پابندی ضروری سمجھی جائے گی۔ لیکن یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا لوگ یہ سبق بآسانی سیکھ لیں گے یا نہیں ؛

اراضی کے چھوٹے چھوٹے قطعات میں تقسیم ہونے کی وجہ سے جو نقصان پہنچا ہے۔ اس کا احساس بھی نہیں۔ جن مقامات پر کھیت سارے گاؤں میں کھلے اور منتشر ہوں۔ تو عام دستور یہ ہے۔ کہ جونہی فصل کٹتی ہے مویشی کو کھیتوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ کھیتوں میں اجناس کی جڑوں سے پیٹ بھریں۔ چونکہ کھیتوں کے ارد گرد جنگلے تو ہوتے نہیں۔ جن کی وجہ سے وہ اپنے مالک کے کھیت میں ہی رہیں۔ اس لئے وہ تمام کھیتوں میں اس طرح پھرتے ہیں۔ گویا سارے کھیت مشترکہ ہیں۔ اسی صورت میں جب کہ گاؤں کے تمام لوگ ایک ہی جنس کی کاشت کرتے ہوں۔ چنداں نقصان نہیں ہوتا۔ لیکن جب اجناس کی کاشت میں کوئی تنوع پیدا کرنے کی کوشش کیجائے

تو یہ دستور نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اگر کوئی کسان جو اپنے ساتھیوں سے زیادہ عقلمند ہو اس خیال سے کہ اراضی بنجر نہ رہے۔ اپنی زمین میں کسی دوسری جنس کی کاشت کرے۔ تو اسے یہ دشواری پیش آئے گی۔ کہ اس کے ہمسایوں مویشی اس کے کھیت میں آکر چریں گے۔ اور اس کے ہمسائے یہ اعتراض کریں گے۔ کہ جب وہ ان کے مویشی کو اپنے کھیت میں چرنے نہ دے۔ وہ بھی اس کے مویشی کو اپنے کھیتوں میں چرنے اور کٹی ہوئی فصل کی باقی ماندہ جڑوں سے پیٹ بھرنے نہ دیں گے۔ اس کی ایک سیدھی سادھی مثال یہ ہے کہ ایک کسان اپنے کھیت میں چارہ کی کاشت کرتا ہے۔ ابھی تک فصل کاٹی نہیں گئی۔ کہ اس کے ہمسائے مویشی کو چرنے کیلئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح گویا کھیتوں کا بغیر کسی جنگلہ کے ہونا زراعت کے نئے طریقے اختیار کرنے بلکہ کسی نئی جنس کی کاشت کرنے میں بھی مزاحم ہوگا۔ اور اسی جنس کی کاشت کی جائیگی جس سے وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ کاٹ سکے۔ موجودہ حالات میں گاؤں کے کمین وغیرہ کو اندو ئے دستور یہ حق حاصل ہے۔ کہ فصل کٹ چکنے کے بعد اپنے مویشی کو کھیتوں میں بھیج دیں۔ لیکن اگر بنجر زمینوں کو زرخیز بنانے کی کوشش کی گئی۔ تو اس طبقہ کے لوگ معترض ہونگے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو زمینیں جنگلہ یا باڑ کے بغیر بکھری پڑی ہیں۔ اُن کی فصل کے بارہ میں کسان آزاد نہیں۔ وہ اپنی زمین میں کسی ایسی جنس کی کاشت نہیں کرسکتا۔ جسے وہ سب سے اچھی اور سب سے زیادہ منفعت بخش سمجھتا ہے۔ بہت سی اراضی میں ایسی جنسوں کی کاشت ہوتی ہے۔ جو زیادہ منفعت بخش تو نہیں۔ لیکن جس زمانہ میں ذرائع رسل ورسائل اچھے نہیں تھے۔ اور وسائل حمل ونقل ناقص تھے۔ یہ ضروری تھا۔ کہ ایسی فصل کی کاشت کی جائے۔ جو یہیں کی ضروریات کے مطابق ہو۔ اور مقامی منڈیوں میں فروخت ہو سکے۔ اور اب تک انہی فصلوں کی کاشت ہو رہی ہے۔ چونکہ کسان اپنی ساری توجہ ایسی اجناس کے پیدا کرنے پر صرف کر رہا ہے۔ جو صرف اس کے اپنے کنبہ کی ضروریات پوری کرسکتی ہیں۔ اور اس بارہ میں منڈی کا خیال نہیں رکھتا۔ اس لئے وہ زیادہ منفعت بخش اجناس کی کاشت کی جانب متوجہ نہیں ہوسکتا۔ گویا زمین کو زمین کو ایسے طریقے سے استعمال نہیں کیا جاتا۔ کہ اس کی بدولت زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہوسکے۔

پہاڑی علاقہ میں اچھے پھل پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہاں ادنیٰ درجہ کا باجرہ وغیرہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ جس زمانہ میں بڑے بڑے نہری علاقے لبائے نہیں گئے تھے اور ان میں گیہوں کی کاشت شروع نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ انہیں تقسیم کرنے کے لئے ریلوں کی تعمیر ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں باجرے کی کاشت کا دستور تھا۔ ہمارا موجودہ علم یہ کہتا ہے۔ کہ زمین کو ایسی اجناس کی بجائے جو زیادہ منفعت بخش ثابت ہو سکیں۔ دوسری اجناس کی کاشت میں استعمال کرنا صوبہ کے لئے اس قدر کثیر سالانہ نقصان کا باعث ہو رہا ہے۔ کہ دوسری وجہ سے اتنا نقصان نہیں ہوا۔

پھر مختلف اجناس سے جو کام لیا جاتا ہے۔ اس میں بہت نقصان ہوتا ہے۔ جو لیشی کو بنولے اپنی اصلی حالت میں کھلا دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ جانور اس صورت میں انہیں ہضم نہیں کر سکتے بنولے سے چھوٹے چھوٹے ریشے نکالنا چاہئے۔ جن سے ڈبیوں کے لئے غدہ تیار ہو سکتا ہے چھلکے کو الگ کر لینا چاہئے۔ تاکہ آگ جلانے کے کام آسکے۔ اور اس کے گودے کو کچل کر تیل نکالنا چاہئے۔ جو کھانا پکانے کے کام بھی آسکتا ہے۔ اور صابون وغیرہ بنانے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ تیل نکالنے کے بعد جو فضلہ رہ جائے گا۔ وہ اچھی خوراک ہے جسکو مویشی ہضم کر سکتے ہیں۔ اور جو عمدہ کھاد کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ صوبہ کی پیداوار کا جو کثیر نقصان ہوتا ہے۔ اس کی یہ ایک مثال ہے اس قسم کی اکثر اور مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ نباتی اجزاء جن سے طاقت ہو سکتی ہے۔ ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ اس امر کی جانب ابھی پچھلے دنوں سے لوگوں کی توجہ ہوئی ہے۔ کہ ہر کام میں کسی قدر چیز فضول ضائع کی جاتی ہے ہوتا ہے۔ ضائع ہونے کی وجہ سے نقصان ہوتا ہے۔ اور یہ افلاس کا ایک سبب ہے۔

جیسے وسیع رقبوں کو ہر وقت بدلنے والی قدرت (نیچر) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے اس سے بھی نقصان ہوتا ہے۔ ہم نے نقصانات کی جو فہرست پیش کی ہے۔ غالباً اس کی کسی شق سے وہ فرق اس قدر واضح نہیں ہوتا۔ جو ہندوستان اور شمالی یورپ کے مابین موجود ہے شمالی مغربی یورپ کے لوگوں نے اس مقولہ کو اپنا اقتصادی اصول قرار دے رکھا ہے۔ کہ خدا اُن کی مدد کرتا ہے۔ جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ اور وہ ترقی کا اندازہ اس طرح کرتے ہیں۔

کہ فطرت کی قوتوں کے متعلق انسان کے علم میں کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ اور اُس میں اُن قوتوں سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت کس حد تک بڑھ گئی ہے۔ جنوبی یورپ اور اس براعظم میں اس امر کے متعلق کہ انسان کس حد تک قسمت پر اثر انداز ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔ . . .

. . . . . لوگ یقین نہیں رکھتے اور اس بارہ میں اُن کے عقائد تغیر پذیر لوگوں جیسے ہیں۔ اور فطرت بھی انہیں کسی کوشش اور محنت کے بغیر جو کچھ عطا کرتی ہے اسے راضی برضا ہو کر قبول کر لیتے ہیں جب کبھی گھی اور دودھ کے متعلق بحث ہوتی ہے۔ تو لوگ اس خیال کا سہارا لیتے ہیں۔ کہ ایک ایکڑ غیر مزروعہ رقبہ میں جسقدر چارہ پیدا ہو سکتا ہے اس قدر چارہ ایک ایکڑ مزروعہ زمین میں بھی نہیں ہو سکتا جسکی آبپاشی نہروں سے ہوتی ہو۔ کونسل اور اسمبلی سے درخواست کی گئی ہے۔ کہ وہ اس دلیل کی تصدیق کریں۔ اور حکومت سے بھی یہ التجا کی جاتی ہے کہ جھوٹے وعدوں پر اپنی حکمت عملی کی بنیاد رکھے لیکن اگر صاف صاف اور سیدھی سادھی بات پوچھیے۔ تو یہ دلیل بالکل بے ربط ہے۔ اور دراصل محض مذہبی تحقیقات کے لئے سستی رکھتی ہے۔ اور اس کی پشت پر صرف انہیں لوگوں کی رائے ہے جنہیں دیہاتی اقتصادیات کے متعلق ابھی محض ابتدائی علم حاصل ہے

صوبہ میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسکی بنا پر یہ کہا جائے۔ کہ اس کی قسمت میں ہمیشہ مفلس رہنا لکھا ہے بعض ایسے اسباب افلاس جنکے دفعیہ کی مناسب تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ یہ تدابیر کیا ہیں۔ تو اس کا فیصلہ محض تحقیق سے کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ ادنیٰ معیار زندگی کا سب سے بڑا سبب گذشتہ پانچ سو سال کی تاریخ میں جلی حروف سے رقوم ہے۔ اس زمانہ کے حالات کے مطالعہ سے جو کچھ معلوم ہوا ہے اس سے قطع نظر کر کے اگر دوسرے اسباب کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ تو اُس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر زمانہ حال کے انگریز عیش و عشرت سے بہرہ یاب ہیں انہیں ہر قسم کی راحتیں اور زندگی کے وہ تمام لطف میسر ہیں جنہیں دولت مہیا کر سکتی ہے۔ تو اُسکی وجہ یہ ہے کہ اُن کے آباؤ اجداد صدیوں سے کفایت شعاری کر کے روپیہ پس انداز کرتے ہیں۔ انہوں نے ناسازگار قدرتی اسباب و حالات کا مقابلہ کیا۔ اور جو چیز انہیں قابل قدر اور بیش بہا نظر آئی۔ اسے حاصل کرنے اور اپنے قبضہ میں لانے کیلئے انہوں نے قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ موجودہ نسل کو بہت کچھ ورثہ میں ملا ہے۔ بندرگاہیں نہریں سڑکیں پل۔ طرح طرح کی عمارتیں غیر ممالک کی تجارت

میں بہت سا روپیہ بھی لگا ہوا ہے۔ غرضکہ انہیں مختلف صورتوں میں مالی دولت حاصل ہو چکی ہے لیکن غالباً سب سے زیادہ قابل قدر چیز یہ ہے کہ اُسے وسیع علم اور تجربہ ورثہ میں ملا ہے جسے اس کے آباؤ اجداد نے بہت محنت اور تکلیف سے فراہم کیا تھا۔ انگلستان کی تاریخ کے متعلق خاص طور پر اصلی دستاویزات موجود ہیں جنکی مدد سے ہر تحریک کی تفاصیل اس حد تک معلوم کی جاسکتی ہیں کہ اگر تمام ممالک میں نہیں تو اکثر ممالک میں انسقدر تفصیلات فراہم نہیں ہوسکتیں اسکا نتیجہ یہ ہے کہ انمیں بعض ایسے سبق پنہاں ہیں جن سے ہر انگریز فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگرچہ وہ ایسے حقائق پر مبنی ہیں جنہیں سمجھ لینا دشوار نہیں تاہم دوسروں کو وہ محض ایسے عقائد نظر آتے ہیں جنکی بنیاد کورانہ تقلید پر ہے لیکن عبرت و نصیحت کے یہ درس کم و بیش ہر شخص کی رہنمائی کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے اہم معاملات میں لوگ اعلیٰ درجہ کی عقل و تمیز سے کام لیتے ہیں۔ ہندوستان میں کسی زمانہ کے متعلق ایسی قابل اعتماد بیش بہا دستاویزات کا موجود ہی ارباب تاریخ کیلئے بھی کافی مسالہ فراہم نہیں اس لئے جب ایک غلط دلیل پیش کی جاتی ہے جس کی تردید یقینی طور پر اور فوراً ہو سکتی ہے تو توازن قائم نہیں رہتا عام طور پر جو غلط اندیشے پائے جاتے ہیں۔ اُن کی تہ میں بھی اسی قسم کی کوئی وجہ کار فرما نظر آتی ہے۔ افلاس کی اصل وجہ جہالت ہے علم انسان میں ترقی کی اس قدر طاقت پیدا کر دیتا ہے[1] ۱۸۴۹ء میں سکھوں کی حکومت کا دور دورا تھا۔ اس وقت نہ تو پکی سڑکیں تھیں۔ نہ بڑے بڑے پل اور ایسی رفاہ عام کی چیزیں جنکو قابل قدر تصور کیا جائے ایسی نہریں البتہ موجود تھیں جو طغیانی کی رہین منت تھیں یہ بھی یہ بھی ایک اچھی قسم کی قدیم نہروں کی باقیات میں سے تھیں لیکن عام طور پر دریاؤں کی سی طاقت قوت وقت خاک میں ملجاتی تھی۔ پنجابیوں کی موجودہ نسل کو کنڈوں کے سوا اپنے پیشروؤں سے کوئی چیز ورثہ میں نہیں ملی پیداوار کی بڑی بڑی چیزوں سے لوگ آشنا تھے۔ روپیہ جمع نہیں ہوتا تھا جس سے مالکوں کو سالانہ نفع حاصل ہو سکے۔ جو عمارتیں موجود تھیں وہ بھی صرف فوجی یا مذہبی مقاصد کے کام آتی تھیں ۱۸۴۹ء میں پنجاب ذات پات کے موروثی نظام کے سوا کسی دوسرے اقتصادی نظام سے ناآشنا تھا۔ زراعت یا دوسری صنعتوں کے متعلق کوئی اچھی کتاب موجود نہیں تھی لوگوں کی رہنمائی کیلئے دانشمندانہ اشارات و اقوال کے سوا جو ایک سے دوسرے تک سینہ بسینہ منتقل ہوتے چلے جاتے تھے کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ جو عوام کی رہنمائی کر سکے جو رہنما موجود بھی تھے وہ یا تو مذہبی پیشوا

---

[1] شرح سود اسقدر زیادہ ہے کہ روپیہ قرض لیکر کسی منفعت بخش کام پر صرف نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ پوری طرح اس امر کو نہیں سمجھ سکتے کہ شرح سود کی گرانی کس حد تک ترقی کیلئے سد راہ ہے۔ بہت ہی اسکیمیں ایسی ہیں جن پر ۵ فیصدی شرح سود پر روپیہ لیکر تو کامیابی ہو سکتی ہے۔ لیکن ۱۲ فیصدی شرح سود سے کامیابی ممکن نہیں۔

تھے یا فوجی بنما۔ تقریباً سب کے سب فوجی سردار تو سکھوں کی حکومت کے عہدہ دار ہوا کرتے تھے اور انہیں ہرگز اس قسم کی قابلیت موجود نہیں تھی کہ اقتصادی ترقی کا کوئی مرتب کر سکیں۔ باقی رہے مذہبی پیشوا تو انہوں نے کبھی اپنے اثر و رسوخ سے یہ کام نہیں لیا کہ اپنے پیروؤں کو اپنی مادی فلاح و بہبود کیلئے مناسب طریقے اختیار کرنے پر آمادہ کریں۔

صحیح طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ مختلف پیشوں کو مختلف ذاتوں اور قبیلوں کو مخصوص کر دینے کے عجیب و غریب طریقہ کا نتیجہ کیا ہوا لیکن یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب ایک شخص میں کسی خاص پیشہ کی فطری صلاحیت اور استعداد موجود ہو۔ اور اسے محض اس لئے دبا دیا جائے کہ وہ پیشہ کسی دوسری ذات کیلئے مخصوص ہے۔ تو یقیناً ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ حائل ہو گی۔ ایک حیثیت سے تو یہ نظام زراعت کی پستی اور ادبار کا بھی باعث ہوا ہے۔ عام طور زراعت پیشہ قبائل زمین کی وسیع کاشت کرتے ہیں اور اس طرح انہیں حیات نباتی کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملتا لیکن جب سبزیوں اور دوسری اجناس کو بڑے ہی عمیق کاشت کا خیال رکھا جاتا ہے تو کاشت کرنے والے کو پودوں کی ان تمام مختلف اقسام کی زندگی کا علم حاصل ہوتا ہے اور وہ ہر پودے کی ضروریات سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ جو لوگ اچھی اجناس یعنی سبزی ترکاری اور مختلف جڑوں کی کاشت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی نسبت جو نہری زمینوں میں گیہوں کی کاشت کرتے ہیں۔ پودوں کی زندگی کے تفصیلی حالات کے متعلق زیادہ علم حاصل کر لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس قسم کی سبزی اور خاص اجناس کی کاشت ایک ایسی جماعت سے مخصوص کر دیا گیا ہے جن سے بڑی ذاتوں کے لوگ نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ کسانوں میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جو ایسی چیزوں سے بے خبر رہنا ہی زیادہ پسند کرتے ہیں اسطرح وہ بیش بہا علم اور تجربے سے محروم ہو جاتے ہیں جو غالباً ان کے اپنے پیشہ کی ترقی کے بارہ میں بہت قابلقدر ثابت ہوتا۔ انگلستان میں تو پہلے پہل باغوں سے لوگوں کو اس امر کا علم ہوا کہ کھیتوں میں کسقدر اصلاح و ترقی کیجا سکتی ہے اور پنجاب کی یہ کیفیت ہے کہ کالج جو کچھ تعلیم دے سکتے ہیں اسے کھیت نفرت و حقارت سے مسترد کر دیتے ہیں۔

ایک اور معاملہ جو پیشوں کو ذاتوں سے مخصوص کر دینے کے طریقہ کا نتیجہ ہے اس قابل ہے کہ یہاں اس کا ذکر کیا جائے یا وہ بات ہے کہ ہمارے خیالات سے اختلاف کیا جائیگا۔ اونچی ذاتوں کے لوگ کاریگر نہیں ہوتے پچھلے دنوں کے وہ قطعاً زراعت اور صنعت و حرفت میں حصہ نہیں لیتے تھے اور اب بھی اُن میں ان پیشوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ جو لوگ ان پیشوں کو اختیار کرتے ہیں۔ انکی صحیح حیثیت یا یوں کہئے کہ مغربی اہل فکر کے نزدیک اُن کی جو حیثیت ہے اُسی نہ سمجھ سکیں۔ مثلاً بیرو کیل نے زراعت کو ایک شریفانہ صنعت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر ہندوستان کو صرف

ایک زراعت پیشہ قوم بنادیا جائے تو اس کی وجہ سے زندگی کی تمام شعبوں میں اُسکی ترقی رُک جائیگی زراعت سے مختلف صنعتوں علی الخصوص ایسی صنعتوں کا قیام ضروری ہے جنکی وجہ سے اعلیٰ ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی نشو ونما ہوتی ہے۔" اِن الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صنعتوں میں بعض ایسی خصوصیات موجود ہیں جن سے زراعت کا فن خالی ہو۔ اور جن کیلئے زیادہ ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی ضرورت ہے مزید برآں قوم کی ترقی اور صحیح نشو و ارتقا کی خاطر زراعت کے علاوہ کسی دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے اس بیان میں بہت صداقت ہے لیکن اس بیان میں زراعت کی مخالفت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اور ضروری ہے کہ اسپر تبصرہ کیا جائے۔ ایک ادنیٰ کتاب میں ہندوستانی اقتصادیات کے ایک پروفیسر نے لکھا ہے "تاریخ ہمیں یہ سبق سکھاتی ہے کہ جبتک کسی ملک میں زراعت کو غلبہ حاصل ہا وہ افلاس میں مُبتلا رہا اور باعتبار تمدن بھی صنعتی ملکوں سے فروتر رہا انگلستان کی خوشحالی کس امر کی رہین منت ہے۔ کیا اگر ریاستہائے متحدہ امریکہ نے صنعت و حرفت کی تعلیم حاصل کی ہوتی۔ تو وہ متمول ترین مُلک ہوتا گذشتہ نصف صدی میں جاپان نے جو ترقی اور خوشحالی حاصل کرلی ہے اُسکا کیا سبب ہے ہندوستان کی نجات صرف صنعت و حرفت پر موقوف ہے۔" یہاں پھر زراعت کی مخالفت کا پہلو موجود ہے انگلستان نے زرعی انقلاب سے پہلے شہنشاہی اور عظمت حاصل کرلی تھی اور اپنے آئندہ صنعتی اقتدار کی بنیاد پشتہا پشت کی کفایت شعاری ایثار اور فطرت کی قوتوں سے مُسلسل و پیہم جدوجہد کے بدولت رکھی تھی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے وسیع قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھاکر دولت حاصل کرلی۔ اب تک امریکہ کی بعض ریاستوں میں زراعت کو غلبہ حاصل ہے وہاں صنعت و حرفت ایک چھوٹے سے مخصوص رقبہ تک محدود ہے۔ جاپان میں بھی زراعت کو غلبہ ہے اُسکی صنعتیں ابھی تک ابتدائی حالت میں ہیں۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہاں صنعتیں مستقل حیثیت سے قائم ہوگئی ہیں جاپانیوں کی حیرت انگیز ترقی کا باعث یہ ہے کہ انہوں نے ذات پات کے اختلاف اور تعصبات کے تمام قضیوں کو جو ملکی ترقی میں حارج ہوتے ہیں پس پشت ڈال دیا ہے تمام جاپانی برضا و رغبت ایثار و قربانی پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ اور انہوں نے ایک قومی فوجی حکومت کے نظم و نسق کے سامنے سر تسلیم خم کردیا ہے۔ جاپان میں افلاس کے خلاف جو اُسے پامال کررہا تھا عمل

سلہ انڈین اکنامکس تیسرا ایڈیشن صفحہ ۱۳۵ یہ تاریخ کے درسِ عبرت کو نظرانداز کردینے کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے مذہبی اور اخلاقی رہنما اس زمانہ میں پیدا ہوئے جب کہ کارخانوں کا وجود نہیں تھا۔ کوئی مذہب کسی مادی فضا میں پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ الزبتھ کے عہد میں جو صاحب استعداد لوگ پیدا ہوئے انہیں صنعتوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جن معنوں میں آج کل لفظ صنعت استعمال کیا جاتا ہے، شاعری۔ اور صنعت۔ فلسفہ اور صنعت کو ایک دوسرے کی ضد سمجھا جاتا ہے۔ سلہ ہندوستان کے اقتصادی مسائل پر مضامین ص۳۹ مصنفہ پروفیسر سی۔ این۔ وکیل ایک دانشمندانہ کتاب ہے جس میں بعض دلچسپ خیالات بھی ظاہر کئے گئے ہیں۔

شروع ہوگیا ہے ۔ افلاس درحقیقت نتیجہ تھا۔ اس امر کا جاپانیوں نے پہلے مغرب سے علحدگی اور تفرقت کی حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی ۔ ایں ہمہ جاپان نے ابھی تک اپنے تمام مسائل کا حل تلاش نہیں کیا ؀

زراعت کو ترقی کا مخالف سمجھنا گویا ملک کو حصول دولت کے ایک بہت بڑے ذریعہ سے محروم کردیتا ہے ۔ زراعت کی تعریف و توصیف کرو۔ اور اس امر کو پوری طرح محسوس کرو کہ اگر اس کی باگ ڈور اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ہاتھ میں ہو جن کے پاس زراعت سے نفع حاصل کرنے کے لئے سرمایہ بھی موجود ہو اور ہمت بھی تو زراعت کیا بن سکتی ہے ۔ اس طرح رفاہ عامہ کا بیج بو یا جائے گا۔ اور شائد اس کی وجہ سے یہ خواب پورا ہوجائے ۔ اس کی مذمت کرو۔ اور افلاس اور پستی کی جانب سے جانے والی ایک اور قوت پیدا ہوجائے گی۔ اس سلسلہ میں یہ کہا گیا ہے ۔ کہ زراعت کے متعلق جو طریق عمل اختیار کر رکھا تھا ۔ وہ موجودہ افلاس کا ایک حد تک ذمہ وار ہے ۔ یہ بالکل صحیح ہے ۔ کہ انگلستان کے اسلاف نے ہندوستانیوں کے اسلاف سے بالکل مختلف طریق کار اختیار کیا تھا ۔ اور یہ اسی کی برکت ہے ۔ کہ ملک نے آج خوشحالی اور برتری حاصل کر لی ہے ۔ مندرجہ بالا بحث میں سلسلہ سخن کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ ہم قیاسات کے گورکھ دھندے میں جا الجھے ۔ حالانکہ اس مسئلہ کو زیادہ ٹھوس طریقہ پر یوں بیان کیا جاسکتا ہے ۔ کہ لوگوں نے غذا اختیار کرنے میں اقتصادی امور کا لحاظ نہیں رکھا ۔ بلکہ غذا در اصل رسم ورواج مذہب یا تحقیقات کا نتیجہ ہے ۔ اور اسکی وجہ سے بہت سا نقصان ہوا ہے مغربی ملک میں افلاس نے غذا کی تعین کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صوبہ کے باشندوں کو کے اندازہ نسبت انکی غذا کا عام معیار بہت پست واقع ہوا ہے ۔ پشتہا پشت تک سؤر کا گوشت انگریز مزدوروں کی عام خوراک بنا ہے اسکی وجہ یہ نہیں کہ انگریز مزدور سؤر کھانا پسند کرتا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ سؤر کا گوشت ارزاں السہل الحصول ہے جو رنی گوشت کی تمونیت سے سؤر کا گوشت سب سے

لہ ہم زراعت کی ترقی کے بارہ میں رہنمائی کی اہمیت پر زور دے چکے ہیں جب کوئی اور جوہر خلا در رکھنے والا شخص رہنمائی تو کسانوں میں اس جذبہ کا فروغ دیا جاتا ہے ۔ کہ وہ مجالس قائم کریں۔ ان مجالس کا حصہ یہ ہوتا ہے ۔ کہ وہ زراعت کے ترقی یافتہ طریقے اختیار کریں ۔ ان مجالس نے جن کے مختلف نام ہیں ۔ بہت فائدہ پہنچایا ہے جس ملک میں ان کا وجود نہیں وہ ان فوائد سے محروم رہے گا۔ (بقیہ صفحہ آئندہ پر دیکھو)

زیادہ فائدہ مند ہے۔ اسلئے اقتصادی حیثیت سے بھی بہتر ہے۔ یہ جانور دراصل مکھن اور دودھ کی صنعت
کے ساتھ ایک ثانوی پیداوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ سور کی خوراک وہ دودھ ہے۔ جس سے مکھن
نکال لیا گیا ہو یا گیہوں کا بھوسہ اور یہ چیزیں اس کام نہ آئیں۔ تو بالکل بیکار ہیں۔ اسی طرح آلو بھی ایک
خوراک ہے۔ جو بہت فائدہ مند ہے۔ اور اس اعتبار سے اقتصادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ظاہر ہے۔
کہ جب ایک چھوٹے سے رقبہ میں کوئی جنس دوسری اجناس سے زیادہ مقدار میں پیدا ہوتی ہو۔ تو بہت
سا رقبہ دوسری اجناس کی کاشت سے آزاد ہو جائیگا! ور اس میں ایسی اجناس کی کاشت کیجائیگی
جن کا تبادلہ دوسری اشیاء سے کیا جا سکے۔ گیہوں جس رقبہ میں دس بارہ من پیدا ہوتا ہے۔ اسی
رقبہ میں ایک سو من آلو پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اگر گیہوں کی بجائے آلو کی کاشت کی جائے۔ تو
بہت سی زمین گیہوں کی کاشت سے آزاد ہو جائیگی۔ اور اس میں ایسی اجناس کی ہی کاشت ہوسکیگی
جن سے زیادہ روپیہ حاصل ہو سکے۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۴ء تک جرمنی نے تمام ملک میں گیہوں کی
بجائے آلو کی کاشت جاری رکھی۔ چنانچہ زمانہ جنگ میں وہ آبادی کے لئے خوراک مہیا کرنے کے
قابل ہو گیا۔ جنوبی یورپ کے باشندوں کی خوراک دیکھ کر وہ لوگ پنجابی کسانوں کی خوراک کو
ادنے سمجھتے ہیں۔ حیران ہو جائیں گے۔ انگلستان میں آبادی کا اکثر حصہ مکھن کھانے کی استطاعت
نہیں رکھتا۔ اسلئے وہ مارجیرین استعمال کرتے ہیں۔ جو ناریل کے تیل سے تیار ہوتا ہے۔ اور جنوبی
ہند سے بھیجا جاتا ہے۔ وہ بہت تھوڑا سا گوشت کھاتے ہیں۔ اور خالص گیہوں کا آٹا تو تھوڑے
عرصے سے ہی عام طور پر استعمال میں آنے لگا ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں بھیڑ کا گوشت
بکثرت کھایا جاتا ہے۔ کیونکہ بھیڑیں پالنا اس وقت تک کوئی سودمند پیشہ نہیں۔ جب تک زیادہ
عمر کی بھیڑوں کے گوشت کا کوئی مصرف نہ تلاش کیا جائے۔ اطالیہ کا کسان اعلیٰ درجہ کا گیہوں فروخت

بقیہ صفحہ پچھلا۔ یہاں ہر ملک کی گذشتہ تاریخ سے افلاس کا ایک منفی سبب معلوم ہوتا ہے۔ صنعتی فضا میں دلیرانہ مقابلہ
کے باعث ایسی مجالس غیر ضروری ہیں۔ ایک فاتح ایک نئے خیال سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایک کسان کو کوئی
نیا خیال سوجھے گا۔ تو وہ اپنے ہمسایہ کو اسے اختیار کرنے پر آمادہ کرے گا۔ تاکہ وہ عمدہ منڈی فراہم کر سکے۔ ایک
کھیت کی کی خاص پیداوار سے منڈی فراہم نہیں ہو سکتی اور کسان تنہا بہت سی جنس پیدا نہیں کر سکتا۔

کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس بیچارے میں اتنی استطاعت نہیں۔ کہ خود اسے استعمال کرسکے۔ وہ خود ادنےٰ درجہ کے گیہوں کی استعمال کرتا ہے۔ جرمنی کا باشندہ گومی کھاتا ہے! ور امریکن باجرے سے پیٹ پالتا ہے اس کی یہ وجہ نہیں۔ کہ ان لوگوں کو ان اشیاء کا فطری ذوق ہے۔ بلکہ وہ اقتصادی حالت کی وجہ سے ان چیزوں کو کھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی جودت طبع کی بدولت وہ ان چیزوں کو خوش ذائقہ بنا کر کھاتے ہیں ❖

اس طرح اگر بیچارے آئرلینڈ والے آلو کھانے پر مجبور ہو گئے۔ تو وہ بھی اپنی پسند سے نہیں بلکہ افلاس نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ جنوبی یورپ میں زیتون کے تیل کو کھانا پکانے کے لئے اسی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح پنجاب میں گھی کو۔ لوگ گھی کو ہی ترجیح دیتے۔ لیکن کیا کریں۔ اتنی استطاعت نہیں۔ کسی ملک کے لوگوں کی خوراک پر ذرا وسیع نظر ڈالئے۔ آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ خوراک حاصل کرنے کے لئے فی کس رقبہ کا اوسط اس صوبہ کی نسبت بہت کم ہے۔ وہاں تو خوراک اس ملک کی نسبت بدرجہا زیادہ افلاس کی رہون منت ہے۔ کیونکہ یہاں جب کبھی افلاس و مصیبت کا زمانہ ہوتا ہے۔ تو لوگ اشیائے خورد و نوش میں تبدیلی کرنے کی بجائے مقدار خوراک میں کمی کر دیتے ہیں۔ گذشتہ بیس سال کے اندر گیہوں کا صرف بہت بڑھ گیا ہے۔ اور سستی اجناس مثلاً جو۔ باجرا وغیرہ کے صرف میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ گھی کی قلت کے بڑے اسباب میں ایک یہ بھی ہے۔ کہ اب ان لوگوں میں جو اس سے پہلے گھی کھانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اس کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ مسٹر امرسن کی رائے ہے کہ کسان پہلے جو گھی فروخت کر دیا کرتے تھے اب اسے خود استعمال کرتے ہیں اور یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے بیرونی ممالک میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی خوراک میں ترقی ایک ایسی خوبی ہے جس کے حصول کی کوشش کرنا چاہیئے لیکن اقتصادی زاویۂ نگاہ سے یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ زیادہ بیش قیمت

ے جئی۔ جوار اور باجرا بھی کھایا جاتا ہے۔ اطالوی کسان جسقدر گیہوں کا آٹا صرف کرتا ہے اُسکا اندازہ ۱۲ سیر ہے۔ وہ جسقدر اناج کھاتا ہے اس کا تناسب پنجاب کے کسی جیل کے قیدی کی خوراک سے بھی کم ہے۔ وہ چھ سیر سالانہ روغن زیتون استعمال کرتا ہے۔ یہاں کے جیلوں میں قیدی اسی قدر تیل کھاتے ہیں ❖

خوراک اسوقت تک ایک اقتصادی نقصان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جبتک اس کا نتیجہ یہ نہو۔ کہ مزید صرف و استعمال خوراک کیوجہ سے جسقدر روپیہ کا نقصان ہوتا ہے اس سے زیادہ روپیہ حاصل کیا جاوے۔ ڈنمارک اور ہالینڈ کے کسان اعلیٰ درجہ کا مکھن اور انڈے تو انگلستان اور جرمنی کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ اور سائبیریا سے آیا ہوا مکھن اور انڈے جو ادنیٰ درجے کے ہوتے ہیں اس طرح وہ کوئی نمایاں نقصان کئے بغیر اچھی خاصی رقم بچا لیتے ہیں۔ اگر پنجاب کے دیہات اور شہروں کے باشندوں کی خوراک زیادہ اچھی اور قیمتی ہو جائے۔ اور اس سے اتنی مزید قوت حاصل نہو۔ جس کے باعث ہونے پر مزید کام یا بہتر طریق پر محنت کیجا سکے۔ تو بہت نقصان ہوگا۔ یہ اور بات ہے۔ کہ کچھ عرصہ کے لئے لوگ لطف اٹھا لینگے۔ یہ گمان غالباً ہے۔ کہ اگر اقتصادی ترقی کیلئے زیادہ محنت کیجائے۔ تو اُسکے لئے بہتر خوراک بھی ضروری ہوگی۔ لیکن یہ بھی اغلب ہے۔ کہ محض گھی اور دودھ استعمال نہیں ہوگا۔ بلکہ گوشت سبزی اور آلوؤں کو استعمال کیا جائیگا گھی اور دودھ واقعی بہت قابلقدر اشیا ہیں۔ مگر جاپان کی مثال نے اس امر کی تردید کر دی ہے۔ کہ یہ چیزیں ضروری ہیں۔ کیونکہ وہاں یہ چیزیں عام لوگونکو حاصل نہیں ہو سکتیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے حالات ایسے واقع ہوئے ہیں کہ یہاں ان اشیا کا استعمال ضروری ہے۔ ان کا بیان علم الادب پر مبنی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک مذہبی عقیدہ بیان کر دیتے ہیں۔ اکثر ہندوستانی اس خیال کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ کہ آلو لوگونکی عام خوراک کی حیثیت حاصل کر لینگے۔ یہ لوگ زمانہ سے ڈیڑھ سو سال پیچھے ہیں۔ یورپ میں بھی آلوؤں کے متعلق اسی قسم کا خیال رائج تھا۔ اور انہیں محض مفلس لوگوں کے لئے ہی مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن کسانوں کو آلوؤں کی کاشت ناگوار تھی۔ غربا اُسے خوراک بنانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ آرتھر ینگ کا بیان ہے کہ فرانس میں لوگ آلوؤں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔ لیکن اب تو اس امر کا احساس بھی دشوار ہے۔ کہ تقریباً اٹھارہویں صدی کے خاتمہ تک اس بیش بہا جڑ کے بغیر لوگوں کو خوراک کے مسئلہ کا حل کرنا پڑا ہوگا۔ تو کیا کیا دشواریاں پیش آئی ہونگی[1]۔

جرمنی میں آلوؤں میں ۱۸۱۵ء سے بہت عرصہ پہلے رواج حاصل کر لیا تھا۔ ۱۸۱۵ء سے پہلے ہی جرمنی میں فرانس کی نسبت آلوؤں نے زیادہ ترقی حاصل کر لی تھی۔ خشک سالی اور غلہ کی گرانی کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ ۱۷۷۱ء سے پہلے ہی آلوؤں کے خلاف تعصب کا خاتمہ ہو گیا[2]۔

---

[1] اکنامک ڈیولپمنٹ آف فرانس اینڈ جرمنی (فرانس اور جرمنی کی اقتصادی ترقی ۱۸۱۵ء تا ۱۹۱۴ء) مصنفہ جے۔ ایچ کلیپم ص ۲۲ ۔ [2] ایضاً ص ۱۸۔

یہ ظاہر ہے۔ کہ یورپ میں اس سو بہ سے کہیں زیادہ خوراک کا دارومدار افلاس پر رہا ہے۔ اور یورپ کا کوئی ملک اس پیمانہ پر زندگی بسر کرنیکی استطاعت نہیں رکھتا۔ جیسے یہاں ضروری ظاہر کیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک کو آلوؤں سے محروم کر دیجئے۔ اور آپ دیکھ لیجئے گا۔ قحط اسی طرح رونما ہو جائیگا جس طرح روز روشن کے بعد رات کی تاریکی محیط ہو جاتی ہے۔ پنجاب میں آلوؤں کو اسقدر عام کر دیجئے۔ کہ یہ روزمرہ کی خوراک میں شامل ہو جائے۔ تو آپ دیکھ لیجئے۔ کہ سب کے لئے خوراک بھی فراہم ہو جائیگی! اور بہت سی زمین بھی بچ جائیگی جس سے اور کام لئے جا سکتے ہیں۔ یورپ کے لوگ آلوؤں کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں۔ کہ ان سے محروم ہو جانا ان کیلئے مصیبت ہے آجکل آلوؤں کے متعلق جاہلانہ تعصب پایا جاتا ہے۔ وہ ان سے مانوس ہونے کے بعد اسی طرح دور ہو جائیگا جس طرح انگلستان اور فرانس اور جرمنی میں افلاس کی بدولت دور ہو گیا تھا۔ موجودہ زمانہ میں دنیا کا نظام ہی ایسا ہے۔ کہ اس اہم ترین نباتی خوراک کے استعمال کے خلاف جدوجہد بے سود ہے ؛

مویشی کی ہلاکت کے باعث بھی بہت سا نقصان ہوتا ہے۔ اس نقصان کو بہت حد تک روکا جا سکتا ہے لیکن پھر وہی مذہبی جذبات کا قضیہ حائل ہو جاتا ہے۔ اور طبعیات کے متعلق انسان نے جسقدر معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اُن سے فائدہ اٹھانے نہیں دیتا۔ لوگ ذکر اذکار کرتے رہتے ہیں۔ کہ تجارت برآمد اور گاؤکشی کے باعث بہت نقصان ہوتا ہے۔ لیکن اس مسئلہ پر انکی زبان گنگ ہے۔ کہ انکی اپنی جہالت اور مذہبی جذبات کی بدولت کسقدر زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ مردم شماری کے اعداد شمار سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ گائیوں اور بیلوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے یعنی ۱۸۸۱ء و ۱۹۳۱ء میں انکی تعداد ستر لاکھ تھی لور اب ایک کروڑ بیس لاکھ ہے لیکن اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں۔ کہ تجارت برآمد اور گاؤکشی کی وجہ سے جو در حقیقت ناقابل التفات چیزیں ہیں۔ گایوں کی تعداد کم ہو رہی ہے اقتصادی ترقی تو جبھی ممکن ہے۔ کہ حقائق کو پیش نظر رکھا جائے۔ اس قسم کی غلط بیانیوں سے تباہی کے سوا اور کوئی نتیجہ نکلنا ممکن نہیں ؛

اراضی کو چھوٹے چھوٹے قطعات میں تقسیم کرنے کیوجہ سے بھی بہت سا نقصان ہو رہا ہے۔ اراضی کی تقسیم کا جو طریقہ رائج ہے۔ اسکے روسے جب وارثوں میں اراضی تقسیم کی جاتی ہے۔ تو سب کو ہر کھیت کا ایک قطعہ دیا جاتا ہے یا کم از کم اُن کھیتوں کے متعلق جو گاؤں کے مختلف حصوں میں ہوتے ہیں۔ یہی طریقہ روا رکھا جاتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ مالک الاراضی کی مملوکہ زمین دس یا بارہ مقامات میں منتشر ہوتی ہے۔ ایسے ان منتشر قطعات اراضی کی زراعت میں بہت سا وقت۔ محنت اور طاقت ضائع کرنی پڑتی ہے۔ جاپان اور یورپ کے اکثر ممالک مثلاً فرانس۔ سوئیٹزرلینڈ اور بلجیم وغیرہ میں بھی یہی نقص موجود ہے۔ اور یہ صوبہ ان دیگر ملکوں سے جنہوں نے اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت کچھ سیکھ سکتا ہے ॥

غرض ہماری دلیل کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ پنجاب کے افلاس کے بڑے بڑے اسباب اس صوبہ کی تاریخ میں پائے جاتے ہیں یہ تو اب ظاہر ہو گیا ہو گا۔ کہ اگر کسی ملک کے لوگ مفلس ہیں۔ تو انکے افلاس کا باعث یہ ہے کہ وہ ایسی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ جو حصول دولت کیلئے ضروری ہیں۔ عوامل و اسباب دولت سے کافی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ گویا وہ جو کچھ کرتے ہیں انمیں اقتصادی حیثیت سے کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص دیانتداری سے تحقیقات کرنا چاہتے۔ تو اسے چاہیئے۔ کہ سہو و خطا اور غلطیوں اور نقائص کی ایک فہرست مرتب کرے ॥

اس صوبہ میں کبھی باقاعدہ اور منظم طریقہ پر کفایت شعاری اختیار کرنیکی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر ایسا کیا جاتا — تو یہاں بھی شمال مغربی یورپ کیطرح دولت جمع ہو جاتی۔ یہاں وقتاً فوقتاً جو رہنما پیدا ہوتے رہے ہیں ان کا تعلق محض شاہی خاندان کے استحکام یا مذہبی معاملوں سے رہا ہے۔ انہوں نے پیداوار بڑھانیکے مسائل کیجانب کوئی توجہ نہیں کی۔ لوگوں کے عام جذبات بھی دولت کے جمع کرنیکے حق میں نہیں انہیں یہ ہدایت کیگئی ہے۔ کہ مادی سود و بہبود کیطرف مت کرو۔ اور روحانی ترقی کی تعریف میں تر زبان ہو۔ آج بھی یہ کیفیت ہے کہ ایک با استعداد کاریگر کی نسبت ایک گدا اگر زیادہ عزت و احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں کی یہ کیفیت ہے۔ کہ انہیں اگر یہ کہا جائے کہ عام مصائب کا صحیح علاج یہ ہے۔ کہ زیادہ جانفشانی سے کام کیا جائے۔ قابلیت اور استعداد حاصل کیجائے۔ اور محنت و مشقت میں زیادہ مستعدی دکھائی جائے۔ تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر انکے سامنے کوئی تجربی حکمت عملی پیش کیجائے تو وہ اسے غور سے سنیں گے۔ ابھی تک مادی چیزوں کی کیجانب لوگوں کا میلان نہیں۔ اس کے ساتھ ایک اور مشکل یہ ہے کہ لوگ ایک اعلیٰ اور بلند و برتر طاقت پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ اور انہیں اسباب پر اعتماد نہیں کہ بس اعلیٰ قوت نے ان کیلئے جو راہ معین کر دی ہے۔ اس پر وہ انفرادی جد و جہد کی بدولت بہت کچھ ترقی کر سکتے ہیں۔ حکومت یا خدا سے لوگوں کے نقائص دور کرنے کی توقع کیجاتی ہے۔ جب تک ہر شخص کے ذہن میں یہ بات پوری طرح نہ بیٹھا دیجائے۔ کہ اس کی اقتصادی حالت اسکی اپنی غلطی کا نتیجہ ہے۔ کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس غرض کیلئے

یہ ضروری ہے۔ کہ اپنی مدد آپ کرنیکے جذبہ کو اسقدر ترقی دیجائے۔ کہ وہ دوسرے تمام جذبات پر چھا جائے۔

چونکہ بزرگوں نے روپیہ جمع نہیں کیا۔ جو موجودہ نسل کو ورثہ نہ ملتا! اسلئے سرمایہ بھی موجود نہیں جس سے آمدنی حاصل کی جاسکتی۔ سرمایہ موجود نہ ہو۔ تو اس کے بہترین استعمال کی سمجھ بھی مفقود ہوگی! اور بڑی بڑی رقوم کو مناسب طریقہ پر خرچ کرنے کا ڈھنگ نہیں آئیگا۔ جب تک انگلستان کے بڑے بڑے زمینداروں نے زراعت کی اصلاح و ترقی کیجانب توجہ نہیں کی تھی۔ دنیا بھر کی زراعت جمود کیحالت میں تھی بعض طریقوں میں ہالینڈ[1] کے کسانوں نے لوگوں کی رہنمائی کی لیکن اکثر نئے خیالات انگریزوں کی قوت ایجاد کے نتائج تھے۔ یہ اور بات ہے۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا۔ کہ سمندر پار کے ملکوں میں زراعت میں ترقی ہو رہی ہے۔ تو انہیں بھی ترقی کی تحریک ہوئی۔ اور انکی سوئی ہوئی ہمت بیدار ہو گئی۔ اس کے بعد لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا۔ کہ علم کیمیا اور فن زراعت میں گہرا تعلق ہے۔ تو کھادوں میں انقلاب ہو گیا! اور بڑی بڑی اہم تبدیلیاں ہونے لگیں۔ مویشی کی غور و پرداخت کے فن کا مطالعہ صدیوں سے کیا جا رہا ہے۔ اور جوں جوں اس فن کو ترقی ہوتی جاتی ہے۔ جزائر برطانیہ اصیل جانوروں کا بہت بڑا مرکز بن رہے ہیں۔ بس فن میں بعض ممالک مثلاً ڈنمارک اور ہالینڈ نے پچھلے دنوں بہت تیزی سے ترقی کی ہے لیکن جنوبی یورپ کے ملک مویشی کی پرورش کے بارہ میں موزوں ثابت نہیں ہوئے۔ بحیرۂ روم کے ساحلی ممالک اور تمام ایشیا اور افریقہ پر اس فن کی ترقی کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ پنجاب کے لوگ بھی مویشی کے پرورش کے اصولوں سے بالکل واقفیت نہیں رکھتے۔ حالانکہ اس بارہ میں لوگوں کے جذبات انکے عمل سے بالکل مخالفت و متضاد واقع ہوئے ہیں۔

بعض سیاسی اسباب و وجوہ کی بنار پر اس صوبہ میں سرمایہ عقل و دانش اور ہنرمندی نایاب ہے

---

[1] سترہویں صدی میں فلمنگ اور ہالینڈ کے باشندے جدید زراعت کے معلمین کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے مصنوعی گھاس کو استعمال کیا۔ ایسی جڑوں کی کاشت کی۔ جو جاڑے میں کام آسکتی ہیں! اور اس زمانہ میں ہوا۔ جب کہ اُن کے ہمسایئے ان علم اکتشافات سے بے خبر تھے۔ وہ زرعی ترقی میں سب سے پیش پیش نہیں تھے۔ بلکہ ملی اور تجارتی ترقی اور بنکنگ کے طریقوں میں بھی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔

تھورولڈ راجرس جلد پنجم صفحہ ۶۴ و صفحہ ۶۵۔

اور یہ ان تمام اسباب و عوامل سے عاری ہے۔ جن کا وجود اضافہ دولت کے لئے لازمی ہے ؂

چھوٹی چھوٹی اراضی بذاتِ خود افلاس کا باعث نہیں مصیبت تو یہ ہے۔ کہ اراضی سے ایسا کام نہیں لیا جاتا۔ کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے! اور کوئی ایسا عنصر بھی موجود نہیں۔ جو اس بات کا محرک ہو سکے۔ کسان اسیقدر جنس کی کاشت کرتا ہے جس قدر وہ فروخت کر سکے یا اپنی ذاتی ضروریات پوری کرے۔ وہ اتنی جنس ہی بوتا ہے جس قدر وہ کاٹ سکے لیکن اگر وہ جنس کاٹے۔ تو وہ اس کا کوئی نہ کوئی محل استعمال بھی تلاش کرے گا۔ پنجاب کے حالات ہی ایسے ہیں۔ کہ یہاں زائد از ضرورت غلہ پیدا کیا جائے۔ تو اس کی فروخت کے لئے منڈی نہیں مل سکتی۔ ہاں اگر کبھی آس پاس کے علاقوں میں غلہ کی غیر معمولی قلت ہو جائے۔ تو پنجاب کا غلہ فروخت ہو سکتا ہے۔ جب تک غلہ کی فروخت کے لئے منڈی موجود نہ ہو۔ زراعت کو کیونکر وسعت دی جا سکتی ہے۔ چونکہ صدیوں سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ اس لئے لوگوں کو بعض ایسی عادتیں پڑ گئی ہیں جن میں گذشتہ نصف صدی بھی تغیر پیدا نہیں کر سکی ؂

کسی ملک میں انسان۔ سرمایہ۔ قوت یا خاص مہارت کے بغیر زائد از صرف غلہ نہیں پیدا کر سکتا۔ جب تک پیداوار صرف سے زیادہ نہ ہو۔ دولت میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک دولت کے حصول سے یہ مقصد نہ ہو۔ کہ اسے خرچ کر کے زندگی کا لطف اٹھایا۔ اس وقت تک دولت حاصل کرنے کی خواہش بھی پیدا نہیں ہو گی۔ جب تک صوبہ میں ریلوے اور سڑکیں موجود نہیں تھیں۔ اور لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کا سامان نہیں ہوا تھا۔ کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی۔ جس پر روپیہ صرف کیا جاتا۔ تمام لوگوں نے دولت کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں جان رکھا۔ اس صوبہ میں جو مذہبی عقاید مروج ہیں۔ ان کی وجہ سے ایسی فضا مہیا نہیں ہو سکتی۔ جس میں اقتصادیات کا احساس نشو و نما پا سکے کسی حد تک یہی مذہبی عقاید لوگوں کے افلاس کا باعث ہیں! اور بہت حد تک خطرہ ہے۔ کہ جدید سائنٹیفک علم سے بعض امور مثلاً مویشی کی اصلاح و ترقی کے متعلق جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کے حصول میں یہی عقاید مانع رہیں گے۔ یہاں تمام پیشے خاص ذاتوں سے مخصوص کر دیئے گئے ہیں اور اس طریقہ کی بدولت ان گھریلو صنعتوں کو ترقی نہیں ہوئی۔ جو دنیا کے ہر ملک میں زراعت کی معاون سمجھی جاتی ہیں۔ روس اور جرمنی کے دہقان فرصت کے اوقات میں کھلونے اور لکڑی کی دوسری چیزیں

بناتے ہیں۔ انگلستان کے کسان شہد، مرغیاں، پھل، وغیرہ پیدا کرتے ہیں۔ یا ٹوکرے بنتے ہیں۔ اور دنیا کے تمام ملکوں کے کسان اسی قسم کے پیشوں میں مصروف ہیں۔ صرف ہندوستان میں یہ مثال ملتی ہے۔ کہ ایک چھوٹا سا مالک اراضی صرف اپنی اراضی کی پیداوار سے اسباب معیشت فراہم کرنیکی کوشش کرتا ہے۔ ہندوستانی کسان میں دنیا کے دوسرے ملکوں کے کسانوں کی تقلید کا جذبہ پیدا کرنے میں بھی ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے دہرم شاستر کی رو سے کسان کو جو رتبہ حاصل ہے۔ وہ زراعت کی ترقی میں بہت مانع ہوا ہے لیکن پنجاب کے دیہات کی حالت پر ایک نظر ڈالئے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ جو مسائل یہاں حل طلب ہیں وہ دوسرے ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں! اور پنجاب کے دیہات میں جو نقائص پائے جاتے ہیں انکے اسباب بیان کئے جائیں۔ تو بڑی آسانی سے یہ کہکر تردید کیجا سکتی ہے۔ کہ دوسرے ملکوں میں جہاں اسباب موجود نہیں۔ یہی نقائص کیوں نظر آتے ہیں؟

ان تمام مصیبتوں کا علاج صرف یہ ہے۔ کہ دیہاتی اقتصادیات کا مطالعہ دقت نظر سے کیا جاوے! اور حکومت اس صوبے کے وسائل دولت کو بسرعت تمام ترقی دینا چاہے۔ تو دوسرے ملکوں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھائے۔ رائے عامہ کی رہنمائی کیجائے! اور لوگوں پر واضح کردیا جائے۔ کہ زمانہ جدید کی زراعت کیا کیا کرسکتی ہے زراعت کی حیثیت کے متعلق ملک کے خیالات کی اصلاح کیجائے اور انپر یہ بھی واضح کردیا جائے کہ صنعت و حرفت کے قیام سے زراعت کیونکر اثر پذیر ہوسکتی ہے صفحات گذشتہ میں ہم نے اسبات پر زور دیا ہے۔ کہ افلاس کا اصل سبب چیزوں کا ضائع کرنا ہے اب بیان کرنا ضروری نہیں کہ مختلف حکمران خاندانوں کی باہمی زور آزمائی اور کشمکش سے ملک کو برہمی اور خرخونیت دا نار کی، سے جو صوبہ میں وقتاً فوقتاً رونما ہوتی رہی ہے کس قدر نقصان اٹھانا پڑا۔ پنجاب کی جغرافیائی حیثیت اس قسم کی ہے۔ کہ یہ خاص طور پر بیرونی حملہ آوروں اور لٹیرا ہونیوالی فوجوں کی غارتگری کا مرکز بن گیا ہے۔ ۱۸۴۹ء سے پہلے اس قسم کے حالات نہیں تھے۔ کہ ایک اعلیٰ معیار زندگی کے حصول کی راہ میں کوئی منظم ترقی کی جاسکتی۔ یہ مسائل تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انمیں زمانہ حال کے حالات کی شرح بھی نظر آتی ہے۔ اسلیئے اسباب افلاس کی تحقیقات کرتے وقت انہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے! اور جب زمانہ مستقبل کی توقعات پر بحث کیجائے۔ تو انپر ضرورت سے زیادہ زور بھی نہیں دینا چاہیئے۔ ذات پات کے اثرات صنعتی ترقی میں بہت مانع ہو رہے ہیں لیکن یہ مسئلہ اس قدر نازک ہے۔ کہ اس کتاب میں اس پر کوئی تفصیلی بحث نہیں کی جاسکتی۔ سر آر وہ ہندوستانیوں نے اس سلسلہ میں ان تمام امور کا ذکر وضاحت سے کردیا ہے۔ جنہیں ذہن میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ موجودہ تاریخ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ صنعتی ترقی اس صورت میں ممکن ہے۔

کہ ان تمام زنجیروں کی گرفت ڈھیلی کردی جائے۔ جنھوں نے لوگوں کو آبائی پیشہ یا پیشوں کو اختیار کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ اگر اس صوبہ کی خواہش ہے کہ بڑی بڑی صنعتوں کو فروغ حاصل ہو۔ تو اس کے باشندوں کو یہ اصول تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ انسان کی فطری صلاحیت کو موقع دیا جائے کہ رسم و رواج کی قیود سے بے نیاز ہو کر اپنے لئے مشاغل تلاش کرے۔

اوسطاً سالانہ زرعی پیداوار کا اندازہ ۸۰ کروڑ کیا گیا ہے۔ لیکن بحالت موجودہ ایک ارب روپیہ کا اندازہ صحت سے زیادہ قریب ہوگا۔ ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ اس قسم میں سے ۸ کروڑ روپیہ سے بارہ کروڑ روپیہ تک تو ساہوکاری اور سود کاروں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ اس کا ایک حصہ منافع نہیں ہوتا۔ بلکہ قرض دینے کا معاوضہ ہوتا ہے۔ جو دراصل نتیجہ ہے۔ قرض کے ایک ناقص طریقہ کا جو اس صوبہ میں رائج ہے۔ صوبہ کا اس قدر روپیہ تو بالکل ضائع ہوتا ہے۔ مقدمہ بازی میں جو اقتصادی نقصان ہوتا ہے اس کا اندازہ بھی تقریباً چار کروڑ کر لیجئے۔ مویشی کی ہلاکت سے جس کا روکنا ممکن ہے تین اور چار کروڑ کے درمیان نقصان ہوتا ہے۔ اگر لوگوں میں سائنٹفک طریقوں سے مویشی کا علاج کرنے اور ان کی ہلاکت روکنے کی زیادہ خواہش پیدا ہو جائے تو یہ روپیہ بھی بچایا جا سکتا ہے۔ چالیس ہزار ساہوکاروں کے علاوہ جن کا بوجھ صوبہ پر پڑا ہوا ہے تقریباً دس لاکھ چھوٹے چھوٹے تاجر ہیں۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کاروبار میں حصہ لینے والے سب لوگ عمدہ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ دیہات میں لون تیل کی جو چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں ان میں تقریباً دو لاکھ اشخاص کام کرتے ہیں۔ ان کی محنت و مشقت اس طرح بہت ضائع ہوتی ہے۔ لوگوں میں بڑے بڑے سٹور قائم کرنے کا رجحان نہیں پایا جاتا۔ ان اعداد سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ کس قدر عقل و دانش جس سے صنعتی کاموں میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ضائع ہو جاتی ہے۔ ان کے علاوہ ۱۵۸۰۰۰ سے زیادہ اشخاص ایسے ہیں جو سنار کا کام کرتے ہیں۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ان میں بالغ مردوں کی تعداد ۳۲۰۰۰ ہے جن کی روزانہ آمدنی تقریباً ایک روپیہ ہے۔ تو صوبہ کو سالانہ ایک کروڑ روپیہ کا زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ اس میں لوگوں کی وجہ سے صوبہ میں بیش قیمت دھاتوں کو جمع کیا جا رہا ہے

اور ان کی سرگرمیوں سے جس قدر نقصان ہوتا ہے وہ بہت زیادہ ہے ۔ سنار بہت اچھا بکدست صناع ہوتے ہیں ۔ وہ اپنی محنت اور قابلیت کو اگر زیادہ قابل قدر صنعتوں میں صرف کریں ۔ تو زیادہ نفع ہو سکتا ہے لیکن بحالت موجودہ ان کی وجہ سے محض نقصان ہو رہا ہے ۔ اب اس سلسلہ میں اور باتیں گنوانا غیر ضروری ہیں ۔ آپ کو ہر جگہ نقصان اور ضیاع ہی نظر آئیگا ۔ عقل و دانش کا نقصان ۔ قابلیت اور ہنرمندی کا نقصان ۔ محنت و مشقت کا نقصان ۔ سرمایہ اور قوت کا نقصان ۔ اگر صوبہ کی تعلیم ۔ دانش و عقل ۔ ہنرمندی ۔ محنت سرمایہ اور صوبہ کے بڑے بڑے وسائل سے دولت پیدا کرنے کا کام پوری طرح لیا جائے ۔ تو پنجاب کے افلاس پر آنسو بہانے کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی ٭

سولھواں باب

تجارت کا تحفظ یا آزادانہ تجارت

ہم ایک گذشتہ باب میں کہہ چکے ہیں کہ آج صنعتوں کو ترقی دینے کا مطالبہ اس لئے کیا جا رہا ہے کہ اس صوبہ میں ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں جن کے پاس سرمایہ ہے اور اُسے منفعت بخش طریق پر لگانا چاہتے ہیں۔ اور ایسے تعلیمیافتہ نوجوان ہیں۔ جو منفعت بخش وسیلہ معاش کی تلاش میں ہیں۔ یہ دونوں خواہشیں فطری اور قابل تعریف ہیں۔ اور صنعتوں کو ترقی دینے کے حق میں ایک بہت بڑی دلیل کا حکم رکھتی ہیں فنی تعلیم۔ علمی ایجادات کی تعلیم اور ضروری معلومات اور اطلاعات کی بہمرسانی حکومت اپنی پالیسی حکمت علمی آقرار دے چکی ہے۔ لیکن اب بھی اکثر اشخاص ایسے موجود ہیں۔ جو ہندوستانی تجارت کے تحفظ کے لئے محصول لگانا ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ ہندوستان کی منڈی میں ہندوستانی مصنوعات ہی فروخت ہوسکیں۔ آیئے اس تجویز پر پنجاب کے مخصوص حالات و اسباب کی روشنی میں غور کریں ؂

ہم اس صوبہ کے مخصوص جغرافیائی محل وقوع کا ذکر کر چکے ہیں۔ اور اس امر پر بھی بحث ہو چکی ہے کہ صوبہ کے اقتصادی وسائل پر محل وقوع کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ لوگوں کی مادی فلاح بہبود کی تمام مساعی جغرافیائی محل وقوع کی تابع ہیں۔ اور ہمیشہ تابع رہینگی۔ یورپ اور امریکہ کی صنعتوں میں بحری ساحل اور جہازرانی کے قابل دریا بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں جہاں مقابلہ و مسابقت کا بازار گرم ہے۔ خواہ مقابلہ وسیع ہے یا محدود اُنہیں کارخانوں کا قیام و بقا ممکن ہے جنہیں اپنے حریف کارخانوں پر کوئی نمایاں فوقیت حاصل ہو۔ باقی رہا یہ امر کہ یہ فوقیت کس قسم کی ہے تو یہ ممکن ہے کہ کسی کارخانہ کو کوئلہ یا طاقت حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع و وسائل سے قریب ہونے کے باعث یہ فوقیت حاصل ہو جائے۔ لیکن جب کسی کارخانہ کی تجارت کا دائرۂ تمام ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ چیز زیادہ مفید ہوگی۔ کہ کارخانہ سمندر کے قریب ہو۔ اور وسائل

عمل ونقل پر کم روپیہ صرف ہو۔ ہم یہ بیان کرچکے ہیں کہ انگلستان کا کوئی حصہ سمندر سے چالیس میل سے زیادہ دور نہیں۔ جاپان میں بھی بڑی بڑی صنعتیں ساحلی علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ جرمنی اور فرانس کے صنعتی کارخانے کوئلے کے میدانوں کے قریب واقع ہوتے ہیں۔ یہ ماننا پڑیگا۔ کہ اگر پنجاب میں کوئی کارخانہ ایسا قائم کیا جائے جس میں محض دوسرے ملکوں کی مصنوعات کی نقل کی جاتی ہو۔ تو وہ بین الاقوامی تجارت میں غیر ملکی کارخانوں کا مقابلہ نہیں کرسکیگا۔ کیونکہ وہاں کے کارخانوں کا ماحول بہتر واقع ہوا ہے ؂

لیکن یہ دلیل ان مصنوعات پر چسپاں نہیں ہوسکتی جن کے لئے خام اجناس بہت حد تک اسی صوبہ سے مہیا ہوسکتی ہیں۔ یہ جو ایسے خام اجناس سے تیار ہوتی ہیں۔ جو عام طور پر باہر بھیجی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا وزن اور حجم زیادہ ہوتا ہے۔ اور ان سے جو اشیا تیار ہوتی ہیں ان کا حجم قیمت کے اعتبار سے کم ہوتا ہے۔ مثلاً آجکل بہت سے بیج جن سے تیل نکلتا ہے۔ باہر بھیجے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان سے یہاں تیل نکالکر باہر بھیجا جاسکتا ہے تیل نکلنے کے بعد جو فضلہ بچ جائیگا۔ وہ مویشی کی خوراک اور کھاد کے کام آئیگا۔ اسی طرح ہڈی چمڑا وغیرہ اشیا دوسرے ملکوں میں کئی مرحلوں سے گذرنے کے بعد استعمال کے قابل ہوتی ہیں۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ پنجاب میں ہی ایک دو مرحلوں سے گذر لیں۔ تاکہ دوسرے ملکوں میں تھوڑی سی محنت کے بعد قابل استعمال بنایا جاسکے لیکن اگر پنجاب میں یہ کوشش کی جائے کہ بمبئی کی طرح یہاں بھی پارچہ بافی کے کارخانے قائم ہوجائیں۔ تو ان کارخانوں کو وہ سہولتیں حاصل نہیں ہونگی۔ جو بمبئی کو ایک بہت بڑی بندرگاہ کے قریب ہونے کی وجہ سے حاصل ہیں ؂

تحفظ کے خیال کا سبب

تجارت کے تحفظ کا خیال اس لئے پیدا ہوا۔ تاکہ مقامی مصنوعات مقامی مانگ میں باہر کی آئی ہوئی اشیا کا مقابلہ کرسکیں۔ دراصل اس تحفظ کے معنی یہ ہیں۔ کہ بدیشی مصنوعات سے سودیشی مصنوعات کو برتر رکھا جائے۔ تجارت برآمد پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس لئے متذکرہ بالا صنعتیں جو اس مقصد کے لئے قائم کی گئی ہیں۔ یا قائم کی جائینگی۔ کہ خام اجناس باہر بھیجنے سے

سے پہلے چند مرحلے طے کر کے صرف و استعمال کی منزل کے قریب ہو جائیں۔ اس تحفظ سے بلا واسطہ اثر پذیر نہیں ہونگی۔ زرعی ممالک میں اس قسم کی صنعتیں زیادہ ترقی کر سکتی ہیں۔ اور تحفظ سے ان کی ترقی کو چنداں فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ آجکل حریفانہ مقابلہ کا بازار گرم ہے جس جگہ دوسری صنعتوں نے کوئی ترقی نہ کی ہو وہاں کسی ایک صنعت کے زندہ رہنے کی امید نہیں ہو سکتی۔ آجکل کارخانوں کو کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کارخانے قائم کرنے والوں کو تجربہ نے بتا دیا ہے۔ کہ کارخانوں کی بہم ضروریات کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے لئے ایسی جگہ منتخب کی جائے۔ جہاں تمام ضروری اشیا فراہم ہو سکیں اگر پارچہ بافی کا کوئی نیا کارخانہ قائم کیا جائے تو اس کے قیام کے لئے بمبئی کو رہتک یا لائل پور پر ترجیح دی جائیگی۔ کیونکہ وہاں خام اجناس کے سوا تمام ضروریات فراہم ہو سکتی ہیں۔ چونکہ دوسرے شہروں میں پارچہ بافی کے کارخانے قائم نہیں ہوئے۔ اس لئے وہاں کئی متعلقہ صنعتوں نے نشوونما نہیں پائی جن کا وجود پارچہ بافی کی ضروریات پورا کرنے کے لئے لازمی ہے۔ یہ سمجھئے کہ جن علاقوں میں اعلےٰ درجہ کی خاص مصنوعات تیار کی جا رہی ہیں۔ انہیں محض اتفاقاً یہ شرف حاصل ہو گیا ہے۔ بلکہ جن علاقوں میں کسی صنعت کے بہت سے کارخانے موجود ہیں مشینوں کی مرمت ہو سکتی ہو۔ قابل لوگوں کے مشورہ اور رہنمائی سے استفادہ کرنے کا موقع مل سکتا ہو تجربہ کار منتظم فراہم ہو سکتے ہوں۔ صنعت کا فنی اور اصطلاحی علم رکھنے والے موجود ہوں۔ غرض کہ ایک صنعت کی تمام متعلقہ ضروریات جمع ہوں۔ وہیں کارخانوں کی تعداد بڑھیگی۔ لیکن اگر کہیں صرف ایک کارخانہ قائم ہو تو اسے یہ آسانیاں میسر نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر اس صوبہ میں دوسرے صوبوں کے صنعتی مرکزوں کا مقابلہ کرنے کے خیال سے ان کی نقالی میں کوئی صنعت قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ تو یقیناً یہ کوشش ناکام ہوگی۔ اس لئے ہم نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ پنجاب میں اگر جتنے کارخانے کھولے گئے تو جہاں انہیں ممالک خارجہ کی مصنوعات سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ وہاں دوسرے صوبوں کے کارخانوں سے بھی اس کا تحفظ ضروری ہوگا۔ جو عرصہ دراز سے قائم ہیں۔ چونکہ یہ عملی طور پر ناممکن ہے کہ ایک صوبہ کی مصنوعات دوسرے صوبوں میں بھیجی جائیں۔ تو ان پر محصول لگایا جائے۔ اس لئے محب وطن پنجابیوں کا فرض ہے کہ وہ تحفظ

کے مسئلہ پر رائے دیتے وقت احتیاط سے کام لیں۔

اگر یہ مان لیا جائے۔ کہ صوبہ میں سرمایہ بھی ہے عقل و دانش کی بھی کمی نہیں لیکن ان سے ابھی تک پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ انہیں کس طرح استعمال کیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل ہو سکے۔ ان دونوں چیزوں کو کسی صنعت پر لگانے کا فیصلہ کرنے سے پیشتر یہ معلوم کر لینا چاہئے۔ کہ آیا دوسری صنعتوں پر انہیں فوقیت حاصل ہے مثلاً جدید نہروں کی تعمیر اس قسم کی ایک صفت ہے۔ صنعتوں کے قائم کرنے کا مطالبہ تو عام طور پر کیا جاتا ہے لیکن اس مطالبہ کی وجہ یہ نہیں۔ کہ ان لوگوں کو صوبہ کی اہلیت و صلاحیت کا پورا پورا علم ہے۔ اور وہ یہ جانتے ہیں۔ کہ پنجاب کی فضا صنعت و حرفت کی نشو و نما کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ یہ مطالبہ بہت حد تک جذبات پر مبنی ہے۔ اور لوگ محسوس کرتے ہیں۔ کہ جب تک اس صوبہ میں صنعت و حرفت کو وسیع پیمانہ پر ترقی نہ دی جائے پستی سے نجات حاصل کرنا ممکن نہیں۔ یہ جذبہ بہت قابل تعریف سہی لیکن اس کا کیا علاج کہ دوسرے صوبوں میں پنجاب سے زیادہ کامیابی کے لوازم اور وسائل موجود ہیں۔ پورے یقین سے یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہ پنجاب میں صنعتوں کا قیام منفعت بخش ہوگا۔ ہندوستان پر تحفظ کے عام اثرات و نتائج کیا ہونگے۔ اس کے متعلق کوئی قطعی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی۔ اس مسئلہ میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں جن ممالک نے تجارت کے تحفظ کیلئے درآمد اور برآمد پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ ان میں بھی اس امر کے متعلق اختلاف رائے موجود ہے۔ کہ اس حکمت عملی نے کیا فائدہ پہنچایا ہے۔ اور جن ملکوں میں تجارت کے بارہ آزادی دے رکھی ہے ان میں بھی بعض زبردست پارٹیاں ایسی موجود ہیں جو اس حکمت عملی کی مخالفت کرتی ہیں۔ ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں کس قدر پیچیدگیاں ہیں۔ ان حالات میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایسی مبہم اور غیر یقینی حکمت عملی کو اختیار کرنے سے پیشتر اس امر کی تحقیقات نہایت یقینی طور پر کر لینی چاہئے۔ کہ کن صنعتوں کا تحفظ مقصود ہے! ور تحفظ سے کن نتائج کی توقع کی جاتی ہیں۔ عام طور پر غلطی سے یہ فرض کر لیا گیا ہے۔ کہ بس ادھر تجارت برامد پر پابندیاں عائد ہوئیں۔ اور ادھر صنعتیں روئیدگی طرح پیدا ہونے لگیں۔ ہندوستان میں بہتیری صنعتیں ایسی ہیں۔ جو تحفظ کے بغیر ہی منفعت بخش ثابت ہوئی ہیں۔ ایسی صنعتیں موجود ہیں۔ جنہیں جغرافیائی

محل وقوع اور بعض دوسری خصوصیات نے غیر ملکی مصنوعات کی دراز دستی سے محفوظ کر رکھا ہے۔ اس ملک میں
ہل کا استعمال عرصہ دراز سے ہو رہا ہے سمندر پار کے ملکوں سے ہل یہاں لائے نہیں گئے۔ ان کی فراہمی مقامی
صناعوں پر موقوف ہے۔ پھر بھی کوئی ایسا کارخانہ موجود نہیں جن میں ہل تیار ہوتے ہیں۔ تحفظ دوسرے لوازم
صنعت کے بغیر مفید نہیں۔ جب تک یہ لوازم صنعت موجود نہ ہوں کارخانے قائم نہیں ہو سکتے۔ ایک زرعی
ملک میں عام طور پر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے۔ کہ دیسی گیہوں کے مقابلہ میں غیر ملکی گیہوں پر پابندیاں عائد کی جائیں
تاکہ کسانوں کو اس امر کا یقین ہو جائے۔ کہ اُنہیں گیہوں کی قیمت زیادہ ملیگی۔ ان کی ہمت بڑھے۔ اور
وہ شہر والوں کی ضروریات کے لئے زیادہ گیہوں پیدا کر سکیں لیکن پنجاب کے شہروں کے باشندے
اس قسم کی کوئی پابندی پسند نہیں کرینگے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ دو باتوں سے ایک پسند کریں یعنی یا تو تجارت
میں آزادی دیدی جائے۔ یا اس بات پر آمادہ ہو جائیں۔ کہ ہر چیز حتیٰ کہ اشیائے خورد و نوش پر بھی پابندیاں
عائد کر دی جائیں۔ تو قرین قیاس یہی ہے۔ کہ عوام اشیائے خوردنی کی گرانی کو کارخانوں کی ترقی کی خاطر گوارا
نہیں کرینگے ۔

قابل غور نکتہ

ایک اور بات جسے عام طور پر پوری طرح محسوس نہیں کیا جاتا یہ ہے۔ کہ اگر کارخانوں کی ترقی
کیلئے اس قسم کے مصنوعی ذرائع سے کام لیا گیا تو اس سے ملکی دستکاری کی تباہی کا اندیشہ ہے۔ جب صوبہ
میں کارخانے قائم ہو جائینگے تو دستکاری کا زندہ رہنا دشوار ہے۔ یہ اور بات ہے۔ جب جدید قسم کے
کارخانے قائم ہو جائینگے۔ تو ان چھوٹی موٹی پرانی صنعتوں کی تباہی پر چنداں تشویش نہیں چاہیئے۔ خالص
اقتصادی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مقصود اصلی محض اس قدر ہے۔ کہ ہر کارکن کو اس بات کا
موقع دیا جائے کہ وہ کسی ایسے کام پر محنت صرف کرے۔ جس کی بدولت اسے زیادہ سے زیادہ
آمدنی حاصل ہو سکے اور یہ ظاہر ہے۔ کہ کوئی شخص جس قدر زیادہ سرمایہ لگائیگا اُسے اُسی قدر زیادہ
دولت کے حصول کی توقع ہوگی۔ مثلاً عام طور پہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ ایک جلاہا پرانی وضع کے اچھے سے
جس کی قیمت محض چند روپے ہوتی ہے۔ کام کر کے جتنا روپیہ کماتا ہے۔ ہزارہا روپیہ کی مشینوں سے
کام کر کے اس سے بدرجہا زیادہ روپیہ پیدا کر سکتا ہے۔ موجودہ دستی راچھ کے بجائے اگر مشینوں سے

کام لیا جائے تو ماہرین اقتصادیات کو اس پر افسوس نہیں ہوگا۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے۔ کہ اگر مشینوں کے مالک غیر ہندوستانی ہوئے تو قومی جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ یہ امر زور دینے کے قابل تو نہیں البتہ قابلِ ذکر ضرور ہے ؎

تجارت اور صنعت و حرفت کی حکمت عملی اختیار کرنے کے خلاف ایک اور دلیل یہ ہے۔ کہ اس صوبہ کے لوگ بہت مفلس ہیں۔ اگر اس حکمت عملی کو اختیار کر لیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ مصارف زندگی میں اضافہ ہو جائیگا۔ اور اہل پنجاب میں اتنی استطاعت نہیں۔ دوسرے ملکوں کے حالات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حفاظت کی حکمت عملی وہاں صنعتوں کی ترقی کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہاں اس حکمت عملی کے اختیار کرنے پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اس بارہ میں لوگوں کا عقیدہ یہ معلوم ہوتا ہے حفاظت کی حکمت عملی اختیار کی گئی تو اس سے نقصان کی نسبت فائدہ زیادہ ہوگا لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس حکمت عملی سے ہندوستان میں بھی صنعت و حرفت کو ترقی ہوگی جب بھی یہ لازم نہیں آتا۔ کہ اس سے اس قدر فائدہ ہوگا۔ پنجاب سمیت تمام صوبوں کو اپنے نقصانات کا کافی معاوضہ مل جائیگا۔ اس سے زیادہ تر فائدہ انہیں صوبوں کو ہوگا جو سمندر کے قریب واقع ہیں جنہیں صنعت و حرفت کا تجربہ بھی ہے۔ اور تنظیم سے بھی بہرہ یاب ہیں۔ اور پھر وہ اپنے صوبوں سے بیشتر فائدہ حاصل کریں گے۔ جو صنعت و حرفت کے میدان میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور محصول کے زیادہ ہونے کی وجہ سے بمبئی۔ کلکتہ اور مدراس کے کارخانوں کی مصنوعات استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ بیچارے پنجابیوں کو جن کے مصارف زندگی بڑھ جائیں گے۔ بھلا یہ جان کر کیا تسکین ہو سکتی ہے۔ کہ کلکتہ۔ بمبئی اور مدراس میں مُلکی صنعتیں قائم ہو گئی ہیں۔ اکثر غیر ممالک میں زرعی پیداوار کی درآمد پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ تاکہ بیچارے کسان کو گراں قیمت پر ضروری اشیاء خریدنے سے جو خسارہ ہوتا ہے اُس کی تلافی ہو جائے لیکن یہاں کسانوں کو اس وقت کا انتظار کرنا پڑیگا۔ کہ شہروں اور قصبوں کو ترقی ہو۔ اور اسے اب دوسرے ملکوں سے زرعی پیداوار کی جس قدر قیمت ملتی ہے۔ اس سے زیادہ قیمت حاصل ہو سکے۔ یہ بات واضح نہیں ہوئی۔ کہ اگر بمبئی کے کارخانوں کو ترقی دی گئی تو اس سے پنجاب کے باشندوں کو کیا فائدہ ہوگا ؎

چونگی کا مسئلہ

چونگی کے مسئلہ میں اس قدر غلط بحث ہو گیا ہے کہ کبھی اس پر ٹھنڈے دل سے بحث نہیں کی جاتی کارخانے والے تو قدرتاً صنعت و حرفت کے حفاظت کے خواہشمند ہونگے کیونکہ اس طرح انہیں اپنی مصنوعات کو زیادہ قیمت پر بیچنے اور زیادہ منافع حاصل کرنیکا موقع ہاتھ آجائیگا۔ انہیں یہ بات بہت اچھی معلوم ہوتی ہے کہ مصنوعات کے باہمی مقابلہ و مسابقت کو سرکاری حکم سے روک دیا جائے۔ اور اس بات کی نوبت ہی نہ آئے کہ ان کا مال اپنی خوبی کی وجہ سے غیر ملکی مصنوعات پر سبقت حاصل کرے۔ ان کی یہ خواہش اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ جو سیاسی پارٹی ان سے صنعت و حرفت کی حفاظت کا وعدہ کرے۔ وہ اس کے فنڈ میں چندہ دینے پر آمادہ ہو جائینگے۔ ان سیاسی پارٹیوں کے قبضہ میں اخبارات بعد دوسرے ترجمان ہیں۔ جو ہمیشہ اس حکمت عملی کی خوبیاں بیان کرتے رہتے ہیں۔ جب یہ حال ہو تو عام آدمیوں کو کیونکر یقین نہ آئے کہ تحفظ کی حکمت عملی جس کی حمائت میں اخبارات اور سیاسی لیڈر دونوں ہمزبان ہیں ضرور اچھی چیز ہو گی لیکن ایک کارخانے والا جس چیز کی زیادہ قیمت لینا چاہتا ہے دوسرا اُسے سستا خریدنے کا خواہشمند ہے مثلاً سوت کے کارخانے والا سوت کو گراں قیمت پر بیچنا چاہتا ہے اور پارچہ بافی کے کارخانے کا مالک سوت کو ارزاں قیمت پر خریدنا چاہتا ہے۔ اگر غیر ملکی سوت پر پابندیاں عائد کر دی جائیں۔ تو اس سے ان دونوں پر مختلف اثر ہو گا۔ اس لئے جب تک کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ جو دونوں کے لئے قابل قبول ہو۔ اس بحث میں دونوں کا طریق عمل جداگانہ ہو گا۔ یعنی ایک تو سوت پر قیود عائد کرنے کی حمائت کریگا اور دوسرا مخالفت۔ چونکہ کسی ایسے طریقہ کی تلاش ضروری ہے۔ جسے دونوں قبول کر سکیں۔ اس لئے صنعت و حرفت کی حفاظت کے ساتھ ایک اور خرابی کا ظہور بھی ہو گا یعنی ملکی سیاست پر رشوت ستانی کا اثر پڑیگا۔

انگلستان کی مثال

انگلستان میں غلہ کے قوانین کے خلاف جو شورش برپا ہوئی اس کا صرف یہی سبب نہیں تھا کہ لوگ آزادانہ تجارت کے فوائد محسوس کر چکے تھے۔ ایک باعث یہ بھی تھا کہ نظم و نسق میں خود غرضی اور

بد دیانتی ملحوظ رکھی جاتی تھی - اور تجارت میں بیجا مداخلت کی جاتی تھی - اور ان امور نے لوگوں میں غیظ و غضب کے جذبات پیدا کر دیئے تھے - جب صنعت و حرفت ابتدائی مرحلے طے کر کے استقلال و ثبات حاصل کر لے - تو رشوت ستانی اور بد دیانتی کے اندیشہ سے حفاظت کی حکمت عملی کو ترک کرنا پڑیگا - اس چیز کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ جن ملکوں میں اس حکمتِ عملی کا تجربہ کیا گیا ہے وہاں اس سے کیا نتائج ظہور پذیر ہوئے ہیں ؛

یہ صحیح ہے کہ اکثر ممالک نے صنعت و حرفت کے تحفظ کی حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے لیکن جو ملک تمدن اور تہذیب میں بڑھے ہوئے ہیں - وہاں تجارت پر پابندیاں نہیں ؛

انگلستان - ہالینڈ - بلجیم اور بہت حد تک ڈنمارک نے عدم مداخلت کی حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے - جرمنی تحفظ کی پالیسی پر عامل ہے - اس کی وجہ یہ تھی - کہ مرکزی حکومت کو روپیہ کی ضرورت تھی - اور ماتحت ریاستوں کو روپیہ دینے سے انکار تھا - چونکہ مرکزی حکومت کو یہ اختیار نہیں تھا - کہ ریاستوں کی مرضی کے بغیر براہ راست محصول لگا سکے - اس لئے بسمارک اس بات پر مجبور ہو گیا - کہ چونگی کے نرخ زیادہ کر دئے جائیں - اس لئے عوام میں اس طریق عمل کو مقبول بنانے کے لئے اسے رنگ دیدیا گیا کہ یہ طریقہ صنعت و حرفت کی حفاظت کے لئے اختیار کیا گیا ہے - اس سلسلہ میں امریکہ کی حالت عجب واقع ہوئی ہے - امریکہ نے تمام یوروپ علے الخصوص سلطنت متحدہ (جزائر برطانیہ) کے صناعوں اور ہنرمند کاریگروں کی توجہ منعطف کر لی تھی - اور یہ لوگ چاہتے تھے - کہ امریکہ کی منڈی پر پورا پورا قبضہ کر لیں - اور انگلستان کی مصنوعات سے مقابلہ کا اندیشہ نہ رہے - امریکہ کی مصنوعات بہت حد تک انگریزوں یا یوں کہ ایسے لوگوں کی ہمت کا نتیجہ تھیں - جو انگلستان میں پیدا ہوئے - ایک زمانہ میں انگلستان کے بڑے بڑے صنعتی مرکزوں کے بڑے بڑے صناع کام لیکر امریکہ چلے گئے تھے - بلکہ جنگ عظیم کے زمانہ میں امریکہ کی صنعتوں پر جس قدر روپیہ صرف ہوا - وہ انگلستان سے آیا تھا - اس طرح ریاستہائے متحدہ امریکہ نے سرمایہ - قابلیت - اور ہمت سب کچھ یورپ سے مستعار لیا - اور ان چیزوں کی مدد سے بڑے بڑے کارخانے قائم کر لئے - جاپان نے بھی امریکہ سے

سبق لیا۔ یعنی یوروپ سے مشینیں لیں۔ اُسی سے نظم ونسق کا ڈھنگ اور کارخانہ چلانے کا طریقہ سیکھا۔ اور اسی سے سرمایہ لیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پنجاب کس حد تک ان ممالک کے نقش قدم پر چل سکتا ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں حرارت اس قدر زیادہ ہوتی ہے۔ کہ کارخانوں کی چار دیواری کے اندر رہ کر زیادہ دیر تک کام نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر متذکرہ بالا حکمت عملی کے اختیار کرنے میں بہت سے دوسرے امور بھی مانع ہیں جن کی بنیاد صرف جذبات پر ہے ؎

اگر یہ بات اطمینان بخش طریقہ پر ثابت ہو جائے۔ کہ اس صوبہ کے اندر بعض صنعتیں ایسی ہیں۔ جنہیں محض اس لئے قائم کرنا یا ترقی دینا ممکن نہیں۔ کہ غیر ملکی مصنوعات سے انہیں مقابلہ کرنے پڑے گا۔ اور اگر ان کی حفاظت کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ تو انہیں اس خطرہ سے نجات ہو جائے گی۔ ساتھ ہی اس بات کا ثبوت فراہم ہو جائے۔ کہ ان صنعتوں کی وجہ سے صوبہ کو فائدہ بھی ہو گا۔ تو یہ واقعی حفاظت کی تدابیر اختیار کرنے کے حق میں ایک زبردست دلیل ہے۔ لیکن ابھی تک اس بات کا ثبوت فراہم نہیں ہو سکا۔ جو لوگ صنعت وحرفت میں ناکام ہوتے ہیں وہ غیر ملکی مصنوعات سے مقابلہ کو اپنی ناکامی کا باعث قرار دیتے ہیں۔ چونکہ ناکامی کی وجہ ان کی اپنی ناقابلیت۔ ناتجربہ کاری۔ کوتاہ اندیشی اور بے ہنری ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا بیان سننے میں احتیاط برتنا لازم ہے۔ بحالت موجودہ کوئی ایسی صنعت نہیں۔ جو کسی حیثیت سے بھی بحث اور غور کا مرکز بنی ہوئی ہو۔ درحقیقت ابھی تک اس امر پر بھی اتفاق رائے نہیں ہوا کہ حفاظت کی حکمت عملی کی مدد سے کن صنعتوں کو محفوظ رکھنا مقصود ہے۔ ایک ہندوستانی ماہر اقتصادیات اس سلسلہ میں کہتا ہے۔ کہ یوں تو ہر اخبار نویس اور لیڈر یہی کہتا ہے۔ کہ اس ملک کی صنعتیں ابھی ابتدائی حالت میں ہیں۔ اور جو لوگ ان کے منتظم ہیں۔ وہ بھی کاروباری تجربہ اور قابلیت کے اعتبار سے یورپ والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ؎

اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ حکومت تجارت برآمد پر محصول لگا کر اور عطیے

بخش کر دینی گرانٹ دے کر) اس کی سرپرستی کرے لیکن ہندوستان میں صنعت وحرفت کی ترقی کا جو نیا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ وہ اس قدر محدود ہے کہ ابھی تک اس امر کے متعلق عوام نے واضح طور پر کوئی رائے قائم نہیں کی۔ کہ اس ملک میں کونسی صنعتیں قائم کی جائیں جن کی حفاظت حکومت کرے۔ مسٹر گھو کھلے آنجہانی بھی تذبذب میں مبتلا تھے۔ کہ فی الحال کن صنعتوں کی حفاظت کی جائے۔ انہیں ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی تھا۔ کہ حفاظت کی حکمت عملی کو ایسے امور کی ترقی میں صرف کیا جائے گا جنہیں اکثر ہندوستانی پسند نہیں کرینگے چنانچہ انہیں باتوں سے مجبور ہو کر انہوں نے کہا تھا" میرا عقیدہ ہے کہ بحالت موجودہ آزادانہ تجارت کی حکمت عملی جس سے موزون طریقہ پر کام لیا جائے ہمارے لئے محفوظ ترین حکمت عملی ہے ؎

آج کل پنجاب میں باہر سے مصنوعات آتی ہیں۔ اور یہاں سے اشیائے خوردنی اور خام اجناس دوسرے ملکوں کو جاتی ہیں۔ نئی صنعتیں کہیں بہت عرصہ میں اس قدر ترقی کریں گی۔ کہ آج کل باہر سے جو چیزیں آتی ہیں ان کے بجائے مانگ پوری کر سکیں۔ جب تک مقامی صناع یہ چیزیں فراہم نہیں کر سکتے۔ انہیں بیرونی ممالک سے منگوایا جائے گا۔ اس عرصہ میں پنجاب کے لوگ درآمد شدہ اشیاء کی زیادہ قیمت ادا کرتے رہیں گے۔ اور یہ روپیہ شاہی خزانہ میں داخل ہوتا رہے گا۔ ابھی تک یہ بھی یقینی نہیں۔ کہ جو چیزیں باہر سے منگوائی جاتی ہیں۔ وہ اسی صوبہ کے اندر تیار کی جا سکتی ہیں۔ تجربہ اس خیال کی تائید نہیں کرتا۔ کہ حفاظت کی حکمت عملی سے صنعتوں کو ترقی ہوگی۔ دودھ اور گھی کو درآمد شدہ اشیا سے مقابلہ کا خطرہ تو نہیں۔ پھر بھی ان دونوں چیزوں کی طلب اُن کی رسد سے زیادہ ہے۔ اور اس امر کی جانب کسی کی توجہ نہیں کہ ان اشیا کی پیداوار میں سرمایہ صرف کرنا چاہئے۔ دوسرے ممالک میں دودھ اور گھی کی پیداوار نے ایک بڑی صنعت کی حیثیت اختیار کر لی ہے جس پر سرمایہ عقل و دانش اور ہمت صرف کی جاتی ہے لیکن یہاں حصول دولت کے اس اہم ذریعہ پر یہ چیزیں صرف نہیں کی جاتیں شیشہ کی صنعت بھی محفوظ ہے۔ کیونکہ آسٹریلیا اور

بلجیم سے جو شیشہ منگوایا جاتا ہے اس کے وسائل حمل ونقل پر بہت لاگت صرف آتی ہے۔ اور جنگ کے زمانہ میں نوان ملکوں سے بھی شیشہ منگوایا نہیں جا سکتا تھا۔ بایں ہمہ شیشہ کی صنعت کو بھی چنداں فروغ حاصل نہیں ہوا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ کثیر التعداد لوگ کپڑے۔ چمڑے۔ جواہرات وغیرہ کی صنعتوں پر لگے ہوئے ہیں جو آزادانہ تجارت کے موجودہ طریقہ کے باوجود زندہ ہیں۔ جب یہ لوگ گذشتہ زمانہ میں معاش حاصل کرتے رہے۔ تو اب وہ بجائے اس کے کہ نئی صنعتوں کو صوبہ سے روشناس کرائیں۔ سائینٹفک تعلیم۔ فنی واقفیت رکھنے والے لوگوں کی اعانت اور جدید مشینوں کے توسط سے اپنے پیشوں کو فروغ دے سکتے ہیں ؛

متذکرہ بالا امور سے یہ واضح ہو گیا۔ کہ اگر آزادانہ تجارت باحفاظت کے مسئلہ کی عام حیثیت سے قطع نظر بھی کر لیا جاوے۔ جب بھی اہل پنجاب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس مسئلہ کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے بعض خاص امور کے متعلق اطلاع حاصل کریں۔ اس مسئلہ کی حیثیت عمومی میں بعض خودغرضانہ مقاصد کی وجہ سے اس قدر خلط مبحث ہو گیا ہے۔ کہ اب اس مسئلہ کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ کہ آزادانہ تجارت مفید ثابت ہوگی۔ باحفاظت کی حکمت عملی سے زیادہ فائدے حاصل ہونگے۔ اس ملک میں جذبات پرستی کا عنصر اس قدر زیادہ ہے۔ کہ مسئلہ زیر بحث میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی ملک میں صنعتوں کا قیام چاہتے ہیں۔ لیکن ابھی تک انہوں نے یہ بھی فیصلہ نہیں کیا۔ کہ انہیں کونسی صنعتیں مطلوب ہیں۔ یا وہ صنعتیں کہاں کہاں قائم کی جائیں گی۔ اور آیا لوگ صنعتوں کے قیام کی خاطر کوئی قربانی یا ایثار بھی کر سکتے ہیں۔ کیا پنجاب کے لوگ اس امر پر تیار ہیں کہ جن مصنوعات کو وہ استعمال کرتے ہیں۔ انہیں محض اس لئے گراں خریدیں۔ کہ ہندوستانی صنعتوں کو ساحلی صوبوں میں فروغ حاصل ہو۔ اگر وہ ولیسی مصنوعات کو زیادہ قیمت دے کر خریدنے پر آمادہ ہیں۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ کس حد تک زیادہ قیمت دے سکتے ہیں۔ تیس فیصدی۔ پچاس فیصدی

یا سو فیصدی ! - اگر کارخانے کے مالک یہ کہہ دیں کہ وہ اپنے کاروبار کے قیام و بقا کے لئے اس حد تک قیمتیں زیادہ لیں گے تو کیا پنجاب کے باشندے اتنی قربانی پر آمادہ ہو جائیں گے - کیا وہ تمام اشیا کے مزید مصارف کے متحمل ہو سکتے ہیں - یا صرف بعض اشیا کو زیادہ قیمت پر خرید سکتے ہیں - اگر یہ صحیح ہے تو وہ چیزیں کون کون سی ہیں ؟

اگر صنعتوں کے مکمل تحفظ کا انتظام کر دیا جائے تو ہر قسم کی غیر مفید صنعتیں قائم کی جا سکتی ہیں - انہیں چلایا بھی جا سکتا ہے - اور ان سے کوئی نہ کوئی شخص فائدہ بھی حاصل کر سکتا ہے - جب تک پنجاب ہندوستان کی صنعتی ترقی میں خود حصہ نہ لے - اس وقت تک یہی کیفیت رہے گی - کہ دیسی مصنوعات کی قیمتیں گراں ہوتی چلی جائیں گی - اور پنجاب کا معیار زندگی برابر پست ہوتا جائے گا - پنجاب اس وقت تک صنعتی ترقی کی عام تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا - جب تک بعض اشیا کی ساخت میں اُسے دوسرے صوبوں پر فوقیت حاصل نہ ہو - اور ساحل بحر سے دوری اور کوئلہ وغیرہ جیسے لوازم کامیابی سے محرومی کے باعث اُسے جو خسارہ ہوگا - اُس کی پوری پوری تلافی نہ ہو جائے - یہ نہیں کہا سکتا کہ پنجاب میں یقیناً صنعتی کارخانے قائم ہو جائیں گے - کیونکہ ابھی تک یہ بات بھی صاف صاف معلوم نہیں ہوئی - کہ یہاں کونسی صنعتیں قائم ہوں گی - یہ صحیح ہے کہ پنجاب کے لوگ اپنے صوبہ میں مفید صنعتوں کا قیام چاہتے ہیں - یہ بھی درست ہے کہ زراعت کی ترقی کا تقاضا یہی ہے کہ یہاں کارخانے قائم کئے جائیں - اور یہ بھی مانا کہ جب تک یہاں صنعتیں قائم نہ ہوں متعصب طبقہ کے لوگوں کا مستقبل چنداں روشن نظر نہیں آتا - لیکن اس سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ حفاظت کی حکمت عملی سے یہ مقصد حاصل ہو جائیگا ؎

اگر موجودہ حکمت عملی میں کوئی تبدیلی کی گئی تو جو اس سے فوری اثرات رونما ہوں گے وہ ظاہر ہیں حفاظت کی حکمت عملی کا مقصد تو یہ ہے - کہ بدیشی مصنوعات جنہیں اس ملک میں سودیشی مصنوعات کی نسبت زیادہ ارزاں قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے - نجات

حاصل کر لی جائے۔ اس حکمت عملی کا منشا صرف اسی قدر ہے۔ کہ درآمد شدہ اشیاء کی قیمت زیادہ ہو جائے۔ اگر یہ منشا پورا نہ ہوا۔ تو اُس کے معنی یہ ہونگے کہ حفاظت کی حکمت عملی کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی ہے یہ حکمت عملی منڈی کو محض سودیشی مصنوعات کے لئے مخصوص کر دیتی ہے۔ اور یہ مصنوعات بدیشی کی نسبت زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ جب ملکی صنعتوں کے تحفظ کے لئے بدیشی مال پر محصول لگا دیا جائیگا تو مصنوعات کی قیمتیں بہت بڑھ جائیں گی۔ خواہ اس طرح ملکی صنعتوں کو ترقی ہو یا تنزل بہرحال یہ تو یقینی ہے کہ مصارف زندگی بہت زیادہ ہو جائیں گے۔ اور یہ امر چنداں یقینی نہیں کہ لوگوں کی آمدنی میں بھی اس قدر اضافہ ہو جائیگا۔ کہ مصارفِ زندگی کی تلافی ہو جائے۔ جس دن چونگی محصولوں میں اضافہ کیا گیا۔ ملک کو اسی دن سے یقیناً نقصان ہوگا۔ اور اس سے فوائد حاصل کرنے کے لئے عرصہ دراز درکار ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پنجاب کو اس سے مطلقاً کوئی فائدہ نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مقصد سائنٹیفک طریقوں سے جو اضافہ محصول کی طرح بھدے اور ناقص نہ ہوں حاصل کیا جا سکے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ آیا اس صوبہ کے باشندوں کو آج ہی اس مقصد کے لئے قربانی کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ اور صرف یہ امید دلا کر خوش کر دیا جائے۔ کہ انہیں اس قربانی کا معاوضہ زمانہ مستقبل میں ملے گا۔

ختم شد